خطوطِ غالب



مرتّبہ:

غلام رسول مہر



خطوطِ غالبؔ

مرتبہ

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

SGAS

طابع: شیخ نیاز احمد

مطبع: غلام علی پرنٹرز، اشرفیہ پارک
فیروز پور روڈ، لاہور

SGAS

مقام اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز

199-سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور-54000

فہرست

تعارف

میرزا غالب کے اردو مکاتیب کا جو مجموعہ آپ کے ملاحظہ میں پیش ہو رہا ہے اس کی خصوصیات کے بارے میں چند گزارشیں ضروری ہیں:

۱۔ اس مجموعے میں میرزا کے وہ تمام خطوط آ گئے ہیں، جن کا سراغ مرتب کو مل سکا۔ صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا ہے۔ ایک مکاتیب رام پور کا مجموعہ، دوسرا منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط کا وہ مجموعہ جو "نادراتِ غالب" کے نام سے چھپا۔

۲۔ تمام خطوط تاریخ وار مرتب کر دیے گئے ہیں۔ جن خطوط پر تاریخیں ثبت نہیں تھیں، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر قیاساً فیصلہ کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے۔ اغلب ہے اکثر قیاس درست ہوں۔ اگر کہیں لغزش ہوئی ہو تو اسے مرتب کی سعیِ نارسا کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

۳۔ تمام مکتوب الیہم کے حالات لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ میرزا کے ساتھ ان کے تعلق کی حیثیت واضح ہو جائے اور خطوط ملاحظہ فرماتے وقت وہ حیثیت سامنے رہے۔

۴۔ خطوط میں جا بجا مقامی اور تاریخی تلمیحات ہیں، جن کی حقیقت مکتوب الیہم سے مخفی نہ تھی، لیکن عام خوانندگانِ کرام تشریح کے بغیر انہیں سمجھ نہیں سکتے اور خطوط سے بقدرِ طلب ذوق و لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرتب نے حتی الامکان تمام تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔

۵۔ ابتداء میں مقدمہ لکھا ہے، جس میں انشائے غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خطوط کا مطالعہ یقیناً زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

میری رائے برسوں سے یہ ہے کہ میرزا غالب کے اردو مکاتیب کو مختلف درجوں میں درسی کتابوں کے طور پر پڑھانے سے اُردو زبان کا صحیح ذوق جس پیمانے پر پیدا کیا جا سکتا ہے، وہ کسی دوسری کتاب سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ "اردوئے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" قرنوں سے نصاب میں داخل ہیں؛ چونکہ ان مجموعوں کی ترتیب میں وہ اہتمامات نہ کیے جا سکے جو ان کی افادی حیثیت کو واضح کر سکتے، اس لیے نہ اساتذہ ان کی تدریس پر پوری توجہ کر سکے اور نہ طلبہ ان سے بقدرِ آرزو فائدہ اٹھا سکے۔
میں نے پیشِ نظر مجموعے میں اپنی بساط کے مطابق یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں مزید کام ضروری ہے۔ دعا ہے کہ خدا اس کے سرانجام کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

مقدمہ

میرزا غالبؔ

میرزا اسد اللہ بیگ خاں غالبؔ، قوم کے سلجوقی ترک، ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں اس زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ جب سلطنتِ مغلیہ کے اقبال کا دیا ٹمٹما رہا تھا اور نواب معین الملک عرف میر منّو پنجاب کے ناظم تھے۔ میرزا قوقان بیگ خاں پہلے میر منّو کے پاس ملازم ہوئے، ان کی وفات پر نظامتِ پنجاب کا کارخانہ درہم برہم نظر آیا تو دہلی چلے گئے۔ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ دہلی ہی میں رہے یا اور کسی جگہ بھی مشغولیت اختیار کی۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جب شاہ عالم ثانی مرہٹوں کا سہارا لے کر پورب سے دہلی پہنچا اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے ہاتھ میں اختیارات کی باگ آئی تو میرزا قوقان بیگ خاں کو بلند شہر کے ضلعے میں پہاسو کا تعلقہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مل گیا۔ غالباً دہلی ہی میں انھوں نے شادی کی۔ چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ہمیں ان کی نرینہ اولاد میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں: ایک میرزا عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولھا، دوسرا میرزا نصر اللہ بیگ خاں۔

نجف خاں کی وفات کے بعد اس خاندان نے شاہی ملازمت چھوڑ کر ریاست جے پور میں ملازمت کر لی اور بظاہر اسی دور میں اقامت کے لیے آگرہ مناسب سمجھا گیا۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ کے رئیس خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی اور وہ خانہ داماد کی حیثیت میں وہاں رہنے لگے۔ ان کے تین بچے ہوئے چھوٹی خانم، میرزا اسد اللہ بیگ خاں غالبؔ اور میرزا یوسف خاں۔

عبداللہ بیگ خاں پہلے آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ میں ملازم رہے، پھر حیدر آباد چلے گئے، جہاں نظام الملک میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے انہیں سو سوار کا افسر مقرر کر دیا۔ یہ نوکری چھٹی تو آگرہ چلے آئے۔ پھر سواروں کا ایک دستہ لے کر ملازمت کی غرض سے الور پہنچے، وہاں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ یہ ۱۸۰۲ء کا واقعہ ہے، راج گڑھ میں ان کی قبر بنی۔ میرزا غالبؔ نے مہاراجہ الور کے قصیدے میں لکھا ہے:

> در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار   کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست

عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے وقت غالبؔ کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ چھوٹی خانم ان سے بڑی تھیں، میرزا یوسف دو برس چھوٹے تھے۔ ان یتیم بچوں کو ان کے حقیقی چچا میرزا نصر اللہ بیگ نے اپنے دامنِ شفقت میں لے لیا۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار تھے۔ جب انگریز دہلی اور آگرہ پر قابض ہو گئے اور صوبیداری کمشنری بن گئی تو لارڈ لیک نے میرزا نصر اللہ خاں کو چار سو سواروں کا افسر بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ پھر میرزا نے سونک اور سونسا کے پرگنے ہلکر سے بزور چھین لیے۔ سونک اور سونسا آجکل ضلع متھرا میں ہیں۔ لارڈ لیک نے اس کارنامے پر خوش ہو کر دونوں پرگنے نصر اللہ خاں کو دے دیے۔ غرض ان کی آمدنی لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ ہو گئی لیکن اس واقعے پر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ میرزا نصر اللہ خاں بھی ۱۸۰۶ء میں اچانک وفات پا گئے۔ اس طرح نہ محض ان کی تنخواہ بند ہوئی بلکہ سرکار انگلشیہ نے سونک اور سونسا کے پرگنے بھی اپنے قبضے میں لے لیے، لیکن میرزا کے پسماندوں

کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کردی۔ پسماندوں میں مرحوم کی والدہ، تین بہنیں، ایک بھتیجی اور دو بھتیجے تھے۔

پنشن میں قطع و برید

میرزا نصراللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروزپور جھرکا کی ہمشیر سے ہوئی تھی اور ان کے پسماندوں کی پنشن فیروزپور جھرکا ہی کی ریاست سے متعلق کردی گئی تھی۔ نواب نے پہلے دس ہزار روپے کی رقم گھٹا کر پانچہزار کی، پھر اس پانچہزار میں سے دو ہزار روپے کا حصہ دار خواجہ حاجی کو بنا دیا، جو میرزا نصراللہ بیگ خاں کے رسالے کا ایک افسر تھا اور میری معلومات کے مطابق اسے میرزا کے خاندان سے کوئی نسبی علاقہ نہ تھا، اس لیے پسماندوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا، گویا میرزا کے متعلقین کے لیے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی رقم رہ گئی جو بصورتِ ذیل تقسیم ہوئی،

والدہ و ہمشیرگان میرزائے مرحوم	پندرہ سو روپے
برادر زادگان میرزائے مرحوم (میرزا غالب اور میرزا یوسف)	پندرہ سو روپے

غرض میرزا غالب کو محض ساڑھے سات سو روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ابتداء میں غالب یا ان کے عزیزوں میں سے کسی نے اس قطع و برید کے خلاف اعتراض نہ کیا۔ اس کی کئی وجہیں ذہن میں آتی ہیں مثلاً گھر میں کوئی بالغ مرد نہ تھا جو اصل مطالبے کا تعاقب کرتا۔ نواب احمد بخش خاں کے ساتھ قریبی رشتہ تھا، اس لیے ان کے خلاف مقدمہ کھڑا کرنا غیر مناسب سمجھا گیا۔ نواب موصوف مقررہ پنشن کے علاوہ بھی ان لوگوں کو کچھ رقمیں دیتے رہتے تھے، اس لیے قانونی کارروائی خلافِ تقاضائے احسان نظر آئی۔ ۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی نے وفات پائی جسے نواب احمد بخش خاں نے پنشن میں دو ہزار کا حصہ دار بنا لیا تھا اور یوں قانونی کارروائی کا بہت اچھا موقع پیدا ہو گیا۔ سب سے آخر میں یہ کہ پہلی رشتہ داری کی بناء پر خود میرزا کی شادی نواب احمد بخش خاں کی بھتیجی سے ہو گئی۔ اس طرح وہ احمد بخش خاں کے ہم خاندان بن گئے تھے۔

جب میرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مقیم ہو گئے تو ان کا امیرانہ ٹھاٹھ بدستور قائم رہا، لیکن آمدنی کے وسائل گھٹتے گئے، یہاں تک کہ وہ قرضدار ہو گئے۔ نیز احمد بخش خاں نے اپنی جائداد کو بیٹوں میں تقسیم کر کے کاروبارِ ریاست سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس وقت میرزا غالب کو خاندانی پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی کا خیال آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے ان کی بیوی اور بعض دوسرے متعلقین محرک ہوئے ہوں گے، جنھیں نواب احمد بخش خاں کے فرزندِ اکبر شمس الدین احمد خاں سے اختلاف تھا۔ شمس الدین احمد خاں ایک فریق تھا، باقی سارا خاندان مخالف فریق تھا، اس میں غالب کو بھی شامل ہونا پڑا۔ اسی پنشن کے سلسلے میں غالب نے ۱۸۲۶ء میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا جو اس زمانے میں حکومتِ انگلشیہ کا مرکز تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا:

۱۔ دس ہزار روپے کی جو رقم ابتداء میں مقرر ہوئی تھی، اسے بحال کیا جائے۔

۲۔ خواجہ حاجی کو میرزا نصراللہ بیگ خاں کے پسماندوں میں شامل کر کے دو ہزار روپیہ سالانہ دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ رقم نیز پانچہزار سالانہ کی گھٹائی ہوئی رقم، ۱۸۰۶ء سے یک مشت ادا کی جائے۔

۳۔ آیندہ کے لیے پنشن فیروزپور جھرکا کی ریاست کے بجائے سرکارِ انگلشیہ کے خزانے سے متعلق کردی جائے۔

دعوےٰ ریاست فیروزپور جھرکا کے خلاف تھا جس کے والی نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر نواب شمس الدین احمد خاں بن گئے تھے۔ ان کی طرف سے بر جواب دعویٰ پیش ہُوا کہ دس ہزار روپے کی پنشن میں نصف کی تخفیف اور بقیہ رقم میں خواجہ حاجی کا شمول لارڈ لیک کے حکم سے ہُوا، جو ابتدائی پنشن مقرر کرنے کا ذمہ دار تھا۔ مقدمہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ میرزا غالب لارڈ لیک کے دُوسرے حکم سے بالکل بیخبر تھے اور کہتے تھے کہ اگر یہ حکم جاری بھی ہُوا تو خلاف قاعدہ تھا اور اس کا کوئی ریکارڈ دفتر میں موجود نہیں، نہ کسی بڑے یا چھوٹے حاکم کا کوئی ذاتی حکم سرکار کے منظورہ حکم کا ناسخ ہوتا ہے۔ آخر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ لارڈ لیک کا دوسرا حکم سرجان میلکم کے پاس بھیج کر پوچھا جائے کہ آیا اس پر مُہر اور دستخط لارڈ موصوف ہی کے ہیں؟ سرجان میلکم پنشن کے تقرر کے زمانے میں لارڈ لیک کا سکرٹری تھا اس نے مہر اور دستخط کی تصدیق کر دی تو یہ حکم صحیح تسلیم کر لیا گیا اور میرزا غالب کا دعوےٰ خارج ہو گیا اس طرح انھیں ساڑھے سات سو روپے سالانہ پر قناعت کرنی پڑی۔

شادی اور دہلی میں توطن

میرزا غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر میں نواب احمد بخش خاں کے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بڑی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہُوئی۔ اس تعلق کی بنا پر وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آگرہ کی سکونت چھوڑ کر دہلی میں مقیم ہو گئے اور باقی زندگی اسی شہر میں گزاری۔ ان کے بھائی میرزا یوسف بھی آگرہ سے دہلی آ گئے تھے۔ وہ دیوانے ہو گئے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بحالتِ دیوانگی فوت ہُوئے۔ بیگم کی وجہ سے نواب احمد بخش خاں کا خاندان میرزا کا اپنا خاندان بن چکا تھا اس کے مختلف افراد کی اجمالی کیفیت یہ ہے:۔

۱۔ **نواب غلام حسین خاں مسرور** جو میرزا کے ہم زلف یعنی امراؤ بیگم کی چھوٹی بہن آبادی بیگم کے شوہر تھے۔

۲۔ **میرزا زین العابدین خاں عارف ابن غلام حسین خاں مسرور** جنہیں امراؤ بیگم نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا وہ ۱۸۵۲ء میں بہ عالمِ جوانی فوت ہُوئے۔

۳۔ **باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں فرزندان زین العابدین خاں عارف**۔ حسین علیخاں شاداں کو بیگم غالب بچپن ہی میں اپنے پاس لے آئی تھی۔ عارف کی وفات کے بعد باقر علی خاں بھی میرزا کے پاس آ گئے۔ یہ میرزا کی زندگی میں الور میں ملازم ہو گئے تھے۔ میرزا کی وفات کے بعد ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی اور جوانی میں فوت ہو گئے۔ میرزا کی وفات کے بعد حسین علی خاں رام پور میں پچیس روپے کے ملازم ہو گئے تھے اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد یہ بھی چل بسے۔

۴۔ **علی بخش خاں ابن الٰہی بخش خاں معروف** یعنی بیگم غالب کے حقیقی بھائی۔ ابتداء میں انہیں فیروزپور جھرکا سے سو روپے پنشن ملتی تھی، جو ریاست کی ضبطی کے بعد نصف رہ گئی۔ "غدر" کے بعد یہ دہلی سے باہر رہے۔ ۱۸۶۴ء میں فوت ہُوئے۔ ان کے بیٹے غلام فخرالدین خاں، بہادر شاہ ثانی کی جاگیر کوٹ قاسم کے منتظم تھے۔ "غدر" کے بعد ان پر مقدمہ چلا، لیکن بری ہو گئے۔ ان کی شادی میرزا کے بھائی یوسف خاں کی اکلوتی بیٹی سے ہُوئی تھی۔ ان کے بیٹے محمد سعید خاں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ کئی برس کی ملازمت کے بعد درویشی اختیار کر لی۔ ان کے بیٹے میرزا نصراللہ خاں بیرسٹرایٹ لاء دولت آصفیہ میں صدر محاسب بن گئے تھے۔ معروف کے دیوان کی پہلی جلد انھی نے شائع کی تھی۔

۵۔ **نواب شمس الدین احمد خاں (نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر)** ریاست فیروز پور جھرکا کے والی بنے دو چھوٹے بھائیوں سے ان کا جھگڑا ہو گیا جنھیں نواب احمد بخش خاں نے لوہارو کی جاگیر دے دی تھی۔ شمس الدین احمد خاں چاہتے تھے کہ لوہارو میں بھی ان کا انتظام ہو اور چھوٹے بھائیوں کو ایک مقررہ رقم ملتی رہے۔ انتظامِ ریاست سے کوئی سروکار نہ ہو۔ بھائی کہتے تھے کہ لوہارو کے علاوہ والد کی منقولہ جائداد میں سے بھی حصہ ملنا چاہیئے۔ یہ جھگڑا دیر تک چلتا رہا۔ آخر ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کی کوشش سے لوہارو چھوٹے بھائیوں کو مل گیا۔ اس وجہ سے شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی جس نے عام شہرت حاصل کر لی۔ ۱۸۳۵ء میں فریزر مارا گیا۔ اس کے قتل کا الزام شمس الدین احمد خاں اور اس کے ایک ملازم پر لگا۔ دونوں کو پھانسی ملی اور ریاست ضبط ہو گئی۔

۶۔ **امین الدین احمد خاں (نواب احمد بخش خاں کے منجھلے فرزند)** جنھیں لوہارو کا والی تسلیم کیا گیا۔ یہ ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ نواب علاؤالدین احمد خاں علائی (غالبؔ کے خلیفۂ ثانی) انھیں کے فرزند اکبر اور جانشین تھے۔ علائی نے ۱۸۸۴ء میں وفات پائی اور ان کے فرزند اکبر نواب امیر الدین احمد خاں رئیس بنے جن کا دوسرا نام فرخ میرزا تھا اور غالبؔ انھیں فرخ سیر کہا کرتے تھے۔

۷۔ **ضیاء الدین احمد خاں نیّرؔ (نواب احمد بخش خاں کے فرزند اصغر)** جنھیں لوہارو سے حصے کی رقم ملا کرتی تھی۔ اردو اور فارسی کے ادیب اور شاعر تھے۔ اردو میں نیّرؔ اور فارسی میں رخشاںؔ تخلص تھا۔ تاریخ کے یگانہ عالم مانے جاتے تھے۔ ایلیٹ نے اپنی تاریخ مرتب کرتے وقت زیادہ تر نادر قلمی نسخے انھی سے لیے تھے۔

۸۔ **شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ (نیّرؔ کے فرزند اکبر)** ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ ان کے چار بیٹے تھے:

(۱) شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ، جن کی شادی باقر علی خاں کامل کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور وہ لاولد فوت ہوئے۔

(۲) سراج الدین احمد خاں سائلؔ جن کا انتقال چند سال پیشتر ہوا۔ (۳) بہاؤالدین احمد خاں: ان کی صرف ایک صاحبزادی تھی جن کی شادی نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ سے ہوئی۔ یہ صاحبزادی یعنی بیگم ذوالفقار علی خاں بفضلِ خدا زندہ ہیں۔ (۴) ممتاز الدین احمد خاں کی بھی ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی سر امیر الدین احمد خاں سے ہوئی۔

۹۔ **سعید الدین احمد خاں طالبؔ (نیّرؔ کے فرزند اصغر)** لاولد فوت ہوئے۔

شغل شعر و ادب

میرزا غالبؔ نے معمول کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی، اس لیے کہ ان کی والدہ ہندوستانی تھیں۔ فارسی اس عہد کی مروجہ تعلیمی زبان تھی جس طرح بعد میں انگریزی تعلیمی زبان بنی۔ ترکی بھی ان کے گھر کی ایک بولی تھی۔ خواجہ حالیؔ نے لکھا ہے کہ ان کے دادا کی زبان ترکی تھی اور ہندوستانی بہت کم سمجھتے تھے۔ والد اور چچا بھی یقیناً ترکی جانتے ہوں گے اور میرزا بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے۔ وہ تیرہ چودہ برس کے تھے جب ایک نومسلم پارسی بطریق سیاحت آگرہ پہنچا اور کم و بیش دو برس میرزا کے ہاں ٹھہرا رہا۔ اس کا اصل نام ہرمزد تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد عبدالصمد نام اختیار کیا۔ یہ فارسی اور عربی کا اجل فاضل اور منطق و فلسفہ کا یگانہ ماہر تھا۔ خصوصاً قدیم فارسی کے حقائق و غوامض پر اسے پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اسی عبدالصمد کی تعلیم نے میرزا کے طبعی جوہروں کو

جلادے کر روشن کر دیا۔ مروجہ تعلیم کے سوا انھوں نے جو کچھ سیکھا عبدالصمد ہی سے سیکھا۔

شاعری کا جوہر انھیں مبداءِ فیاض سے ملا تھا۔ طبیعت مشکل پسند تھی، میرزا عبدالقادر بیدل کا کلام پڑھا تو اردو میں بیدل ہی کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔ اس دور کا کلام "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں بیدل میرزا کے دل و دماغ پر بے طرح مسلّط تھا۔ انھوں نے مختلف غزلوں کے مقطعوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ جیسے جیسے طبیعت میں پختگی آتی گئی، طرزِ فکر و نظر میں تبدیلی یا کہنا چاہئے صفائی اور پختگی آتی گئی۔ پھر وہ فارسی گوئی پر متوجہ ہوئے۔ یہاں تک کہ دورِ متوسط میں اردو کے بجائے فارسی ہی کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔

دہلی میں اقامت کے بعد شاعروں کے عام طریقے کے مطابق انہوں نے شاہی دربار سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرفی اور نظیری کے ہم پایہ تھے، لیکن ان کے زمانے کا شاہی دربار مغلوں کی سطوت و شوکت کا محض ایک بے رنگ نقش رہ گیا تھا، اس لیے میرزا کا کمال شاعری جس قدر دانی و منزلت شناسی کا حقدار تھا وہ اسے نصیب نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں وہ ایک قصیدہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ۱۸۳۷ء میں ابوظفر سراج الدین تخت نشین ہوا تو اس کی مدح میں قصیدے پر قصیدے کہنے لگے۔ ان قصیدوں کے محرک غالباً وہ لوگ تھے جو میرزا کے دوست تھے اور دربار میں انھیں خاصا رسوخ حاصل تھا، انھیں میں سے شیخ نصیر الدین عرف کالے صاحب (بہادر شاہ کے پیر) اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش سے ۱۸۵۰ء میں میرزا کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام سونپا گیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا اور پچاس روپے مہینا تنخواہ مقرر ہوئی۔ پوری تاریخ کا نام "پرتوستان" تھا۔ اس کی دو جلدیں تجویز ہوئیں۔ جلد اوّل میں ابتدائے آفرینش سے ہمایوں بادشاہ تک کا حال، جلد دوم میں جلال الدین اکبر سے بہادر شاہ ثانی تک کا حال۔ پہلی جلد کا نام "مِہرِ نیمروز" اور دُوسری کا نام "ماہِ نیم ماہ" قرار پایا۔ میرزا نے پہلی جلد ۱۸۵۲ء میں مکمل کر دی، دوسری کی تسوید و ترتیب شروع ہی نہ ہو سکی۔

دربارِ شاہی سے تعلق کے زمانے میں میرزا نے اپنی اکثر بہترین اردو غزلیں کہیں، اس لیے کہ قلعے میں مشاعرے ہوتے تھے جن میں میرزا کو شریک ہونا پڑتا تھا۔ بہادر شاہ ویسے بھی اُردو غزلیں طلب کرتے رہتے تھے جیسا کہ خود میرزا نے ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے۔ مغلوں کی حکمرانی کے تمام مناصب انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ میرزا کے پاس شعر گوئی کے سوا کوئی ہنر نہ تھا اس لیے انگریز حاکموں اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں بھی انھوں نے قصیدے کہے۔ ایک قصیدے میں کس درد و سوز سے کہتے ہیں:

با صلیبم فتادہ کار بہ دہر　　　عَلَمِ کاویاں نمی خواہم

انھوں نے چند قصیدے متفرق اُمراء کی مدح میں بھی کہے۔ مثلاً نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ والیانِ اودھ، نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیانِ رام پور، سرسالار جنگ وزیرِ اعظم حیدر آباد، نواب وزیر الدولہ والیٔ ٹونک، راجہ شیودھان سنگھ مسند نشین الور، مہاراجہ نرندر سنگھ والیٔ پٹیالہ۔ چند قصیدے دوستوں کی مدح میں ہیں۔ مثلاً نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر۔ ان قصیدوں کا مدعا میرزا غالب کی اصطلاحِ خاص میں محض "بھٹئی" نہ تھا

بلکہ قصیدہ گوئی کمالاتِ شاعری کی نمائش کا ایک متداول ذریعہ تھی۔

خاندانی پنشن کے علاوہ میرزا سات برس تک قلعے سے تنخواہ پاتے رہے۔ انھیں مختلف امرا کی طرف سے صِلے ملے ہوں گے نواب یوسف علی خاں والئ رام پور نے مستقل تنخواہ مقرر کر دی تھی، جو ان کے جلیل القدر فرزند نواب کلب علی خاں کے عہدِ حکومت میں بھی جاری رہی۔

قاطع برہان کا ہنگامہ اور وفات

میرزا کو ہندوستان کے عام فارسی شعرا کی طرز و روش پسند نہ تھی، نہ انھیں مستند مانتے تھے۔ کلکتہ کے ایک اجتماع میں ان کے کلام پر اعتراض ہُوئے اور معترضین نے میرزا قتیل کی سند پیش کی تو میرزا نے سند کو بے پروائی سے ٹھکرا دیا۔ اس پر ہنگامہ بپا ہُوا اور میرزا نے معذرت کے طور پر مثنوی "بادِ مخالف" لکھی۔ اس میں ایک جگہ فارسی کے مشہور اساتذہ کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را؟

ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

غالبؔ سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری   بہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

غدر کے زمانے میں ان کے پاس "برہانِ قاطع" (مؤلفہ محمد حسین تبریزی ثم دکنی) کے مطبوعہ نسخے کے سوا کوئی کتاب نہ تھی۔



غدر کے حالات میں "دستنبو" لکھنے سے فارغ ہُوئے تو "برہانِ قاطع" کو دیکھنے لگے۔ اس میں جو غلطیاں آئیں، ان پر نشان لگاتے رہے، پھر ایک کتاب مرتب کر دی جس کا نام "ردِ برہانِ قاطع" کی نسبت سے "قاطع برہان" رکھا۔ یہ فارسی کے ہندستانی لغت نگاروں کو کھلا چیلنج تھا۔ "قاطع برہان" کے رد و اثبات میں کئی کتابیں لکھی گئیں اور میرزا کی زندگی کے آخری دم تک تغلیط و توثیق کا ہنگامہ گرم رہا۔ "قاطع برہان" کو بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ انھوں نے دوبارہ چھپوایا تو اس کا نام "درفشِ کاویانی" رکھا۔

تہتر برس تین مہینے اور ۲۳ دن کی عمر پاکر میرزا ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو اس خاکداں سے رہ گرائے عالمِ بقا ہُوئے۔ بیگم نے پُورے ایک برس بعد انتقال کیا۔

میرزا کے سات بچے ہُوئے، لیکن کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ صرف میرزا کا کلام بقائے نام اور شہرتِ عام کی دستاویز رہ گیا۔

تصانیف

میرزا کی تصانیف کا مختصر سا نقشہ یہ ہے:

۱۔ **کلیاتِ نظمِ فارسی**: اس میں قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنویاں، قصیدے، غزلیں اور رباعیاں غرض سب کچھ شامل ہے۔

۲۔ **کلیاتِ نثرِ فارسی**: اس میں میرزا کی تین کتابیں شامل ہیں۔ (۱) "پنج آہنگ" جو فارسی کے قواعد، تقریظوں اور فارسی خطوں پر مشتمل ہے۔ (۲) "مہرِ نیم روز" یعنی تاریخ خاندانِ تیموری۔ (۳) "دستنبو" جس میں غدر کے دیدہ و شنیدہ حالات درج ہیں۔ آخری کتاب خالص فارسی ہے اور اس میں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔

۳۔ دیوانِ اُردُو : اس کے پانچ ایڈیشن صرف میرزا کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ بعد میں بیسیوں اڈیشن چھپے اور متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

۴۔ نسخہ حمیدیہ : میرزا کے ابتدائی اردو کلام کا مجموعہ جسے وہ قلم انداز کر چکے تھے۔

۵۔ سبدِ چیں : میرزا کا وہ فارسی کلام جو کلیات نظم فارسی میں شامل نہ ہو سکا یا کلیات کی طباعت کے بعد کہا گیا۔

۶۔ باغِ دودر : جس میں آخری دَور کے اشعار ہیں۔

۷۔ عودِ ہندی : اردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی وفات سے چار ماہ پیشتر میرٹھ میں چھپا تھا۔

۸۔ اُردُوئے معلیٰ حصۂ اوّل : اردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی زندگی میں مرتب ہُوا۔ دہلی میں چھپ رہا تھا، لیکن میرزا کی وفات کے بعد طباعت مکمل ہُوئی۔

۹۔ اُردوئے معلیٰ حصہ دوم : جو اردو خطوط پہلے حصے میں شامل نہیں ہُوئے تھے، ان کا ایک مجموعہ خواجہ حالیؔ نے مرتب کر کے مطبع مجتبائی کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ بھی حصہ اوّل کے ساتھ شائع ہو گیا۔

۱۰۔ نادر خطوطِ غالبؔ : میرزا کے ستائیس اُردُو مکاتیب کا مجموعہ جو کرامت حسین کرامتؔ ہمدانی بہاری، صفیرؔ بلگرامی اور صوفی منیری کو لکھے گئے تھے۔ میرے نزدیک ان سب کا مستقل وجود محلِ نظر ہے۔

۱۱۔ مکاتیبِ غالبؔ : میرزا کے ان خطوں کا مجموعہ جو والیان رام پور کو لکھے گئے۔

۱۲۔ متفرقاتِ غالبؔ : میرزا کے فارسی نظم و نثر کے تبرکات۔

۱۳۔ نادراتِ غالبؔ : میرزا کے ان خطوط کا مجموعہ جو منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھے گئے تھے۔

۱۴۔ انتخابِ غالبؔ : اردو اور فارسی اشعار کا وہ انتخاب جو میرزا نے نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی فرمایش پر کیا تھا۔ یہ بھی دربار رام پور کی توجہ سے چھپ گیا ہے۔

۱۵۔ قاطعِ برہان : جسے بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ دوبارہ "درفشِ کاویانی" کے نام سے چھاپا گیا۔

۱۶۔ نامۂ غالبؔ : "قاطع برہان" کی بحث کے سلسلے کا وہ طویل خط جو میرزا رحیم بیگ مؤلف "قاطع برہان" کے نام لکھا گیا تھا، الگ بھی چھپ گیا تھا۔ "اودھ اخبار" میں بھی شائع ہُوا تھا۔ "عودِ ہندی" میں بھی شامل ہو گیا تھا۔

۱۷۔ تیغِ تیز : "قاطع برہان" کی بحث کے سلسلے کا ایک اردو رسالہ۔

۱۸۔ نکات و رقعاتِ غالبؔ : اس میں "پنج آہنگ" سے فارسی قواعد والے حصے کا اردو ترجمہ کر کے پندرہ فارسی خطوط شامل کر دیئے گئے تھے۔

۱۹۔ قادر نامہ : بچّوں کے نصاب کی کتاب۔

۲۰۔ لطائفِ غیبی : "قاطع برہان" کی بحث کے سلسلے کی ایک کتاب، جو سیف الحق میاں داد خاں سیّاحؔ کے نام سے چھپی۔

۲۱۔ سوالاتِ عبدالکریم : یہ بھی قاطع برہان کے سلسلے کا ایک رسالہ ہے، جو عبدالکریم کے نام سے چھپا، لیکن دراصل

میرزا نے لکھا تھا۔

۲۲۔ گلِ رعنا: میرزا نے اپنے عزیز دوست سراج الدین احمد کی فرمایش پر اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا۔ اس کا نام "گلِ رعنا" رکھا تھا۔ اس کا صرف ایک حصّہ مولانا حسرتؔ موہانی کے پاس تھا جیسا کہ ایک مرتبہ مرحوم نے خود بتایا۔

میرزا کا مقام ادب و شعر میں

ادب و شعر میں میرزا کی رفعت و برتری اب کسی شرح کی محتاج نہیں رہی۔ جامعیت ان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ بے شائبہ مبالغہ ہندوستان نے امیر خسروؔ کے بعد ان جیسا جامع شخص پیدا نہیں کیا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے یگانہ شاعر تھے۔ حافظؔ اور نظیریؔ کی طرح محض غزل ہی میں نہیں، عرفیؔ کی طرح محض غزل اور قصیدے ہی میں نہیں، بلکہ تمام اصنافِ سخن میں ان کی رفعت و برتری عموماً مسلم ہے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، قطعہ، مرثیہ، نوحہ وغیرہ کوئی صنفِ نظم نہیں، جس میں ان کا پایہ یکساں بلند اور مختلف اصناف کے مشاہیر اساتذہ کے برابر نہ ہو۔ اردو نظم میں اگرچہ ان کا کلام تھوڑا ہے لیکن جتنا ہے ہر لحاظ سے ہماری قومی زبان کا نہایت گراں بہا سرمایہ ہے۔ پھر میرزا فارسی نثر کے یگانہ ادیب تھے۔ فارسی کلیات نثر میں ہر رنگ اور ہر انداز کی نثریں موجود ہیں۔ ابوالفضل کا سرمایۂ شہرت صرف نثر نگاری تھا۔ میرزا نثر میں اس سے پیچھے نہیں اور نثر نگاری ان کے کمالاتِ فطری کی بہار آفرینی کا محض ایک کرشمہ ہے۔ اردو نثر میں ان کے صرف مکاتیب ہیں یا چند تقریظیں اور دیباچے۔ لیکن حسنِ کلام، لطفِ بیان، روانی و انسجام، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا۔



اگر میرزا کے خداداد جوہروں کا اندازہ اس بنا پر کیا جائے کہ زندگی میں انھیں شعر و ادب کے ذریعہ سے کس قدر مالی منافع حاصل ہوئے یا انھوں نے کون کون سے اعزازات پائے تو لاریب خود ان کی زبان مستعار لے کر کہنا پڑے گا۔

در آں دیار کہ گوہر خریدن آئین نیست ۔۔۔ دکاں کشودہ ام و قیمتِ گہر گویم

یا

بہ کلبہ ام گہرِ شب چراغ خس پوش است ۔۔۔ سخن ز تیرگیِ طالعِ ہنر گویم

لیکن اگر ان کی شہرت، ناموری اور وفات کے بعد روز افزوں قدر و منزلت کو سامنے رکھا جائے تو تسلیم کرنا چاہیئے کہ علامہ اقبال مرحوم کو چھوڑ کر اردو زبان کے کسی شاعر کو عقیدتِ عامہ کی ویسی گراں بہا متاع نصیب نہیں ہوئی جیسی میرزا کے حصّے میں آئی۔ انھوں نے خود پیشین گوئی کی تھی۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است ۔۔۔ شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالبؔ کی اُردو نثر

بلاشبہ ان کے مختصر سے اردو دیوان کی بہت قدر ہوئی، جسے وہ "بے رنگ" اور "وزرمِ برگِ گلستانِ فرہنگ" کہتے تھے لیکن فارسی پر قطعاً توجہ نہ ہوئی، جسے وہ "نقشہائے رنگ رنگ" کا نگارخانہ قرار دے رہے تھے۔ اب فارسیت کا ذوق اتنا کم ہو گیا ہے اور ادبی فکر و نظر کا رُخ اس قدر بدل گیا ہے کہ شاید ہی میرزا کی فارسی پر توجہ کی نوبت آئے، لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اردو نثر بھی اب تک ٹھیک مرتب نہ ہو سکی۔

اردوے معلیٰ اور عودِ ہندی اگرچہ نصاب میں شامل رہیں، ان کے کئی اڈیشن بھی شائع ہوئے لیکن ان رقعات کو تاریخ وار مرتب کرنے کا خیال کسی کو نہ آیا۔

یہاں یہ بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ غالب کے اردو دیوان سے بہ درجہ غایت شغف و شیفتگی نے ملک میں شعر کا صحیح ذوق پیدا کیا یا نہیں لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اردو مکاتیب نثر نگاری کا صالح اور صحیح مذاق پیدا کرنے کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتے تھے، ان میں ہر درجے اور ہر رنگ کی تحریریں موجود تھیں، ایسی بھی جو بچوں کو بے تکلف پڑھائی جا سکتی تھیں، ایسی بھی جو دقیق علمی و ادبی نکات کی حامل تھیں اور صرف اہلِ علم ہی ان سے محظوظ ہو سکتے تھے پھر ان میں رنگ رنگ کے مطالب بیان ہوتے تھے اور ہر قسم کی تحریروں کے نمونے ملتے تھے تاہم تعجب ہے کہ انھیں صرف رسمی خطوط سمجھ لیا گیا اور اس لحاظ سے نہ دیکھا گیا کہ ان میں صحیح مذاقِ نگارش کی پرورش کے کتنے جوہر موجود ہیں۔ وہ اگر محفوظ رہے تو زیادہ تر اس لیے کہ ایک باکمال اور شہرۂ آفاق شاعر کے تبرکات تھے، اس لیے نہیں کہ بجاے خود محفوظ رہنے اور فروغ پانے کے حقدار تھے۔

تین ضروری کام

ان مکاتیب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں تین کام ضروری تھے:

۱۔ خطوط کو نگارش کی تاریخوں کے لحاظ سے مرتّب کیا جاتا، "تاکہ مختلف مباحث و مطالب "تاریخی ترتیب" پاکر زیادہ لطف انگیز اور دل پذیر بن جاتے۔ نیز مکتوب الیہم کے حالات اختصار سے لکھ دیئے جاتے "تاکہ میرزا کے ساتھ ان کا تعلق واضح ہو جاتا۔

۲۔ مکاتیب میں قدم قدم پر ایسے اشارے موجود تھے جو شرح کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے۔ میرزا نے مکتوب الیہ کا علم و نظر پیش رکھتے ہوئے محض اشارے کر دینا کافی سمجھا، لیکن ہمارے لیے وہ سراسر یا بیشتر مبہم بن چکے تھے۔ جب تک انھیں کھول کر نہ بیان کیا جاتا، مختلف عبارتوں کا پورا مطلب ذہن میں نہیں آ سکتا تھا اور نہ خوانندہ ان سے بوجہ اتم لذت اندوز ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر حواشی لکھنے ضروری تھے۔

۳۔ میرزا کی خصوصیاتِ نگارش اور لطائفِ تحریر کو تفصیلاً نہیں تو کم از کم اجمالاً بیان کر دیا جاتا۔

مدت ہوئی میں نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ منشی مہیش پرشاد پروفیسر بنارس یونیورسٹی خطوطِ غالب مرتب کر رہے ہیں اور انھوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تمام خطوں کا مقابلہ حتی الامکان اصل خطوں سے کریں گے تو میں نے اپنا کام روک دیا، اس لیے کہ جو وسائلِ تحقیق و تقابل منشی صاحب کو میسّر تھے وُہ مجھے میسر نہ تھے اور جب ایک کام بہتر طریق پر انجام پا رہا تھا تو اسے کمتر پیمانے پر انجام دینے کے لیے وقت صرف کرنا بالکل غیر مناسب تھا چنانچہ منشی صاحب کے مرتبہ خطوط کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی نے شائع کر دی، پھر یہ سلسلہ غیر معلوم وجوہ کی بنا پر تعطل میں پڑ گیا۔ گویا اصل کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

منشی مہیش پرشاد کا مجموعہ

منشی مہیش پرشاد صاحب کی کاوش مستحق صد ستایش ہے، لیکن ان کا جو مجموعہ چھپا، وہ بھی غلطیوں سے پاک نہ تھا، جیسا کہ پیشِ نظر مجموعے کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو جائے گا پھر ان کا مرتبہ مجموعہ مکمل نہ چھپا اور کام ادھورا رہ گیا۔ نیز منشی صاحب نے نہ حواشی لکھے، نہ مکتوب الیہم کے حالات

پر توجہ فرمائی اور نہ غالبؔ کی خصوصیات نگارش پیش کیں۔ غالباً انھوں نے یہ کام آئندہ کے لیے اٹھا رکھے تھے۔

غرض برسوں کے انتظار کے بعد پھر خیال آیا کہ اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق جو کچھ ہو سکتا ہے کر دینا چاہیئے۔ ممکن ہے زیادہ بالغ نظر اور ذی وسائل اہلِ علم ادھر متوجہ ہوں تو ان کے لیے کڑی منزل میں کسی قدر سہولت پیدا ہو جائے چنانچہ یہ مجموعہ مرتب کر دیا اور جتنے متفرق خطوط مل سکے وہ بھی اس مجموعے میں شامل کر دیئے تاکہ غالبؔ کی زیادہ سے زیادہ تحریک جا ہو جائے ——"اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" کی تقسیم میں نے توڑ دی اور سارے خطوط اکٹھے کر دیئے۔ آخر میں "نامۂ غالبؔ" اور "تقریظیں" لگا دیں۔

مشکلاتِ کار

یہ کام سخت مشکل تھا، خصوصاً میرے لیے جس کے وسائلِ تحقیق ویسے بھی محدود تھے اور ملک کی تقسیم کے باعث ہر مقام پر پہنچنا اور ہر ماخذ سے فائدہ اٹھانا سہل نہیں رہا تھا۔

غالبؔ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام خطوں پر تاریخیں اہتمام سے درج کرتے تھے بلکہ جا بجا ہجری اور عیسوی دونوں تاریخیں بھی بعض مقامات پر دن اور وقت تک بھی نظر انداز نہ کیا۔ جب خطوں کو طباعت کے لیے جمع کیا گیا تو میرا خیال ہے کہ اوّل مکتوب الیہم نے جیسی بے ترتیبی سے رکھ چھوڑے تھے، ویسے ہی اٹھا کر بھیج دیئے اور اسی بے ترتیبی سے وہ نقل ہوئے۔ پھر جامعین مکاتیب نے تاریخوں کو عموماً غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا یا نقل و کتابت میں برابر غلطیاں ہوتی رہیں۔ اس وجہ سے کچھ کم ایک صدی بعد انھیں تاریخ وار مرتب کرنا آسان نہ رہا۔ جن خطوں میں مختلف مطالب درج ہوئے تھے انھیں تو غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ہر لحاظ سے یقینی نہیں تو اقرب الی الصواب تاریخ نکال لینا ایک حد تک ممکن تھا، لیکن جو خطوط سراپا علمی تھے اور ان میں کوئی ایسی بات درج نہیں ہوئی تھی جسے مقابلہ کے لیے سہارا بنایا جا سکتا، ان کی تاریخیں نکالنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بہر حال ان مشکلات کے باوجود جو کام انجام پایا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اُمید ہے کہ پورا نہیں تو بیشتر درست ہوگا۔

عودِ ہندی

جیسا کہ معلوم ہے میرزا غالبؔ ابتدا میں اردو خطوط چھپوانے کے حامی نہ تھے۔ منشی شیو نرائن آرامؔ نے ان سے طباعت کی اجازت مانگی تو میرزا نے منع کر دیا۔ اس خیال کو زائل کرنے کا باعث چودھری عبدالغفور سرورؔ مارہروی ہوئے، جنھوں نے اپنے نام کے خطوط مرتب کر کے ان کا نام "مہرِ غالبؔ" رکھا اور اس مجموعہ پر ایک دیباچہ بھی لکھ دیا۔ اس میں زیادہ تر علمی خطوط تھے، اس لیے میرزا نے ان کی اشاعت غیر مناسب نہ سمجھی۔ پھر خیال آیا کہ اس انداز کے دوسرے خطوط بھی اس مرقع میں شامل کر دینے چاہئیں۔ چنانچہ خواجہ غلام غوث خاں بےخبرؔ میر منشی حکومت آگرہ و اودھ کے اہتمام میں علمی خطوط فراہم ہونے لگے۔ خود میرزا بھی علمی انداز کا جو خط لکھتے تھے اس کی نقل خواجہ صاحب کے پاس بھیج دیتے تھے یا مکتوب الیہ کو لکھ دیتے تھے کہ اس کی نقل خواجہ صاحب کو پہنچا دی جائے۔ کئی برس میں یہ مجموعہ تیار ہوا اور طباعت کے لیے منشی ممتاز علی خاں صاحب مالک مطبع مجتبائی کے پاس میرٹھ بھیج دیا گیا۔ یہی مجموعہ ہے جو "عودِ ہندی" کے نام سے غالبؔ کی وفات سے پونے چار مہینے پیشتر شائع ہوا۔

اُردوئے معلّٰی

"عودِ ہندی" کی اشاعت میں بہت دیر ہو گئی تو دہلی میں میرزا کے مخلص نیاز مندوں نے "اردوئے معلّٰی"

کے نام سے نئے مجموعے کی ترتیب شروع کردی۔ عودِ ہندی کی پہلی اشاعت کی کاپی کسی اناڑی کاتب نے لکھی تھی اور غلطیاں بہت رہ گئی تھیں، نیز اس کی ابتدائی ترتیب صرف علمی خطوط تک محدود تھی۔ اس کے برعکس "اردوے معلیٰ" میں ہر قسم کے خط جمع کرنے کی کوشش کی گئی اور خود میرزا غلطیوں کی تصحیح کے لیے موجود تھے۔ یہ مجموعہ اکمل المطابع میں چھپنا شروع ہوا جس کے مالک غلام رضا خاں تھے اور میرزا نے "اُردوے معلیٰ" کا حق تصنیف بھی انھیں کے حوالے کردیا تھا، لیکن طباعت میرزا کی وفات کے بعد مکمل ہوئی۔ اس کا دیباچہ میر مہدی مجروح نے اور خاتمہ میرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھا۔ یہ صرف حصہ اول تھا۔ اگر غالب زندہ رہتے تو دوسرا حصہ بھی مرتب ہو جاتا۔ ان کی وفات کے باعث کام التوا میں پڑ گیا۔ پھر مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی پورا "اُردوے معلیٰ" چھاپنے پر آمادہ ہوئے تو ۱۸۹۹ء میں خواجہ حالی نے اپنے فراہم کردہ خطوط ان کے حوالے کر دیے۔ اس کا نام "اردوے معلیٰ" حصہ دوم قرار پایا، لیکن یہ الگ کتاب کی صورت میں نہ چھپا بلکہ حصۂ اول کے ساتھ شامل ہوگیا۔

متفرق مجموعے اس کے بعد میرزا کے متفرق خطوط بھی رسالوں میں چھپتے رہے اور مختلف مجموعے بھی شائع ہوئے مثلاً

۱۔ **نادر خطوط غالب**: جو مولوی کرامت علی ہمدانی، صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کے نام لکھے گئے۔ یہ کل ستائیس خط ہیں۔

۲۔ **مکاتیبِ غالب**: یہ مجموعہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو میرزا نے والیانِ ریاست رام پور کے نام بھیجے تھے اور ریاست کے دفتر میں محفوظ تھے۔ صدیق محترم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے انھیں انتہائی اہتمام سے مرتب کیا۔ مبسوط فاضلانہ مقدمہ لکھا، جس میں پہلی مرتبہ انشاے غالب کی خصوصیات منظرِ عام پر لائی گئیں اور ٹائپ میں بہ صرفِ زرِ کثیر چھپوایا۔ یہ کل ۱۱۷ خط ہیں، جن میں سے چار خط فارسی کے ہیں، باقی سب اُردو کے۔

۳۔ **نادراتِ غالب**: اس مجموعے میں وہ خطوط ہیں جو میرزا نے نبی بخش حقیر کے نام بھیجے تھے۔ یہ کل ۷۴ ہیں، صرف پہلا فارسی کا ہے۔

منشی مہیش پرشاد نے "خطوط غالب" کے نام سے جو مجموعہ چھاپنا شروع کیا تھا اس کی پہلی جلد میں کئی غیر مطبوعہ رقعے شامل ہوگئے۔ بایں ہمہ نہیں کہا جاسکتا کہ میرزا نے اردو میں جتنے خطوط لکھے تھے وہ سب محفوظ رہے یا منظرِ عام پر آگئے۔ بعض مجموعوں کا علم ہو چکا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کن کے پاس ہیں۔

اُردو خطوں کی ابتداء کا مسئلہ ایک مسئلہ مدت سے اہلِ علم کے زیرِ بحث چلا آتا ہے کہ میرزا نے اردو میں خط لکھنے کی ابتدا کب سے کی؟ خواجہ حالی نے یادگارِ غالب میں فرمایا تھا کہ "قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو میں خط لکھنے شروع کیے"۔ میرا خیال شروع ہی سے یہ تھا کہ اس بارے میں ۱۸۵۰ء کی تحدید ٹھیک نہ ہوگی۔ اب ۱۸۴۷ء کے لکھے ہوئے خطوط بھی چھپ چکے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر بھی میرزا حسبِ ضرورت اردو میں خط لکھتے رہے ہوں گے، اگرچہ وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ بہر حال صحیح یہی ہے کہ جب تک اردو کا رواج کم تھا، میرزا زیادہ تر فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے۔ پھر جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا، انھوں نے بھی اردو کو ذریعۂ مخابرت بنا لیا۔ ابتدائی دور کے عام محفوظ

خطوط فارسی میں ہیں۔ آخری دور کے زیادہ تر خطوط اردو میں ہیں۔ نہ سارے خط فارسی کے فراہم ہوئے یا محفوظ رہے اور نہ اُردو کے۔ "مہر نیمروز" کی ترتیب میں کاوش کو بھی اس امر کی دلیل بنایا گیا ہے کہ میرزا نے ۱۸۵۰ء میں فارسی خط و کتابت کو چھوڑ کر اردو کو ذریعہ مکاتبت بنانے پر مجبور ہوئے۔ بلاشبہ میرزا نے اس کاوش کے اظہار میں خاصی سخن گستری فرمائی ہے لیکن اس سے وہ حقیقت نہیں بدل سکتی جو میں اوپر عرض کر چکا ہوں اور جب ۱۸۴۶ء کے لکھے ہوئے اردو خطوط موجود ہیں تو ۱۸۵۰ء پر حصر کا معاملہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ پھر بحث کو طول دینے سے کیا حاصل؟ اور یہ خط ایسے شخص کو لکھے گئے جو فارسی کا بہت بڑا عالم تھا، یہاں تک کہ میرزا نے "دستنبو" کے سلسلے میں اس کے متعلق فرمایا تھا کہ اگر اصل میں بھی غلطی ہو گی تو وہ اسے درست کر دے گا یعنی منشی نبی بخش حقیر۔

بہر حال میرزا کے اردو مکاتیب کو مکمل تاریخ وار مرتب کرنے اور ان پر تشریحی حواشی لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ جا بجا قیاس سے بھی کام لینا پڑا، اس لیے ممکن ہے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔ غلطیوں کا زیادہ امکان ان خطوں میں تھا جو شروع سے آخر تک صرف علمی مباحث پر مشتمل تھے اور ان میں کوئی ایسی بات درج نہ تھی جس سے تعیین تاریخ کے لیے کوئی قرینہ ہاتھ آتا۔ مجھے امید ہے کہ اس ترتیب و تحشیہ کے بعد میرزا کے خطوط کا مطالعہ زیادہ مفید و دلچسپ بن جائیگا

اُردو نثر کی مجمل سرگزشت

میرزا نے جب اُردو میں خط لکھنے شروع کیے تو اس سے پہلے اردو نثر کے دو مستقل اسلوب موجود تھے۔ ایک سادہ اور عام فہم اسلوب، جس کی مثال میں عام طور پر فورٹ ولیم کالج کی کتابیں پیش کی جاتی ہیں، جو ڈاکٹر گل کرسٹ کے زیر اہتمام مرتب ہوئیں لیکن اس سلسلے کی اور کتابیں بھی تھیں مثلاً بائبل کا وہ اردو ترجمہ جو سرام پور میں چھپا۔ شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے تراجم قرآن مجید، شاہ اسمٰعیل شہید کی "تقویت الایمان" جو میرے اندازے کے مطابق ۱۸۱۶ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیان لکھی گئی۔ پھر سید احمد شہید بریلوی کے دوسرے مریدوں اور معتقدوں نے عربی کی بعض مذہبی کتابوں کے سلیس اردو ترجمے کیے۔ بیسیوں چھوٹے چھوٹے رسالے عام فہم زبان میں لکھے، جن کا مقصد "تقویت الایمان" کی طرح یہ تھا کہ اردو پڑھنے والا ہر شخص استاد کی مدد کے بغیر ضروری دینی مسائل سے آگاہ ہو جائے۔ اس طرح سادہ اور عام فہم اسلوب تحریر کو خاصی تقویت پہنچی۔ ۱۸۰۷ء میں انشا نے "دریائے لطافت" لکھی۔ اس کا انداز تحریر بھی بہت سلیس تھا۔ بایں ہمہ اسے علمی انداز قرار دینے میں کسی صاحبِ ذوق کو ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہیں ہو سکتا۔

اس کے ساتھ مقفّٰی اور مغلق اسلوب تحریر بھی موجود تھا۔ عام اہلِ قلم کے نزدیک عالمانہ انداز یہی تھا کہ معمولی بات کو تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ سے مبہم اور پیچدار بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ فارسی کے اس اسلوب نگارش کا پرتو تھا جو صدیوں سے ہندوستان میں رائج چلا آتا تھا۔ اس میں تفہیم کے بجائے نمایش علمیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

میرزا غالب کی نثر

میرزا نے اپنے خطوں میں سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اردو مکاتبت شروع کی، جب فارسی میں ان کی مشّاقی اوجِ کمال پر پہنچ چکی تھی۔ بیان و نگارش کے محاسن ان کے دل و دماغ میں رچ چکے تھے۔ یہ حقیقت ان پر کھل چکی تھی کہ عبارت میں قدم قدم پر پیچ

ڈالنا، نئی نئی ترکیبوں اور نئے نئے استعاروں سے اسے بوجھل بنانا علم و فضل کی نمایش کا صحیح طریقہ نہیں بلکہ نفسِ مطلب ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ مخاطب بے تکلف اسے سمجھ جائے۔ بایں ہمہ اس سے بہتر اور موزوں تر الفاظ کا انتخاب آسان اور سہل نہ ہو۔ اس طرح انھوں نے اپنے انداز کو سہل ممتنع بنا دیا۔

پھر قدرت نے انھیں نکتہ وری اور نکتہ نوازی کے خاص جوہر عطا کیے تھے۔ وہ معمولی مطالب بھی لے کر بیٹھتے تو بیان کے حسن، ابداع کی خوبی اور نکتہ آفرینی کے کمال کے باعث دلچسپی اور دلآویزی کے نادر پہلو پیدا کر لیتے۔ سادگی اور سلاست کے باوجود انھوں نے اپنی تحریر کو ایسا پرواز دے دیا کہ گزشتہ اسّی برس سے ان کی نثر گوناگوں خوبیوں میں ممتاز چلی آتی ہے۔ ان کے بعد ملک میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے، جن کی تصانیف ہماری زبان کا گراں بہا سرمایہ ہیں۔ ان میں اکثر کے مکاتیب بھی چھپ چکے ہیں، لیکن ان میں سے کون سا مجموعہ مکاتیب رقعاتِ غالبؔ کے لطائف و نفائس کی ہمہ گیری کا مقابلہ کر سکتا ہے؛ بلکہ کس کی تصنیف میں دلچسپیوں کی وہ فراوانی مل سکتی ہے جو میرزا نے اپنے خطوں میں بے تکلف فراہم کر دی؟

تصوّرِ عام کی پیروی

لیکن یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں خود میرزا کو اپنے دل پذیر انداز کی گیرائی کا صحیح احساس نہ تھا۔ منشی شیونرائن آرامؔ اکبرآبادی نے نومبر ۱۸۵۸ء میں ان کے خطوط چھاپنے کا قصد کیا تو میرزا نے منع کر دیا۔ لکھتے ہیں:

"یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا، جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔"

انھی دنوں میں میرزا ہرگوپال تفتہؔ نے بھی اس بات پر زور دیا کہ اردو خطوط چھپ جانے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ منشی شیونرائن اور میرزا تفتہؔ نے باہم بات چیت کر کے غالبؔ کو لکھا ہوگا۔ تفتہؔ کو لکھتے ہیں:

"رقعات کے چھاپنے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اگر تمھاری اس میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔"

پھر کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ میرزا نے اردو نثر میں جو انداز اختیار کیا تھا، یہ اُن کے وسیع ادبی تجربات کا نچوڑ نہ تھا؟ بلکہ اتفاقیہ اور بے ارادہ ان کے قلم سے ٹپک پڑا، جب ہر طرف سے مدح و ستایش ہونے لگی تو میرزا کو اس کے انوکھے پن کا یقین ہُوا۔ میرے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ شروع میں میرزا کو اپنے اُردو خطوط کی اشاعت میں صرف اس وجہ سے تامّل تھا کہ اس زمانے میں علم و فضل کو فارسی میں یا اس کے اسالیب کی پیروی میں محدود و محصور مانا جاتا تھا۔ اُردو کی علمی حیثیت پُوری طرح مسلّم نہ تھی لہٰذا میرزا نے کہا کہ اردو خطوط میری سخنوری کے "شکوہ" کے آئینہ دار نہیں، لیکن جب فارسی کا تداول تیزی سے کم ہو گیا اور اردو سرکاری زبان بن جانے کے باعث دفاتر و مدارس اور علمی مجامع میں عام رواج پا گئی تو میرزا کی رائے بھی بدل گئی اور وہ خود اپنے مکاتیب کی فراہمی میں جامعین کے معاون بن گئے۔

اگر میری یہ ناچیز رائے درخورِ قبول نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ تاجر جب نئی جنس بازار میں لاتا ہے تو اسے پہلے ہی

دن یہ یقین نہیں ہوتا کہ جنس واقعی گراں ہے اور ضرور ہے کہ قبول عام حاصل کرے یعنی گاہک دیکھتے ہی اس پر اس طرح گرنے لگیں، جس طرح مکھیاں شہد پر گرتی ہیں۔ میرزا پر بھی ابتدا میں کچھ مدت تک "مذبذب کی یہ کیفیت طاری رہی ہو گی۔ وہ شاعر و ادیب تھے، پیغمبر نہ تھے، جنھیں پیام کی صداقت و افادیت کا یقین قدرت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ اگر یہ انداز الفاقیہ اور بے ارادہ بھی ان کے قلم سے تراوش پذیر ہُوا تو اسے انھیں کے چمنستان کمال کی ایک بہار مانا جائے گا۔

انشاء غالب

میرزا کو قدرت نے صرف شعر و ادب کے لیے پیدا کیا تھا۔ وہ جوہر عطا کیے تھے جو شاذ ہی ایک فرد میں جمع ہوتے ہیں۔ اُردو نثر پر متوجہ ہونے سے پہلے وہ تیس پینتیس برس تک حریم ادب فارسی کے طواف میں مشغول رہ چکے تھے۔ اسی مشغولیت میں ان کے قوائے فکر و نظر نے نشو و بلوغ کی منزلیں طے کیں اور اسالیب بیان کے دقائق و معارف پر انھیں عبور حاصل ہوا۔ فارسی کے خزینہ ادب میں صدیوں سے حسن کلام اور لطافت ادا کے جو شہوار گوہر جمع ہوتے رہے تھے، میرزا نے نہ محض انھیں دُرج حافظہ میں جمع کیا، بلکہ ایک بالغ نظر جوہری کی طرح ان گوہروں سے دو قرنوں تک طرز و آرائش کے نئے نئے شیوے اور نئے نئے انداز پیدا کرتے رہے۔ فارسی ادب ایشیا بھر میں وقت کا بہترین ادب مانا جاتا تھا اور یہی ادب تھا جو ایران، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کا مشترکہ علمی سرمایہ تھا میرزا اسکی پوری دولت سمیٹ لینے کے بعد اردو کی فضا میں ابر گہربار بن کر نمودار ہُوئے۔ زبان کی لطافت، الفاظ کی موزونی، بیان کے حُسن اور تراکیب کی دل آویزی کے اسرار ان پر روشن ہو چکے تھے۔ وہ معانی کے دریا کو عبارت کے کُوزے میں بند کرنے کی ہنرمندی میں کمال بہم پہنچا چکے تھے۔ ادب میں یہ مقام بلند ہر صاحب تحریر اور ہر اہل قلم کو میسّر نہیں آتا۔ لفظ جوڑ کر فقرے تیار کر لینا یا پیش نظر مطالب کو الفاظ کا لباس پہنا دینا آسان ہے، لیکن لفظوں کی معنویت کے دقائق کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ان سے موقع اور محل پر کام لینا سہل نہیں۔ اس بارے میں میرزا نے کیا خوب فرمایا ہے:-

نے ہر ترانہ سنج، نکیسا نوا بود　　نے ہر سخن سرائے بہ سحباں برابر است

نے ہر شتر سوار بہ صالحؑ بود بمال　　نے ہر شباں بہ موسیٰؑ عمراں برابر است

نے ہر کہ گنج یافت زپرویز گوے برد　　نے ہر کہ باغ ساخت بہ رضواں برابر است

گفتی کہ این و آں بود از نطق مایہ ور　　ایں در شمار شیوہ نہ با آں برابر است

گیرم کہ ہر گیہ برداز ابر و باد فیض　　خرزُہرہ کے بہ سنبل و ریحاں برابر است



بے تکلفی اور بے ساختگی

میرزا کے اندازِ نگارش کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے، بے تکلف لکھتے تھے۔ ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت شاید ہی کہیں یہ احساس ہو کہ الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی تلاش و جستجو میں انھیں کاوش کرنی پڑی۔ برابر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مطالب دلکش الفاظ کا لباس پہن کر اسی طرح بہے چلے آ رہے ہیں جس طرح فوارے کا مُنہ کھل جانے سے پانی خود بخود اُچھلا چلا آتا ہے۔ عام ادبی بول چال کا سہارا لے کر کہہ سکتے ہیں کہ میرزا کے اردو خطوط سراسر "آمد" تھے، "آورد" سے ان کا دامن یک قلم پاک تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"ہنجارِ من در نگارش این است کہ چو کلک و ورق بر کف گیرم، مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ در خورِ حالت اوست در سر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنجِ مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو و زوائد است و پختگاں حشو را دفع نہند"۔

اس بے تکلفی اور عام رسم و راہ سے علیحدگی کا جامع ترین مرقع ان کے اردو خطوط ہیں۔ اگر مثالیں دی جائیں تو مکاتیب کے بڑے حصّے کو یہاں دُہرانا پڑے۔ تاہم چند نمونے ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ منشی شیو نرائن آرام سے ارسال جواب میں تاخیر ہوئی۔ فرماتے ہیں:

"بھائی، یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے، بخیر دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔"

۲۔ میرزا تفتہ نے خط لکھنے میں دیر کر دی تو فرماتے ہیں:

"کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دِلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا، کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کی ڈاک میں نہ جائے"۔

۳۔ انور الدولہ شفق نے قصیدہ بغرض اصلاح بھیجا۔ میرزا نے درستی کے بعد اسے واپس کر دیا۔ شفق نے کٹے ہوئے اشعار کی قباحت پوچھی۔ میرزا نے بتا دی۔ ایک رقعہ کسی اور صاحب کے نام بھیجا تھا۔ میرزا نے اس کا جواب لے کر ارسال کر دیا۔ شفق نے پھر شکایت کی۔ میرزا جواب میں فرماتے ہیں:

"پیر و مرشد، بارہ بجے تھے، میں ننگا پلنگ پر لیٹا ہوا حقّہ پی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کُرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا"۔

۴۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسوّدے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو، مسوّدے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟"

۵۔ مجروح کے نام ایک اور خط اس طرح شروع ہوتا ہے:

"او میاں سیّد زادۂ آزادہ، دِلّی کے عاشقِ دلدادہ، ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم"۔

جدّت

جدّت میرزا کے پُورے کلام نظم و نثر کی جان ہے۔ وہ کوئی بھی بات عام اور فرسودہ انداز میں نہیں کہتے۔ انتہا یہ ہے کہ تقریباً ہر خط میں مکتوب الیہ کو نئے طریق پر خطاب کرتے ہیں مثلاً میر مہدی مجروح کے نام کے بعض خطوں کی ابتدائی عبارتیں ملاحظہ فرمایئے:

بھائی، تم سچ کہتے ہو۔ بر سرِ فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد۔

۲- نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ کلیاتِ فارسی کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہُوا۔

۳- برخوردار کامگار میر مہدی علی دہلوی، اُردو بازار کے مولوی، صاحب لوائے ولائے مرتضوی پر علم عباسؓ ابن علیؓ کا سایہ۔

۴- صاحب، دو خط تمھارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دو پہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے، تمھارا خط دیا۔

۵- میاں، تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنسن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنسن جاری ہو اور میں تم کو اطلاع نہ دوں؟

۶- میر مہدی تم میری عادت کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور میں کیوں رہتا؟

۷- جویائے حال دہلی، سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دُکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔

۸- لو صاحب، یہ تماشا دیکھو۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کہاں ہیں، حالانکہ میر نصیر الدین شہر میں ہیں اور مجھ سے نہیں ملے۔ میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اُترے۔

۹- میاں لڑکے، کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو۔



۱۰- اہاہا، میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے؟

۱۱- آئیے جناب میر مہدی صاحب دہلوی، بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج تو خوش ہے؟

۱۲- میری جان، خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو۔ اس کی وجہ میں نہیں سمجھا۔

۱۳- مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟

لطف یہ کہ جس قسم کے مطالب پیشِ نظر ہوتے ہیں، اُسی رنگ کا خطاب ہوتا ہے۔ عام خطوں کی کیفیت یہی ہے۔

میر مہدی کے نام ایک خط لکھا، جس کی ابتدا یوں ہے:

"میرن صاحب السلامُ علیکم"

"حضرت آداب"

"کہو صاحب، آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

غرض اسی طرح میرن صاحب سے مکالمہ چلا آتا ہے۔ بادی النظر میں خط میرن کے نام معلوم ہوگا لیکن ہے میر مہدی کے نام۔

اسی طرح نواب علاؤالدین خاں کے چند خطابات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ جانا جانا۔
۲۔ میرزا علائی۔
۳۔ علائی مولائی۔
۴۔ میری جان علائی ہمہ دان۔
۵۔ جانِ غالبؔ اگر جسم سے نکلی ہوئی جان۔

اپنا نام لکھنے کے طریقے

طریقِ خطاب کے نئے نئے رنگ آپ نے دیکھ لیے۔ اپنا نام بھی وہ اکثر عجیب و غریب انداز میں ظاہر کرتے ہیں، مثلاً:

۱۔ خواجہ غلام غوث بے خبرؔ کے نام:
"قبلہ! آپ کو کبھی یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالبؔ کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے؟"

۲۔ انورالدولہ شفقؔ کے نام:
"واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ اربابِ ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم۔ سُن غالبؔ، ہم تجھ سے کہتے ہیں، مصاحب نہ بن۔"

۳۔ علاؤالدین احمد علائی کے نام:
"دن، تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام "غالب" ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔"

۴۔ علائی کے نام:
"تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں، نام بدل کر "مغلوب" رکھ لیا ہے۔"

پھر کہیں فقیری کا رنگ اختیار کر کے اپنے آپ کو "غالب علی شاہ" لکھتے ہیں۔ اکثر "نجات کا طالب، غالب" تحریر فرماتے ہیں۔

اندازِ مکالمت

میرزا کے مکاتیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تحریر میں مکالمت کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو لکھتے ہیں۔

"میرزا صاحب، میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

تفتہؔ کو بھی لکھتے ہیں:

"بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔"

غلام نجف خاں، انورالدولہ شفقؔ، خواجہ غلام غوث خاں بے خبرؔ وغیرہ کے خطوں میں بھی اس قسم کے اشارے موجود ہیں۔

اوّل ان کے خطوں کا عام انداز ہی مکالمے اور بات چیت کا ہے۔ کہیں کہیں باقاعدہ مکالمے بھی لکھے ہیں مثلاً:

۱۔ مجروح کو لکھتے وقت، آغاز میرن صاحب کے ساتھ مکالمے سے کیا ہے اور پوری بات چیت لکھ دی ہے۔

"اے میرن صاحب! السّلام علیکم"

"حضرت! آداب"

"کہو صاحب! آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

"حضور! میں کیا منع کرتا ہوں، مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟"

"نہیں میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے"

"حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے؟"

"بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سبحان اللہ! اے لو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے"

"اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میر مہدی کو خط لکھوں؟"

"کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے"

۲۔ علائی کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ ان کی والدہ، بیگم اور فرزند روانہ ہونے والے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میرا منظر سر راہ ہے۔ وہاں بیٹھا ہوا خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ ادھر سے نکلا"

"بھئی محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟"

"حضرت! ابھی نہیں"

"کیا آج نہ جائیں گی؟"

"آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے"

ان باقاعدہ مکالموں کے علاوہ بھی بیسیوں مثالیں مل جائیں گی، جن میں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے گویا مکتوب الیہ سامنے بیٹھا ہے اور اس سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ مثلاً

۱۔ میر مجروح کے نام:

"میاں، کیوں ناسپاسی و حق شناسی کرتے ہو؟ چشمِ بیمار ایسی چیز ہے کہ کوئی شکایت کرے؟ تمہارا منہ چشمِ بیمار کے لائق کہاں؟ چشمِ بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشمِ بیمار کو کیا جانو؟"۔

۲- میر مجروح کے نام:

"اہا ہا، میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے، بیٹھو یہ رام پور ہے، یہ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟"

۳- تفتہ کے نام:

"کیوں مہاراج، کول میں آنا اور جناب منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا، مجھ سے پوچھو میں نے کیونکر جانا؟ تم مجھ کو بھول گئے۔ کول میں آئے اور مجھے اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا کہ کیونکر آیا ہوں اور کب آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جا ملوں گا؟"

ایسی مثالیں آپ کو جا بجا ملیں گی۔ مکاتیب میں حسن تحریر کا کمال یہی ہے کہ ان میں باقاعدہ گفتگو کی شان پیدا کر دی جائے۔ میرزا اس وصف میں سب سے منزلوں آگے نکل گئے۔

ذات اور ماحول

میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ اثنائے تحریر میں ذاتی حالات اور ماحول کی جزئیات اس بے ساختگی سے بیان کر جاتے ہیں کہ دوران مطالعہ میں شاید یہ محسوس نہ ہو، اپنے متعلق کیا کچھ لکھ دیا، لیکن پورے مکاتیب کو سامنے رکھ کر حیاتِ غالب کا مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ خاندان کی کیفیت کیا تھی؟ وسائل معاش کیا تھے؟ کہاں کہاں سے پیسے ملتے رہے؟ کن کن مکانوں میں رہے؟ کن کن لوگوں سے کس کس قسم کے تعلقات تھے؟ قلعے کب جاتے تھے؟ کھاتے پیتے کیا تھے؟ رات دن کی مشغولیت کا کیا حال تھا؟ کن کن بیماریوں سے سابقہ پڑا؟ آخری عمر میں ضعف کس رفتار سے ترقی کرتا گیا؟ نظم و نثر کی اصلاح کا طریقہ کیا تھا؟ اخلاق کیسے تھے؟ کن کن مقامات کے سفر کیے؟ غرض ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو، جس کے متعلق ان کے قلم سے معلومات کا گراں بہا ذخیرہ فراہم نہ ہوا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ ذاتی حالات کی تسوید ان کے پیش نظر نہ تھی۔

اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان کے خطوں میں بہ کثرت موجود ہیں۔ عام ملکی حالات کے متعلق بھی خاصی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے "غدر" کے نتائج و عواقب پر بیسیوں خطوں میں بحث کی ہے اور جو نقشہ پیش کر دیا ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔

نواب میر غلام بابا خاں نے جشن کے سلسلے میں سورت آنے کی دعوت دی۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"زمزمہ گلگوں نے سیر کی بہار دکھلائی، بہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعف طالع۔ کیونکر قصدِ سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟"

اس طرح بیان کر گئے کہ ۱۸۶۰ء میں ریل کے ذریعے سے سورت پہنچنے میں تین چار دن صرف ہوتے تھے۔ ایک اور خط میں رام پور سے لکھتے ہیں:

"میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان کے گورنمنٹ سے

چاہتا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ کتاب (دستنبو) اور عرضی اواسط ماہ جنوری (۱۸۶۰ء) میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں، چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے، یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہو گا۔"
اس طرح بتا دیا کہ ۱۸۶۰ء میں جہاز ڈیڑھ مہینے میں ہندوستان سے ولایت پہنچتا تھا۔ ایسی معلومات ان کے مکاتیب سے بکثرت نکالی جا سکتی ہے۔

منظر کشی

میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کی تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ شاید رنگ و روغن کی تصویر میں نہ وہ جزئیات سما سکیں اور نہ اس میں وہ روح تاثیر پیدا ہو۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ میں صرف چند پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ میر مہدی مجروح کے نام:

"برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کا جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے، چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔"

۲۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام:

"تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں، جی پر کیا گزری، بقول شیخ علی حزیں:

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں — شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے، اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ مُلّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا۔"

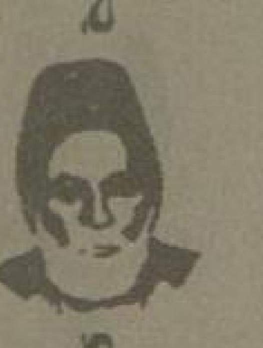
۳۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ میں کرایے کے جس مکان میں رہتا تھا، مالک نے وہ بیچ ڈالا:

"جس نے لیا، اس نے مجھ پر پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بیدرد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے، اس میں پاٹ بند ہو گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاٹ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹہرہ ہے اور صبح کو مجھے

پھانسی ملے گی۔"

۴- میر مہدی مجروح کے نام:

" برسات کا نام آگیا، سو پہلے تو مجملاً سنو۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنۂ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے، آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں، مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزار ہا مکان گر گئے، سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ "ان کال" تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ "پن کال" ہے کہ پانی ایسا برسا، بوئے ہوئے دانے بہہ گئے جنھوں نے نہیں بھی بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سُن لیا دلّی کا حال؟"



جزئیات نگاری

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مفصل بیانات عموماً بے لطف ہو جاتے ہیں، لیکن میرزا جزئیات کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ تحریر بے مزہ ہونے کے بجائے زیادہ پُر لطف بن جاتی ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

۱- غدر کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ قید سے رہا ہوئے۔ میرزا مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

" میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔"

۲- اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

" میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔"

۳- شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے نام بہ سلسلۂ سفر رام پور:

" دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار (باقر علی اور حسین علی) گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ روشنامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی۔ شراب پی لی، کباب کھا لیے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی

کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوالیا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر بچھونا بچھا کر حقّہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ ان جزئیات نے ان کے خط کو ایک زندہ اور جاندار شے بنا دیا، یا سمجھ لیجیے ان کا خط سینما کا پردہ تھا، جس پر ثاقب نے میرزا کے سفر کو اس رنگ میں دیکھ لیا گویا وہ ساتھ تھا۔

نکتہ آفرینی

میرزا ہر بات میں سے دلچسپ اور لطیف نکتے پیدا کر لیتے ہیں، مثلاً:

۱۔ چودھری عبدالغفور سرور مارہروی بیمار ہو گئے۔ صاحب عالم مارہروی نے اپنے خط میں ان کی علالت کا حال لکھا۔ میرزا چودھری صاحب کو لکھتے ہیں:

"آپ نے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا۔ اگر پیر و مرشد بھی نہ لکھتے تو میں کیونکر اطلاع پاتا اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصولِ صحت کی دعا کیونکر مانگتا؟ کل سے وقتِ خاص میں دعا مانگ رہا ہوں۔ یقین ہے پہلے تم تندرست ہو جاؤ گے، ازاں بعد یہ خط پاؤ گے۔"

۲۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام:

"غمہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پر دل نے کبھی تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں: ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں، یوں ہی رو رہا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشین ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے۔"

۳۔ میرزا نے چالیس پینتالیس برس کی عمر میں اپنی وفات کے متعلق ایک قطعہ کہا تھا جس سے ۱۲۷۷ھ تاریخ نکلتی تھی غدر کے بعد مصائب نے انھیں گھیر لیا تو مختلف دوستوں کو لکھا کہ تھوڑی سی زندگی اور ہے ۱۲۷۷ھ میں مر جاؤں گا لیکن موت کسی شاعر کے قطعۂ وفات کی پابند نہیں ہو سکتی۔ وہ نہ مرے۔ اتفاق سے اسی سال ہیضہ پھیلا، فرماتے ہیں، "وبائے عام میں مرنا میرے لیے باعثِ کسرِ شان تھا۔"

صاحب عالم مارہروی نے ان کی مدح میں شعر کہے۔ انھیں لکھتے ہیں:

"خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو خاصان درگاہ سے بھلا کہلواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی کہ میں اس وبائے عام میں جیتا رہا۔ اللہ اللہ! ایسے کشتنی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رتبے کو پہنچایا۔ واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمائیے گا، ورنہ بندہ دعوائے خدائی کرنے میں محابا نہ کرے گا۔"

۴۔ میر سرفراز حسین کے نام:

"تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ میاں یہ ہم تم

بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتواں ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟"

۵- نواب علاؤ الدین خاں علائی کے نام:

"دوجانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا، جن سے تمہارے چچا (ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ) کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانہ جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرۂ نار ہو، لوہارو بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو۔"

۶- نواب علائیؔ کے نام:

"استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا، اور اس وجہ سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشیِ سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام، اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی، اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں، درود، اور موافق اس مصرع کے:

"سوی اللہ واللہ مافی الوجود" ، سجود۔"

شکوہ اور معذرت

۱- میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے نام:

"بندہ پرور! فقیر شکوے سے بُرا نہیں مانتا، مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے۔"

سوچیے کہ شکوے کی تعریف اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے؟ شکوہ حقیقتہً یہی ہے، محض دوسرے پر الزام دھرنے کے اضطراب کو "شکوہ" قرار دینا بالکل غلط ہوگا۔

۲- بعض اوقات شکایت کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ابھی شکایت نہیں کرتا، مثلاً حاتم علی بیگ مہرؔ کو دو ایک کاموں کیلیے لکھا تھا جو مشکل نہ تھے۔ وہ نہ ہو سکے تو ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابھی شکایت نہیں کرتا، پوچھتا ہوں کہ یہ امور مقتضی شکایات ہیں یا نہیں؟"

۳- شکایت کا ایک لطیف طریقہ میرزا نے تفتہؔ کے نام ایک خط میں اختیار کیا ہے۔ جے پور سے ان کے لیے پانسو روپے مع خلعت تجویز ہو چکے تھے۔ متوسط نے اطلاع بھیجی کہ ہولی کے بعد لے کر چلوں گا۔ یہ وعدہ پورا نہ ہوا۔ میرزا کو پڑے

کی ضرورت تھی۔ تفتہ کو جو متوسط کے درست نہیں، لکھتے ہیں:

"پھاگن، چیت، بیساکھ نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے، آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔"

۴۔ میرزا تاریخیں کہنے سے بہت گھبراتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب علاؤالدین احمد خاں کو لکھا:

"میں مادۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے مادّے دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔"

نواب موصوف نے ایک مرتبہ اپنے نومولود فرزند کا تاریخی نام تجویز کرنے اور تاریخ ولادت کہنے کی فرمائش کی میرزا معذرت کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے نیا طریقہ اختیار کیا:

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو؟ علاؤالدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر سے میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ (والیانِ اودھ) ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر سنبھل نہ سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ صاحب! دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ تاریخی نام ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت اور اقبال عطا کرے۔"

تاریخی پرواز

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بعض اوقات حرف مطلب کو تاریخی پرواز دے کر بے حد پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ نواب علاؤالدین خاں علائی بہ زمانۂ ولی عہدی لوہارو میں تھے اور اپنے والد کے اذن و اجازت کے بغیر دہلی نہیں آ سکتے تھے۔ سخت پریشان تھے۔ اس لیے کہ لوہارو میں دہلی کی رنگین اور دل آویز صحبتیں میسّر نہیں آ سکتی تھیں۔ میرزا لکھتے ہیں:

"تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کی نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا۔ لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔"

اس تاریخی پرواز نے علائی کی مصیبتوں کا جو نقشہ پیش کر دیا، اُسے کوئی تفصیل زیادہ جامع اور پُر تاثیر نہیں بنا سکتی۔

۲۔ اسی طرح ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا، جو پیراہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔"

۳۔ علاؤالدین خاں علائی کے نام:

"کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دہلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں ہوں گے۔ اے میری جان، یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم حاصل کیا۔ وہ دلی نہیں، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔"

دیکھیے کس طرح دلی کی عظمت کے معروف ادوار کی نفی کر کے حقیقتِ حال نہایت مؤثر انداز میں مکتوب الیہ پر واضح کر دی۔ نفی کے بعد جو اثباتی پہلو پیش کیے وہ بھی احسن طریق پر موضح مدعا ہوئے۔ کیمپ عرف عام میں فوجیوں کی قیام گاہ یا چھاؤنی کو کہتے ہیں۔ دلی اس زمانے میں یقیناً کیمپ تھا۔ مسلمانوں کی عظمت و عزت دلی کی خصوصیت تھی، وہ جاتی رہی۔ مسلمان امرا مٹ گئے۔ باقی صرف اہل حرفہ رہ گئے یا چپراسی، جمعدار، خانسامے وغیرہ۔

مزاح وظرافت

میرزا کے مزاج میں شوخی اور ظرافت اس درجہ تھی کہ خواجہ حالی نے فرمایا: انھیں بجائے "حیوان ناطق" کے "حیوان ظریف" کہنا بجا ہے۔ یہ شوخی اور ظرافت خطوں میں بھی جا بجا موجود ہے۔ مثلاً:

١۔ بعض مقامات پر محض نقالی سے لطفِ ظرافت پیدا کر لیتے ہیں۔ حسین علی خاں (ابن زین العابدین عارف)، بچہ تھا اور بچوں کی زبان بول چال میں صاف نہیں ہوتی۔ میرزا نے اپنے خط میں حسین علی خاں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی لکھا:

"وہ حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے، کھلونے منگا دو، میں بھی بجار (بازار) جاؤں گا۔"

٢۔ ان کی ایک ملازمہ تھی "بی وفادار" جسے بیگم غالب نے "وفادار بیگ" خطاب دے دیا تھا۔ میرزا غالب نے ایک خط میں اس کے عادات کا نقشہ کھینچا ہے:

"باہر نکلتی ہیں۔ سودا تو کیا لائیں گی۔ مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں"۔ (تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں) مراد ہے امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو سے جو بیگم غالب کے چچیرے بھائی تھے۔

٣۔ بعض اوقات موقعے اور موضوع کی مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موزوں نام تراش لیتے ہیں، جو بے حد مزا دیتے ہیں اور باوجود بے معنی ہونے کے میرزا کے مطلب کو بھی ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں مثلاً فارسی کے ایک قطعہ میں اپنے متعلق کہتے ہیں:

چوں زمن ساقیم نہ محتسبم ٭ نہ بہ رزم، نہ مے بہ کاس کنم
نہ بہ واجب ز سعی وامانم ٭ نہ بہ ہر مدعا مکاس کنم
بہ مدارا اگر مدار نہم ٭ کاخ الفت قوی اساس کنم
لیک ناید زمن کہ در گفتار
مدحتِ لالہ سورداس کنم

"لالہ سورداس" کے نام سے دماغ میں جیسی شخصیت کا تصور ابھر سکتا ہے، اس کی تفصیل میں دفتر سیاہ کر دیجیے، لیکن یہ نام جن خصوصیتوں کا حامل ہے، ان کی پوری تصویر کبھی نہ اتر سکے گی اور نہ اس میں وہ لطف پیدا ہوگا، جو ان تینوں لفظوں کی موجودہ ترتیب میں ہے۔

۴۔ اسی طرح انورالدولہ شفقؔ کو لکھتے ہیں :

"ڈاک کا ہرکارہ جو بلّی ماراں کے خطوط پہنچاتا ہے، ان دنوں میں ایک بنیا، پڑھا لکھا، حرف شناس کوئی "فلاں ناتھ ڈھمک داس" ہے۔"

ہرکارے کی حرف شناسی کی جو تصویر "فلاں ناتھ" "ڈھمک داس" میں کھینچ دی گئی ہے وہ کسی توضیح کی محتاج نہیں۔

۵۔ جب انھیں کوئی دلچسپ واقعہ مل جاتا تھا تو اپنے خاص انداز میں بیان کر کے اسے بے حد پُرلطف بنا دیتے تھے مثلاً جس ہرکارے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اسی کے متعلق لکھتے ہیں :

"میں بالا خانے پر رہتا ہوں۔ حویلی میں آکر اس نے داروغے کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران، کہ کیا بکتا ہے۔ سرنامے کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشاں" لکھا تھا۔ اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشاں" کو "کپتان" پڑھا۔"

۶۔ بعض اوقات اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ پڑھتے ہی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مثلاً قربان علی بیگ سالکؔ کو لکھتے ہیں :

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالبؔ کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالبؔ کیا مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرامگاہ، عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "زاویہ ہاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آیئے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں: "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو بولو، کچھ تو اکسو۔" بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا؟"

مقفّیٰ عبارتیں

میرزا کے زمانے میں عالمانہ اندازِ بیان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ پوری عبارت مقفّیٰ ہو، چنانچہ خود میرزا نے بھی تقریظوں اور دیباچوں میں یہی ڈھنگ اختیار کیا ہے اور اہلِ ذوق کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ تقریظیں اور دیباچے کتنے ہی "عالمانہ" ہوں تاہم انھیں میرزا کے معروف اندازِ نگارش سے کوئی مناسبت نہیں۔ خطوط میں بھی میرزا نے کہیں کہیں مقفّیٰ عبارت لکھی ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ فقروں کے خواتیم میں قافیے کا التزام کر لیا بلکہ بے تکلف لکھتے لکھتے خود بخود قافیے پیدا ہو گئے۔ وہ اتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں گویا سونے کی انگوٹھی میں بیش قیمت ہیرے جڑ دیے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ منشی شیو نرائن آرام نے اکبر آباد سے لکھا کہ اخبار کے کچھ خریدار بنانے کی سعی فرمائیے۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو! مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، یہ ڈھونڈتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے، کاغذ روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے؟"

۲۔ میر مہدی مجروح کے نام:

"او میاں سیّد زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشقِ دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھوں میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن کہاں؟ ایک آزردہ، سو خاموش، دوسرا غالب، وہ بے خود و مدہوش، نہ سخنوری رہی، نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلّی! وائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔"

۳۔ مجروح کے نام:

"سیّد صاحب، نہ تم مُجرم، نہ میں گنہ گار، تم مجبور، میں لاچار۔ لو اب میری کہانی سُنو، میری سرگزشت میری زبانی سُنو۔"

۴۔ مجروح کے نام:

"بھائی اردو کے میرزا قتیل بن گئے، اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے کیسا قتیل کیسا رود نیل۔ یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں، لو سنو، اب تمہاری دلّی کی باتیں ہیں۔"

کمالِ حُسنِ تحریر

یہ میرزا کے اسلوبِ نگارش کے چند نمایاں پہلو تھے۔ انھوں نے مکاتیب کے مختصر سے مجموعے میں جو تحریری کمالات دکھائے، ان کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ اس بارے میں خاص طور پر قابلِ ذکر و توجہ امر یہ ہے کہ ان کی تحریر میں سے ایک لفظ کو آگے پیچھے کرنے یا بدلنے یا حشو و زاوئد قرار دینے کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ جو کچھ لفظوں میں اور جس ترتیب سے بیان کر گئے ہیں، اس مضمون کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور پیرایہ بیان اختیار کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً:

۱۔ میرزا غدر کے بعد شدید مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ صاحب عالم مارہروی نے لکھا کہ والئ حیدر آباد کے لیے قصیدہ کہیے تو اسے ایک متوسل کے ذریعے سے پیش کر دیا جائے گا۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبروک صاحب ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریذیڈنٹ معزول ہوئے۔ سکرٹر گورنمنٹ بہ مرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہِ دہلی نے ۵۰ روپے مہینا مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دیکر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں! اب میں جو والی دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور اگر احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔"

۲۔ میر مجروح کے نام:

"بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"

پھر گورنر جنرل کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پہلے در[illegible] میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا دربار الگ تھا۔

"چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے ان میں سے دو جا[illegible] اور لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر، اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود، محروم، مغموم:

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

۳۔ رام پور پہنچ کر لکھتے ہیں:

"غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں؟ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا،

سریع النفوذ۔"

پانی کی مٹھاس کے لیے "پھیکے شربت" کی تعبیر کتنی عمدہ اور دل نشین ہے۔ دو لفظوں میں اس سے بہتر تعبیر کیا ہو سکتی ہے جو مٹھاس کے متعلق تاثر کی ٹھیک ٹھیک آئینہ دار بن سکے؟

۴۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام:

"آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔ بس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بہ امید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہے الہام سمجھیے، چاہے اوہام سمجھیے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم　　　چوں نظیری نہ ماند و طالب مرد
در بہ پرسند در کدامیں سال　　　مُرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"

اب بارہ سو چھتر ہیں اور "غالب مرد" کے بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں؟"

۵۔ انوار الدولہ شفق کے نام:

"سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا۔ اُٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا؟ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ۔ ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑے پر ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بارہ تیرہ پھاہے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے سے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی، دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی، جاگ اُٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا، پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں تین حصے یوں گزرے، پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے رُوح قالب میں آ ئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں، ناتوان و سُست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قدِ آدم دیوار اُٹھے۔ آپ کی پُرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا، میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور یہ میری تحریر، آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ در صورتِ مرگ نیم مُردہ اور در حالت حیات نیم زندہ ہُوں۔"

۶۔ امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو نے بلایا۔ میرزا ضعف کے باعث جا نہیں سکتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"واللہ نہیں آ سکتا۔ باللہ نہیں آ سکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی، عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی (امین الدین خاں اور

ضیاء الدین خاں) اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ ہو۔ میں لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ ہوں۔ میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچّے تمہارے بچّے ہیں۔ خود جو میری بھتیجی ہے، اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنّا یہ ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مرجاؤں تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دوگے تو چنے تو دوگے۔ اگر چنے بھی نہ دوگے اور بات نہ پوچھوگے تو میری بلا سے میں تو موافق اپنے تصوّر کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔"

۷۔ علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام :

"اگرچہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے، اُن میں سے بقدر ہزار، یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع سوت کی ایک رسّی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اس میں بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔"

۸۔ امین الدین احمد خاں نے حاجی جان محمد قدسی کی ایک غزل پر غزل کہنے کی فرمائش کی۔ علائی کو لکھتے ہیں :

"بھائی، تمہارا باپ بدگمان ہے، مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور میرا یہ شعر پڑھ کر سناؤ :

گمان زیست بود بر منت ز بےدردی ۔۔۔۔۔ بداست مرگ، و لے بدتر از گمانِ تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے اور وہ ستمگر شعر و سخن کا طالب ہے۔"

۹۔ علائی نے مکان کا پتا بہ اصرار پوچھا۔ جواب میں لکھتے ہیں :

"قسمِ شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزّت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام اور ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ نہیں لکھتے، بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلّہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ پتا نہ پائے۔"



تعزیتی خطوط

میرزا کے کمال تحریر کا ایک نمونہ تعزیتی خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔ امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو کی والدہ فوت ہو گئیں۔ انھیں لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب، آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں؟ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں: اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم تکلّف محض ہے۔ جو غم تم کو ہُوا، ممکن نہیں دُوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر بیدردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور (احمد بخش خاں) کو تازہ کر دیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے؟ رہی مغفرت، میں کیا اور میری دُعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربّیہ اور محسنہ تھیں، دل سے دُعا نکلتی ہے۔"

یوسف میرزا کے والد کی وفات پر:

"یوسف میرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں بھی تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تُو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف میرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ (یعنی قید فرنگ سے بعد از غدر) یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھُوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔"

نواب یوسف علی خاں فرمانروائے رام پور کے نام اُن کی والدہ کی وفات پر:

"نواب میرزا (داغ دہلوی) نے دِلّی آکر پہلے نویدِ بزم آرائی سنائی۔ چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں۔ کل اس نے از روئے خط آمدۂ رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہُوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصوّر کر کے اور مغموم ہُوا۔ بے درد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بہ طریقِ انشا پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقینِ صبر و شکیبائی کروں:

از دست گدائے بے نوا ناید ہیچ   جز آں کہ بہ صدقِ دل دعائے بہ کند"

میرزا کی شخصیت خطوط کے آئینے میں

میں نے میرزا کے اسلوبِ نگارش کی بعض نمایاں خصوصیات واضح کر دیں اور اس امر کی طرف شروع میں اشارہ کر چکا ہوں کہ ان چند سو خطوں میں میرزا نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اس تفصیل سے واضح کر دیے ہیں کہ تنہا انھیں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کا جامع اور مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے اوضاع و اطوار اور اخلاق و عادات کا پہلو بھی اس سے باہر نہ رہے گا۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے، یہ خطوط محض اس

وجہ سے بیش بہا نہیں کہ غالبؔ کے خطوط ہیں، بلکہ ان کی بیش بہائی کے دوسرے وجوہ بھی ہیں، مثلاً :

۱۔ ان کے آئینے میں غالبؔ کی شخصیت ایسے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے کہ اکثر اصحاب کو زندگی میں بھی اسے اس تفصیل سے دیکھنے کا موقع شاید ہی ملا ہو۔

۲۔ یہ خطوط اُردو زبان میں گوناگوں اسالیبِ بیان کا ایک نہایت نادر اور دلکش مرقع ہے۔

۳۔ ان میں غالبؔ کے سوانح حیات کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔

۴۔ ان میں غالبؔ کے دل و دماغ کی مکمل تصویر خود ان کے مُوقلم سے تیار ہو کر سامنے آگئی ہے اور یہ تصویر اس جامعیت سے نہ ان کے کلیات نظم فارسی میں ملتی ہے، نہ کلیات نثر فارسی میں اور نہ اُردو دیوان میں، جو ہمارے ہاں ان کی یگانہ شہرت کا شہپر پرواز ہے۔

غالبؔ سے پہلے بھی بعض اکابر علم وفضل کے مکاتیب ترتیب پا کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد بھی مشاہیرِ ادب اُردُو کے خطوط عقیدت مندوں نے مرتّب کر کے چھاپ دیئے لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں غالباً کسی صاحبِ علم و نظر کو قطعاً تامّل نہ ہوگا کہ غالبؔ نے اپنی سرسری تحریرات میں ذات و ماحول کے متعلق معلومات کا جو گراں قدر ذخیرہ بے قصد و ارادہ فراہم کر دیا ہے، اس کا عُشرِ عشیر بھی کسی دُوسرے مجموعے میں نظر نہ آئے گا اور اسلوب فکر و نگارش میں ابداع کی جو فراوانی غالبؔ کے ہاں موجود ہے، اس کی مثالیں تو شاید ہی مل سکیں! گویا مکاتیب نگاری کے دائرے میں بھی غالبؔ کی انفرادیت و یکتائی محتاجِ شرح و بیان نہیں۔ کاش ان مکاتیب پر پوری توجہ فرمائی جائے اور غالبؔ کے فارسی کلام کی طرح یہ شکوہ سنجِ بے اعتنائی نہ رہیں !

مہر

۱۴ ارمئی ۱۹۵۱ء — مسلم ٹاؤن۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"خطوطِ غالب" کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ اس میں ان خطوط کی بھی خاصی بڑی تعداد شامل کر دی گئی ہے، جو پہلے ایڈیشنوں کے وقت دستیاب نہیں ہو سکے تھے۔ تصحیح اور ترتیب و تحشیہ کے اہتمام میں بھی حتی الامکان کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہیں رکھا گیا، لہٰذا اگر میں گزارش کروں کہ اب کتاب سابقہ ایڈیشنوں کے مقابلہ زیادہ مکمل و جامع ہے تو شاید وہ ستائش نفس پر محمول نہ ہو۔ بعض خطوط بروقت ہاتھ نہ آسکے اور تکمیل کتابت کے بعد ملے لہٰذا انھیں مجبوراً ضمیمہ میں درج کیا گیا۔

مجھ "ظلوم و جہول" کے کمزور کندھوں پر مختلف الانواع علمی کاموں کا جو بار گراں اتفاقات کی بناء پر آپڑا ہے، وہ ایسا نہیں کہ سالہا سال بیشتر کی مرتبہ و مطبوعہ کتاب کے سلسلے میں مزید جمع و فراہمی مواد کے لیے تگ و دو کا فرض بطریق احسن انجام دے سکتا یا تصحیح کی ذمہ داریوں سے بقدر واجب عہدہ برآ ہو سکتا۔ خدائے بزرگ و برتر کی رحمت سے مجھے اپنے عزیز دوست اور خوش ذوق رفیق محمد عالم مختار حق صاحب کی اعانت میسر آگئی، جن کی مساعی جمیلہ سے یہ کٹھن مسافت میرے لیے بہ ہمہ وجوہ آسان ہو گئی۔ ان کی پُر اخلاص محبانہ اعانت کا حق سپاس الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں جزا دے اور مجھ عاجز کو ان کی اس للّٰہی یاوری کے احسان سے سبکدوش ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین !

مسلم ٹاؤن
۳۔ مارچ ۱۹۶۸ء

مہر



خاندانِ لوہارو

خاندانِ لوہارو کے حالات مختصراً یہ ہیں:

اٹھارھویں صدی کے وسط میں سمرقند سے تین بھائی پنجاب آئے۔ قاسم جان، عالم جان اور عارف جان۔ قاسم جان سب سے بڑے تھے۔ نواب معین الملک عرف میر منّو ناظم پنجاب نے بڑی قدر و منزلت کی اس لیے کہ میر منّو کے اجداد بھی تورانی تھے۔ چنانچہ ان بھائیوں نے کچھ مدّت لاہور میں میر منّو کے پاس گزاری۔ اس کی وفات پر نظامت پنجاب کا کارخانہ درہم برہم ہوتا نظر آیا تو قاسم جان اپنے بھائیوں اور رفیقوں کو لے کر پنجاب سے آگے بڑھ گئے تاکہ کسی دوسری جگہ قسمت آزمائیں۔ اس زمانے میں شہزادہ عالی گوہر کو (جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا) بہار میں تجربہ کار اور باتدبیر آدمیوں کی ضرورت تھی: قاسم جان بہار کی طرف روانہ ہوگئے۔ شہزادے کے پاس پہنچنے سے پہلے میر جعفر ناظمِ بنگال کے بیٹے میر صادق عرف میرن کا ایک قافلہ مل گیا، جو شہزادے کی مخالف فوج کیلیے سامان رسد لیے جارہا تھا۔ قاسم جان نے اس پر حملہ کر کے سارا سامان چھین لیا۔ شہزادے نے اس خدمت پر خوش ہو کر قاسم جان کو شرف الدولہ کا خطاب دیا اور اپنے رفقاء خاص میں داخل کرلیا۔

شہزادہ اپنے والد عزیز الدین عالمگیر ثانی کے قتل پر بادشاہ بن گیا، لیکن گیارہ برس اس نے پورب ہی میں گزار دیے۔ قاسم جان نے یہ مدّت غالباً پورب ہی میں بسر کی۔ جب سنہ ۱۷۷۱ء میں بادشاہ دہلی آیا تو قاسم جان بھی ساتھ آئے۔ انھیں کی وساطت سے نجف خاں ملازمت شاہی میں داخل ہوا، ذوالفقار الدولہ خطاب پایا اور اپنی وفات تک (د سنہ ۱۷۸۲ء) وہ سلطنت کا مختار عام بنا رہا۔ اس زمانے میں قاسم جان اور ان کے بھائیوں کی سکونت غالباً اسی محلہ میں رہی جو بعد میں گلی قاسم جان کے نام سے مشہور ہوا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میرزا غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں بھی قاسم جان ہی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور غالباً قاسم جان کے خاندان سے ان کی قرابت بھی تھی، جس کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے انتقال پر دربار دہلی کا رنگ بگڑ گیا، یہاں تک کہ غلام قادر خاں روہیلے کے مختصر سے دورِ عروج میں شاہی خاندان پر ہولناک آفتیں نازل ہوئیں۔ شاہ عالم کو اندھا کر دیا گیا اور اسے کہنا پڑا۔

چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما

اس زمانے میں قاسم جان دہلی سے دل برداشتہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور آصف الدولہ کے پاس ملازمت کرلی۔ لکھنؤ ہی میں قاسم جان نے وفات پائی۔ ان کے اقربا اور متوسلین وہاں سے چلے آئے۔ غالب کے دادا نے جے پور میں ملازمت کے بعد آگرے میں سکونت اختیار کرلی۔ قاسم جان کا خاندان پہلے کی طرح دہلی میں مقیم ہوگیا۔

قاسم جان کے کتنے بیٹے تھے؟ تحقیقی طور پر معلوم نہیں، لیکن دو کے نام ہم جانتے ہیں: ایک شرف الدولہ فیض اللہ بیگ خاں، دوسرے قدرت اللہ بیگ خاں۔ فیض اللہ بیگ خاں کے بیٹے غلام حسین خاں مسرور تھے جو غالب کے ہم زلف اور زین العابدین خاں عارف کے باپ تھے۔ قدرت اللہ خاں کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا ہمیں علم ہے۔ بڑے

بیٹے معین الدین حسین خاں تھے، جنھوں نے غدر کا روزنامچہ اردو میں لکھا تھا۔ تھیوفلس مٹکاف نے اسے انگریزی میں چھاپا اور خواجہ حسن نظامی نے اس کا ترجمہ اردو میں چھپوایا۔ دوسرے بیٹے کا نام محمد حسین خاں تھا۔ ان دونوں کا ذکر غالبؔ کے خطوط میں آیا ہے۔ قدرت اللہ بیگ خاں کی بیٹی نواب ضیاءُ الدین احمد خاں نیرؔ کی بیگم تھی۔

قاسم جان کے بھائی عالم جان یا اس کی اولاد کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

تیسرے بھائی عارف جان کے چار بیٹے تھے۔ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں، نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ، محمد بخش خاں اور نبی بخش خاں۔ احمد بخش خاں آخری دور کے امرا میں ممتاز فرد تھے۔ ذاتی قابلیت سے فیروز پور جھرکا (ضلع گوڑگانوہ) کی ریاست اور لوہارو کی جاگیر حاصل کی۔ ان کی دو بیگمیں تھیں: ایک میواتی الاصل (مدی عرف بہو خانم) اور دوسری ہم قوم (بیگم جان)۔ پہلی کے بطن سے نواب شمس الدین احمد خاں تھے۔ ہم قوم کے بطن سے نواب امین الدین خاں والی لوہارو اور ضیاءُ الدین احمد خاں نیرؔ۔ اہل خاندان شمس الدین احمد خاں کو نسلاً اپنا ہم رتبہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے خاندان میں مناقشت پیدا ہوئی، جس نے انجام کار یہ شکل اختیار کر لی کہ شمس الدین احمد خاں ایک فریق بن گئے، باقی سارے خاندان نے ان کے خلاف جتھا بنا لیا۔

احمد بخش خاں نے ان مناقشات کو روکنے کی غرض سے ریاست دو حصوں میں بانٹ دی۔ علاقہ فیروز پور جھرکا شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دیا۔ لوہارو کی جاگیر چھوٹے بیٹوں کو دے دی۔ ۱۸۲۶ء میں وہ اپنی حویلی واقع قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے اور ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔

لیکن تقسیم کے باوجود جھگڑے قائم رہے۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاءُ الدین احمد خاں نے باپ کی جائداد منقولہ میں سے اپنے حصے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ شمس الدین احمد خاں لوہارو کے دعویدار بن گئے۔ یہ کشاکش کئی برس تک جاری رہی۔ آخر لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاءُ الدین احمد خاں کو مل گیا۔ یہ فیصلہ چونکہ ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کی کوشش سے ہوا تھا۔ اس وجہ سے شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی۔ ۱۸۳۵ء میں فریزر مارا گیا۔ اس سلسلے میں شمس الدین احمد خاں اور ان کا ایک سپاہی ماخوذ ہوئے۔ ان کو پھانسی کی سزا ملی اور فیروز پور جھرکا کی ریاست ضبط کر لی گئی۔ شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی، صرف دو لڑکیاں تھیں۔ مشہور ہے کہ فصیح الملک میرزا داغؔ دہلوی شمس الدین احمد خاں کے صاحبزادے تھے مگر شمس الدین احمد خاں کی جائداد متروکہ کے جو دعوے وارثوں کی طرف سے ہوئے تھے، ان میں داغؔ کا کوئی ذکر نہیں[1]۔

نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو قرار پائے اور ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے اور

---

[1] داغ کی والدہ کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم تھا۔ یہ محمد یوسف سادہ کار کی منجھلی بیٹی تھی۔ پہلے ایک انگریز کے گھر رہی۔ پھر نواب شمس الدین احمد خاں اسے لے آئے۔ داغؔ نواب موصوف ہی کے گھر پیدا ہوئے۔ پھر چھوٹی بیگم سے شہزادہ فتح الملک عرف میرزا فخرو (ابن بہادر شاہ ظفرؔ) نے شادی کر لی۔ داغؔ کی تعلیم و تربیت قلعہ معلّٰی میں ہوئی۔ شہزادے کی وفات پر چھوٹی بیگم سے آغا مولوی نواب علی خاں نے نکاح کر لیا۔ پھر یہ دکن میں ایک صاحب کے گھر چلی گئی۔ کہتے ہیں اس سے جتنے بچے ہوئے سب شعر کہتے تھے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ لیکن ان میں خاص شہرت صرف داغؔ نے پائی۔

وارث ریاست نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی تھے جنھیں میرزا غالب نے اپنا خلیفہ ثانی بنایا تھا۔ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم اور خوش ذوق شاعر تھے۔ ترکی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ ترکی زبان کی ایک لغت بھی لکھی تھی۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کے جانشین نواب سر امیر الدین احمد خاں تھے، جو ابتداء میں "فرخ میرزا" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ بڑے خوش مذاق، علم دوست اور مجلس آرا بزرگ تھے۔ امین الدین احمد خاں، علاؤ الدین احمد خاں اور امیر الدین احمد خاں تینوں کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔

امین الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں کو منصب ریاست حاصل نہ تھا، البتہ حقے کی رقم ملتی تھی۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ علم تاریخ میں اپنے عہد کے یگانہ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ تاریخی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ ایلیٹ نے انھیں سے نادر قلمی نسخے لے کر اپنی مشہور تاریخ انگریزی میں مرتب کی۔ وہ اردو میں نیر اور فارسی میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ غالب نے انہیں خلیفہ اول بنایا تھا۔ فارسی کلیات میں ایک قصیدہ ان کی مدح میں ہے اس میں فرماتے ہیں:

منم خزینۂ راز و در خزینۂ راز	ضیائے دینِ محمد کہیں برادر من
بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق	بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ بہتر من

عارف کے مرثیہ میں بھی ان کا ذکر آیا ہے:

ہم سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی	بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ان کا منتخب کلام "صحیفۂ زریں" کے نام سے چھپا تھا۔ آجکل کمیاب ہے۔ ۱۸۸۵ء میں وفات پائی۔

نیر کے دو صاحبزادے تھے: شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور سعید الدین احمد خاں طالب۔ دونوں علم و فضل میں خاندانی روایات کے حامل تھے۔ ثاقب نے ۶ محرم الحرام ۱۲۸۶ھ (مطابق ۹ اپریل ۱۸۶۹ء) کو، یعنی غالب سے تقریباً دو ماہ بعد بعارضہ تپ و اسہال وفات پائی اور حسب وصیت درگاہ قدم شریف میں اپنے عم محترم نواب شمس الدین احمد خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قربان علی بیگ سالک نے تاریخ کہی:

از صدمۂ مرگ ثاقب والا جاہ	ہر سو ست صدائے نالہ ہائے جانکاہ
تاریخ وفات او چنیں سالک گفت	روز ششم ماہِ محرم صد آہ ؟

ان کے چار بیٹے تھے: ممتاز الدین احمد خاں، شجاع الدین احمد خاں تاباں، سراج الدین احمد خاں سائل اور بہاؤ الدین احمد خاں۔ تاباں اور سائل بوڑھے ہو کر فوت ہوئے۔ بہاؤ الدین احمد خاں کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا تھا۔ انکی صرف ایک صاحبزادی تھی، جس کی شادی نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ سے ہوئی۔ وہ خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ تاباں کے کوئی اولاد نہ تھی۔ نواب سعید الدین احمد خاں طالب بھی لاولد فوت ہوئے۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف ابتداء ہی میں مولانا فخر الدین فخر عالم کے مرید ہو گئے اور انھوں نے ساری عمر گوشہ نشینی میں گزار دی۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹیوں میں سے آبادی بیگم کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی۔

زین العابدین خاں عارف انہی کے بیٹے تھے۔ امراؤ بیگم میرزا غالب سے بیاہی گئی۔ اس کی اولاد بچپن ہی میں مرتی رہی۔ آخر اس نے پہلے عارف کو بیٹا بنا لیا۔ عارف کی وفات پر اس کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں کو بیٹوں کی طرح پالا۔ باقر علی خاں پہلے الور میں ملازم ہو گئے تھے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی۔ یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ (مطابق ۲۵ رمئی ۱۸۷۶ء) کو ساڑھے اٹھائیس برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں: بڑی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم جن کی شادی شجاع الدین احمد خاں تاباں سے ہوئی۔ دوسری فاطمہ سلطان بیگم عرف بندو بیگم، ان کی شادی نواب علاؤالدین احمد خاں رئیس لوہارو کے صاحبزادے مرزا بشیر الدین احمد خاں سے ہوئی۔ تیسری رقیہ بیگم کرنیل ذوالنور احمد خاں سے بیاہی گئی۔

حسین علی خاں شاداں، غالب کی وفات کے بعد ریاست رام پور میں پچیس روپے کے ملازم ہو گئے تھے۔ بڑے بھائی کی وفات کے صدمے نے دماغی توازن بگاڑ دیا اور وہ ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ یکم شوال ۱۲۹۷ھ (۷ر ستمبر ۱۸۸۰ء) کو وفات پائی۔ انہیں وہم ہو گیا تھا کہ موٹا آدمی شاعر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ غذائی تقلیل کے اہتمام میں آخر کار کھانا ترک کر دیا اور پانی سیپیوں میں پیتے تھے، اس طرح صحت تباہ ہو گئی۔

عارف کے علاتی بھائی حیدر حسن خاں کے بیٹے کا نام ضمیر الدین میرزا عرف خضر میرزا تھا۔ وہ تحصیلدار تھے۔ پنشن لے کر قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ بڑی عمر پائی۔ غالب کو دیکھا تھا اور اس عہد کی دلکش باتیں سنایا کرتے تھے۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

معروف کے بڑے بیٹے کا نام میرزا علی بخش خاں تھا اور میرزا غالب سے ان کا تعلق آخری وقت تک نہایت خوشگوار رہا۔ دوسرے بیٹے علی نواز خاں نے جوانی ہی میں وفات پائی۔ علی بخش خاں کے بیٹے کا نام غلام فخر الدین خاں تھا پہلی بیوی کی وفات کے بعد علی بخش خاں نے دوسرا نکاح میرزا غالب کی بھانجی امانی خانم سے کیا۔ انھیں فیروزپور جھرکا سے سو روپے ماہانہ ملتے تھے، ریاست ضبط ہوئی تو وظیفہ صرف پچاس روپے رہ گیا۔ وہ کچھ مدت حیدر آباد میں رہے۔ پھر عرب سرائے (دہلی) میں رہنے لگے۔ وہیں ۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کے فرزند غلام فخر الدین کی شادی غالب کی بھتیجی (میرزا یوسف خاں دیوانہ کی بیٹی) عزیز النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ یہ شاہی ملازم تھے۔ غدر کے بعد ان پر مقدمہ چلا، لیکن کوئی جرم ثابت نہ ہوا اور بری ہو گئے۔ ان کے بیٹے میرزا محمد سعید خاں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ پہلے ملازم رہے، پھر درویش بن گئے اور بیس بائیس برس یادِ الٰہی میں گزار کر وہیں فوت ہوئے۔ مستعد پورہ میں دفن ہیں۔ ان کے صاحبزادے میرزا نصر اللہ خاں بیرسٹر ایٹ لاء سرکار آصفیہ میں صدر محاسب (اکونٹنٹ جنرل) بن گئے تھے۔ نواب الٰہی بخش معروف کے دیوان کی پہلی جلد انہیں کی کوشش سے شائع ہوئی۔

میرزا قربان علی بیگ خاں سالک اور میرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوان میرزا عالم بیگ خاں کے صاحبزادے تھے دونوں اردو کے اچھے شاعر مانے جاتے تھے۔ سالک حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور دہلی میں نشو و نما پائی۔ بڑے خوش مزاج بشگفتہ اور ذکی آدمی تھے۔ غدر کے بعد الور میں وکالت کا عہدہ پایا۔ پھر حیدر آباد چلے گئے جہاں ان کے چچا نواب

تاڑبن کے خانہ داماد بن گئے تھے۔ محکمہ تعلیم میں سررشتہ داری کا عہدہ مل گیا۔ نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کی سرپرستی میں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" کے نام سے جاری کیا جس میں تاریخی مضامین چھپتے تھے۔ شطرنج کھیلنے میں خاص مہارت تھی۔ حیدرآباد ہی میں ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں فوت ہوئے۔ رضوان بھائی کی وفات کا صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں وہ بھی چل بسے۔

اس خاندان کے جن افراد کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔ ان کی فہرست مع تعداد مکاتیب ذیل میں درج ہے:

مکتوب الیہ	تعداد مکاتیب
نواب امین الدین احمد خاں	۶
نواب علاؤ الدین احمد خاں	۵۶
نواب سر امیر الدین احمد خاں	۱
نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر	۱
شہاب الدین احمد خاں ثاقب	۹
قربان علی بیگ سالک	۲
شمشاد علی بیگ خاں رضوان[1]	۲
باقر علی خاں کامل	۳
	۸۰

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ محض اتنے ہی خطوط لکھے گئے۔ بعض خط یقیناً ضائع ہو گئے ہوں گے۔ خطوں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام سب سے بڑھ کر علائی نے کیا تھا۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں، غالب کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے ہوں گے۔ ان کے نام صرف ایک خط ہے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ اردوے معلیٰ چھپ رہی تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ ایک خط تم بھی اپنے نام لکھوالو۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض کیا کہ دادا جان! ایک خط ہمارے نام بھی لکھ دیجیے۔ اس طرح وہ لکھا گیا۔ نیر، ثاقب، سالک، رضوان اور کامل کے نام اس وجہ سے بھی خط کم ہیں کہ وہ لوگ عموماً دہلی میں رہتے تھے اور روزانہ غالب سے ملتے تھے، اس لیے انھیں خط لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ کامل کو خط اس زمانے میں لکھے گئے، جب وہ الور میں ملازم ہو گئے تھے۔

---

[1] مالک رام صاحب فرماتے ہیں کہ سالک و رضوان کو خاندان لوہارو سے کوئی تعلق نہ تھا۔

نواب امین الدین احمد خاں

(۱)

بھائی صاحب!

ساٹھ برس سے ہمارے تمھارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں، نج کا میرا تمھارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے تم کو چاہتا ہوں، بے اس کے کہ چاہت تمھاری طرف سے بھی ہو۔ چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ میں تمھیں چاہتا رہا، تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام اور یہ امر خاص، کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے؟ وہ قرابت اور یہ مودت کیا پیوند خون سے کم ہے؟ تمھارا یہ حال سنوں اور بیتاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں؟ مگر کیا کروں، مبالغہ نہ سمجھو، میں ایک قالب بے رُوح ہوں:

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اضمحلال رُوح کا روز افزوں ہے۔ صبح کو تبرید، قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب۔ اگر اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی، میں مرگیا۔ واللہ نہیں آسکتا، باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی، عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی[۱] اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ[۲] کی جگہ ہو۔ میں لَم یَلِدْ وَلَم یُوْلَدْ ہوں[۳]۔ میری زوجہ تمھاری بہن، میرے بچے[۴] تمھارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے، اس کی اولاد بھی تمھاری اولاد[۵] ہے۔ نہ تمھارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمھارا دعاگو ہوں اور تمھاری سلامتی چاہتا ہوں، تمنا یہ ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا، کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے میں مرجاؤں تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دو گے، چنے تو دو گے اور اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصوّر کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔[۶]

---

[۱] امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں [۲] شرف الدولہ قاسم جان کا خطاب تھا جو اس کے بیٹے فیض اللہ بیگ خاں کو ملا۔ فخر الدولہ احمد بخش کا خطاب تھا۔ [۳] مطلب یہ کہ میرے کوئی اولاد نہیں۔ [۴] بچوں سے مراد میرزا کے اپنے بچے نہیں بلکہ عارف کے بچے ہیں جو میرزا کی تحویل میں تھے۔ [۵] غالب کی بھتیجی یعنی میرزا یوسف خاں کی بیٹی عزیز النساء بیگم جو علی بخش خاں بن الٰہی بخش خاں معروف (غالب کے خسر) کے بیٹے غلام فخر الدین سے بیاہی گئی تھی۔ گویا اس کی اولاد بھی خاندان لوہارو ہی سے ہوگئی۔

[۶] انسان کو غم صرف زندگی تک ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد غم یا خوشی اس کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ بیوی بچوں کو تمھارے حوالے کر کے میں اطمینان سے مرجاؤں گا، اس لیے کہ تصور میں یہ بات ہوگی، تم ان کی کفالت کرو گے۔ اگر اس فرض کو پورا نہ کرو گے تو میری بلا سے، میری موت تو بحالتِ اطمینان ہوگی۔

ساب والدۂ ماجدہ تمھاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاءُ الدین احمد خاں اسی واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ سنو، بعد تبدیل آب وہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرت اطباؔ، صحبت احبابؔ، تنہائی سے نہ ملول رہو گے، حرف وحکایت میں مشغول رہو گے، آؤ آؤ، شتاب آؤ بھائی۔

میرزا علاؤالدین خاں! تم کو کیا لکھوں؟ جو وہاں تمہارے دل پر گزرتی ہو گی۔ یہاں میری نظر میں ہے۔ خیر دعائے مزید عمر و دولت۔

نجات کا طالب، غالب

—— (۲) ——

اخ مکرم کے خدام کرام کی خدمت میں بعد اہدائے سلام مسنون، ملتمس ہوں، تمھارا شہر میں رہنا موجب تقویتِ دل تھا، گو نہ ملتے تھے، پر ایک شہر میں تو رہتے تھے۔

بھائی، ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیور آشیاں گم کردہ کی طرح ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آ جاتے ہیں۔ لو صاحب، اب وعدہ کب وفا کرو گے؟ علائی کو کب بھیجو گے؟ ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کہے گا: میں رہرو چالاک ہوں، تیراک نہیں[۲]، لوہارو سے دہلی تک کشتی بغیر کیونکہ جاؤں؟ دخانی جہاز کہاں سے لاؤں؟

اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

استاد میر جان صاحب کو سلام۔

یوم الخمیس ۱۷ محرم سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۲ جون سنہ ۱۸۶۴ء)

علائی کے دیدار کا طالب، غالب

—— (۳) ——

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت!

تمہاری تفریح طبع کے واسطے ایک غزل نئی لکھ کر بھیجی ہے، خدا کرے پسند آئے اور مطرب کو سکھائی جائے۔

آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں، سوانح لیل ونہار لکھتا ہوں۔ کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اول روز بڑے زور کی آندھی آئی پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا

---

[۱] یعنی دہلی آ جاؤ گے تو اول آب و ہوا بدل جائے گی۔ اس سے صحت کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسرے دہلی میں طبیب بکثرت موجود ہیں، ان سے طبی مشورے لیے جا سکیں گے اور علاج کا انتظام بہتر ہو جائے گا۔ تیسرے دوستوں اور محبتوں سے صحبتیں رہیں گی اور لوہارو میں یہ باتیں میسّر نہیں آ سکتیں۔

[۲] اس زمانے میں لوہارو جانے کے لیے ریل نہ تھی۔ گرمی کے موسم میں سفر عام طور پر رات کو کرتے تھے اور دن کے وقت آرام لیتے تھے۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ اگر برسات شروع ہو جائے گی تو راستوں میں پانی بھر جائے گا۔ اس وقت علائی کو دہلی آنے کی اجازت دینا بالکل بے نتیجہ گا۔ وہ آ نہیں سکے گا۔

کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہوگئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں: ایک شبیر زور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں، جن کو عوام گمرٹی[1] کہتے ہیں، انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی، اینٹ سے اینٹ بجادی۔ واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر! ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال عسیر الحال[2] عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے۔ بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیتا ہے، باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ، نہ ہر شام و پگاہ، غالب علی شاہ درویش کے تکیے پر آجاتا ہے[3]۔ اہل شہر حیران ہیں کہ کھانا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ باپ سے پھر گیا ہے، میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہو۔ غالب علی شاہ کا قول یہ ہے کہ کل کا بھلا ہو۔

جمعہ ۲۶ رمئی ۱۸۶۵ء

—(۴)—

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت!

بعد سلام مسنون و دعاے بقاے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامہ کی رُو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ تیسری غزل "گوہر نتواں گفت"، "اختر نتواں گفت"، جو تمھارے حسب الطلب بھیجی گئی ہے، کیا نہیں پہنچی؟ بے شبہ پہنچی ہوگی۔ تم بھول گئے ہوگے۔ وکیل حاضر باش دربار اسد اللّٰہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے۔ جھنجوٹی[4] کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آکر میں بھی سن لوں گا۔ والسلام مع الاکرام

چہار شنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ
(مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء)

نجات کا طالب، غالب

غزل

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی! / تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ؟ / ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت، پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟ / تم خداوند ہی کہلاؤ، [illegible]

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی / آپ کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا / کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں، مگر باغ نہیں ہے واعظ / خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی

---

[1] گنبد کی تصغیر
[2] یعنی بال بچے زیادہ ہیں اور تنگ دست ہے۔
[3] یعنی خود میرزا کے مکان پر
[4] ایک مشہور راگنی



کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب | سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں | زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی
مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی | ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

—(۵)—

بھائی صاحب!

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ[1] قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں، اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم تکلّفِ محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے، ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو، تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے، جس نے غمِ رحلت نواب[2] مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دُعائے مغفرت، میں کیا اور میری دُعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربیہ و محسنہ تھیں، دل سے دُعا نکلتی ہے۔ معہذا تمہارا یہاں آنا سُنا جاتا تھا، اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہُوا کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور اس سبب سے آنا نہ ہوا۔ یہ چند سطریں لکھی گئیں۔ حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

۱۵ ر نومبر ۱۸۶۶ء | تمہاری خوشی کا طالب، غالبؔ

—(۶)—



جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت

بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت روز افزوں، عرض کیا جاتا ہے کہ استاد میرن جان آئے اور ان کی زبانی تمہاری خیر و عافیت معلوم ہُوئی۔ خدا تم کو زندہ و تندرست و شاد و شادماں رکھے۔

یہاں کا حال کیا لکھوں؟ بقول سعدی علیہ الرحمۃ: (نہ ماند آب جز چشمِ دُرِّ یتیم) شب و روز آگ برستی ہے یا خاک۔ نہ دن کو سُورج نظر آتا ہے، نہ رات کو تارے۔ زمین سے اٹھتے ہیں شعلے، آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ نادان! قلم انگریزی دیا سلائی کی طرح جل اُٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی، ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے۔ گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے، وہ اور بھی جاں گزا ہے۔

خیر اب فصل سے قطع نظر ایک کودک غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہُوں کہ وُہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ میرزا[3] آیا اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں صاحب، میں تمہارا کون ہُوں اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ "تمہاری تنخواہ آئی؟" کہا "جناب عالی، آغا جان[4] کی تنخواہ آگئی ہے۔ میری نہیں آئی۔" میں نے کہا "تو لوہارو جائے تو تنخواہ پائے"۔

---

[1] بیگم جان والدہ صاحبہ امین الدین احمد خاں و ضیاءُ الدین احمد خاں [2] نواب احمد بخش خاں والد مکتوب الیہ [3] میرزا امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا ابن نواب علاؤ الدین احمد خاں ابن نواب امین الدین احمد خاں مکتوب الیہ [4] ترکی میں "آکا" بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ بول چال میں یہ لفظ والد کے لیے استعمال

(باقی اگلے صفحہ پر)

کہا "حضرت میں تو آغا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو، اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے"؟

سبحان اللہ! بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔ میں اس خوبی خو اور فرخی سیرت پر اس کو فرخ سیر کہتا ہوں مصاحب بے بدل ہے۔ تم اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے؟ مگر بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبع ہو کہ زین العابدین و حیدر حسن اور ان کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا۔ علاؤالدین خاں جیسا ہوشمند و ہمہ دان بیٹا، فرخ سیر جیسا دانشور، بذلہ سنج اور شیریں سخن پوتا۔ یہ دو عطیۂ عظمیٰ و موہبت کبریٰ ہیں تمہارے واسطے من جانب اللہ؛

اگر دریافتی بر دانشت بوس
دگر غافل شدی افسوس افسوس

آج ۲۲ جون کی ہے، آفتاب سرطان میں آگیا۔ نقطۂ انقلاب صیفی ہیں[۲] دن گھٹنے لگا۔ چاہیے کہ تمھارا غیظ و غضب ہر روز کم ہوتا جائے۔ [۳]

نجات کا طالب، غالب

علاؤالدین احمد خاں علائی[۴]

(۱)

میرزا نسیمی[۵] کو دعا پہنچے!

آنکھ کی گھاجنی جب پک کر پھوٹ گئی تھی اور پک کر پیپ نکل گئی تھی تو نشتر کیوں کھایا؟ مگر یہ کہ بطریق خوشامد طبیب سے رجوع کی۔ جب اس نے نشتر تجویز کیا، خواہی نخواہی امتثال امر کرنا پڑا اور شاید یوں نہ ہو، کچھ مادہ باقی ہو۔ بہرحال حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شفا بخشے!

قطعہ

بسکہ فعال[۶] ما یرید ہے آج
ہر سلحشور[۷] انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک[۸] جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ہونے لگا جس طرح آپا جان والدہ کے لیے حالانکہ آپا کے معنی بڑی بہن کے ہیں۔ یہاں آغا جان سے مراد علاؤالدین احمد خاں ہیں۔ [۱] غلام حسین خاں مسرور جو میرزا غالب کے ہم زلف اور زین العابدین خاں عارف کے والد تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی بنیادی بیگم اور اس کے بچوں کو بالکل چھوڑ رکھا تھا اور ننگی بیگم نام ایک خاتون سے شادی کر لی تھی۔ میرزا کہتے ہیں کہ امین الدین احمد خاں بھی مسرور کے متبع ہو گئے اور اپنے بچوں کو چھوڑ دیا۔ [۲] گرمیوں میں سب سے بڑا دن ۲۱ جون کا ہوتا ہے۔ پھر دن گھٹنے لگتا ہے اور رات بڑھنے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے ۲۲ جون سے دن گھٹنے لگا جس طرح ۲۱ دسمبر نقطۂ انقلاب شتائی ہے اور ۲۲ دسمبر سے رات گھٹنے لگتی ہے۔ [۳] میرا اندازہ ہے کہ یہ خط جون ۱۸۶۷ء کا ہوگا۔ اس میں امیر الدین احمد خاں عرف فرخ میرزا سے گفتگو کا مفاد درج کیا ہے۔ انکی پیدائش ۱۸۶۱ء میں ہوئی۔ اسی لیے انھیں بالشت بھر کا لڑکا بتایا گیا ہے۔ [۴] علائی کا تخلص پہلے نسیمی تھا [۵] یعنی جو چاہے کرنے والا۔ مطلق العنان، فاعل مختار [۶] ہتھیار استعمال کرنے والا یعنی سپاہی۔ [۷] چوک سے یہاں بظاہر چاندنی چوک مراد ہے۔ اس میں بعد "غدر" کوتوالی کے سامنے لوگوں کو پھانسیاں دی جاتی تھیں۔

شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک　　آدمی واں نہ جا سکے، یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا　　وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ　　سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب　　کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۶ء[1]

(۲)

آج بدھ کے دن، ۷، ہ رمضان کو پہر دن چڑھے کہ جس وقت میں کھانا کھا کر باہر آیا تھا، ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط اور شہاب الدین خاں[2] کا خط معاً لایا۔ مضمون دونوں کا ایک۔ واہ کیا مضمون! ان دنوں میں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں، ایک داغ جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سبحان اللہ میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی، یا ولادت کی تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی[3]۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا کرے۔

میاں اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے دیے ہوئے مادّے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی[4] کی رحلت کا مادہ "دریغ دیوانہ" نکالا۔ پھر اس میں سے "آہے" کے سولہ عدد گھٹا دیے۔

تمام دوپہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مادہ ڈھونڈا۔ تمہارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں۔ بارے ایک قطعہ درست ہوا، مگر تمہاری زبان سے، گویا تم نے کہا ہے پانچ شعر ہیں: تین شعر زائد، دو موضح مدعا[5]، لیکن میں نہیں جانتا کہ تعمیہ[6] اچھا ہے یا برا۔ ہاں اغلاق[7] تو البتہ ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوحِ مزار پر کھدوانے کے

---

[1] یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قطعہ ان حالات سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو "غدر" کے بعد دہلی میں پیدا ہو گئے تھے، اسی لیے کہا کہ انگریزوں کے سپاہی مطلق العنان ہیں، جو چاہتے ہیں، کرتے ہیں، کسی کو گھر سے بازار تک جانے کا حوصلہ نہیں۔ چوک مقتل بنا ہوا ہے اور دہلی کا ایک ایک ذرہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہے۔

[2] شہاب الدین احمد خاں ثاقب ابن ضیاء الدین احمد خاں نیر۔ [3] علائی کے بچے کی وفات کا ذکر ہے جس کا نام یحیٰی تھا۔ [4] میرزا یوسف جس نے غدر کے دوران میں ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء) کو دہلی میں بحالت دیوانگی وفات پائی۔ غالب نے تاریخ وفات کہی تھی:

زسالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف　　کہ زیستے بہ جہاں در، زخویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمے پژوہش کرد　　کشیدم آہے وگفتم "دریغ دیوانہ"

[5] مدعا کو واضح کرنے والے۔ [6] تعمیہ: اصطلاحاً اصل مادے میں اعداد بڑھانے اور شامل کرنے کو کہتے ہیں۔ تفصیل خود اس خط کے آخر میں درج ہے۔ [7] اغلاق: پیچیدگی۔

قابل نہ ہو۔

قطعہ

درگریہ اگر دعویِ ہم چشمی ما کرد ۔۔۔ بینی کہ شود ابرِ بہاری خجل ازما
ناچار بگرئیم شب و روز کہ ایں سیل ۔۔۔ باشد کہ برد کالبدِ آب و گل ازما
گفتی کہ نگہدار دل از کشمکشِ غم ۔۔۔ خود گرد برآورد غمِ جاں گسل ازما
یکجا شدہ، از شعلۂ سوزِ غمِ ہجرش ۔۔۔ چوں شمع دود دود بسر متصل ازما
غم دیدہ نسیمی پئے تاریخ وفاتش ۔۔۔ بنوشت کہ در داغِ پسر سوختہ دل ازما

"ما" کے عدد ۴۱ "دل" کے عدد ۳۴۔ "ما" میں سے "دل" گیا، گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گئے۔ باقی رہے سات۔ وہ "داغ پسر" پر بڑھائیے، ۱۲۷۴ ہاتھ آئے۔

۲۷۔ رمضان ۱۲۷۴ (۱۱ مئی ۱۸۵۸)

(۳)

خاک نمناکم و تو بادِ بہار ۔۔۔ نتوانی مرا ز جا بردار ہے
ہاں "نسیمی" ز من چہ می خواہی ۔۔۔ زحمتِ خویشتن چہ می خواہی ہے[1]

خوشی مجھ میں تجھ میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمھیں تہنیت دی تو مناسب، للہ الحمد، للہ الشکر۔

بھائی، سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ، اُٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا مقصود تمھارے والد ماجد[2] سے اور تمھاری جدۂ ماجد اور تمھارے عمِ[3] عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور[4] بچوں کو کہ یہ تمھاری قوم کے ہیں، مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی، بالشرط ان لوگوں کے

---

[1] مثنوی کے شعر ہیں لیکن تمام نسخوں میں "جا بردار" کے بجائے "جا بردن" چھپا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ منشی مہیش پرشاد صاحب نے بھی اسی طرح چھاپا۔ لیکن ذرا غور کرنے سے غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ غالب قادر الکلام شاعر تھا اور غیر ممکن تھا کہ وہ دو شعر متصل لکھتا، جو نہ رباعی کے تھے اور نہ قطعے کے۔ صحیح "جابردن" نہیں "جابردار" ہی ہو سکتا ہے۔ اس مصرع کا ایک نسخہ یہ بھی ہے: کے توانی مراز جا بردار۔

[2] نواب امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو۔ [3] نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر۔ [4] بی بی امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے سگے چچا کی بیٹی تھی۔ دو بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں، زین العابدین خاں عارف کے بیٹے تھے۔ عارف، نواب غلام حسین خاں مسرور کا فرزند تھا۔ مسرور امین الدین احمد خاں کا ہم خاندان تھا۔ نیز اس کی شادی بیگم غالب کی سگی بہن سے ہوئی تھی۔ گویا بچوں سے لوہارو والوں کا دوہرا رشتہ تھا۔

لوہارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنسن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا، جہاں سے دل اکھڑا، چل دیا۔[1]

تا درمیانہ خواستہ کردگار چیست

دوشنبہ ۱۳ر محرم ۱۲۷۵ھ غالبؔ
(مطابق ۲۳ر اگست ۱۸۵۸ء)

—— (۴) ——

سبحان اللہ! ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو! یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ "دساتیر"[2] اور "برہان[3] قاطع" کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازاں جملہ "برہان قاطع" تم کو دے چکا ہوں۔ "دساتیر" میرا ایمان و حرز جان ہے۔ اشعار تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں، اصلاح پاتے ہیں۔ باور کرنا اور مطابق واقعہ سمجھنا۔

تمھارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمھارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمھارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مرقومہ روز دوشنبہ۔ ۲ر جولائی ۱۸۶۰ء غالبؔ

—— (۵) ——

صاحب! میری داستان سنیے۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجتمعہ سہ سالہ[4] یک مشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق[5] چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینا بدستور رہا۔ آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنسن دار علی العموم ششماہی پایا کریں، ماہ بماہ پنسن تقسیم نہ ہوا کرے۔

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اب وہ حویلی غلام اللہ نے مول لے لی۔ آخر جون میں

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا، جب غدر کے بعد غالبؔ کی خاندانی پنشن بند ہو گئی تھی۔ "پنسن" اصل میں "پنشن" ہے، لیکن غالبؔ کا املا پنسن ہی تھا۔ [2] پارسیوں کی مذہبی کتابیں [3] "برہان قاطع" فارسی لغت کی مشہور کتاب مؤلفہ محمد حسین تبریزی دکنی، جس کے رد میں غالبؔ نے "قاطع برہان" لکھی تھی اور اس پر رد و کد کا ایک وسیع ہنگامہ بپا ہوا تھا [4] از ابتدا مئی ۱۸۵۷ء تا او اخر اپریل ۱۸۶۰ء۔
[5] مراد ہے واجبات قرض۔

مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمدگر ایسی ملیں کہ ایک محلسرا اور ایک دیوان خانہ ہو، نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلّی ماروں[1] میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں، نہ ملا۔ تمھاری چھوٹی پھوپی نے بیکس نوازی کی، کٹڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محلسرا سے قریب ہو مگر خیر، بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا۔ ایک پانو زمین پر ہے، ایک پانو رکاب میں۔ توشے کا وہ حال، گوشے کی یہ صورت[2]۔

کل شنبہ ۱۷ر ذی الحجہ کی اور ۷ر جولائی کی[3]، پہر دن چڑھے تمھارا خط پہنچا۔ دو گھڑی بعد سنا گیا کہ امین الدین خان صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے از راہ مہربانی ناگاہ میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے ان کو دبلا اور افسردہ پایا، دل کڑھا۔ علی حسین[4] خاں بھی آیا، اس سے بھی ملا۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب[5] بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ[6] اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اس کو چاہتے تھے؟ ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بظاہر ان کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔

راقم، غالب

نگاشتہ درواں داشتہ یک شنبہ بین الظہر والعصر

۱۸ر ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ (۸ر جولائی ۱۸۶۰ء)

(۶)



مولانا نسیمی!

کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیر[7] خلیفہ اوّل ہے (تو) تم خلیفہ ثانی ہو۔ اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے[8]۔ جانشین دونوں، مگر ایک اوّل اور ایک ثانی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکالو کر مجھ پیر غمزدہ دل کو تکلیف دو؟ علاؤ الدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر[9]الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ[10] تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے

---

[1] دلّی کا مشہور محلہ جس میں غالب نے زندگی کے بیشتر اوقات گزارے۔ اسی محلے میں شریف خانی خاندان کے مکان ہیں۔ [2] توشہ و گوشہ سے مراد معاش و مکان ہیں۔ [3] یہاں عام نسخوں میں "۷ر جون کی" درج ہے جو غلط ہے، اس لیے کہ ۲۰ر جون سے ذی الحجہ کا مہینا شروع ہو گیا تھا لہٰذا "۷ر جولائی کی" صحیح ہے۔ یا تو غالب سے سہو ہوا یا بعد میں نقل کرنے والوں نے غلطی کی۔ [4] علائی کا چھوٹا بھائی [5] امین الدین احمد خاں [6] وہ سے مراد علاؤ الدین احمد خاں مکتوب الیہ ہیں اور یہ کلام امین الدین احمد خاں کا ہے۔ [7] ضیاء الدین احمد خاں ہیں۔ [8] یعنی مکتوب الیہ عمر میں چھوٹا اور نیر بڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مکتوب الیہ نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا تھا کہ نیر کو کیوں جانشین بنایا؟ [9] نصیر الدین حیدر شاہ اودھ تھے۔ ان کے بعد محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ پھر امجد علی شاہ، ان کے بعد واجد علی شاہ۔ [10] یعنی معزول ہو گئے اور سلطنت چھن گئی۔

گئے۔ وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب، حُسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے، وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ، سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط پہنچنے کا میں ضامن[1]۔

پنجشنبہ ۴ ر ماہ اپریل ۱۸۶۱ء غالب



(۷)

میری جان، تخلص تمہارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔ "لشمی" کو بہ تکلف اس کا مصحف[2] کیوں ٹھہراؤ؟ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کی خے کو جیم فارسی سے بدل دو[3]۔ نبی کو بتقدیم موحدہ علی النون لکھو[4]۔ یہ وساوس دل سے دور کرو۔ "رہرو" ایک اچھا تخلص ہے۔ "رہزد" اس کی تجنیس موجود ہے۔ "شیون" اچھا تخلص ہے، "ستون" اس کی تصحیف ہے۔ تمہارے واسطے بمناسبت اسم عالی تخلص خوب تھا مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے[5]۔ ہاں "نامی"، "سامی" یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ مولانا "فائق" کی پیروی کرو۔ مولانا "لائق" کہلاؤ۔ اگر کہو گے کہ اس ترکیب سے لفظ "نالائق" پیدا ہوتا ہے۔ مولانا "شائق" بن جاؤ۔

ہنسی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقت واجبی سنو۔ "نسیمی" تخلص، خماسی[6] بروزن "ظہوری" و "نظیری" اچھا ہے۔ اگر بدلنا منظور ہے تو "نامی"، "سامی"، "رہرو"، "شیون" یہ چار تخلص رباعی[7] بروزن "عرفی" و "غالب" اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو۔ میرے نزدیک سب سے بہتر تمہارے واسطے خاص "فخری" تخلص ہے۔ کہو گے کہ آزادپور

---

[1] عبارت سے ظاہر ہے کہ علائی نے غالب سے محلّے کا پتا پوچھا تھا، اس سے میرزا کے احساس شہرت و عظمت کو ٹھیس لگی اور نہایت دلچسپ انداز میں اس کا اظہار کیا۔ [2] تصحیف کا مطلب ہے نقطے بدل کر دوسرا لفظ بنا لینا جیسے "نسیمی" سے "لشمی"۔ مصحف یعنی تصحیف شدہ [3] یعنی "خدا" کو "جدا" بنایا جا سکتا ہے۔ [4] "نبی" کی ب کو "ن" پر مقدم کر دو تو "بنی" بن جائے گا۔ [5] اشارہ ہے نعمت خان عالی کی طرف جو عالمگیر اعظم کا خانساماں تھا اور مشہور شاعر ہونے کے علاوہ فارسی کا عالی پایہ نثر نگار تھا۔ "وقائع" "حسن و عشق" اور "جنگ نامہ" اس کی متداول کتابیں ہیں۔ دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ آخر میں دانشمند خاں خطاب پایا تھا [6] یعنی پنج حرفی [7] چار حرفی۔

کے باغ کے ایک آم کا نام "فخری" ہے: حاصل کلام دو دن کی فکر میں جو تخلص میرے خیال میں آئے، وہ آج لکھ بھیجتا ہوں۔ بھائی "موبد" تخلص نیا ہے۔ اگر پسند آجائے تو یہ رکھو۔ والدعا

صبح یک شنبہ ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء
نجات کا طالب، غالب

(۸)

میری جان علائی ہمہ دان!

اس دفعِ دخل مقدر کا کیا کہنا ہے۔[1] "فرہنگ لغات دساتیر" تمھارے پاس ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی نقل تم سے منگاؤں تم نے "دساتیر" مجھ سے مانگی۔ اسی صحیفۂ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہو گے کہ اگر "دساتیر" نہیں تو "فرہنگ" کی خواہش کیوں ہے؟ حق تو یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں، اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اس "فرہنگ" کی نقل بھیج دو گے تو مجھ پر احسان کرو گے۔ "دساتیر" میرے پاس موجود ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب اگر "دساتیر" ہوتی اور میں بھیج دیتا، تو البتہ بھائی[2] صاحب کا مشکور ہوتا۔ دین و دنیا میں کیوں ماجور ہوتا؟ ارسال اہدا[3] پر حصول اجر کیوں مترتب ہوگیا؟ بھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں اور تم اس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اس کے اعلان و شیوع کا ہوتا تو عنداللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر حافظ کا اور ایک شعر مولوی روم کا سناؤ۔

غالب:

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو — کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

حافظ:

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

مولانا روم:

مذہبِ عاشق ز مذہبہا جداست — عاشقاں را مذہب و ملت خداست

رات کو خوب مینہ برسا ہے، صبح کو تھم گیا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ ابر تنک چھا رہا ہے۔ یقین ہے کہ تمھاری جدۂ ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانۂ لوہارو ہوں۔ کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعید ازلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسائش کے واسطے ہے۔ میرا منظر سرِ راہ ہے، وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔

بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟

حضرت، ابھی نہیں!

---

[1] "دفعِ دخل مقدر" سے مراد ہے سوال کا دروازہ پہلے ہی بند کر دینا [2] امین الدین احمد خاں والدِ علائی [3] ہدیہ بھیجنا۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے!

مرقومہ شنبہ یکم جون وقت ۶ بجے، کے عمل میں ۱۸۶۱ء غالب

(۹)

جانِ غالب!

یاد آتا ہے کہ تمھارے عمِ نامدار[1] سے سُنا تھا کہ لغات "دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ بھیج دیتے۔

خیر:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں۔ کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ رہی دید وا دید، اس کی دو صورتیں ہیں، تم دلّی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے؟

سُنو، عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے: لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّار۔ ہرچند قاعدۂ عام یہ ہے کہ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا[2]۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس[3] صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ پھرتا رہا[4]۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے، پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں[5]۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار۔ مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا[6]۔ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی[7] دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد

---

[1] ضیاء الدین احمد خاں نیّر [2] یعنی پیدا ہوا [3] یعنی شادی ہوئی۔ بیڑی سے مراد بیوی ہے۔ [4] اس سے مراد کلکتہ کا سفر ہے، جس میں میرزا نے دو سال سات ماہ گزارے۔ [5] ہتکڑیوں سے مراد عارف کے بچّے باقر علی خاں اور حسین علی خاں ہیں جنھیں میرزا، عارف اور اس کی بیوی اور والدہ کی وفات کے بعد اپنے گھر لے آئے تھے [6] پہلے سفرِ رام پور کی طرف اشارہ ہے یعنی بیوی کو دلّی میں چھوڑا اور بچّوں کو ساتھ لے گئے۔ [7] یعنی دیکھیے موت کب آئے؟

نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ دو فارسی غزلیں، دو اردو غزلیں اپنے حافظہ کی تحویل میں بھیجتا ہوں، بھائی صاحب کی نذر:

از جسم بجاں نقاب تا کے؟ — ایں گنج دریں خراب تا کے؟
ایں گوہرِ پُر فروغ یارب! — آلودۂ خاک و آب تا کے؟
ایں راہروِ مسالکِ قدس — وا ماندۂ خورد و خواب تا کے؟
بیتابیِ برق جز دمے نیست — ما و ایں ہمہ اضطراب تا کے؟
جاں در طلبِ نجات تا چند؟ — دل در تعبِ عتاب تا کے؟
پرسش ز تو بے حساب باید — غم ہاے مرا حساب تا کے؟
غالبؔ بہ چنیں کشاکش اندر
یا حضرتِ بوترابؑ تا کے؟[1]

دوش، کز گردشِ بختم گلہ بر روے تو بود — چشم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود
آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بہ عتاب — نفسم پردہ کشاے اثرِ خوے تو بود
چہ عجب، صانع اگر نقشِ دہانت گم کرد؟ — کاں خود از حیرتیانِ رُخِ نیکوے تو بود
بکفِ باد مباد ایں ہمہ رسوائیِ دل — کآخر از پردگیانِ شکنِ موے تو بود
مردن و جاں بہ تمناے شہادت دادن — ہم از اندیشۂ آزردنِ بازوے تو بود
دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند — کایں ہماں است کہ پیوستہ در ابروے تو بود
لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دلِ غالبؔ ہوسِ روے تو بود[2]

---

[1] یہ غزل غالبؔ کے فارسی کلیات میں شامل نہ ہوئی، "سبدِ چین" میں چھپی۔ [2] یہ غزل کلیاتِ فارسی میں موجود ہے۔ لیکن اس کے بارہ شعر ہیں۔ بقیہ شعر یہ ہیں:

چرخ کج باختہ بہ من، درخمِ دامِ تو فگند — نعل وا اژدونِ بلا حلقۂ گیسوے تو بود
شب چہ دانی ز تو در بزم بہ خوباں چہ گذشت — خاصہ بر صدر نشینے کہ بہ پہلوے تو بود

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا — ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا — ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
یارب نہ وہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے — جلاّد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور[1]

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خُو بری نہیں — بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے — مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

غالبؔ تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے[2]

ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ (جون ۱۸۶۱ء)

خلد را از نفسِ شعلہ فشاں مے سوزم — تا ندانند حریفاں کہ سرِ کوے تو بود
روشِ بادِ بہاری بہ گمانم انگند — کایں گل و غنچہ پے قافلۂ بوے تو بود
ہم ازاں پیش کہ مشاطہ بد آموز شود — نقشِ ہر شیوہ در آئینۂ زانوے تو بود

[1] اردو دیوان میں اس غزل کے گیارہ شعر ہیں۔ باقی چار یہ ہیں:

ابرو کو ہے کیا اس نگہِ ناز سے پیوند — ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین — کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

[2] اس غزل کے باقی شعر یہ ہیں:

(۱۰)

علائی مولائی!

اس وقت تمھارا خط پہنچا۔ اُدھر پڑھا اِدھر جواب لکھا۔ واہ کیا کہنا ہے؟ رام پور کے علاقہ کو گاؤ تنگ[1] اور مجھ کو بیل یا اس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنایا۔ وہ علاقہ اور وہ پیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مزاحم کیوں ہو؟ رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اس سرکار[2] سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعاے خیر اور مجھ سے اصلاحِ نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لوں، چل دوں۔ رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے۔ شراب مل سکتی ہے۔ کہار بہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محلسرا میں کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے۔ والیِ رام پور نے بھی تو مرشد زادہ کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں۔ تمھارا اقبال تمھارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔

بھائی[3] کے اور تمھارے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے، پر کیا کروں؟ عقرب و قوس کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر میں قصد تو کروں گا۔ کاش لوہارو کی جگہ گوڑگانوہ ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو گے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انحطاط و اضمحلال روزافزوں۔ نہ تم یہاں آسکتے ہو، نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر حملہ چل گیا، بہتر، ورنہ:

اے واے ز محرومیِ دیدار و دگر ہیچ

چہار شنبہ ۵ ستمبر ۱۸۶۱ء۔ ہنگام نیمروز[4]۔ غالب

(۱۱)

صاحب! آگ برستی ہے، کیونکر آگ میں گر پڑوں؟ مہینا ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو۔ دے و بہمن بہت دور ہیں۔ آبان و

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا — میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہاے گرانمایہ کیا کیے؟

[1] گاؤ تنگ ہندی میں "آر" کو کہتے ہیں، یعنی بیلوں کے ہانکنے کی لکڑی کے سرے پر جو لوہے کی سوئی سی لگا لیتے ہیں۔ سوئی بیلوں کو چبھوئی جائے تو وہ تیز چلتے ہیں۔ [2] یعنی سرکار رام پور [3] امین الدین احمد خاں والد علائی [4] اصل خط میں تاریخ پہلے مرقوم تھی، لیکن میں نے اسے خط کے نیچے درج کیا تاکہ ترتیب میں یکسانی قائم رہے۔

آذر میں بہ شرطِ حیات فصد کروں گا۔ یہ چند اوراق یوسف میرزا نے از روئے دہلی اردو اخبار کاتب سے لکھوا رکھے تھے اور میرے پاس پڑے تھے۔ ثاقب کو دے دیئے تاکہ کسی آدمی کے ہاتھ تم کو بھیج دے اور تم میری طرف سے میرے بھائی اور اپنے والد ماجد کو دو۔ جب اٹھا کر دیکھا کریں گے تو کوئی منٹ کی دل لگی کو یہ اشعار مکتفی ہو جائیں گے۔ یہ سطریں جواب ہیں اس خط کا، جو آج اس وقت ڈاک سے میں نے پایا ہے۔

نیم روز دو شنبہ

۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء

(۱۲)

میری جان! کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ فصل اچھی ہو گئی۔ اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیع[1] جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ خرقہ پایا۔ سبحہ وسجادہ کا یہاں پتا نہیں، ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہنچ گئے۔ آخر اکتوبر میں یا آغاز نومبر میں نیر رخشاں کو بھی وہیں لو۔ پھر عقرب و قوس کے آفتاب کا کیا ذکر؟ آبان ماہ آذر ماہ سے کیا غرض؟

بسے تیر و دے ماہ واردی بہشت برآید کہ ما خاک باشیم و خشت

استاد میر جان کو، اس راہ سے کہ میری پھوپی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، دعا اور اس رُو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سالی کی رعایت نہیں کرتے، سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں، درُود اور موافق مضمون اس مصرع کے:

سوے اللہ واللہ، ما فی الوجود

حضرت وہ "شرف نامہ" نہیں ہے، کسی احمق نے شرف نامہ میں سے کچھ لغات، اکثر غلط، کمتر صحیح، چُن کر جمع کیے ہیں۔ نہ دیباچہ ہے کہ اس سے جامع کا حال معلوم ہو، نہ خاتمہ ہے کہ عہد و عصر کا حال کھلے۔ بایں ہمہ میاں ضیاء الدین کے پاس ہے۔ اگر وہ آجائیں گے تو ان سے کہہ دوں گا۔ اگر وہ لائیں گے تو ان کو قیمت دے کر علائی مولائی کو بھیج دُوں گا۔

خصی بکروں کے گوشت کے قلیے، دوپیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو۔ خدا کرے، بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا تم کو میسّر نہ آیا ہو۔ کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہُوں۔

سہ شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء نجات کا طالب، غالب

---

[1] یعنی ادب میں جانشینی کی سند

(۱۳)

مرزا علائی!

پہلے استاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ، تاکہ میرے حواس جو منتشر ہو گئے ہیں، جمع ہو جائیں۔ میں اپنے کو کسی طرح کے قصور کا مورد نہیں جانتا۔ جھگڑا ان کی طرف سے ہے، تم اس کو یوں چکا دو۔ یعنی اگر ان کو صرف آشنائی و ملاقات منظور رہے، تو وہ میرے دوست ہیں، شفیق ہیں، میرا سلام قبول فرمائیں اور اگر قرابت و رشتہ داری ملحوظ ہے تو وہ میرے بھائی ہیں، مگر عمر میں چھوٹے، میری دعا قبول فرمائیں۔

صاحبین[۱] کی رائے کا اختلاف مشہور رہے۔ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا، مگر ہر ایک قول جدا جدا لکھوں۔ آج نہ لکھا نہ سہی، دو چار دن کے بعد لکھوں گا۔ تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ صاحبین مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ ہیں۔

بھائی صاحب کی رضا جوئی مجھ کو منظور اور یہ غزل معروض ہے۔ میری طرف سے سلام کہو:[۲]

از من غزلے گیر و لفرماے کہ مطرب　　　در نے دمد از روے نوازش دو سہ دم را

غزل

جز دفع غم زیادہ نبود است کام ما　　　گوئی چراغ روز سیاہ ست جام ما

در غلولش گزر نبود باد را مگر　　　مرصر بخاک راہ رساند پیام ما

اے باد صبح، عطرے ازاں پیرہن بیار　　　تسکین ز بوے گل نہ پذیرد مشام ما

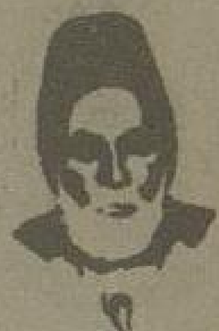
ہر بار دانہ بہر ہما انگنیم و مور　　　آید بدام و دانہ رباید ز دام ما

گفتی چو حال دل شنود، مہرباں شود　　　مشکل کہ پیش دوست تواں برد نام ما

از ما بما پیام و ہم از ما بما سلام　　　رنج و لے مباد پیام و سلام ما

مقصود ما ز دہر ہر آئینہ نیستی ست　　　یارب کہ ہیچ دوست مبادا بکام ما

غالب بقول حضرت حافظ ز فیض عشق　　　"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"



(۱۴)

آج جس وقت کہ روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا، شہاب الدین خاں تمہارا خط اور مصری کی ٹھلیا لے کر آئے۔ میں اس کو لیا کر گھر گیا۔ آپ اپنے سامنے مصری تلوائی۔ آدھ پاؤ اوپر دو سیر نکلی۔ خانۂ دولت آباد، یہی کافی و وافی ہے اور اب حاجت نہیں۔ روٹی کھا کر باہر آیا۔ تمہارے ابن عم[۳] کا آدمی جواب خط کا متقاضی ہوا کہ شتر سوار جانے والا ہے۔ میں کھانا کھا کر لیٹنے کا عادی ہوں،

---

[۱] صاحبین۔ لفظی معنی دو ساتھی۔ اصل میں حضرت امام ابو یوسف رح اور حضرت امام محمد رح کو کہتے ہیں جو حضرت امام اعظم رح کے شاگرد اور رفیق تھے۔ یہاں مراد سالک شیر رضوان ہے، جیسا کہ غالب نے خود تصریح کر دی ہے [۲] اس خط پر تاریخ درج نہیں لیکن خط نمبر ۱۲ میں استاد میر جان کے نام سلام کا ذکر ہے، جس کے جواب میں کچھ لکھا آیا۔ بظاہر یہ خط اسی کے جواب میں مرقوم ہوا۔ [۳] شہاب الدین خاں ثاقب ابن ضیاء الدین احمد خاں نیر، عم علائی۔

پڑے پڑے مصری کی رسید لکھ دی۔ مطالب مندرجہ خط کا جواب کل دوں گا۔

چاشت گاہ سہ شنبہ دوازدہم نومبر ۱۸۶۱ء غالب

—— (۱۵) ——

صاحب!

صبح جمعہ کو میں نے تم کو خط لکھا، اسی وقت بھیج دیا۔ پہر دن چڑھے سنا کہ شب کو پھر دورہ ہوا، گیا، خود ان سے حال پوچھا۔ محمد علی بیگ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ بہ نسبت دورہ ہائے سابق خفیف تھا اور افاقہ جلد ہو گیا۔ کل مرزا شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین کہتے تھے کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں مگر پیٹ بھر کے۔ غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ سالک کے سلوک منظور نہیں، تنہا ہوائے شمشاد[۱] درسر است:

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

یک شنبہ یکم فروری ۱۸۶۲ء

—— (۱۶) ——

"نیّرِ اصغر[۲]"، "سپہر سخن سرائی"، مولانا علائی کے خاطر نشان و دل نشین ہو کہ آج صبح کوئی پانچ چھ گھڑی دن چڑھے دونوں بھائی صاحب تشریف لائے۔ میں گیا اور ملا۔ علی حسین خاں کو بھی دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بھائی صاحب والدہ صاحبہ کے پاس گئے۔ میں گھر آیا، کھانا کھایا۔ دوپہر کو تمہارا خط پایا۔ دو گھڑی لوٹ پوٹ کر جواب لکھا اور ڈاک میں بھجوایا۔

یہ مرض جو بھائی کو ہے اس راہ سے کہ ضد صحت ہے، مکروہ طبع ہے، ورنہ ہرگز موجب خوف و خطر نہیں۔ میں تو بھول گیا تھا۔ اب بھائی کے بیان سے یاد آ گیا کہ بارہ تیرہ برس پہلے ایک دن ناگاہ یہ حالت طاری ہو گئی تھی۔ وہ موسم جوانی کا تھا اور حضرت عادی بہ افیون نہ تھے۔ تنقیہ بہ قے فوراً اور بہ اسہال چند روز بعد عمل میں آیا۔ اب سن کہولت، استعمال افیون مزید علیہ۔ دورہ جلد جلد متواتر ہوا۔ اضطراب از راہِ محبت ہے، از روئے حکمت اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔ نظیری[۳] میں یکتا حکیم امام الدین خاں،

---

[۱] قربان علی بیگ سالک جو شمشاد علی بیگ رضوان کے بھائی تھے۔ مطلب یہ کہ نواب صرف شمشاد علی بیگ کو ساتھ لے جا رہے تھے اور قربان علی بیگ سے سلوک کے لیے تیار نہ تھے۔ منشی مہیش پرشاد نے لکھا ہے کہ "تنہا ہوائے شمشاد درسر است" کے کچھ معنی نہیں بنتے، لیکن معنی بالکل ظاہر ہیں۔ سالک سے سلوک منظور نہیں، صرف شمشاد کا شوق سر میں ہے۔ یعنی سالک کو اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار نہیں، صرف شمشاد کو رکھنے پر آمادہ ہیں۔ ہوا کا لفظ شمشاد کی مناسبت سے لائے ہیں۔ اس خط میں نواب امین الدین احمد خاں کی بیماری کا ذکر ہے۔ [۲] نیّرِ اصغر، علائی کو اس لیے کہا کہ ضیاء الدین احمد خاں نیّر سے چھوٹے تھے اور غالب کے خلیفہ ثانی۔

[۳] نظیری کا مطلب یہ ہے کہ علم طب میں۔

وہ ٹونک۔ عملی[1] ہیں چالاک حکیم احسن اللہ خاں[2]، وہ کرولی رہے حکیم محمود خاں[3]، وہ ہمسایہ دیوار بہ دیوار۔ حکیم غلام نجف خاں وہ دوست قدیم صادق الولا۔ حکیم "بقا"[4] کے خاندان میں دو صاحب موجود۔ تیسرے حکیم "منجھلے" وہ بھی شریک ہو جائیں گے۔ اب آپ فرمائیے حکیم کون ہے؟ ہاں دو ایک ڈاکٹر بہ اعتبار ہم قومی حکام نامور[5] یا کوئی ایک آدھ بید۔ سو منزوی[6] اور گمنام۔ بہر حال خاطر جمع رکھو۔ خدا کے فضل پر نظر رکھو۔

سبحان اللہ، تم مجھ سے سپارش کرو امین الدین خاں کی؟ کیا میرے پہلو میں دل یا میرے دل میں ایمان، جس کو محبت بھی کہتے ہیں، بقدر پرِ پشہ و سرِ مو ر بھی نہیں؟ معالجہ حکماء کی راہ پر رہے گا۔ ندیمی اور غمخواری میں اگر قصور کروں تو گنہ گار۔ میاں ایسے موقع میں رائے اطبا میں خلاف کم واقع ہوتا ہے۔ مرض مشخّص، دوا معیّن، سوء مزاج ساذج نہیں، مادی ہے اور مادہ بارد[7] ہے۔ کوئی طبیب سوائے تنقیہ کے کچھ تدبیر نہ سوچے گا۔ تنقیہ میں سوائے مخرجات بلغم اور کچھ تجویز نہ کرے گا تجویز ہے کہ دو دن کے بعد تنقیہ خاص ہو اور ایارج[8] کا مسہل دیا جائے۔ اسماء آیات شفا بخش[9] مقرر ہیں۔ رد سحر و دفع بلا ان کے ذریعے سے منصوّر ہے، مگر ان ملاؤں اور عزائم خوانوں نے تہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور باتیں بگھارتے ہیں۔ تمھارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا؟ بیچارہ الگ ایک ایسے گوشہ رہتا ہے کہ جب تک خاص وہاں کا قصد نہ کرے، کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال ہے عبث۔ ہاں خیرات اور مساکین سے طلب دعا اور اہل اللہ سے استمداد، شہر میں مساکین شمار سے باہر، اہل اللہ میں ایک حافظ عبد العزیز، ما بہ خیر، شما بسلامت۔

۱۵ شعبان ۱۲۷۸ھ و فروری (۱۸۶۲ء) وقت نماز ظہر — نجات کا طالب، غالب

(۱۷)

صاحب!

کل تمھارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچ چکا ہوگا۔ آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور بھائی شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدر الدین[10] میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ سو اس کے موافق حبوب[11] بن گئی ہیں۔ نقوع[12] کی دوائیں آج آ کر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائے گا مگر انداز و ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور ان کے ہوا خواہوں کی رائے میں

---

[1] عملی سے مراد ہے علاج معالجہ ہیں۔ [2] حکیم امام الدین خاں اور حکیم احسن اللہ خاں دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ اول الذکر "غدر" کے بعد ٹونک چلے گئے اور بڑے بڑے والیان ریاست کے معالج رہے۔ حکیم احسن اللہ خاں ریاست کرولی میں ملازم ہو گئے تھے بڑودہ میں وفات پائی [3] حکیم محمود خاں شریف خانی والد مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم [4] بقا کا خاندان اطبا بہت مشہور تھا۔ منجھلے صاحب کا نام حکیم حسام الدین تھا۔ [5] انگریز [6] گوشہ نشین [7] خرابی مزاج سادہ نہیں، اس میں مادہ جمع ہو گیا ہے جو بارد ہے۔ [8] ایک دوا ہے مسہل جس سے دماغ کا تنقیہ ہوتا ہے [9] یعنی وہ آیتیں یا اوراد جو شفا مرض یا رد سحر یا دفع بلا کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔ [10] مفتی صدر الدین خاں آزردہ جو "غدر" سے پہلے صدر الصدور تھے۔ [11] گولیاں [12] وہ دوائیں جو بھگو کر پلائی جاتی ہیں۔

قصد اس استعلاج کا مذبذب[1] ہے۔ نسخے کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں۔ استاد میر جان بھی تھے۔ نیم نامعقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح خیریت ہے۔

کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وُہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہُوئے ہو، وُہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ[2] ہے۔ مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول[3] بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی[4] خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینا کا روزینہ خوار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر نصیر الدین[5] باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا[6]، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہُوئی۔ احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا[7]۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے[8] صاحب ساری املاک بیچ کر، نوش جان کر کے، بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ[9] کی پانسو روپے کرایہ کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہُوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکما کا حال لکھا ہے، وہ بیان واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سچ جانو۔ اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر، آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو۔ خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں؛

یک شنبہ ١٦ر فروری ١٨٦٢ء

عافیت کا طالب، غالب



۱۔ یعنی علاج کا ارادہ پختہ نہیں ہوا۔ ۲۔ یعنی چھاؤنی، معسکر ۳۔ بہادر شاہ ثانی ۴۔ نجابت علی خاں والیِ جھجر کا چھوٹا بیٹا۔ بڑے بھائی فیض محمد خاں کے عہد حکومت میں فوج کا سپہ سالار رہا۔ جب فیض علی خاں مسند پر بیٹھا تو اختلاف پیدا ہو گیا۔ مقدمے تک نوبت پہنچی۔ آخر سرکار انگلشیہ نے صلح کرائی۔ ۲ ہزار روپے پنشن لے کر دہلی میں اقامت اختیار کر لی۔ "غدر" کے دنوں میں باہر نکل گیا تھا۔ جنوری ١٨٥٩ء میں واپس آیا۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ١٨٦٢ء میں فوت ہُوا۔ اس وقت تک صرف سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ ۵۔ شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں۔ یہ خواجہ فخر عالم کے پوتے اور شیخ نظام الدین کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ دہلی کے کسی امیر خاندان سے تھی، اسی لیے نانا نانی کو امرا میں گنا ۶۔ بخشیوں کا خاندان بھی بہت مشہور اور بلند منزلت تھا۔ ۷۔ ناظر حسین میرزا کا نام اور پُورا لقب معین الدولہ عمدۃ الامرا صفدر الملک ذوالفقار الدین حیدر نظامت خان بہادر ذوالفقار جنگ تھا اور بڑے بھائی کا نام مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں۔ دونوں حسام الدین حیدر خاں کے فرزند تھے۔ مظفر الدولہ مارے گئے۔ ناظر حسین مدت تک پریشان حال پھرتے رہے ۸۔ بڈھے صاحب کا نام نواب غلام محی الدین تھا۔ رؤسائے دہلی میں سے تھے۔ ایک ہزار ماہوار پنشن تھی۔ تین سو روپے ماہوار بھرت پور سے ملتے تھے پانسو ماہانہ کرایہ آتا تھا۔ ۹۔ رکن الدولہ کے بیٹے تھے۔ "غدر" کے بعد پانی پت چلے گئے اور پکڑے گئے۔

(۱۸)

صاحب!

پرسوں تمھارا خط آیا۔ کل جمعہ کے دن نواب کا مسہل تھا۔ گیارہ بجے وہاں سے آیا۔ چونکہ جبوب میں مکرب[1] دوائیں تھیں، بہت بے چین رہے۔ آٹھ دس دست آئے۔ آخر روز مزاج بحال ہو گیا۔ تنقیہ اچھا ہوا۔ اب بفضلِ الٰہی اچھے ہیں اور یقین ہے کہ مرض عود نہ کرے۔ دلّی کی اقامت کی مدت اپنے والد کی رائے پر رہنے دو۔ بقدرِ مناسب، وقتِ عزم، خیر خواہانہ کچھ کہوں گا ضرور، نہ بہ ابرام۔ میں تم سے زیادہ ان کا مزاج داں ہوں۔ یہ خود پسند اور معہذا سپارش کا دشمن ہے۔ مغلچوں[2] کے مقدمے کو طبیعتِ امکان پر چھوڑ دو۔ میں دخل نہ کروں گا۔ ہاں اگر خود مجھ سے پوچھیں گے یا میرے سامنے ذکر آ جائے گا تو میں اچھی طرح کہوں گا:

بریده باد زبانے کہ ناسزا گوید

بُرا نہ ماننا۔ اگر یہ دونوں بھائی یا ان میں سے ایک رفیق ہو گیا، یوں تمام عمر بخوشی گزر جائے، لیکن تم کے برس، کے مہینے، کے ہفتے کا اگریمنٹ لکھتے ہو؟

صبح یک شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۲ء

غالب

(۱۹)

صاحب!

میرا برادر عالی قدر اور تمھارا والد ماجد اب اچھا ہے۔ از روئے عقل اعادۂ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا وہم، اُس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھو گے، میری طرف سے جواب وہی ہوگا، جو آگے لکھ چکا ہوں یعنی میں تماشائی محض رہوں[3] گا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے کچھ ذکر کریں گے تو بھلی کہوں گا۔

آپ کے عمِ عالی مقدار جو فرماتے ہیں کہ غالب کو بیٹھے ہوئے ہزارہا تسویلات و خیالات دکھلائی دیتے ہیں یہ حضرت نے اپنی ذات پر میری طبیعت کو طرح کیا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح میں مبتلائے وسواس و اوہام ہوں اور لوگ بھی اسی طرح بخارات مراقی میں گرفتار ہوں گے۔ قیاس مع الفارق ہے نہ تخییل صادق۔ یہاں لاموجود اِلّا اللّٰہ کے بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں:

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر
سوائے اللّٰہ واللّٰہ ما فی الوجود

ضیمران بروزن "درگراں" لغت عربی ہے نہ معرب۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ پھول ہندوستان میں ہوتا ہے یا نہیں۔

---

[1] کرب پیدا کرنے والی [2] مغلچوں سے مراد قربان علی بیگ اور شمشاد علی بیگ ہیں [3] ملاحظہ ہو خط نمبر ۱۸۔

اس کی تحقیقات از رُوئے الفاظ الادویہ ممکن ہے۔

آج اس نے جلاب لیا۔ دست آئے۔ مواد خوب اخراج ہُوا۔

فارسی غیر فصیح : امروز فلانے مسہل گرفت، دہ دست آمدند، مواد خوب برآمد۔

فارسی فصیح : امروز فلانے پگاہ، داروے مسہل آشامید، تا شام دہ بار نشست یا دہ بار بہ متراح یا دہ بار بہ بیت الخلا رفت۔ مادۂ فاسد چنانکہ باید، اخراج یافت۔

معلوم رہے کہ لوطیوں کے منطق میں خصوصاً اور اہلِ پارس کے روزمرّہ میں عموماً "نشستن" استعارہ ہے "ریدن" کا۔ چنانچہ ایک تذکرہ میں مرقوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعرا کی دعوت اپنے باغ میں کی۔ مرزا صائب اور اس کے ہم عصر کئی شعرا جمع ہُوئے۔ ایک شاعر کہ تذکرہ میں اس کا نام مندرج ہے اور میں بھول گیا ہُوں، اکول[1] تھا اور معدہ اس کا ضعیف تھا حرص و شرہ[2] کے سبب سے بہت کھا جاتا تھا، ہضم نہ کر سکتا تھا۔ کھانا کھا کر، شراب پی کر دروازہ باغ کا مقفّل کر کے سب سو رہے۔ اس مردا کولِ فضول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا۔ نہ ایک جگہ، بلکہ کبھی اس کیاری میں اور کبھی اس روش پر، کبھی اس درخت کے تلے، کبھی اس دیوار کی جڑ میں۔ قصّہ مختصر غایت شرم و حیا سے دو چار گھڑی رات رہے دیوار سے کُود کر چلا گیا۔ صبح کو جب جاگے، اس کو ادھر ادھر ڈھونڈا۔ کہیں نہ پایا، مگر حضرت کا فضلہ کئی جگہ نظر آیا۔ مرزا صائب نے ہنس کر فرمایا۔ "یاراں شمارا چہ افتادہ است کہ مے گوئید فلانے در باغ نیست؛ می بینم کہ مخدوم ہم دریں باغ چند جا نشستہ است"۔

صبح جمعہ ۵ ر رمضان و ۷ ر مارچ سال رستاخیز۔

رباعی خط میں لکھنا بھول گیا۔ یہ میں نے بھائی کو تہنیت میں بھیجی تھی:

اے کردہ بہ مہرِ زر فشانی تعلیم ۔۔۔ پیدا ز کلاہ تو شکوہِ دیہیم
بادا بتو فرخندہ ز یزدانِ کریم ۔۔۔ پروانگیِ جدید انقطاعِ قدیم

۵ ر رمضان ۱۲۷۸ھ ۔ ۷ ر مارچ ۱۸۶۲ء

(۲۰)

یار بھتیجے، گویا بھائی، مولانا علائی! خدا کی دُہائی، نہ میں ویسا ہوں گا جیسا نیّر سمجھا اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی خفقانی اور خیال تراش، نہ ویسا ہوں گا جیسا میرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے:

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم، داند

دوجانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا، جن سے تمھارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانہ جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرۂ نار ہو، تو یار و بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے

---

[1] بہت کھانے والا ۔۔۔ [2] حرص، لالچ

کی گرمی بازار ہو؟

کل استاد میر جان صاحب نے تمہارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ میں نے ان کو جانے نہ جانے میں متردد پایا ہے۔ جائیں، نہ جائیں، میں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ غلام حسن[1] خاں اگر کسی وقت آ جائیں گے تو ان کو تمہاری تحریر کا خلاصہ خاطر نشان کر دوں گا۔ حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو دلی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں[2] کے حال پر اور رئیس فرخ آباد[3] پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ اہا ہا ہا۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلیات[4] کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان[5] کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آ گئی۔ وہ تمہارے عم نامدار کی نذر ہوئی۔ باقی جلدیں، جن کا میں خریدار ہوا ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے، جب تک قیمت نہ بھیج دوں، کیونکر آئیں؛ روپے کی تدبیر میں ہوں۔ اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں۔ تمہارے پاس جو "قاطع برہان" پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو، مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو، بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمیس ۱۹ ؍جون المبارک، بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا اِدھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی[6] آئے، تمہارا خط ان کو دیا۔ وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔

۱۹ ؍جون ۱۸۶۲ء

—— (۲۱) ——

جانِ غالب!

دو خط متواتر تمہارے پہنچے۔ مغربی[7] "عرفا" میں سے ہے۔ بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آ گئیں ہیں، لیکن "داماں گلہ دارد" اس زمین میں میں نے اس کی غزل نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی[8] کی غزل اس زمین میں ہے:

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ ایک شعر اس کا مجھے یاد ہے۔ بھائی تمہارا باپ بدگمان ہے، یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور

---

[1] غلام حسن خاں محو پسر غلام حسین خاں مسرور والدِ عارف۔ یہ عارف کے علاتی بھائی تھے یعنی دوسری والدہ سے۔ [2] وہ لوگ جنہیں "غدر" میں حصہ لینے کی بنا پر انڈمان بھیجا گیا تھا۔ [3] تفضل حسین خاں رئیس فرخ آباد، جن پر "غدر" میں شرکت کا الزام لگا تھا اور خود ان کی خواہش پر انہیں عرب بھیج دیا گیا تھا۔ مکہ معظمہ میں ان کی وفات ہوئی۔ [4] کلیات نظم فارسی جو نولکشور کے مطبع میں چھپ رہی تھی [5] "برہان قاطع" کے رد میں غالب کی کتاب جو پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء میں چھپی تھی پھر "درفش کاویانی" کے نام سے بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ اسے ۱۸۶۵ء میں چھاپا گیا تھا۔ [6] شہاب الدین خاں ثاقب جنہیں مشہور شیخ طریقت سے اشتراک اسم کے باعث "سہروردی" کہا۔ [7] فارسی کا ایک شاعر [8] فارسی کا ایک شاعر۔

یہ شعر میرا پڑھ کر سنادو۔

گمان زلیست بود بر منت زبے دردی
بداست مرگ ولے بد تر از گمانِ تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے، وہ ستمگر شعر و سخن کا طالب ہے۔ زندہ ہوتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا؟ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھوالو اور تم اس زمین میں چند شعر لکھ کر بھیج دو۔ میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصائے پیر بجائے پیر۔ واللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ میرے پاس نہیں ہے۔ آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا وہ لکھ بھیجا۔ اب جو کچھ یاد آگیا، وہ لکھتا ہوں[ل]:

غزل

بامن کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست　　　در امرِ خاص حجتِ دستورِ عام چیست؟
مستم زخونِ دل کہ دو چشمم ازاں پُر است　　　گوئی مخور شراب و نہ بینی بجام چیست؟
با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام　　　داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست؟
ما خستۂ غمیم و بود مے دوائے ما　　　با خستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست؟
از کاسۂ کرام نصیب است خاک را　　　تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست؟

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست؟

دل بُرد و حق آن است کہ دلبر نتواں گفت　　　بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت
در رزمگہش ناچخ و خنجر نتواں بُرد　　　در بزمگہش بادہ و ساغر نتواں گفت
رخشندگیِ ساعد و گردن نتواں جست　　　زیبندگیِ یارہ و پرگر نتواں گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند　　　ہموارہ تراشد بت و آزر نتواں گفت

ل کلیات میں اس غزل کے دس شعر ہیں نیز چوتھے شعر میں "ما خستہ" کی جگہ "دل خستہ" ہے، باقی ذیل میں درج ہیں:

در روز تیرہ از شب تارم نہ ماند بیم　　　چوں صبح نیست خود چہ شناسم کہ شام چیست؟
با خیل مور مے رسی از رہ خوش است فال　　　قاصد بگو کز آں لب نوشیں پیام چیست؟
گفتی قفس خوش است، تواں بال و پر کشود　　　بارے علاج خستگی بند دام چیست؟
نیکی ز تست، از تو نخواہیم مزدِ کار　　　ور خود بدیم کار تو ایم، انتقام چیست؟

اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں، لیکن قرینہ یہی ہے کہ یہ ۱۸۶۲ء کا ہے۔ اس لیے کہ کلیات چھپنے سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور اس سے بعد کے خط میں گلہ دارد والے شعر کا حوالہ ہے۔ وہ جولائی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا تھا۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوئیم — با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت
ہنگامہ سر آمد، چہ زنی دم ز تظلم — گر خود ستمے رفت بہ محشر نتواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است — بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت
کارے عجب افتادہ بدیں شیفتہ ما را
مومن نہ بود غالبؔ و کافر نتواں گفت[1]

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی!
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
داغ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی!
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی![2]

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات؟ جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل — اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آئے تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے — کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے[3]

—(۲۲)—

لو صاحب، پرسوں تمہارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میر جان آئے۔ جب ان سے کہا گیا تو جواب پایا کہ ہیں مدت سے

---

[1] ایک شعر چھوٹ گیا [2] تین شعر چھوٹ گئے [3] تین شعر چھوٹ گئے۔

آمادۂ سفر لوہارو بیٹھا ہوں۔ حکیم صاحب کی گاڑی کی روانگی کے وقت میں نے اپنی گٹھڑی بھیجی تھی؛ وہ پھر آئی، اس مراد سے کہ گاڑی میں جگہ نہ گٹھڑی کی، نہ سواری کی۔ ناچار چپ ہو رہا۔ اب وہ گٹھڑی ویسی ہی بندھی ہُوئی رکھی ہے۔ جب میاں خاں اور وزیر خاں روانہ ہوں گے اور منشی امداد حسین مجھ کو اطلاع دیں گے، تو میں فوراً چل دوں گا۔ پا بر کاب ہوں۔ کل ہی آخر روز غلام حسن خاں آئے۔ کل انھوں نے چوتھے دن کھانا کھایا تھا۔ ہیضہ ہوگیا تھا۔ قے متواتر، دست پے بہ پے۔ غرض بچ گئے۔ کہتے تھے کہ آج جولائی کی ۷ ارتاریخ ہے۔ تیرہ دن یہ اور پانچ دن اگست کے اَور[1] نہیں جاسکتا۔ تنخواہ لے کر بانٹ بُونٹ کر ایک دن نہ ٹھہروں گا، لوہارو کی راہ لوں گا۔ مرزا شمشاد علی بیگ سے تمھارا پیام کہا گیا۔ بعید ہے جو غلام حسن خاں کے ہم سفر ہو جائیں۔ بھائی کی طرف سے منشی امداد حسین خاں کو لکھوا بھیجو کہ میاں خاں وغیرہ کے ساتھ استاد کو ضرور بھیجنا اور تم اپنی طرف سے اپنے ابن عم غلام حسن کو بحوالہ میری تحریر کے عیادت اور اوائل اگست میں روانگی کی تاکید لکھ بھیجو۔

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

یہ زمین قدسی رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آگئی ہے، میں اس میں کیوں کر تخم ریزی کروں اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں ؟

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار
بیجاست برادر اگر از من گلہ دارد

التوا شرب شراب ۲۲ جون، شروع شراب ۱۰ جولائی
المنۃ للّٰہ کہ در میکدہ باز است

جولائی ۱۸۶۲ء — غالب

—(۲۳)—

میری جان!

سُن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ[2] جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ، ایک مژہ بر ہم زدن مینہ نہیں تھما۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمھارے خط کا جواب ضرور۔ لو سنتے جاؤ۔ مرزا شمشاد علی بیگ کو تمھارا خط پڑھوا دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں، اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے، بس پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم[3] نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم ایک غزل لکھی بیت الغزل یہ:

---

[1] یہاں اَور بہ معنی مزید ہے۔ [2] آٹھ اتفاق سے تمام نسخوں میں حذف ہوگیا۔ غلطی بالکل واضح تھی، لیکن کسی کی توجہ تصحیح کی طرف نہ کی گئی۔ [3] غالب کے خسر الٰہی بخش خاں معروف۔

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربیؔ کا ہے اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں:

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مغربیؔ قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ ان کا کلام دقائق و حقائقِ تصوف سے لبریز۔ قدسیؔ شاہجہانی شعرا میں صائبؔ و کلیمؔ کا ہم عصر اور ہم چشم۔ ان کا کلام شور انگیز۔ ان بزرگوں کی روش میں زمین و آسمان کا فرق۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں، ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول، نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خاںؔ[1] نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرہ سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری[2] کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وُہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جُدا، چوکیدار جُدا، سود جُدا، مول جُدا، بی بی جُدا، بچے جُدا، شاگرد پیشہ جُدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گزارہ مشکل ہو گیا۔ روزمرّہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کو شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا: تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا: نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں[3] گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔

---

[1] خاں سے مراد بظاہر احمد بخش خاں مرحوم ہیں، جو الٰہی بخش خاں معروفؔ کے بڑے بھائی فیروز پور جھرکا اور لوہارو کے نواب تھے۔ [2] خاندانی پنشن جو کلکٹری کے خزانے سے ملتی تھی۔ [3] جلانا (بہ کسرِ جیم)، بہ معنی زندہ کرنا، جان بخشنا، زندہ رکھنا اور (بہ فتحِ جیم)، بہ معنے سوختہ کرنا، آگ لگانا۔ میرزا نے یہاں یہ لفظ اس طرح استعمال کیا ہے کہ دونوں معنی اس سے نکالے جا سکتے ہیں لیکن واضح معنی زندہ رکھنے کے ہیں۔

چونکہ بھائی صاحب نے وجہ موقوفی اور بحالی کی پوچھی تھی، ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا:

اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

دیکھا! ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ دریبہ کے بنیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشیں کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین ص کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت۔ اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ، ثم حسینؑ، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام:

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا، بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفویؐ و امامت مرتضویؑ اس میں جلیں۔ سنو، مولوی صاحب! اگر ہٹ دھرمی نہ کرو گے اور کتمانِ حق کو گناہ جانو گے تو البتہ تم کو یاد ہوگا اور کہو گے کہ ہاں یاد ہے، جن روزوں میں تم علاؤ الدین خاں[1] کو "گلستاں" اور "بوستاں" پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپانچے مارے ہیں۔ نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں۔ علاؤ الدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم باچشم پُر آب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں۔ تم نے بے جا کیا۔ آیندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشین[1] طفل سے گزر کر، پیر ہفتاد سالہ[2] کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فانوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے؛ "چوں پیر[3] شدی حافظ" اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعۂ نثر جدا گانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں:

صوفی بیا کہ آئنہ صاف است جام را　　تا بنگری صفائے مئے لعل فام را

شراب ناب خور و روئے مہ جبیناں بیں　　خلاف مذہب آناں جمال اینان بیں

---

[1] نواب علاؤ الدین　[2] غالب　[3] اس مضمون سے ظاہر ہے کہ حمزہ خاں نے نواب علاؤ الدین خاں کے خط میں میرزا غالب کو لکھوایا ہوگا، اب بوڑھے ہو گئے ہو شراب چھوڑ دو۔ ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہوگا:

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو　　رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست   نانِ حلال شیخ ز آبِ حرامِ ما

ساقی نگر وظیفۂ حافظ ز بادہ داد   کآشفتہ گشت طرۂ دستارِ مولوی

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں. محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں. پاخانہ ڈھے گیا ہے. چھتیں ٹپک رہی ہیں. تمھاری پھوپی[1] کہتی ہیں؛ ہائے دبی، ہائے مری. دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے. مَیں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں. چھت چھلنی ہے. ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے. مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی، جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں، جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو. برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ[2] اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے. تمھارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں، ایک یہ مروّت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی.

صبح یک شنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء   غالب

(۲۴)



مولانا علائی!

نہ مجھے خوفِ مرگ، نہ دعوائے صبر ہے. میرا مذہب بخلاف عقیدۂ قدریہ جبر ہے. تم نے میانجی گری کی، بھائی نے برادر پروری کی. تم جیتے رہو، وہ سلامت رہیں. ہم اسی حویلی میں تا قیامت رہیں.

اس ابہام کی توضیح اور اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ مینہ شدت سے برسا. چھوٹا لڑکا[3] کا ٹورنے لگا. اس کی دادی[4] بھی گھبرائی. مجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رویہ، اس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ درہ یاد تھا. جب تمھارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا. یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پسنہاری، ان فرقوں کا ممرّ[5] دروازہ رہے گا. میری اور بچوں کی آمد و رفت دیوان خانہ میں سے رہے گی. عیاذاً باللہ! وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں. اپنے بیگانے کو ہر وقت چھلپائیاں[6] نظر آئیں.

بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں، اب تمھاری پھوپی نے انھیں "وفادار بیگ" بنا دیا ہے، باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور ملنسار ہیں. رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں. جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں. ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں. ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی

---

[1] بیگم غالب [2] یعنی غالب، ان کی بیگم اور بچے [3] حسین علی [4] بیگم غالب [5] گزرگاہ [6] چھلپائی چڑیل کو کہتے ہیں اس لیے کہ عام خیال ہے چڑیلوں کے پاؤں پیچھے کی طرف ہوتے ہیں.

کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں"؛ (تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں) ہے ہے: ایسے عالی شان دیوان خانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت! معہذا اس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے کتب کے لیے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دُنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے؛ عرفت ربی بفسخ العزائم پڑھا اور چپ ہو رہا مگر تمھاری خاطر عاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت و خوف و خطر نہ رہے۔ مینہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے نہ بی بی گھبراتی ہے، نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات، ہوا سرد، تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا، ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لُطف، روشنی کا وہ عالم۔

۶ رماہ اگست سنہ ۱۸۶۲ء
غالب

(۲۵)

جانِ غالب، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان، قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے، خدا کا احسان۔ مرزا قربان علی بیگ تمھاری کشش کے مجذوب کیوں بنتے؟ وہ تو خود سالک[1] ہیں۔ مگر ہاں یہ صاحبزادہ سعادت مند رضوان[2]، سو اس کے آپ مالک ہیں۔ نواب صاحب کا ہم مطبخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہُوا، کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا ہوا[3]؟ اثنا عشری ایک تم ہو، سو تمھیں کیا اختیار ہے؟ البتہ عشرہ مبشرہ کی اولیت پر مدار ہے۔ باپ تمھارا خلاف قاعدہ اہل سنت و جماعت، عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا[4]۔ رضوان نے نہ مانا۔ کیونکر مانتا؟ وہ ثلثہ کا دم بھرتا تھا۔ تہور خاں صاحب کے باب میں بندہ جویا اس خبر کا ہے کہ اب لوہارو سے ان کا ارادہ کدھر ہے؟

رضواں کو دعا پہنچے۔ نواب صاحب کی عنایات اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو۔ پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ "تم خوب ہو؟" اور وہ کہتے ہیں "کیا کہنا" اور میں پوچھتا ہوں "کس کا؟" تو وہ فرماتے ہیں، "مرزا شمشاد علی بیگ کا!" "ایں اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے!" "واہ صاحب! میں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں؟ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غیب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟" "ہاں صاحب آپ ایسے ہی وضعدار ہیں، اس میں کیا ریب ہے[5]۔"

صبح سہ شنبہ۔ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۲ء
غالب

---

[1] سالک قربان علی بیگ کا تخلص تھا۔ اس کی رعایت سے مجذوب کا لفظ لائے۔ مراد یہ کہ تمھاری کشش انھیں نہ کھینچ سکی۔ اس کا بھائی شمشاد علی بیگ رضوان پہنچ گیا [2] شمشاد علی بیگ رضواں لفظ سالک کی رعایت بھی واضح ہے [3] یعنی کھانا تو تمھارے ساتھ کھانے لگا، لیکن تنخواہ کیا ٹھہرائی؟ [4] مطلب یہ کہ علائی بارہ روپے تنخواہ دلانا چاہتے تھے پھر دس سے ابتدا کی، لیکن امین الدین احمد خاں نے سات روپے سے شروع کرانا چاہی۔ [5] یہ مکالمہ ہے اور میں نے کاما لگا کر اقوال الگ الگ کر دیے ہیں تاکہ مکالمے کے سمجھنے میں دقت نہ رہے۔

(۲۶)

میاں! تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو، جو احیا سے مرسوم و معمول ہیں[1]۔ خیر تمہارا حکم بجالایا۔ غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ جناب لفٹنٹ[2] گورنر بہادر نے دربار کیا۔ میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر لطف و عنایت میری ارزش و استحقاق سے زیادہ، بلکہ میری خواہش اور تصور سے سوا مبذول کی۔ اس ہجوم امراض جسمانی اور آلام روحانی کو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ہردم، دم نزع ہے۔ دل غم سے خونریز ہوگیا ہے کہ کسی بات سے خوش نہیں ہوسکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔ کئی دن سے کوئی تحریر دل پزیر تمھاری نظر نہیں آئی۔ نہ مجھے تم نے یاد کیا، نہ اپنے بھائی کو کچھ لکھا۔ اب اس کا جواب جلدی لکھو۔ پہلے اپنے بچوں کا حال، پھر وہاں کے اوضاع، جیسا تمہارا قاعدہ ہے، منقح اور مفصل لکھو۔ فقط

مارچ ۱۸۶۳ء نجات کا طالب، غالب

(۲۷)

اقبال نشانا!

بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہارو پہنچنا مبارک ہو۔ مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع "اکمل المطابع"[3] میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آجکل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اور اس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔ بچوں کو دعا۔

۱۸۶۳ء غالب

(۲۸)

ولیعہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

اس امر فرخ و ہمایوں کی شہرت میں کوشش بے حوصلگی ہے اور اس کے اخفا میں مبالغہ خفقانیت۔ تم اپنی زبان پر نہ لاؤ، اگر کوئی اور کہے، مانع نہ آؤ، نہ اشتہار، نہ استتار[4]۔

دورہ ہوا مگر مدت معینہ کے بعد اور پھر جاگ نہ آنا اور تمہارے پکارنے سے متنبہ ہوجانا ماقبے کی کمی کی علامتیں

---

[1] یعنی زندوں سے عمل میں آتے ہیں [2] یعنی سر رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب کا دربار جو ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔
[3] اکمل المطابع کے مالک حکیم غلام رضا خاں تھے، منشی بہاری لال مشتاق جو غالب کے عزیز شاگرد تھے اس مطبع میں کام کرتے تھے وہی اکمل الاخبار کے نام سے ایک اخبار بھی نکالتے تھے۔ [4] یعنی نہ اعلان کرانا مناسب ہے نہ چھپانا۔ مطلب یہ کہ والد کی علالت کے باعث دونوں کو ریاست کا انتظام سونپ دیا گیا۔

ہیں۔ شدت میں جس قدر خفت ہو غنیمت ہے۔

میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا، تمھارے حسن طبع پر تم سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزا ہُوا۔ اگر بے مزگی کی وجہ لکھوں تو شاید ایک تختہ کاغذ کا سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجز و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہے اور شہرت تمھارے منافیِ طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصّہ تمام ہُوا، اور اگر ان کے تلف ہونیکا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ، چاہو بسبیل پارسل ارسال کرو، لیکن خدا کے واسطے کہیں غصّہ آ کر عطائے تو بلقائے تو کہہ کر اصلی خطوط نہ بھیج دینا کہ یہ امر میرے مخالف مقصود ہے۔ بھلا صاحب، ڈرتا ہُوں میں تم سے، ادھر خط پڑھا ادھر جواب لکھ کر ڈاک میں بھیجا۔ تمھارا خط رہنے دیا۔ جب آغا شمشاد علی بیگ آئیں گے، پڑھ لیں گے۔

سنہ ۱۸۶۳ء ‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏ غالب

—(۲۹)—

لا موجود الا اللہ۔ اس خدا کی قسم جس کو میں نے ایسا مانا ہے اور اس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانا ہے کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہِ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سُست پا کر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے۔ اپنا نفع نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ تیس رقعے ایک جگہ سِنے لے کر اُن کو بھیجے۔ اُس کی رسید میں تقریباً انھوں نے طلبِ رقعات بہ تکلّف سوداگر لکھی اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہر اکتابیں لے کر کہیں گیا ہوگا یا کتابیں لینے گیا ہوگا۔ یہ تیئیس لفافے اور چونتیس خط بدستور میرے بکس میں محفوظ رہیں گے۔ اگر متوسط بتقاضا طلب کرے گا، ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا، ورنہ تمھارے بھیجے ہُوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔

میاں ان خطوط کے ارسال میں تم نے مجھ سے وہ کیا جو میں نے تم سے دو جانہ میں کیا تھا۔ بھلا میں تو پیر خرِفت[1] ہوں اور سن خرافت کو نسیان لازم ہے، تم نے کیا سمجھ کے کپڑا لپیٹ کر مختم[2] کر کے بھیجا؟ خطوں پر ایک قلیل العرض کاغذ لپیٹ کر ارسال کیا ہوتا۔ اگر منشی بہاری لال مہرؔ اور شہاب الدین کا دوست نہ ہو تو پچاس روپے کا مجھ کو دھپا لگتا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

صبح شنبہ ۳۰ مئی سنہ ۱۸۶۳ء ‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏ غالب

—(۳۰)—

بداست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

---

[1] حواس باختہ [2] مہر لگا کر۔ پارسل کپڑے میں لپیٹ کر، مہریں لگا کر بھیجنے پر جرمانہ ہوتا تھا، لیکن چونکہ منشی بہاری لال، غالب، اور شہاب الدین احمد خاں کے دوست تھے اس لیے کوئی پرسش نہ ہُوئی۔

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔

مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون سی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو منفرد بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، اژند کی قسم[1]، اوستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں:

بر ہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

جب میں دس پندرہ جلدیں منگا لوں گا، ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغاں بھیجوں گا اور اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں اودھ اخبار کا مطبع، مالک اس کا منشی نولکشور مشہور، جتنی جلدیں چاہیں لکھنؤ سے منگا لیں۔ میں بہرحال دو جلدیں جس وقت متوقع ہوگا، بھیج دوں گا۔

۱۱، جون ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب، غالب

(۳۱)

میری جان!

مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمھارے بیک مشت ان کو دیے۔ اب تمھارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے۔ رسید کا البتہ مجھے انتظار رہے۔ علی حسین خاں سے آنے کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت پوچھی گئی۔ جواب پایا کہ ایک مہینے اور دس دن کی رخصت لے کر آیا ہوں۔ بی بی بیمار ہے، اس کا استعلاج منظور ہے۔ میری جان علی حسین کے کام آئے تو دریغ نہ کروں۔ بھلا یہ مبالغہ سہی بلکہ بے شک تبلیغ و غلو ہے، لیکن قریب قریب اس کے یعنی جو چیز امکان سے باہر نہ ہو، اس میں قصور کیوں کر کیا جائے گا؟ بلکہ شاید تمھاری سپارش کی بھی حاجت نہ ہو مگر سوچو کہ آئین غمخواری و اندوہ گساری کیا ہوگا۔ میرزا بد وضع و بدروش نہیں کہ پند و بند کا محتاج ہو۔ کوئی اس کا مقدمہ کسی محکمہ میں دائر نہیں کہ مصلحت و مشورت کی احتیاج ہو۔ رہے امور خانگی یعنی بی بی اور اس کے آبا و اخوات کے معاملے، ان میں نہ تم کو دخل، نہ مجھ کو مداخلت۔ تم علی حسین خاں کو اس پیوند پر کیا چھیڑتے ہو اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا دادا کتنا بڑا آدمی تھا اور اس کے دادا کی اور اس کی سسرال ایک ہے۔ یہ ذریعۂ فخر ہے اس کو اور اس کے طفیل سے تم کو بلکہ تھوڑی سی نازش اگر مجھ ننگ اقربا کے حصّے میں بھی آ جائے تو کچھ بعید نہیں۔

ہرچند تمھارا ہر کلمہ ایک بذلہ ہے لیکن اس "خسر" و "خسروانی" نے مار ڈالا۔ کیا کہوں جو مجھ کو مزا ملا ہے۔ کہاں "خسرو" "خسران" لغات عربی الاصل اور کہاں روزمرّہ مشہور کہ خسر سسرے کو کہتے ہیں۔ صنعت اشتقاق و طباق کو کس سینہ زوری سے برتا ہے۔ اچھا میرا میاں، یہ خسر بمعنی پدر زن کیا لفظ ہے؟ حروف بین الفارسی والعربی مشترک ہیں؛ لیکن ان معنوں میں نہ فارسی ہے، نہ عربی ہے۔ فارسی میں پدر زن بہ فک اضافت کہتے ہیں۔ عربی میں خسر جس طرح بمعنی نقصان لغت منصرف ہے، شاید سسرے کا

---

[1] ژند پارسیوں کی مذہبی کتاب اور پاژند اس کی تفسیر۔ اوستا بھی پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے۔





اسم جامد بھی ہو یا فی الحقیقت سسرے کی تفریس و تعریب ہو۔ یہ پرسش نہ بہ سبیل استہزا ہے، بلکہ یوسف علی خاں عزیز مانند اس دہقان کے کہ جو دانہ ڈال کر مینہ کا منتظر ہو اور ابر آئے اور نہ برسے، مضطر و حیران ہے۔ علی حسین خاں آتے ہیں، آئے۔ وہ آئے تو کیا لائے۔

یک شنبہ ۳۰ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۶۳ء — غالب

(۳۲)

صاحب!

میں از کار رفتہ و درماندہ ہوں۔ آج تمہارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ لفظ "خسر" کے باب میں اتنی توضیح کیا ضرور تھی۔ میرا علم لغات عربیہ کا محیط نہیں اور بہ طریق حق الیقین جانتا ہوں کہ "خسر" لغات فارسی نہیں۔ سسرے کی تفریس سے خسر پیدا ہوا ہو، کیا عجب ہے۔ تم سے اس کی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عربی الاصل نہ ہو، وہ معلوم ہوا کہ عربی نہیں، لغت ہندی ہے اور یہی تھا میرا عقیدہ۔

علی حسین خاں آئے۔ دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ آ سکتے ہیں، نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیبِ دشمناں وہ لنگڑے، میں لولا۔ ان کے پاؤں کا حال مفصل تم کو معلوم ہوگا۔ جونکیں لگیں، کیا ہوا، کہاں تک نوبت پہنچی۔ میری حقیقت سنو، مہینے بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا، بائیں پاؤں میں درم، کفِ پا سے پشتِ پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس[1]۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر، اٹھا رو ٹی کھانے محل سرا نہ گیا، کھانا یہیں منگا لیا۔ پیشاب کو کیونکر نہ اٹھوں؟ حاجتی رکھ لی، لگیر اوکڑو بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پاخانے کو اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں، مگر جاؤں تو سہی۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی۔ آغاز فتق[2] مزید علیہ یا مستزاد،

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے:

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

زائد بے فائدہ۔

جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء — مرگ کا طالب، غالب

(۳۳)

جانا عالی شانا!

پہلے خط اور پھر بتوسط برخوردار علی حسین مجلد کلیات فارسی پہنچے۔ حیرت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب اور چار آنے محصولڈاک،

---

[1] ورم، سوجن [2] فوطوں کی ایک بیماری

قالب الانطباع میں آ کر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے، خبر جہاں سو وہاں سوا سو۔ میرا حال تمھیں اور تمھارا حال مجھے معلوم ہے۔

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس روپے تمھارے پاس پہنچ جائیں گے۔ ان شاء اللہ العلی العظیم۔ میں بے حیا تھا نہ مرا، اچھا ہونے لگا۔ عوارض میں تخفیف ہے۔ طاقت آتی چلی ہے۔ مختصر مفید:

در نامہ جز این مصرع شاعر چہ نویسم

اے وائے ز محرومی دیدار و دگر ہیچ

صبح یک شنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء — نجات کا طالب، غالب

(۳۴)

اقبال نشان مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو غالب گوشہ نشین کی دعا پہنچے۔ برخوردار علی حسین خاں آیا، مجھ سے ملا۔ بھائی کا حال اس کی زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ الولد سر لابیہ تم اس کے مصداق کیوں بنے؟ خفقان و مراق اگرچہ تمھارا خانہ زاد موروثی ہے، لیکن آج تک تمھاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا۔ اب کیوں آیا؟ اگر آیا تو ہرگز اس کو ٹھہرنے نہ دو، ہانک دو۔ خبردار، اس کو اپنے پاس نہ رہنے دینا۔

شفیق مکرم لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے، گویا بجائے خود قران السعدین ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار یعنی قبول کی یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپے آٹھ آنے ہوئے۔ گویا بتیس روپے آٹھ آنے میں دوں اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو۔ ہمگی پینسٹھ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارھویں کو طالب ہوں گا۔ کہو بتیس روپے آٹھ علی حسین کو دے دوں، کہو لکھنؤ بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلدی لکھو۔

بھائی صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور استاد میر جان کے میری طرف سے قدم لینا۔

۱۲، جمادی الثانی سال غفر (سنہ ۱۲۸۰ھ) مطابق ۳، دسمبر سال "کیا غضب ہے ہے" (سنہ ۱۸۶۳ء) یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن[1] صاحب بہادر کی ہے۔

(نجات کا طالب، غالب)

(۳۵)

مولانا علائی!

زاللہ، علی حسین خاں کا بیان بمقتضائے محبت تھا، ہر بار کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ حق بجانب ان کے ہے۔ نہ کوئی

---

[1] ہندوستان کا وائسرائے، جس نے سنہ ۱۸۶۳ء میں بہ مقام دھرم سالہ وفات پائی۔

ہم سخن، نہ کوئی ہم نفس، نہ سیر، نہ شکار، نہ مجلس، نہ دربار۔ تنہائی و بے شغلی اور بس۔ جی کیونکر نہ گھبرائے؟ خفقان کیونکر نہ ہو جائے؟ نہ دن یاد، نہ تاریخ، آج چوتھا یا بھائی ستا یا بھول گیا ہوں، پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور لبسواری ڈاک راہگرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یک شنبہ ۱۳ دسمبر کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب، میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا: "اگر میں دنیا دار ہوتا، تو اس کو نوکری کہتا، مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں، تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار یعنی سات سو پچاس روپے سرکار انگریزی سے پاتا ہوں، بارہ سو روپے رام پور سے، چوبیس روپے سال ان مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے، مگر ہاں، اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع پہنچا دیا کرتا ہوں۔ تیئیس روپے آٹھ آنے جو میں نے پوچھے تھے کہ علی حسین خاں کے حوالے کروں۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ ارسال بسبیل ہنڈوی دشوار ہے۔ خیر، اب جس طرح ہوگا، حصار پر ہنڈوی لکھوا کر تم کو بھیج دوں گا۔ تم حصار پہنچ کر روپے منگوا لیجیو۔ خدا چاہے تو دسمبر میں روپیہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔

استاد میر جان صاحب کو قدم بوس کہنا کہ مجھ کو فرعون بننا پڑا۔ دہائی خدا کی، اب ایسا نہ کروں گا۔ میرا سلام، بلکہ دعا ان کو کہہ دینا۔

پرسوں مولوی صدرالدین خاں صاحب کو فالج ہو گیا تھا، سیدھا ہاتھ رہ گیا ہے، زبان موٹی ہو گئی ہے۔ بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔ میں ایا بیج ہوں جا نہیں سکتا، جو ان کو دیکھ آتا ہے اس سے ان کا حال پوچھا جاتا ہے۔ دن، تاریخ سدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ گے[۱]

یک شنبہ ۱۳۔ دسمبر ۱۸۶۳ء

—— (۳۶) ——

علائی مولائی کو غالب طالب کی دعا۔ بیچارے مرزا[۲] کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہو گیا۔ یہاں پندرہ کا سوال، وہاں دس میں سے تین کم کرنے کا خیال۔ متوسط دوسرا جو علی حسین خاں بہادر کے بعد درمیان آئے، وہ کیا کرے اور کیا کہے؟ مرزا قانع و متوکل ہیں۔ نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس۔ اللہ بس ماسوا ہوس[۳]۔ جناب ترولین[۴] صاحب، بھائی کے دوست دلی آئے۔ لارڈ صاحب کہلاتے ہیں۔ سنتا ہوں کہ کل اکبر آباد جاتے ہیں۔ بھائی علی بخش خاں[۵] مدت سے بیمار تھے، رات بارہ پر دو بجے

---

[۱] اس فقرے کی ترتیب میں جو خوبی ہے وہ ظاہر ہے۔ یعنی غالب بمعنی گمان قوی استعمال ہوا ہے لیکن ساتھ ہی نام بھی بتا دیا۔ تاریخ میں نے بہ نظر یکسانی ترتیب آخر میں رکھی ہے۔ [۲] شمشاد علی بیگ رضوان۔ [۳] یہ بحث خط نمبر ۲۵ میں آ چکی ہے۔ [۴] غالباً سر چارلس ٹریولین (CHARLES EDWARD TREVELYEN) مراد ہے جو ۱۸۲۶ء میں ہندوستان آیا، کئی برس دہلی میں اسسٹنٹ کمشنر رہا۔ جنوری ۱۸۶۳ء میں سپریم کونسل کا رکن مالیات بنا۔ اس نے لارڈ میکالے کی بہن سے شادی کی تھی۔ [۵] غالب کے نسبتی بھائی۔

مر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط

تمھارے عم نامدار آج دن کے بارہ بجے سلطان جی[1] گئے ہیں، میں نہ جاسکا۔ تجہیز و تکفین ان کی طرف سے عمل میں آئے گی۔ اور پونے تین بجے یہ خط میں نے تمھیں لکھا ہے۔ کل شنبہ ۲ جنوری کو ڈاک گھر بھیج دوں گا۔ مشفقی میر جان صاحب کو سلام مع الاکرام۔

یکم جنوری ۱۸۶۴ء
نجات کا طالب، غالب

(۴۷)

میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سُن۔ میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں۔ جہاں ایک امر کی ابتدا دیکھی، یہ جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس بدایت کے نہایت پذیر[2] ہوگا۔ یہاں اختلاف طبائع کا وہ حال کہ آغاز مغشوش، انجام مخدوش۔ مبتدا خبر سے بیگانہ، شرط جزا سے محروم، سُنا اور متواتر سُنا کہ قضیہ طے ہوگیا۔ اب علاؤالدین خاں مع قبائل[3] آئیں گے۔ دل خوش ہُوا کہ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے نتائج کے دیکھوں گا۔ پرسوں آخر روز بھائی پاس گیا۔ اثنائے اختلاط و انبساط میں میں نے پُوچھا کہ کہو بھئی علاؤالدین خاں کب آئیں گے؟ جواب کچھ نہیں۔ "اجی وہ قضیہ تو طے ہوگیا؟" "ہاں وہ تو روپیہ میں نے دے بھی دیا۔" میں نے کہا تو اب چاہیے کہ وہ آئیں۔ فرمایا کہ "شاید ابھی نہ آئے۔"

معلوم ہُوا کہ خیر، ٹھینگا باجا



ناچار ارادہ کیا کہ جو کچھ کہنا تھا اب میں لکھ کر بھیجوں۔ پرسوں تو شام ہوگئی تھی۔ کل بغلگیر ہونے والوں نے دم نہ لینے دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ثاقب نے کہا کہ بھائی تم سے شاکی ہیں۔ اب ضرور آپڑا کہ گزارش مدعا سے پہلے تمھارے رفع ملال میں کلام کروں۔

بھائی، تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو۔ اگر میرا صلبی بیٹا اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو میں اس کو اپنا یار وفادار اور ذریعۂ افتخار جانتا۔ میرے خطوط کے نہ پہنچنے کا گلہ غلط۔ تمھارا کونسا خط آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصد ضروری فراہم تھے، وہ میں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب تم آتے ہو، زبانی گفت و شنید ہو جائے گی۔ ثاقب نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ تب مجھے توطیہ و تمہید میں ایک ورق لکھنا پڑا، ورنہ آغاز نگارش یہاں سے نہ ہوتا۔

یا اسد اللہ الغالب

با من از جہل معارض شدہ نا منفعلے
کہ گرش ہجو کنم ایں بودش مدح عظیم

یہ رسالہ موسوم بہ "محرق قاطع برہان" جو ثاقب نے تم کو بھیجا ہے، میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے

---

[1] حضرت شیخ نظام الدین کے مزار کے آس پاس کی جگہ کو سلطان جی کہتے ہیں۔ [2] یعنی مطابق اس آغاز کے انتہا کو پہنچے گا۔
[3] یعنی بال بچے۔

میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معاینے کے وقت اس کتاب کی بے ربطی عبارت پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر نظر نہ کرو۔ بیگانہ وار دیکھو اور از روے انصاف حَکَم بنو، بے حیف و میل۔

اس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں، اس پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی، شدتِ اطنابِ مُمل[1] کی، صورت سوال دیگر جواب دیگر، ان باتوں کو مطمح نظر کرو، بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو ان مراتب کو الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوست روحانی کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے، ان ہفوات کا خاکہ اڑا رہا ہے۔ نیرِ رخشاں نے اس کو مدد دی ہے۔ تم بھی بھائی، مدد دو۔

اور وہ امر مبہم کہ جو تمھارے والد کی تقریر سے دل نشین نہیں ہُوا یعنی قصہ چک جانا اور دلی آنا، اس کا ماجرا مفصل و مشرح لکھو۔

دن، تاریخ، اپنا نام، آغازِ کتابت میں لکھ آیا ہوں۔ اب ارسال جواب کی تاکید کے واسطے اور کیا لکھوں۔ فقط

چہار شنبہ ۱۸ ارمئی سنہ ۱۸۶۴ء۔ بقولِ عوام باسی عید کا دن، صبح کا وقت۔

(۳۸)

اے میری جان!

مثنوی "ابر گہر بار"[2] کون سی نکتہ تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا؟ کلیات میں موجود ہے۔ معہذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی، میں مکرر کیا بھیجتا۔ "تپ محرق"[3] کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ اگر منافی طبع تحریر کو بسبب انزجار[4]، نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوط کہاں سے موجود ہوتیں؟

"افسوس" کہ میں نے عربی جانا، عربی نہیں۔ اب مانا، یہ ایک سہو طبیعت تھا۔ میرا اعتراض تو غلط مبحث پر ہے۔ "افسوس" و "فسوس" ایک کیوں ہو جائے؟

یہاں کے اطوار مجھ سے باوجود قرب مخفی اور تم پر بایں ہمہ بُعد آشکارا۔ دُوراں باخبر در حضور و نزدیکاں بے بصر دور۔ روپیہ آگیا۔ دل سے نکلا، مخزن سے نکلا، ہاتھ سے نہیں نکلا۔ جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائے گی اور یہ گنبد کٹ جائے گا، تب ترساں ترساں پیشگاہ نادری میں تمھارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دنوں

۱؎ ایسی طوالت جو دگیر کردے۔ غالب نے نظم میں بھی یہ ترکیب استعمال کی ہے۔

لغو و حشو و ادعاے محض و "اطنابِ مُمل"

مور و موش و سوسمار و گربہ یکجا کردہ است

۲؎ غالب کی ایک ناتمام مثنوی جس میں غزوات نبوی کو نظم کرنا مقصود تھا لیکن اس کے صرف مقدمات ہی مکمل ہُوئے۔ یہ کلیات نظم فارسی میں چھپ چکی ہے لیکن اس مثنوی کو ایک مرتبہ علیحدہ بھی چھپایا گیا تھا۔ ۳؎ یعنی محرق قاطع مؤلفہ مولوی سعادت علی ۴؎ یعنی دیکھنے سے طبیعت کا گریز کرنا اور راضی نہ ہونا۔

مردود بھی ہوں۔ والسلام:

صبح دم بابا ابوالبشر گفتم — پارۂ زر بدہ کہ زر داری
حیف باشد کہ از چو من پسرے — خاک رنگیں عزیز تر داری
گفت حیف است از تو خواہشِ زر — کہ تو گنجینۂ گہر داری
گنج وانِ سخن حوالۂ تست — خود بہ بین تا چہ اے پسر داری
پیش من زر کجاست جان پدر — بری ہر چہ در نظر داری
گفتم اینک بہ بند پیمانے — زر من مے دہی، اگر داری
سرِ زنبیل آں عمرو عیار — گر ز عیار ریش خبر داری
بکشا زود و زر بریز و بگوے — کہ ہمیں مدعا مگر داری
گفت، بابا فسانہ بودہ است — چہ فرو ریزم و چہ بر داری

دوشنبہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء

(۳۹)

علائی مولائی، غالب کو اپنا دعاگو اور خیر خواہ تصور کریں۔ مادہ ہائے تاریخ کو نہ آپ قالب نظم میں لائیں اور نہ اور کو اس امر منکر کی تکلیف دیں۔ بھائی سمجھو۔ یزید پر لعن عبادت سہی لیکن کہہ دیتے ہیں کہ " بر یزید لعنت "۔ کسی مومن نے اس کی ہجو میں قصیدہ نہیں لکھا۔

ابداع مادہ ہائے تاریخ[1] تمہارے حسنات میں لکھا گیا ہے۔ مثاب[2] تم ہو چکے، اجر پاؤ گے ان شاء اللہ۔ اب اپنے کو بدنام اور کسی کو ملول اور عداوت کو ظاہر اور اگر ظاہر ہو تو محکم نہ کرو۔

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے اونہتر واں برس شروع ہوتا ہے۔ اس نے ۶۶ برس کی عمر پائی۔ تہ تحریر و تقریر کا آدمی تھا، اکبر آباد میں میور[3] صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان[4] کے ساتھ لارڈ لیک[5] صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر[6] سے جو محاربات ہوئے، ان میں شامل رہا ہوں، بے ادبی ہوتی ہے، ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں، تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے، جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔

---

[1] تاریخ کے نئے مادے پیدا کرنا [2] مستحق ثواب [3] سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) ۱۸۳۶ء میں سول سروس میں بھرتی ہو کر آیا۔ یوپی میں پہلے سکرٹری رہا، پھر بورڈ آف ریونیو کا ممبر اور آخر میں گورنر بنا۔ [4] نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکا و لوہارو۔ [5] انگریز جرنیل جس نے ۱۸۰۳ء میں علی گڑھ، دہلی اور آگرہ مرہٹوں سے چھینے۔ [6] جسونت راؤ ہلکر جس نے ۱۸۰۵ء میں انگریزوں سے صلح کر کے اندور کی ریاست لے لی تھی۔

وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی، اُن[1] کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب، ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار پانچ برس کے ہوگے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔

خدا ایش بیامرزاد و بدیں دروغہائے بے نمک مگیراد۔

شنبہ ۱۰ر جولائی ۱۸۶۴ء غالب

(۴۰)

اجی مولانا علائی!

نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے اور یہ ہیں خبر تراشی نہیں کرتا، مرزا علی محمد بیگ کی زبانی ہے کہ نواب علاؤ الدین خاں سے کہہ چکے کہ قصہ مٹ گیا ہے، اب تم شوق سے دلّی جاؤ۔ دو ہفتے سے لے کر دو مہینے تک کی تم کو رخصت ہے، پھر تم کیوں نہ آئے؟ خدا نے دعا، خداوند[2] نے استدعا قبول کی، تمہاری طرف سے سست قدمی اور دل سردی کی کیا وجہ؟ اگر حاکی[3] کی حکایت جھوٹ ہے تو تم سچ لکھو کہ ماجرا کیا ہے؟

مرزا یوسف علی خاں عزیز تمہارے بلائے ہوئے اور مہدی حسین بھائی صاحب کے مطلوب، مرزا عبدالقادر بیگ کے قبائل کے ساتھ کل روانۂ لوہارو ہوئے۔

شنبہ ۱۷ر ستمبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب، غالب

(۴۱)

مرزا علائی مولائی!

نہ لاہور سے خط لکھا، نہ لوہارو سے۔ بقدر مادۂ حق محو انتظار، بلکہ امیدوار رہا۔ اب جو کسی طرح کی توقع نہ رہی تو شکوہ طرازی کا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ ایک شکوہ کے دفع میں "طوطی نامہ" برابر ایک رسالہ لکھو گے اور ہزار وجہیں موجہ بیان کرو گے۔ میں اس تصور کا مزہ اٹھا رہا ہوں کہ دیکھوں کیا لکھتے ہو۔

دادی صاحبہ سے لکھوانا، پھوپی صاحبہ سے لکھوانا، غالب سے لکھوانا، بعد حصول اجازت نہ آنا۔ اس کے بھی کچھ معنی ہیں یا نہیں؟ اچھا میرا میاں، کچھ اس باب میں لکھ۔ چھڑی اور دو دو، ایک مندیل اور ایک سیلا یا کوئی اور چیز مبارک۔ بچوں کو میری دعا کہنا اور ان کی خیر و عافیت لکھنا۔ استاد میر جان صاحب کو سلام۔ مرزا تو جب ملے گا کہ تم دِلّی آؤ اور اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامۂ انجمن کا حال بیان کرو۔

چہار شنبہ ۳۰ر نومبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب، غالب

---

[1] یعنی علی بخش خاں کو [2] نواب امین الدین احمد خاں [3] حاکی: حکایت کرنے والا [4] مجروح

(۴۲)

میری جان!

تمھارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا۔ اگر سرنوشت آسمانی میں بھی اواخر رجب یا اوائل شعبان میں ہمارا تمھارا مل بیٹھنا مندرج ہے تو زبانی کہہ سُن لیں گے۔ قلم کو ان اسرار کی محرمیت نہیں ہے۔ جو شخص اپنے ملک و مال و جان و ننگ و نام کے امور میں آشفتہ و سرگرداں بلکہ عاجز و حیران ہو، دوسرے کو اس سے کیا گلہ؟ ہائے نظیری:

با ما جفا و ناخوشی با خود غرور و سرکشی
از ما نہ ای از خود نہ ای آخر از آن کیستی

محل عقل و ہوش دماغ، سو تباہ، افیون کا مخمر ہو جانا علاوہ۔ اللہ جو چاہے سو کرے۔ ایسا پیارا باغ و بہار، بھائی، یوں بگڑ جائے۔

۹۔ رجب ۱۲۸۱ھ، ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء — نجات کا طالب، غالب

(۴۳)

لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔ ان کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہو گئے۔ کل ان کی چھٹی[1] ہو گئی آپ شریک نہ ہوئے۔

اے وائے ز محرومی دیدار و دگر ہیچ



میاں، خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزہ کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں، اللہ اس کو جیتا رکھے۔ اس کا داغ مجھ کو نہ دکھائے۔ یا رب اس کو صحت دے! یا رب اس کی عمر بڑھا دے! تین بچے۔ ایک اب پیدا ہونے والا ہے، یا رب اس کو اولاد کے سر پر سلامت رکھ۔

۷ شعبان ۱۲۸۱ھ، ۵ جنوری ۱۸۶۵ء — نجات کا طالب، غالب

(۴۴)

میری جان! ناسازی روزگار و بے ربطی اطوار، بطریق داغ بالائے داغ، آرزوئے دیدار۔ وہ دو آتش شرارہ بار اور یہ ایک دریائے ناپیدا کنار۔ وَقِنَا رَبَّنَا عذاب النّار۔

خدا نے بھائی ضیاء الدین خاں کے بڑھاپے پر اور میری بیکسی پر رحم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بواسیر خونی، زحیر[2]، تپ، صداع، بارے اب من کل الوجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جائے گا۔ آگے کون قوی تھے کہ اب ان کو ضعیف کہا جائے؛ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا "ہائے بڑھاپا"۔ ادھر ادھر دیکھا، جب جانا کہ کوئی نہیں ہے کہتا ہوا بڑھا کہ "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے"! والسلام

جنوری ۱۸۶۵ء — غالب مستہام[3]

---

[1] یعنی رجب ختم ہو گیا۔ شعبان کے مہینے کی چھٹی تاریخ ہے۔ [2] پیچش [3] سرگشتہ و حیران

(۴۵)

میری جان !

نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمھاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے[1]۔ ثاقب اس کو عزیزا اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تاکہ احتمال رفع ہو۔ خط ثاقب کے نام کا۔ توبہ توبہ خط کاہے کو ایک تختہ کاغذ کا۔ میں نے سراسر پڑھا۔ لطیفہ و بذلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان حبب کرتا کہ فحوائے عبارت سے خونِ جگر نہ ہو جاتا۔ بھائی کا غم جدا، ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور، ایسا عیار طرار! یوں عاجز و درماندہ واز کار رفتہ ہو جائے! تمھارا غم جدا، ساغرِ اول و دُرد۔ کیا دل لے کر آئے۔ کیا زبان لے کر آئے۔ کیا علم لے کر آئے، کیا عقل لے کر آئے؛ اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے۔ کسی شیوہ کی داد نہ پائی۔ گویا نظیری تمھاری زبان سے کہتا ہے:

جوہرِ بینش من در تہ زنگار بماند ‏ ‏ ‏ ‏ آنکہ آئینۂ من ساخت، نہ پرداخت دریغ

بھائی اس معرض میں، میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد[2] ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست[3] پائی نہیں۔ آپ ہی کہا۔ آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی[4] میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار ایک، ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ[5] کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے[6]۔

نہ بستاں سرائے، نہ میخانہ ‏ ‏ ‏ ‏ نہ دستاں سرائے نہ جانانہ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط ‏ ‏ ‏ ‏ نہ غوغائے رامشگراں در رباط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا، لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمھارا خالق تمھاری اور تمھارے بچّوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔

صبح دوشنبہ شانزدہم از مہ صیام ۱۲۸۱ھ (۱۳ر فروری ۱۸۶۵ء)

---

۱ لڑکی ہے یا لڑکا؟ ۲ ہم درد سے مراد غمگسار نہیں بلکہ جو درد تمھیں ہے وہی مجھے ہے ۳ جیسے پانی چاہیے تھی ۴ جمع داعیہ یعنی ارادے، آرزوئیں۔ ۵ قدرت ۶ منشی مہیش پرشاد نے یہاں "آئے" کی جگہ "آؤں" بنایا ہے لیکن ترمیم کی مناسبت سمجھ میں نہ آئی دنیا کے میزبان بننے سے صاف ظاہر ہے کہ غالب لوگوں کو کھلانا اور ضروریاتِ زندگی سے فارغ کرنا چاہتے تھے "خود بھوکا ننگا نظر نہ آؤں" میں نہ داعیہ ایثار و کرم ہے نہ شانِ میزبانی۔ یہاں "آئے" ہی صحیح ہے۔

(۴۶)

صاحب!

کل تمھارا خط پہنچا، آج اُس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ رجب بیگ، شعبان بیگ، رمضان بیگ یہ نامور مہینے ہیں، سو خالی گئے[1]۔ شوال بیگ آدمی کا نام نہیں سُنا۔ ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے۔ پس جب عید ہے اور روز سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ بخلاف شہورِ ثلاثۂ ماضیہ اِس مہینے میں تم آسکو۔ ہے ہے، میں تو کہتا ہوں نہ آسکو۔ اس ماہ مبارک میں امضاے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی عید کوسہ برنشیں[2] کا گماں گزرے۔ دُور کیوں جاؤ ہولی کی دھلینڈی[3] کا ساں نوہاروں میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑی دُھوم سے نکلے۔ حسن اتفاق یہ کہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور "عید کوسہ برنشین" کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے کوسہ برنشیں اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر میں چند روز اور ستمکش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں۔ تو کوسہ برنشیں اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے اور خرسوار ہو کر بضرب تازیانہ دوڑا لے۔

علاؤالدین خاں! واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے۔ اے ظالم! اِس کوسہ برنشیں کی داد دے۔ عقل، کرامت ہے، الہام ہے، لطفِ طبع ہے، کیا ہے؟ یہ اسم کس قدر مناسب مقام ہے۔

صبیہ کا مقدم تم پر مبارک ہو۔ ثاقب مجھ سے لڑتا تھا کہ بھتیجا ہے، میں کہتا تھا کہ پوتی ہے۔ بارے میں جیتا اور ثاقب ہارا۔ عریضہ جداگانہ استاد میاں صاحب کے نام پہنچتا ہے۔

غالب

پنجشنبہ ۲۶۔ رمضان ۱۲۸۱ھ

مطابق ۲۳ فروری ۱۸۶۵ء

(۴۷)

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد ... "حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند"

قدسیاں بہرِ دعاے تو و والا پدرت ... "قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند"[4]

میاں، تم جانتے ہو کہ میں عازم رام پور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بشرطِ حیات جمعہ کو روانہ ہوں گا۔ لڑکے بالوں کی خیر و عافیت علی حسین خاں کی تحریر سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ میر الکھنا زائد ہے۔ ایک بار میں صاحب کمشنر کی عیادت کو گیا تھا۔ فرخ مرزا بھی میرے ساتھ گیا تھا۔ مزاج کی خبر پوچھ آیا۔ بھائی کو میرا سلام کہنا۔

یک شنبہ یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء

راقم غالب علی شاہ

---

[1] یعنی ان مہینوں میں نہ آئے۔ [2] کوسہ برنشیں پارسیوں کا ایک جشن تھا جس کی کیفیت یہ ہے کہ ایک کوسہ یعنی ایسے آدمی کو جس کے بڑی عمر تک ڈاڑھی نہ نکلے، تلاش کر کے گدھے پر سوار کرتے، ایک ہاتھ میں پنکھا دوسرے میں کوڑا دے دیتے۔ اس کے بدن پر گرم دوائیں مل دیتے اور وہ ہاے گرمی ہاے گرمی کہتا۔ پھر تیزی سے پنکھا جھلنے لگتا۔ امیر غریب سب اس کے گرد جمع رہتے۔ کوئی اس پر پانی ڈالتا، کوئی برف پھینکتا۔ جب وہ سردی کے مارے کانپنے لگتا تو کوڑا اٹھاتا۔ لوگ اس کی چوٹیں کھاتے اور ہنستے۔ جس دُکان سے جو چیز چاہتا اٹھا لیتا بلکہ لوگ نذرانے لے کر دروازوں پر کھڑے رہتے۔

[3] ہولی کا دوسرا دن جس میں دُھول اڑائی جاتی ہے۔ [4] دونوں شعروں کے آخری مصرعے خواجہ حافظ کے ہیں ابتدائی مصرعوں میں حسب ضرورت ترمیم کر لی گئی ہے۔

(۴۸)

جانا عالی شانا!

خط پہنچا۔ حظ اٹھایا۔ تمھاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں۔ تم کہیں، قبائل کہیں۔ والی شہر ناساز گار، انجام کار ناپایدار، ایک دل اور سو آزار۔ اللہ تمھارا یاور، علی تمھارا مددگار۔ ہیں پا در رکاب، بلکہ نعل در آتش۔ کب جاؤں اور فرخ سیر کو دیکھوں۔ ایک خط میں نے علی حسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اس کا جواب آ گیا۔ روہیلا پھوڑے پھنسی میں مبتلا ہے۔ خدا اس کو صحت دے۔ شمشاد علی بیگ کہاں الور پہنچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے مل کر بھی نہ گیا۔ خیر:

رموز مصلحت خویش خسرواں دانند

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیراں[1] رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پُر نور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں، خانساماں، خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ پٹن، شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، احکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر، مع صاحبان عالی شان کے، کل جائیں گے، کوئی کہتا ہے پرسوں۔ رئیس[2] کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہٖ ضیاء الدین خاں، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفاوت۔ حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع[3]، شعر فہم۔ سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالاے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اللّٰھم دام اقبالہٗ وزاد اجلالہٗ۔ بعد اختتام محافل طالب رخصت ہوں گا۔ بعد حصول رخصت دِلّی جاؤں گا۔ بھائی صاحب[4] کی خدمت میں بشرط رسائی و تاب گویائی سلام کہنا اور بچّوں کی خیر و عافیت جو تم کو معلوم ہوئی ہے، وہ مجھ کو لکھنا۔ ۶۔ دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہوگے۔

۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

(۴۹)

مرزا،

روبرو بہ از پہلو آؤ، میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ، چھ

---

[1] یہ خط رامپور سے لکھا گیا تھا اور اس میں نواب کلب علی خاں کے جشن جانشینی کا ذکر ہے۔ [2] نواب کلب علی خاں۔ [3] پابند شریعت اور پرہیزگار [4] امین الدین احمد خاں۔

بڑے اور آٹھ چھوٹے کے، دلّی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے بوقتِ رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو ہفتے سے یہاں وارد ہیں اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ دلّی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا۔ میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اسی ہفتہ چلوں گا۔

آپ چال چوکے۔ اردو لکھتے لکھتے جو خط مشتمل ایک مطلب پر تھا، اس کو تم نے فارسی میں لکھا اور فارسی بھی متصدیانہ کہ امیر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بصیغہ مفرد نہ لکھیں۔ یہ وہی چھوٹی "ہے" بڑی "ہے" کا قصّہ ہے۔ خیر خط نہ دکھاؤں گا۔ ما کُتِبَ فیہ کہہ کر کام نکال لوں گا۔ میں نے تو چلتے وقت فرخ سیر کے اتالیق کی زبانی بھائی کو کہلا بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا مدعا کہو تو میں اس کی درستی کر تا لاؤں۔ جواب آیا کہ اور کچھ مدّعا نہیں، صرف مکانوں کا مقدمہ ہے۔ سو اس مقدمہ میں میرا اور میرے شرکاء کا وکیل وہاں موجود ہے۔ اگر وہ اس امر کا ذکر کرتے تو میں ان سے ان کے خالو علی اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھوا لاتا۔ بہر حال اب بھی قاصر نہ رہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔

بھائی سے دو سوال ہیں: ایک تو یہ کہ مجموعہ نثر کو کیا کروں؟ وہ مبنی تھا اس حقیقت پر کہ نول کشور نواب ضیاالدین احمد خاں سے واسطے انطباع کے لے گیا۔ جب یہ واقع نہ ہوا تو اس کو نکال ڈالوں اور اس کی جگہ جو نئی نثریں اور ہیں، وہ لکھ دوں؟

اوراق اشعار مرحومی زین العابدین خاں مستعار ہیں اس واسطے کہ تم اپنے ہاں کے مجموعے کی تصحیح اس سے کر لو، پھر امر واقع ہُوا یا ہونے والا ہے؟ ترجمہ ابوالفدا کی جلد واپس پہنچتی ہے۔

جمعہ ۲۲۔ دسمبر ۱۸۶۵ء۔ دو بجے تین کا عمل — جواب کا طالب غالب

——(۵۰)——

جانا جانا!

ایک میرا خط تمھارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہو گا۔ آج میں اصغر علی خاں بہادر کے گھر گیا ان سے میں نے تذکرہ کیا۔ فرمایا کہ فرخ سیر کی ماں کو لکھ بھیجو کہ سال بھر کی تنخواہ کی رسید بھیج دیں۔ یہاں سے روپیہ بھیج دیا جائے گا۔ آج منگل ہے ۷، شعبان کی، دو بھتیجے تمھارے[1] جمعہ کے دن ۲۶۔ دسمبر کو روانہ دہلی ہوئے۔ میں پرسوں یوم الخمیس کو مرحلہ پیما ہوں گا۔

اوّل ما آخر ہر منتہی (در اکرام و عزت) — آخر ما جیب تمنا تہی (از مال و دولت)

تو کمان گروہہ[2] کیا کر، فارسی بگھارا کر، مجھ سے ہندی کی چندی سُن۔

ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے، ایک اصغر علی خاں سے اینٹھی۔ دونوں کل آئیں گی۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو تین ہفتہ سے یہاں وارد اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ زادکی خدا نے چھٹی فقیر پر کی، راحلہ رہ جائیں۔

۷، شعبان ۱۲۸۲ھ۔ ۲۶۔ دسمبر ۱۸۶۵ء — غالب

---

[1] باقر علی خاں اور حسین علی خاں پسران عارف [2] غلیل

(۵۱)

میاں!

چلتے وقت تمھارے چچا نے غلیل کی فرمایش کی تھی۔ رام پور پہنچ کر وہ بے سعی و تلاش ہاتھ آگئی۔ بنوا رکھی، لڑکوں نے، ملازموں نے، سب نے مجھ سے سن لیا کہ یہ نواب ضیاالدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی، بہم نہ پہنچی۔ دس روپے تک کو مول نہ ملی۔ نواب صاحب سے مانگی، توشہ خانہ میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر[1] کے ہاں پتا لگا، دوڑا ہوا گیا۔ کھپچی موجود پائی، لیکن کیا کھپچی؟ جیسے نجف خاں کے عہد کے تورانیوں میں ہماری تمھاری ہڈی۔ بنوانے کی فرصت کہاں؟ آج لی، کل چل دیا۔ اس بانس کی قدر کرنا اور اس کو اچھی طرح بنوا لینا۔ بادشاہ فرخ سیر اور اس کے اخوان خوش و خرم ہیں۔ فرخ سیر کی ماں نے باجرے کا حلوہ سوہن کھلایا۔

شنبہ ۲۵، شعبان سنہ ۱۲۸۲ھ ۔ مطابق ۱۳، جنوری سنہ ۱۸۶۶ء نجات کا طالب، غالب

(۵۲)

صاحب!

خط تمھارا پہنچا، مطالب دل نشین ہوئے۔ غوغائے خلق سے مجھ کو غرض نہیں۔ کیا اچھی رباعی ہے کسی کی:

مومن بخیالِ خویش مستم داند ۔ کافر بگماں خدا پرستم داند

مردم زغلط فہمی مردم مردم ۔ اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم، داند

بھائیوں[2] سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر خبردار[3] میرا سلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے۔ اسی کو غنیمت جانتا ہوں۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب ۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ مطلع اور مقطع مندرجہ دیوان ہے مگر اس وقت یہ دونوں شعر حسبِ حال نظر آئے، اس واسطے لکھ دیے گئے۔ تم نے اشعار جدید مانگے، خاطر تمھاری عزیز، ایک مطلع، صرف دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے یاد آگئے کہ وہ داخل دیوان بھی نہیں۔ ان پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں۔ بھائی کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رتبہ نہیں:

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے؟ ۔ غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے؟ ۔ تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم، کیا ہے؟

کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلائے ۔ کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے؟

لکھا کرے کوئی احکام طالع مسعود ۔ کسے خبر کہ وہاں جنبشِ قلم کیا ہے؟

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا ۔ خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

---

[1] علی صغر خاں جن کا ذکر پہلے خط میں ہے۔ لیکن کمان نہ ملی صرف کھپچی ملی یعنی کمان بنانے کا بانس۔ [2] بھائیوں سے مراد امین الدین احمد خاں اور ضیاالدین احمد خاں ہیں۔ [3] غالباً چوکیدار کا نام ہے۔

وہ داد و دہد گرانمایہ شرط ہے ہمدم وگرنہ مُہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے؟

لو صاحب، تمھارا فرمان قضا توامان بجالایا مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں ہے۔ اگر یہ احتیاط رکھو گے اور دیوان کے حاشیے پر چڑھا دو گے تو اچھا کرو گے۔ عمر فراوان و دولت زیادہ، فقط۔

(۵۳)

سعادت و اقبال نشان مرزا علاؤ الدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔ کل شام کو مخدوم مکرم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی، لبسواری ریل، مانند دولت دلخواہ، ناگاہ آئے، فقیر کے تکیہ میں تشریف لائے۔ شب کو جناب ڈپٹی ولایت حسین خاں کے مکان میں آرام فرمایا۔ اب وہاں سے آتے ہیں۔ قریب طلوع آفتاب، بہ چشم نیم باز، یہ رقعہ تمھارے نام لکھا ہے۔ جو کچھ جی چاہتا ہے وہ مفصل نہیں لکھ سکتا۔ مختصر مفید آغا صاحب کو دیکھ کر یُوں سمجھنا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر میلے کی سیر کو حاضر ہُوا ہے۔ پس نور چشمان راحت جان مرزا باقر علی خاں بہادر و مرزا علی حسین خاں بہادر[1]، جناب آغا صاحب کا قدمبوس بجا لائیں۔ ان کی خدمت گزاری کو اپنی سعادت اور میری خوشنودی سمجھیں۔ بس۔

غالب

ہاں، مرزا علائی، اگر کرنل الگزنڈر اسکنر بہادر سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہنا۔

(۵۴)

میاں،

مدعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ اگر کل کمیٹی میں گئے ہو، تو میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو۔ ضمناً ذکر ایک مدبر کا لکھا جاتا ہے، جو تم نے اس مدبر کے صفات لکھے، سب سچ ہے۔ احمق، خبیث النفس، حاسد، طبیعت بُری، سمجھ بُری، قسمت بُری۔ ایک بار میں نے دکنی کی دشمنی میں گالیاں کھائیں، ایک بار بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھاؤں گا۔ میں نے جو تمھیں اس کے باب میں لکھا تھا، وجہ اس کی یہ تھی کہ میں نے سُنا تھا کہ تم نے اپنے سائیسوں سے کہہ دیا ہے یا کہا چاہتے ہو کہ اس کو بازار میں بے حرمت کریں۔ یہ خلاف شیوۂ مومنین ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ قصد نہ کرنا۔ یہ مویداس قول کا ہے، جو میں نے تم سے پہلے کہا تھا کہ تم یوں تصور کرو کہ اس نام کا آدمی اس محلے میں، بلکہ اس شہر میں کوئی نہیں۔[2] غالب

(۵۵)



صاحب!

بہت دن سے تمھارا خط نہیں آیا۔ آپ کا وکیل بڑا چرب زبان ہے۔ مقدمہ اس نے جیت لیا۔ چنانچہ اس کی تحریر سے تم کو معلوم ہُوا ہو گا۔ سُنتا ہوں کہ حمزہ خاں کو ان دنوں علت مشائخ کا زور ہے اور سعدیؒ کی اس بات پر عمل کرتے ہیں:

کسانیکہ یزداں پرستی کنند بآواز دولاب مستی کنند

خدا مبارک کرے۔ غالب

---

[1] غالباً اس زمانے میں دونوں لوہارو گئے ہُوئے تھے۔ [2] معلوم نہیں اس خط میں کس کی طرف اشارہ ہے۔ دکنی سے مراد میرزا محمد حسین صاحب برہان قاطع ہے۔ بنارسی کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا

(۵۶)

میاں، تمہارے باپ کا تابع، تمہارا مطیع، فرخ میرزا کا فرمانبردار، مگر ابھی اٹھا ہوں۔ اپنے کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔ آج فرخ صاحب کے نام رقعہ پہنچ جائے گا۔ چھ جز تمہارے دیے ہوئے میر مہدی حسین صاحب کو دیے اور باقی دن چڑھے اعیان مطبع جمع ہولیں تو وہ اوراق بھی منگا دوں۔

غالب

(۵۷)

اقبال نشان والاشان، صدرہ عزیز تر از جان، مرزا علاؤ الدین خاں کو دعائے درویشانہ غالب دیوانہ پہنچے۔ سال گزشتہ تم کو یاد ہوگا۔ میں نے بستان فارسی کا تم کو جانشین اور خلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اسی برس کی عمر[۱] ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں، ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے اثبات حواس میں اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو۔ چاہیے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے، ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے، تم کو مانیں۔ کل شئی ھالکٌ الا وجہہٗ و یبقیٰ وجہ ربک ذی الجلال والاکرام۔

یک شنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ۔ ۲۱۔ جون ۱۸۶۸ء من مقام دہلی[۲]

نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر

جناب قبلہ[۳] و کعبہ!

آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہ ہوتا ہو، یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی، تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔

۱؎ ۱۲۸۵ھ میں غالب کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔ معلوم نہیں اسے کس حساب سے ۷۶ برس بنا دیا۔ میرا خیال ہے اصل لفظ چار نہیں سات ہوگا۔ غلطی سے چار پڑھا گیا اور یہی رائج رہا۔ ۲؎ گویا یہ سند وفات سے کم و بیش نو مہینے پہلے لکھی تھی۔ ۳؎ ضیاء الدین احمد خاں عمر میں میرزا غالب سے چھوٹے تھے، لیکن انہیں قبلہ و کعبہ غالباً اس وجہ سے لکھا کہ صاحب علم و امارت تھے۔ یہاں دیوان سے مراد فارسی کلیات نظم کا نسخہ ہے۔

اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاءالدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دُور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں سے اور کے نام کر دیے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان، جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود، تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمال نقصان وہ بھی از روے وسوسہ و وہم۔ اس صورت میں میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہرحال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں[1]۔

رحم و کرم کا طالب، غالب

میرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب

(۱)

بھائی:

تمھارا خط حکیم محمود خاں صاحب کے آدمی کے ہاتھ پہنچا۔ خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو، اس کا پتا کیوں کر لگے؟ لوٹ کا مال چوری چوری کونے کھتروں[2] میں بک گیا اور اگر سڑک پر بھی بکا تو میں کہاں دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو۔

بر دل نفسِ اندہ گیتی بسر آرید گیرید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں، خدا کرے یہاں کا حال سُن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائیگا، ورنہ قصہ مختصر، قصہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں؟ اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو میری طرف سے دعا کہہ دینا اور تم کو بھی تمھاری استانی دعا کہتی ہیں۔ زیادہ، زیادہ۔

دوشنبہ ۸۔ فروری ۱۸۵۸ء

از غالب

(۲)

بھائی شہاب الدین خاں، واسطے خدا کے، تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیئے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں۔

---

[1] اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ بہ ظاہر ۱۸۶۰ء کا معلوم ہوتا ہے، جب کلیات نظم فارسی منشی نولکشور کے مطبع میں چھپوانے کا خیال آیا تھا۔

[2] کھترا سوراخ کو کہتے ہیں اور یہ لفظ کونے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مطلب ہے چھپ چھپا کر فروخت ہو گیا۔

اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جائیں تو یُوں سمجھنا کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک والدالحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں؟

ایک تو لڑکے میاں غلام نجف ؟ دوسرے تم، میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمھارے ہاتھ پڑا۔ بعد ان سطروں کے لکھنے کے تمھارا خط پہنچا۔ یہ دوسرا حادثہ مجھ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ قضا وقدر کے امر میں دم مارنے کی گنجایش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پر جانے کی اجازت جلد ہو جائے تاکہ سب یکجا باہم[1] آرام سے رہو۔ اپنے کاتب سے کہہ دینا کہ یہ خرافات متن میں نہ لکھے۔ اگر لکھ دیے ہوں تو وہ ورق نکلوا ڈالنا، اور ورق اس کے بدلے لکھوا کر لگوا دینا۔ مناسب تو یوں ہے کہ تم کسی آدمی کے ہاتھ وہ دیوان، جو تمھارے کاتب نے نقل کیا ہے، میرے پاس بھیج دو تاکہ میں ایک نظر اس کو دیکھ کر پھر تم کو بھیج دوں، زیادہ، زیادہ۔ آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام۔ معاف رکھنا۔ والسلام[2]۔

(۳)

بھائی!

تمھارا خط پہنچا۔ کوئی مطلب جواب طلب نہیں تھا کہ میں اس کا جواب لکھتا۔ پھر سوچا کہ مبادا تم آزردہ ہو، اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو لکھتا ہوں۔ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اب جو خط تمھیں لکھوں اس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ مبارک ہو تمھارے اب[3] و عم مع الخیر جاگیر کو روانہ ہو گئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اب کے جو خط تم کو لکھوں گا، اس کا مضمون یہی ہوگا۔ خاطر جمع رکھنا اگر میرا خط دو چار دن نہ پہنچے تو مجھ کو اسی مضمون کے ظہور کا منتظر سمجھنا اور گلہ نہ کرنا، اور ہاں صاحب تم جو خط لکھتے ہو تو اس میں سعید احمد خاں[4] کا کچھ ذکر نہیں لکھتے۔ لازم ہے کہ اس کی خیر و عافیت اور اس کی بہن کی خیر و عافیت لکھتے رہا کرو۔ یہاں تمھاری پھوپی اور دونوں بھتیجے اچھی طرح ہیں[5]۔ والدعا۔

یک شنبہ ۱۲ راپریل ۱۸۵۸ء — از غالب

(۴)

تمھارے بھائی کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ کلیات اردو[6] جو تم نے خریدے ہیں، ایک اس میں سے چاہو، اپنے

---

[1] امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں غدر کے خاتمہ سے پہلے لوہارو روانہ ہو گئے تھے۔ مہرولی میں ان کا سامان لٹا گیا۔ دہلی میں مکانوں کو آگ لگادی گئی۔ دوجانہ پہنچے۔ وہاں سے پکڑے آئے اور خاصی دیر تک قلعہ میں رہے۔ بے گناہ ثابت ہونے پر جولائی کے بعد انھیں جاگیر پر جانے کی اجازت ملی۔ اس خط میں اور اگلے خط میں انھیں اجازت مل جانے کی امید ظاہر کی گئی ہے۔ [2] اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ منشی مہیش پرشاد نے مارچ ۱۸۵۸ء کا بتایا ہے۔ قرینہ یقیناً یہی ہے کہ یہ خط مکتوب نمبر ا کے بعد اور مکتوب نمبر ۳ سے پہلے لکھا گیا۔ [3] یعنی ضیاء الدین احمد خاں اور امین الدین احمد خاں [4] سعید الدین احمد خاں طالب، برادر شہاب الدین احمد خاں ثاقب۔ [5] پھوپی سے مراد بیگم غالب، بھتیجوں سے مراد باقر علی خاں اور حسین علی خاں ہیں۔ [6] کلیات سے مراد اردو کا وہ دیوان ہے جو دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا تھا تو یہ خط ۱۸۶۱ء کے نصف آخر میں لکھا گیا۔ اگر کانپور کے مطبع نظامی کا نسخہ مراد ہے تو پھر اسے ۱۸۶۲ء کا سمجھنا چاہیے۔

چچا کی نذر کرو، چچا ہو بھائی کو تحفہ بھیجو۔ میں نے اس وقت ان کے نام کا خط لوہارو کو روانہ کیا ہے۔ بعدارسالِ خط مولوی سدید الدین خاں صاحب میرے ہاں آئے۔ اثنائے حرف و حکایت میں میں نے "شاہین" کی حقیقت پوچھی۔ جواب دیا کہ ہاں عربی میں ایک باجے کا نام "شاہین" ہے۔ صورت اس کی پوچھی گئی۔ کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ صراح میں میں نے دیکھا ہے۔ فقط تم جو مولانا علائی کو خط لکھو، یہ رقعہ ملفوف کر دو۔

غالبؔ

——(۵)——

نورِ چشم شہاب الدین خاں کو دعا کے بعد معلوم ہو، یہ جو رقعہ لے کر پہنچتے ہیں، ان کا نام حسن علی ہے اور یہ سید ہیں۔ رو اساز[ی] میں یگانہ، رکاب داری میں یکتا۔ جان محمد ان کا باپ ملازم سرکار شاہی تھا۔ اب ان کا چچا میر فتح علی پندرہ روپے مہینے کا الور میں نوکر ہے۔ بہر حال ان سے کہا گیا کہ پانچ روپیہ مہینا ملے گا اور لوہارو جانا ہوگا۔ انکار کیا کہ پانچ روپیہ میں کیا کھاؤں گا۔ یہاں زن و فرزند کو کیا بھجواؤں گا؟ جواب دیا گیا کہ سرکار بڑی ہے، اگر کام تمھارا پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا۔ اب وہ کہتا ہے کہ خیر توقع پر یہ قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں، مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں، بغیر اس کے کسی طرح نہیں جا سکتا۔

سنو میاں، حق بجانب اس غریب کے ہے۔ روٹی بغیر بات نہیں بنتی۔ یقین ہے تم رپورٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آ جائے گا۔ یہ قصہ فیصل ہوا۔ اب یہ کہتا ہے کہ دو ماہ مجھے پیشگی دو تاکہ کپڑا لتّا بناؤں اور کچھ گھر میں دے جاؤں۔ راہ میں روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں، تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں، مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خیر تم یہی میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو۔

سہ شنبہ ۲۴۔ ستمبر ۱۸۶۱ء

غالبؔ

——(۶)——

میاں!

وہ قاضی تو مسخرہ ہے۔ ان کا خط دیکھ لیا۔ خیر۔ ہاں علاؤالدین کا خط گھنٹہ بھر بھانڈ کے طائفے کا تماشا ہے۔ اب تم کہو استاد میر جان کو کیونکر بھیجو گے؟ ان کو کہاں پاؤ گے؟ اور علاؤالدین خاں نے حسب الحکم تمھارے چچا کے لکھا ہے کہ آج لوہارو کی سواریاں آئی ہوئی شاید کل یا پرسوں جائیں۔ اس کی فکر آج کر دو۔ امین الدین خاں بیچارہ اکیلا گھبراتا ہوگا۔

"چکیدن و ہیم"، "رمیدن و ہیم" یہ غزل علاؤالدین کو بھیج چکا ہوں۔ تم علاؤالدین خاں کو لکھو کر بڑے شرم کی بات ہے۔

"ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج"

اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ وا! "غیر سبب"، یہ کہاں کی بولی ہے؟

"از خواندن قُرانِ تو قاری چہ فائدہ"

عیاذاً باللہ امیر خسرو "قرآن" کو، کہ بسکونِ رائے قرشت و الف ممدودہ ہے، "قُران" بر وزن "پُران" لکھیں گے: یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں "خسرو" لکھ دیا ہو۔

(۷)

مرزامیاں شہاب الدین خاں اچھی طرح رہو۔ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہوگا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کرکے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار[1] گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی، شراب پی، کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا، ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس میں صلح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے تمھارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڈھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقّہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کوتل آ گئے۔ دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔ شمشاد کو کتاب کے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دینا۔[2]

(۸)

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے؟ ثاقب حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

(۹)

اے روشنی دیدۂ شہاب الدین خاں کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضان
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن؟

میرزا امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا

اے مردم چشم جہان بین غالب!

پہلے القاب کے معنے سمجھ لو، یعنی چشم جہاں بین غالب کی پتلی، چشم جہاں بیں تمھارا باپ علاؤ الدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ آج میں نے تمھارا خط دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ استاد کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفرین صد آفرین! میں اپنے اور تمھارے پروردگار سے کہ وہ رب العٰلمین ہے، یہ دعا مانگتا ہوں کہ تم کو زیادہ نہیں تو تمھارے باپ کے

---

[1] باقر علی خاں اور حسین علی خاں [2] یعنی شمشاد علی بیگ رضواں کو تاکید کر دینا کہ "قاطع برہان" کا مقابلہ اور تصحیح کرتا رہے۔

برابر علم و فضل اور تمھارے پردادا حضرت فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرامگاہ کے برابر جاہ و جلال عنایت کرے۔ میاں تمھارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں، میں تمھارا دلدادہ ہوں۔ خبردار ہر جمعہ کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو۔

والدعا۔[1]

میرزا قربان علی بیگ خاں سالک

(۱)

میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات[2] احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشین" خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ"[3] خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آیئے نجم الدولہ بہادر"[4]! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب[5]! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔" بولے کیا۔ بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔

(۲)

والحمد للہ الطاف خفیہ[5]۔ خیر و عافیت تمھاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہل اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا، نہ دین[6]۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو اور خدا سے ناامید نہ ہو۔ اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرًا[7] کو اپنا نصب العین

---

[1] یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا، جب دہلی میں میرزا غالب کے خطوط چھپ رہے تھے۔ نواب امین الدین احمد خاں مرحوم نے خود ایک مرتبہ راقم الحروف سے بیان کیا کہ خطوں کے چھپنے کا شہرہ سنا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خاندان کے سب لوگوں کے نام خط ہیں تو میں نے بھی مرزا صاحب سے عرض کیا کہ دادا جان! ہمارے نام بھی ایک خط لکھ دو۔ اس موقع پر میرزا نے فرمایا کہ "دادا" تمھارے امین الدین احمد خاں ہیں، میں تو تمھارا "دلدادہ" ہوں۔ یہ فقرہ خط میں بھی لکھ دیا۔ یہ غالباً ۱۸۶۸ء کا واقعہ ہے۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو خط نمبر ۶۵ بنام علاؤ الدین خاں علائی۔ [2] یعنی دوزخ اس کی جائے قرار ہو، ہاویہ اس کا زاویہ بنے۔ [3] میرزا غالب کو شاہی دربار سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا تھا۔ نجم الدولہ ان کے خطاب کا ایک جزو تھا۔ [4] ترکی زبان میں خطاب کے لیے احترام کا لفظ، جیسے ہمارے ہاں جناب ہے۔ [5] خدا پوشیدہ مہربانیاں کرتا ہے۔ [6] اس اسلوب تحریر کو یقیناً کرامت سمجھنا چاہیے۔ [7] قرآن کی آیت کا ٹکڑا ہے جس کے معنی ہیں، تنگی کے ساتھ کشایش بھی ہے۔

رکھو:

درطریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست

گھر میں تمھارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا پنجشنبہ اور جمعہ کو داستان کے وقت آجاتا ہے۔ رضوان ہر روز شب کو آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے اور دوں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجالائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدعا۔

صبح دوشنبہ ۹ صفر سال حال (۱۲۸۱ھ) اپنی مرگ کا طالب، غالب

۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء

مرزا شمشاد علی بیگ خاں رضواںؔ

(۱)

فرزند دلبند شمشاد علی بیگ خاں کو، اگر خفا نہ ہوں تو دعا، اگر آزردہ ہوں تو بندگی۔ غازی آباد سے جاکر طبع اقدس ناساز ہوگئی: از آمدن کعبہ پشیماں شدہ باشی۔

قربان علی بیگ خاں کو دعا کہنا اور ان کا حال لکھنا۔

آج شنبہ ۱۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورے کو گئے۔ فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ آکر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمایش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔ وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ پنجم دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن تک جشن رہے گا۔ اس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔

پیرجی بہت یاد آتے ہیں۔ ان کو دعا کہنا اور یہ کاغذ پہلے تم پڑھنا، پھر سالک کو پڑھانا، پھر میاں خواجہ امان اور حکیم رضا خاں کو دکھانا۔ پھر مرزا افضل حسین خاں کے پاس لے جانا۔ اس قصیدے کے ساتھ کی نثر نواب ضیاء الدین خاں[1] یا مرزا ثاقب سے مانگ لینا اور اس کی نقل کرلینا اور "قاطع برہان" کا حال لکھنا۔ میں نے تیس روپے کی ہنڈوی، سو روپے کی باقی، حکیم جی کو بھیج دی ہے۔ حضرت نے رسید بھی نہیں لکھی۔ ان سے رسید لکھوا بھیجو اور سب جلدوں کے شیرازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے۔ خبردار کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔ تین سو مجلد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیہ حساب میرے پاس بھیج دینا، یا روپیہ فوراً بھیج دوں گا یا آکر دوں گا۔

گورنر کا حال لکھو، کون کون حاضر ہوا؟ کس کس کی ملاقات ہوئی؟ فرخ سیر کے دادا صاحب آئے یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو روئداد مفصل لکھو۔ ہاں بھائی صاحب، ٹونک والے سید سراج احمد کا بھی حال ضرور لکھنا۔ علی نقی خاں وزیر شاہ اودھ کی حقیقت بھی ضرور لکھنا اور مجھ کو ان مقاصد کے جواب کا منتظر سمجھنا۔ آج دوشنبہ، ۱۴ نومبر کی ہے۔ آٹھ دن میں خط کی آمد شد یقینی ہے۔

---

[1] امین الدین احمد خاں والی لوہارو

نو دن راہ دیکھوں گا، دسویں دن اگر تمھارا خط نہ آیا تو میں رافضی بن جاؤں گا[1]۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا طالب

۴۔ نومبر ۱۸۶۵ء غالب

(۲)

مرزا، رسمِ تحریرِ خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا تارک نہیں ہوں بلکہ متروک ہوں[2]۔ اب مجھے ویسا نہ سمجھو، جیسا چھوڑ گئے ہو۔ رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطفِ طبیعت، یہ سب اسباب لٹ گیا۔ اگر تمھارے خط کا جواب نہ لکھوں تو محلِ ترحم ہے، نہ مقامِ شکایت، سنو، میرے خط نہ پہنچنے سے تم کو تشویش کیوں ہو؟ جب تک زندہ ہوں، غم زدہ و افسردہ، ناتوان و نیم جان ہوں۔ جب مر جاؤں گا تو میرے مرنے کی خبر سن لوگے۔ پس جب تک میرے مرنے کی خبر نہ سنو، جانو کہ غالب جیتا ہے۔ خستہ و نژند، رنجور و دردمند۔ یہ سطریں لکھ کر اس وقت تمھارے بھائی[3] کے پاس بھیجتا ہوں مگر ان کو ہمیشہ سفر در وطن ہے۔ بفرضِ محال اگر گھر میں ہیں تو عنایت[4] اللہ ان کو، ورنہ محمد مرزا کو دے آئے گا۔ ربیع الثانی جمعہ کا دن صبح کا وقت ہے

ربیع الثانی د ۱۲۸۳ھ یعنی اگست ۱۸۶۶ء

میرزا باقر علی خاں کامل

(۱)

اقبال نشان باقر علی خاں کو غالب نیم جان کی دعا پہنچے۔ بہت دن ہوئے کہ تمھارا خط آیا۔ مگر تم نے اپنے مکان کا پتا تو لکھا ہی نہ تھا۔ نقط الور کا نام لکھ کر چھوڑ دیا۔ میں کیونکر خط بھیجتا؟ بارے اب شہاب الدین خاں کی زبانی پتا معلوم ہوا۔ سو اب میں تم کو خط لکھتا ہوں۔ جنیا[5] بیگم اچھی طرح ہے۔ میرے پاس آتی رہتی ہے اور تمھارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ اکتوبر کے مہینے کی تمھاری تنخواہ تمھارے گھر بھیج دی۔ مرزا حسین علی خاں بندگی عرض کرتا ہے۔

تحریر ۱۶۔ نومبر ۱۸۶۷ء اسد اللہ

(۲)

اقبال نشان مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جان کی دعا پہنچے۔ تمھارا خط آیا۔ تمھارے روزگار کی درستی آگے سن چکا تھا اب تمھارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا اور تم خاطر جمع رکھو۔ جیسا کہ مہاراج[6] نے تم سے کہا ہے، تمھاری ترقی ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہو گی۔ مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا۔ بھائی، اب میری انگلیاں نکمی ہو گئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ دو

---

[1] یعنی تم کو چھوڑ دوں گا، بے تعلق ہو جاؤں گا۔ [2] میں نے تحریر نہیں چھوڑی، تحریر نے مجھے چھوڑ دیا یعنی تحریر کا دماغ ہی نہ رہا۔ [3] میرزا قربان علی بیگ سالک۔ [4] میرزا غالب کا ملازم۔ [5] باقر علی خاں کی بڑی صاحبزادی جن کا اصل نام محمد سلطان بیگم تھا۔ خاندان والے اسے جندو بیگم کہا کرتے تھے اور میرزا غالب پیار سے اسے میرزا جیون بیگ پکارتے تھے۔ [6] یعنی شیو دھیان سنگھ والیِ الور جن کے پاس میرزا باقر علی خاں نوکر تھے۔

سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف وجوانب کے خطوط آسئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمھارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آگئے ہیں۔ میں نے ان سے یہ خط لکھوا دیا۔ تمھاری دادی[1] اچھی طرح ہے۔ بھائی[2] اچھی طرح ہے۔ تمھارے گھر میں سب خیر وعافیت ہے۔ تمھاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔

(۳)

نور چشم وراحت جان میرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ تمھارا خط جو میرے خط کے جواب میں تھا وہ مجھ کو پہنچا۔ اس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ اس خط میں ایک نئے امر کی اطلاع دیتا ہوں۔ وہ امر یہ ہے کہ میں نے اگلے مہینے میں "سبد چین" کی ایک جلد مع عرضی، اقبال نشان میر تفضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی۔ سو اب کے ہفتے میں حضور پر نور مہاراجہ راؤ بہادر کا خط انھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے از راہِ بندہ پروری بقیہ القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔ تم تو وہیں ہو، تم کو اس کی اطلاع ہوگئی تھی یا نہیں؟ اور اگر ہوگئی تھی تو تم نے مجھے کیوں نہیں لکھا؟ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں کچھ میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں؟ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں؟

غالب

۷، دسمبر ۱۸۶۸ء

منشی ہرگوپال تفتہ

ہرگوپال نام۔ تفتہ تخلص، سکندرآباد ضلع بلند شہر کا باشندہ۔ والد کا نام موتی لال، قوم کائستھ ۱۲۱۴ھ میں محلہ قانو گویاں میں پیدا ہوا۔ یعنی غالب سے دو برس چھوٹا تھا۔ "ادبی خطوط غالب" کے مولف نے لکھا ہے کہ ابتدا میں کچھ دن قانون گوئی کے عہدے پر مامور رہا۔ واقف بٹالوی کا دیوان پڑھ کر شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ ابتداء میں راقم تخلص تھا۔ غالب کی شاگردی اختیار کی تو تفتہ تخلص تجویز ہوا۔ غالب کے بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جانی بانکے لال رند وکیل راجہ بھرت پور کے ماتحت تفتہ کے لیے مالی منفعت کا کوئی انتظام تھا، جس کی نوعیت میری معلومات کے مطابق یہ ہے کہ بندوبست کے محکمے میں ملازمت مل گئی تھی۔ چنانچہ خط نمبر ۱۱ میں راجہ بھرت پور کے انتقال کی خبر سن کر تفتہ کو جو خط لکھا، اس میں فرماتے ہیں:

"مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اس علاقے میں تم بھی شامل ہو ۔۔۔ تم اگرچہ بابو صاحب در ندا کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو، لیکن انھوں نے از راہِ دُور اندیشی تم کو متوسل اس سرکار کا کر رکھا تھا اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو بھی لازم آپڑا ہے۔ جانی جی کے ساتھ

---

[1] بیگم غالب [2] میرزا حسین علی خاں

روشناس حکام والا مقام ہونا":

یہ سلسلہ بظاہر جانی بانکے لال رند کی وفات تک قائم رہا ہوگا، جو غالباً ۱۸۵۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد تفتہ نے ساری زندگی آزادانہ گزاری۔

بعض خطوں سے متبادر ہوتا ہے کہ تفتہ خاصے خوشحال تھے۔ ان کا روپیہ بنک میں جمع تھا (ملاحظہ ہو خط نمبر ۲۲) وہ اپنے خرچ سے اپنی کتابیں چھپواتے رہے (خط نمبر ۲۷) "غدر" کے بعد غالب پر عسرت کا شدید دور طاری تھا۔ اس زمانے میں تفتہ نے میرٹھ سے سو روپے بھیجے تھے۔ غالب خود لکھتے ہیں کہ "از میرٹھ تفتہ صفتہ زر بہ من فرستاد" (کلیات نثر غالب صفحہ ۴۰۸) غالباً اسی ہدیے کا ذکر خط نمبر ۳۰ میں بھی کیا ہے، لیکن آخری دور میں بہ ظاہر تفتہ کی مالی حالت کمزور ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کے قصیدے لکھے اور غالب نے ان قصیدوں کا صلہ دلانے کی سعی کی (خط نمبر ۹۲) خط نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے تفتہ کے لیے ریٹی گن صاحب کے ماتحت پندرہ بیس روپے مشاہرے کی ملازمت کے لیے سعی کے متعلق استفسار کیا۔

غالب سے تلمذ کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ فارسی خطوں میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جو فروری ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا۔ یعنی اس سے پیشتر تفتہ شاگرد بن چکے تھے اور یہ رابطہ غالب کے آخری دم تک قائم رہا۔



تفتہ کا ایک لڑکا تھا، تیمبر سنگھ، جو ۱۸۵۵ء میں داغ جدائی دے گیا۔ اس صدمے نے کمر توڑ دی۔ ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ صرف ایک لڑکی یادگار چھوڑی۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر تفتہ کے نواسے تھے، لیکن مالک رام صاحب نے چھان بین کی تو یہ بات غلط ثابت ہوئی۔

فارسی شعر خاصا کہتے تھے۔ اردو میں ان کے صرف دو شعر میں نے دیکھے ہیں، یعنی غالب کی تاریخ وفات کا قطعہ:

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پاؤ سر ہوئے

"خمخانۂ جاوید" میں مرقوم ہے کہ چار دیوان ان سے یادگار ہیں۔ نواب علی حسن خاں، اپنے تذکرۂ شعرائے فارسی میں فرماتے ہیں:

"پنج دیوان شعر دارد و ابیات ہر یکے ازاں قریب سیزدہ ہزار بیت" (صبح گلشن صفحہ ۸۶)

میری نظر سے ان کا صرف ایک دیوان گزرا ہے جو ۱۸۶۸ء میں مطبع کوہ نور (لاہور) میں چھپا تھا۔ یہ قریباً چھ سو صفحے کا ہے اور اس میں صرف غزلیات کے اشعار پونے آٹھ ہزار کے قریب ہیں۔ اکثر زمینوں میں دو دو غزلیں کہی ہیں۔

رباعیات و متفرقات کے علاوہ اس دیوان میں ایک دو مرثیے بھی ہیں۔ ایک تفتہ کے بیٹے لالہ پتمبر سنگھ کا جس کے چودہ بند اور ۳۲۲ شعر ہیں۔ دوسرا جانی بانکے لال رند وکیل راجہ بھرت پور کا اس کے بارہ بند اور ۷۲ شعر ہیں۔ اسی طرح غالب کا مرثیہ بھی بہت لمبا لکھا تھا۔

"تضمین گلستان" اور "سنبلستان" بھی ان کی تصانیف میں سے ہیں۔

اردو میں غالب کے سب سے زیادہ خطوط ان ہی کے نام ہیں، یعنی ۱۲۳۔ اس سے ظاہر ہے کہ تفتہ سے میرزا کا کتنا گہرا تعلق تھا اور میرا خیال ہے کہ سارے خطوط محفوظ نہ رہے۔ سنہ ۱۸۴۹ء، سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۵۱ء کا صرف ایک ایک خط ہے اور یہ امر قرینِ قیاس نہیں کہ گہرا تعلق پیدا ہونے کے باوجود سال بھر میں صرف ایک خط لکھا گیا ہو۔ بقیہ سنین کی کیفیت یہ ہے۔

سنہ ۱۸۵۲ء	———	پانچ یا چھ
سنہ ۱۸۵۳ء	———	گیارہ یا بارہ
سنہ ۱۸۵۴ء	———	چار یا پانچ
سنہ ۱۸۵۶ء	———	ایک
سنہ ۱۸۵۷ء	———	ایک
سنہ ۱۸۵۸ء	———	چونتیس
سنہ ۱۸۵۹ء	———	چودہ
سنہ ۱۸۶۰ء	———	نو
سنہ ۱۸۶۱ء	———	پانچ یا چھ
سنہ ۱۸۶۲ء	———	چار یا پانچ
سنہ ۱۸۶۳ء	———	نو
سنہ ۱۸۶۴ء	———	چار
سنہ ۱۸۶۵ء	———	آٹھ

آخری تین سوا تین برس کے کل چار خط ہیں۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں "دستنبو" کی طباعت کے سلسلے میں زیادہ خط لکھے گئے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ بار بار وقفے کیوں ہوئے؟ مثلاً سنہ ۱۸۵۵ء کا کوئی خط موجود نہیں، لیکن سنہ ۱۸۵۶ء کا صرف ایک خط ہے، جو دیوان کی تقریظ کے متعلق ہے اور جسے میں قیاساً سنہ ۱۸۵۶ء کا قرار دیتا ہوں، اس لیے کہ تفتہ کا دوسرا دیوان سنہ ۱۸۵۶ء میں چھپا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کا صرف ایک خط ہے اور اس میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جس سے ظاہر ہو کہ مدت تک سلسلہ مکاتبت بند رہا۔ میرا خیال یہی ہے کہ سارے خط محفوظ نہ رہے، بلکہ بہت سے ضائع ہو گئے۔

تفتہ کو غالب ازراہِ محبت میرزا تفتہ کہتے تھے۔ غالباً انھیں کی وجہ سے جانی بانکے لال رند اور منشی بال مکند بے صبر نے

غالب کی شاگردی اختیار کی۔

سخن شعرا میں بے صبر کے متعلق مرقوم ہے کہ وہ کانجی مل کے بیٹے اسکندر آباد (ضلع بلند شہر) کے باشندے اور تفتہ کے شاگرد تھے۔ زیادہ تر فارسی شعر کہتے تھے۔ میرزا کے بیان سے واضح ہے کہ بے صبر ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مالک رام صاحب ایم۔ اے نے لکھا ہے کہ سرکار انگریزی کے محکمہ مال میں منشی گری اور واروغائی کے عہدہ پر متمکن ہو گئے تھے۔ اسی سلسلے میں دہلی پہنچے اور غالب سے ملاقات کی تقریب پیدا ہوئی۔ ۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔ ستر برس کی عمر پائی۔

---

(۱)



مہاراج!

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا، لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہرحال مجھ کو کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعاگو سمجھتے رہو۔ کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے[1] کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، موجب فرمایش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں۔ ظاہراً تم خود فکر نہیں کرتے۔ اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل[2] کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟

ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو، مادا لجبن سے بھی نہ گیا؟ ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور سود مند ہے، مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ پانچ سات سیر پانی لیویں اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملادیں اور اس کو جوش کریں اور اس قدر کہ چہارم پانی جل جائے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا بھر رکھیں اور جب باسی ہو جائے اس کو پئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں۔ پانی دن رات جب پیاس لگے یہی پئیں۔ روز جوش کرواکر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا اسلام کہہ کر یہ نسخہ عرض

۱؎ اس سے مراد "گلشن بے خار" ہے۔ اس پر میرزا نے جو تقریظ لکھی تھی وہ کلیات نثر فارسی مطبوعہ نولکشور میں صفحہ ۶۹ پر ہے۔

۲؎ میرزا محمد حسن قتیل۔

کردینا۔ آگے ان کو اختیار ہے۔[1]   مئی ۱۸۴۸ء

(۲)

بھائی، یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے، فنِ تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمان[2] ساوجی و ظہیر[3] کا سا ہے۔ چار لفظ اور چاروں واقعہ کے مناسب۔ یہ مصرع کہہ کر اور مصرع کی فکر کرنی کس واسطے؟ واہ واہ! سبحان اللہ۔

اور یہ جو تم کو "فر" کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سوکھا سہما شعر ظہوری کا لکھا، بڑا تعجب ہے۔ یہ لفظ میرے ہاں پنج آہنگ میں دس[4] ہزار جگہ آیا ہوگا۔ "فر" اور "فرہ" لفظ فارسی ہے، مرادف "جاہ" کے۔ پس "جاہ" کو اور اس کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب ویسے نہ لکھے۔ "عالی جاہ" اور "سکندر جاہ" اور "مظفر فر" اور "فریدوں فر" یوں بھی درست ہے اور صرف "جاہ" اور "فر" یوں بھی درست۔

اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب کو خطاب بہادری کہنا بے جا ہے۔ سُنو: خطاب کے مراتب میں پہلے تو خانی کا خطاب ہے اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے۔ مثلاً ایک شخص کا نام ہے میر محمد علی یا شیخ محمد علی بیگ اور اس کو خاندانی بھی خانی نہیں حاصل۔ پس جب اس کو بادشاہ محمد علی خاں کہہ دے، تو گویا اس کو خانی کا خطاب ملا اور جو شخص کہ اس کا نام اصلی محمد علی خاں ہے یا تو وہ قوم افغان ہے یا خانی اس کی خاندانی ہے۔ بادشاہ نے اس کو محمد علی خاں بہادر کہا۔ پس یہ خطاب "بہادری" کا ہے۔ اس کو بہادری کا خطاب کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خطاب "دوگی" کا ہے۔ یعنی مثلاً "محمد علی خاں بہادر" اس کو "منیر الدولہ محمد علی خاں بہادر" کہا۔ اب یہ خطاب "دوگی" کا ہوا۔ اس کو "بہادری کا خطاب" نہیں کہتے۔

---

[1] یہ ان خطوں میں سے ہے۔ جن پر شروع میں کوئی تاریخ درج نہ تھی۔ منشی مہیش پرشاد نے اسے اگست ۱۸۴۹ء کا قرار دیا لیکن جب منشی نبی بخش حقیر کے نام مکاتیب کا مجموعہ بنام "نادرات غالب" چھپا تو واضح ہوا کہ اس خط کو اگست ۱۸۴۹ء کا قرار دینا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ۱۴ جون ۱۸۴۸ء کا مرقومہ ایک خط منشی حقیر کے نام موجود ہے، جس میں تفتہ کی کتاب کی تقریظ اور چوب چینی کے پانی کا ذکر ہے۔ قرینہ یہی ہے کہ یہ خط حقیر کے نام کے خط سے پہلے لکھا گیا اس لیے اسے مئی ۱۸۴۸ء کا سمجھنا چاہیے۔ [2] عباسی خلافت کی تباہی کے بعد متفرق حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں ایک حکومت خاندان جلائر کی تھی جس کا مرکز بغداد تھا۔ اسی خاندانِ حکومت کا مداح سلمان تھا جو "ساوہ" (مغربی ایران) کا رہنے والا تھا۔ اس لیے ساوجی مشہور ہوا۔ عام روایت کے مطابق ۷۶۹ھ/۱۳۶۸ء میں فوت ہوا۔ قصیدہ گو اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔

[3] ظہیر فاراب کا رہنے والا، مشہور قصیدہ گو شاعر تھا جس کے دیوان کے متعلق کسی نے کہا تھا:

دیوانِ ظہیر فاریابی   در مکہ بہ دزد اگر بیابی

اسی کا شعر ہے:

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا   تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

[4] "فر" بمعنی دبدبہ و شوکت۔ دس ہزار سے مراد ہے "بہ کثرت"۔

اب اس خطاب پر افزائش جنگ کی ہوتی ہے۔ "منیرالدولہ محمد علی خاں بہادر شوکت جنگ"۔ ابھی خطاب پُورا نہیں۔ پُورا جب ہوگا کہ جب "ملک" بھی ہو۔ پس پُورے خطاب کو "خطاب بہادری" لکھنا غلط ہے۔ یہ واسطے تمھارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے۔[1]

اب آپ اس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر لیجیے یعنی قطعوں میں لکھ دیجیے۔ جب تمھارا دیوان چھاپا جائے گا، یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا۔ مگر ہاں منشی صاحب کے سامنے اس کو پڑھیے اور ان سے استدعا کیجیے کہ اس کو آگرہ بھیجیں تاکہ اس کو چھاپا جائے۔ "اسعد الاخبار" میں اور "زبدۃ الاخبار" میں یقین ہے کہ وہ تمھارے کہنے سے عمل میں لائیں گے۔ مجھ کو کیا ضرور ہے کہ میں یہاں سے لکھوں؟ میں نے یہاں "صادق الاخبار" میں چھپوا دیا ہے۔

اگست ۱۸۵۰ء

(۳)

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں۔ پہنچا ہوگا۔ کل ایک رقعہ میرے پاس آیا۔ کوئی صاحب عطاءُ اللہ خاں ہیں اور نایابؔ تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں، پڑھ کر حال معلوم کرو گے۔

تمھارے شعر میں جو تردّد تھا، اس کا جواب میں نے یہ لکھا ہے۔ تم کو بھی معلوم رہے:

رفت آنچہ بہ منصور شنیدی تو و من ہم
اے دل سخنے ہست نگہدار زباں را

تردد یہ کہ "آنچہ بہ منصور رفت" نہیں دیکھا۔ "آنچہ بر منصور رفت" درست ہے۔ جواب: بائے موحدہ علیٰ کے معنی بھی دیتی ہے۔ پس جو کچھ بَر سے مراد تھی، وُہ بائے موحدہ سے حاصل ہو گئی اور اگر بائے موحدہ کے معنی معیّت کے لیں، تو بھی درست ہے۔ نظیریؔ کہتا ہے:

شادی کہ غبن میکشی و دم نمے زنی   در شہر ایں معاملہ با ہر گدا رود

اگر کوئی یہ کہے کہ (نظیریؔ کے شعر میں) "معاملہ" ہے اور اس شعر (تفتہؔ کے شعر) میں معاملہ کا لفظ نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے۔ نظیریؔ کے ہاں "معاملہ" مذکور ہے اور تفتہؔ کے مقدر ہے۔ رفت کا صلہ اور تعدیہ بائے موحدہ کے ساتھ دونوں جگہ ہے۔ والسلام

۱۸۵۱ء   اسداللہ



---

[1] غالبؔ نے خطابات کی تدریجی ترتیب یہ بتائی ہے: (۱) خان (۲) بہادر (۳) دولہ (۴) جنگ (۵) ملک۔ ممکن ہے مغلوں کے زمانے میں یہی ترتیب ہو۔ حیدرآباد کے آخری زمانے کے مروّجات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانی کا خطاب اڑ گیا تھا اور ترتیب یہ تھی: (۱) جنگ (۲) دولہ (۳) ملک (۴) امرا (۵) جاہ (۶) فتح جنگ۔ نظام الدولہ۔ آصف جاہ۔ سکندر جنگ، اقبال الدولہ، اقتدار الملک، وقار الامرا۔ ایک خطاب سلطنت کا بھی اختیار کیا گیا تھا۔ مثلاً "یمین السلطنۃ"۔

(۴)

کیوں مہاراج، کول[1] میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے؛ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا میں کیونکر آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابوصاحب[2] سے کہاں جا ملوں گا؟ خیر، اب جو میں نے بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا، لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔ تمھارے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں بابوصاحب کی میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں۔ ہرچند انھوں نے لکھا ہے کہ اکبرآباد ہاشم علی خاں کو بھیج دو، لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجمیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے، تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کر دوں گا یا تم جو لکھو گے، اس پر عمل کروں گا۔ بھائی ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یک شنبہ ۴۔ جنوری ۱۸۵۲ء

اسداللہ

(۵)

شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔

آپ کا وہ خط جو آپ نے کانپور سے بھیجا تھا، پہنچا۔ بابوصاحب کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا لکھنؤ جانا اور وہاں کے شعرا سے ملنا سب معلوم ہوا۔ اشعار جناب رندؔ کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد درست ہو گئے اور اصلاح اور اشارے اور فوائد جیسا کہ میرا شیوہ ہے، عمل میں آیا۔ جب تک کہ ان کا یا تمھارا خط نہ آوے اور اقامت گاہ معلوم نہ ہو۔ میں کاغذ ضروری کہاں بھیجوں اور کیونکر بھیجوں؟ اب جو تمھارے لکھنے سے جانا کہ ۱۹ فروری تک اکبرآباد آ ڈ گے تو میں نے یہ خط تمھارے نام لکھ کر لفافہ کر رکھا ہے۔ آج انیسویں ہے، پرسوں اکیسویں کو لفافہ آگرہ کو روانہ ہوگا۔ بابوصاحب کو میں نے خط اس واسطے نہیں لکھا کہ جو کچھ لکھنا چاہیے تھا، وہ خاتمہ اوراقِ اشعار پر لکھ دیا ہے۔ تم کو چاہیے کہ ان کی خدمت میں میرا اسلام پہنچاؤ اور سفر کے انجام اور حصولِ مرام کی مبارکباد دو اور اوراق اشعار گزرانو اور یہ عرض کرو کہ جو عبارت خاتمے پر مرقوم ہے اس کو غور سے پڑھیے اور اپنا

---

[1] علی گڑھ کا پرانا نام [2] بابو سے مراد جانی بانکے لال رندؔ ہیں۔ جیسا کہ خط نمبر ۹ سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ راجہ بھرت پور کے وکیل تھے اور غالباً جے پور سے بھی کچھ تعلق تھا۔ میرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ تفتہؔ ان کے پاس ملازم ہو گئے تھے تفتہؔ کے دوسرے دیوان مطبوعہ مطبع "کوہ نور" لاہور میں جانی بانکی لال رندؔ پر ایک طویل مرثیہ موجود ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکا انتقال ۱۲۷۲ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) میں ہوا۔ مرثیہ میں تفتہؔ ایک جگہ رندؔ کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بود ہندو و دل سوے اسلام

دوسری جگہ لکھتے ہیں: بدر او ہمیں پسر است واقعہ

در جہاں و نشاں کہ بود، نہ ماند

بلا کہ ان کے ایک بھائی جانی بیج ناتھ کا ذکر خود میرزا غالبؔ نے خط ۱۳ بنام تفتہؔ میں کیا ہے۔

دستورالعمل گردانیے، نہ یہ کہ سرسری دیکھیے اور بھول جائیے۔ لبس تمام ہوا وہ پیام کہ جوبابو صاحب کی خدمت میں تھا۔
اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ وہ جو تم نے اس شخص کوئی[1] کا حال لکھا تھا، معلوم ہوا۔ ہرچند اعتراض ان کا لغو اور پرسش ان کی بے مزہ ہو، مگر ہمارا یہ منصب نہیں کہ معترض کو جواب نہ دیں یا سائل سے بات نہ کریں۔ تمھارے شعر پر اعتراض، اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا ہے، گویا ہم پر ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں۔ کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار ہے جو زبان داں ہوگا، سمجھ لے گا۔ غلط فہم اور کج اندیش لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں۔ ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے اغیار کے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے تمھیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔ آج تمھارا کلام وہ نہیں کہ کوئی اس پر گرفت کر سکے۔ مگر ہاں:

حسود را چہ کنم کوز خود برنج در است

والسلام والاکرام

رقم زدہ ۱۹۔ فروری و مرسلہ بست و یکم فروری ۱۸۵۲ء غالب

———(۶)———

بندہ پرور "بیش از بیش و کم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور جلال اسیر[2] کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ "در زمان من مہر بیش از بیش شد و در زمان تو وفا کم از کم شد۔" استاد کیا کہے گا؟ اس میں تو بڑے کا لف و نشر ہے "من" اور "تو"، "مہر" اور "وفا"، "بیش از بیش" اور "کم از کم"۔ یاد رہے کہ "بیشتر از بیش و کمتر از کم" اگرچہ بحسب معنی جائز ہے لیکن فصاحت اس میں کم ہے۔ "بیش از بیش" اور "کم از کم" افصح ہے۔ وہ شعر تمھارا خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے۔

بیش از تو نہ ایم کم، ولے صبر بیش است ترا، کم است

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر "کمتر" ہوتا تو اور اچھا تھا۔ بہر حال اتنا خیال رہے کہ ایسی جگہ "تر" کا لفظ افصح ہے۔ چنانچہ میرا شعر ہے:

جلوہ کن، منت منہ، از ذرہ کمتر نیستم
حسن با این تابناکی آفتابے بیش نیست

مصرع: ورنہ چشم تو چہ از روزن دیوار کم است

یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے، فارسیت نہیں رہتی۔ مصرع:

سہل مشمار زندگانی ہا

مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے۔

---

[1] باشندہ کول [2] میرزا جلال اسیر بن مومن شہرستان اصفہان کا باشندہ اور شاہ عباس صفوی کے رشتہ داروں میں تھا۔ شعرا کو "خیال بند" کہا جاتا تھا، ان میں شامل ہے۔ ۱۶۳۹ء میں فوت ہوا۔

رایگان ست زندگانی ہا	می تواں کرد جانفشانی ہا

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا تھا کہ میرے دل میں آئی تھی تم کو نہ دوں اور خود اس زمین میں غزل لکھوں۔ پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا۔ حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے، شراب کے نشہ میں لکھا ہے اور وہ اصلاحی اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اب مصرع:

گلہ تا کے ز زندگانی ہا

اس کو موقوف کیجیے اور وہ مطلع رہنے دیجیے کہ وہ بہت خوب ہے۔ بعینہٖ مولانا ظہوری[۱] کا معلوم ہوتا ہے۔ بھائی ہمارے اوراق اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو۔ ہماری محنت تو ضائع نہ جائے۔

"ایامے چند" جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے، بلکہ فقیر کے نزدیک جمع الجمع ہی نہیں ہے۔ مثلاً "معانی چند" اور "احکام چند" اور "اسرار چند" یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ہاں "آمال ہا" یہ کھلی سور ڈھ ہے۔ مصرع:

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے، اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں؛ مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے:

صلاح کار کجا و من خراب کجا	بہ بین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

میری جان! ایسے موقع پر یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم موردِ اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور بُرا نہ کہے گا حضرت صائب کو۔[۲]

شہرت فلانے شخص کے انتقال کی بہ غلط، البتہ میرا بھی موجب ملال ہے، مگر یہ کونسا واقعہ عظیم ہولناک ہے کہ صاحب اخبار اس کو چھاپیں؛ آپ اس طرف اتنا اعتنا نہ فرمایئے۔[۳]

گر ماہ و آفتاب بمیرد، عزا مگیر	ور تیر وزہرہ[۴] کشتہ شود، نوحہ خواں مخواہ

میں کالے[۵] صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں۔ بلّی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایہ کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے۔ اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے۔ "در دہلی بہ اسداللہ برسد" کافی ہے۔ مگر اب

۱؎ فارسی کے مشہور شعرا میں سے ہے۔ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ پھر دکن پہنچ کر بیجاپور میں عادل شاہی دربار میں ملازم ہو گیا۔ ملک قمی نے اپنی لڑکی سے شادی کر دی تھی۔ نظم کے علاوہ اس کی نثر بھی مشہور ہے۔ "سہ نثر" مدت تک فارسی نصاب میں رہی۔ ۲؎ مطلب یہ ہے کہ صائب نے اگر کہیں جمع الجمع سے کام لیا ہے تو اُسے بُرا کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن میں خود جمع الجمع کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ اغلاط میں اساتذہ کی سندیں ڈھونڈھنا بالکل غیر مناسب ہے۔ ۳؎ مطلب یہ ہے کہ تفتہ نے لکھا فلاں شخص کے انتقال کی شہرت ہو گئی اور واقعہ غلط تھا اس کی تردید اخبار میں چھپوا دیجیے۔ ۴؎ دو ستارے۔ ۵؎ شیخ نصیرالدین عرف کالے میاں، بہادر شاہ کے پیر اور مولانا فخرالدین فخر عالم کے پوتے تھے۔ ان کا مکان گلی قاسم جان میں تھا۔ جس میں غالب کئی برس رہے۔

لال کنواں نہ لکھا کرو۔ محلہ بلّی ماراں لکھا کرو۔

اور ہاں صاحب ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال لکھو۔ مسہل سے فراغت ہوئی؟ اور اب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب جائیں گے؟ میرا سلام بھی کہہ دیجیے گا۔ والسلام

محررہ دوشنبہ بست و دوم مارچ ۱۸۵۲ء — اسد اللہ

(۷)

کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ۔ تحریریں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آپڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں[1] مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے[2] کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کر مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں، میں کیوں گھبراؤں گا؟ آپ ان کو جلد بہ سبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد ان کو تمھارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمھارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمھارے معنوی بچوں یعنی نتائج طبع کو فروغ شہرت اور حسن قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط ان کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے، ان کو دے دیجیے گا اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آبو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا

نگاشتہ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء — اسد اللہ

(۸)

کل تمہارا خط آیا، رازِ نہانی مجھ پر آشکارا ہوا۔ میں سمجھا ہوا تھا کہ تم دیوانگی اور شورش کر رہے ہو۔ اب معلوم ہوا کہ حق بجانب تمہارے ہے۔ میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں تو اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہتا ہوں کہ اے دل تو اپنے کو اس

۱؎ زین العابدین خاں عارفؔ غالب کے ہم زلف نواب غلام حسین خاں مسرور کا فرزند اور بیگم غالب کے حقیقی بھانجا تھا۔ مسرور نے اپنی بیوی (بنیادی) بیگم بنت الٰہی بخش خاں معروف کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی تھی اور عارف قریبی رشتے کی بنا پر نیز خوش فکری کے باعث غالب سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ۳۵ برس کی عمر پائی۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۶۸ھ / اپریل ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ اس کے شاگرد الگزانڈر ہیدرلے متخلص بہ آزاد نے جو "الگ صاحب" مشہور تھا۔ مندرجہ ذیل مصرع سے تاریخ وفات نکالی تھی، جس میں سے ایک کا تخرجہ تھا۔

عارف پسند رحمت حق ہو چکا ہے آج

۲؎ باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔

عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پر یہ حادثہ پڑا ہوتا یا تُو اس بلا میں گرفتار ہوا ہوتا تو کیا کرتا؟ عیاذاً باللہ! اب میں تم کو کیوں کر کہوں کہ بے حرمتی گوارا کرو اور رفاقت نہ چھوڑو۔ بلکہ یہ بھی زاید ہے، جو دوست سے کہیے کہ تو ہمارے واسطے اس کو ترک کر۔ بہ ہر حال دوست کی دوستی سے کام ہے، اس کے افعال سے کیا غرض؟ جو محبت و اخلاص ان میں، تم میں ہے، بدستور بلکہ روزافزوں رہے، ساتھ رہنا اور پاس رہنا نہیں ہے، نہ سہی،

وصلے کہ دراں ملال باشد ہجراں بہ ازاں وصال باشد

آمدم بر سرِ مدعا۔ تمھاری راے ہم کو اس باب میں پسند۔ عجب طرح کا پیچ پڑا کہ نکل نہیں سکتا۔ نہ تم کو کچھ سمجھا سکتا ہوں اور نہ ان کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اس موقع میں سواے اس کے کہ تماشائی نیرنگ قضا و قدر بنا رہوں، کچھ بن نہیں آتی[1]

بہ بینم کہ تا کردگار جہاں دریں آشکارا چہ دارد نہاں

جے پور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوسناکانہ ادھر متوجہ ہُوا ہوں۔ بُڈھا ہو گیا ہُوں، بہرا ہو گیا ہُوں۔ سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا، مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ فائدہ اٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے؟

تا نہالِ دوستی کے بر دہد حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آجکل آجائے گا۔ پھر اس کے جزودان کی تیاری کر کے روانہ کروں گا۔[2] ابھی کول میں آرام کرو، اپنے بچوں میں دل بہلاؤ۔ اگر جی چاہے تو اکبرآباد چلے جائیو، وہاں اپنا دل بہلائیو۔ دیکھو اس خودداری میں ادھر سے کیا ہوتا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟ والسلام

جمعہ دہم دسمبر ۱۸۵۲ء[3] اسداللہ

(۹)

پرسوں تمھارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہُوا، غزلیں دیکھ رہا تھا۔ آج شام کو دیکھنا تمام ہُوا تھا۔ غزلوں کو

---

[1] اس عبارت سے متبادر ہوتا ہے کہ کسی معاملے میں تفتہ اور رند کا یکجا رہنا اور تفتہ کا ملازمت جاری رکھنا مشکل ہو گیا تھا اور وہ ترک ملازمت کا خواہاں تھا۔ غالب نے روکا، لیکن جب حقیقت حال کا علم ہوا تو اعتراف کیا کہ تفتہ کی راے درست ہے۔

[2] مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جے پور کے راجہ کے پاس اپنا دیوان بھیجنا تھا، جس کی جلد بندھوائی۔ پھر جزدان یعنی غلاف بنوانا تھا۔

"بدنام ہو گیا ہوں اور دھبا لگ گیا ہے" سے اشارہ غالباً اسیری کی طرف ہے جو قمار بازی کے سلسلے میں عمل میں آئی تھی۔ [3] تمام نسخوں میں ۱۸۵۳ء ہے جو بداہتہً غلط ہے۔ ۱۸۵۳ء کے خط یا اس زمانے کے دوسرے خطوں میں جے پور سے ہنڈی آنے کا ذکر ہے، یقیناً اس سلسلے میں تحریک پہلے ہُوئی تھی۔ لہٰذا یہ خط ۱۸۵۲ء کا ہونا چاہیے۔

رکھ دیا تھا چاہتا تھا کہ ان کو بند کر کے رہنے دوں۔ کل صبح ۹ بجے۔ اب بجے ڈاک میں بھیج دوں، خط کچھ ضرور نہیں ہیں۔ اسی خیال میں تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا، جانی جی کا خط لایا۔ اس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور ہُوا کہ خلاصہ اس کا تم کو لکھوں۔ یہ رقعہ لکھا۔ خلاصہ بطریق ایجاز یہ ہے کہ عرضی گزری، دیوان گزرا، راول جی کے نام کا خط گزرا۔ راجہ صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہُوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعد اللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے، وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نئے ایجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں اور اب اجنٹ علاقہ جے پور کی راہ سے نہیں آتا۔ آگرہ اور گوالیار و کرولی ہوتا ہُوا اجمیر آئے گا اور اس راہ میں جے پور کا عمل نہیں۔ بس چاہیے کہ راول جی اُلٹے پھر آویں۔ اُن کے آئے پر عرضی کا جواب ملے گا اور اس میں دیوان کی رسید بھی ہوگی۔ بھائی، جانی جی تم کو بہت ڈھونڈھتے اور تمھارے بغیر بہت بے چین ہیں۔ میں نہ تم کو کچھ کہہ سکتا ہوں، نہ ان کو سمجھا سکتا ہوں۔ تم وہ کرو کہ جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ ہاں یہ بھی جانی جی نے لکھا تھا کہ بہت دن کے بعد منشی جی کا خط آیا ہے۔

اسد اللہ

(۱۰)

بھائی!

پرسوں شام ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمھارا اور ایک جانی جی کا لایا۔ تمھارے خط میں اوراق اشعار اور بابو صاحب کے خط میں جے پور کے اخبار۔ دو دن سے مجھ کو وجع الصدر[۱] ہے اور میں بہت بے چین ہُوں۔ ابھی اشعار کو دیکھ نہیں سکتا۔ بابو صاحب کے بھیجے ہُوئے کاغذ تم کو بھیجتا ہُوں۔ اشعار بعد دو چار روز کے تم کو بھیجے جائیں گے۔

مرسلہ جمعہ ۲۵۔ فروری ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

(۱۱)

بھائی،

آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہُوں۔ جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو اور اگر وقت نہ رہا تو ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔ منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سُنی جاتی تھی۔ کل سے اور بُری خبر شہر میں مشہور ہے۔[۲] تم بھرت پور سے قریب ہو، یقین ہے کہ تم کو تحقیقی حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھو کیا صورت ہے۔ راجا کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اسی علاقہ میں تم بھی شامل ہو۔ صاحبان انگریز نے ریاستوں کے باب میں ایک قانون وضع کیا ہے، یعنی جو رئیس مر جاتا ہے، سرکار اس ریاست پر قابض و متصرف ہو کر رئیس زادہ کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے مگر یہ وکیل ہیں، معلوم نہیں مختار کون ہے اور ہمارے بابو صاحب میں اور اس مختار میں صحبت کیسی ہے۔ رانی سے اُن کی

---

[۱] سینے کا درد   [۲] یعنی مشہور ہے کہ راجہ فوت ہو گیا۔

کیا صورت ہے۔ تم اگرچہ بابو صاحب کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو، لیکن اُنھوں نے از راہِ دُور اندیشی تم کو متوسّل اس سرکار کا کر رکھا ہے اور تم مستغنیانہ اور لااُبالیانہ زندگی لبسر کرتے تھے۔ زنہار اب وُہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو یہ لازم آپڑا ہے، جانی جی کے ساتھ روشناس حکام والامقام ہونا۔ پس چاہیے کہ دل کی آرمش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ میری رائے میں یُوں آیا ہے اور میں نہیں لکھ سکتا کہ موقع کیا ہے اور مصلحت کیا ہے؟ جانی جی بھرت پور آئے ہیں یا اجمیر میں ہیں؟ کس فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ واسطے خدا کے، نہ مختصر، نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو کچھ واقع ہُوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور جلد کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سُنا، آج صبح قلعہ[1] نہیں گیا اور یہ خط لکھ کر از راہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں ڈاک کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے۔ جب اس محلے میں جانا ہوتا ہے تو اس کو بھی لے جاتے ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔ ضروری جواب طلب۔

نوشتہ چاشت گاہ دوشنبہ ۸ر مارچ ۱۸۵۳ء

(۱۲)

آج منگل کے دن ۵ر اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک خانہ کا ہرکارہ آیا۔ ایک خط منشی صاحب کا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط بابو صاحب کا لایا۔ بابو صاحب کے خط سے اور مطالب تو معلوم ہو گئے مگر ایک امر میں حیران ہوں کہ کیا کروں یعنی انھوں نے ایک خط کسی شخص کا آیا ہُوا میرے پاس بھیجا ہے اور مجھ کو یہ لکھا ہے کہ اس کو اُلٹا میرے پاس بھیج دینا، حالانکہ خود لکھتے ہیں کہ میں اپریل کی چوتھی کو سپاٹو یا آبو جاؤں گا اور آج پانچویں ہے۔ بس تو وہ کل روانہ ہو گئے۔ اب میں وُہ خط کس کے پاس بھیجوں؟ ناچار تم کو لکھتا ہوں کہ میں خط کو اپنے پاس رہنے دوں گا۔ جب وہ آکر مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع دینگے تب وہ خط ان کو بھیجوں گا۔ تم کو تردد نہ ہو کہ کیا خط ہے۔ خط نہیں مینڈھو لال کالستھ غماز کی عرضی تھی بنام مہاراجہ بیکنٹھ باشی، سعایت بابو صاحب پر مشتمل کہ اس نے لکھا تھا کہ ہردیو سنگھ، جانی جی کا دیوان اور ایک شاعر دہلی کا دیوان مہاراجہ جے پور کے پاس لایا ہے اور جانی کی درستی روزگار جے پور کی سرکار میں کر رہا ہے۔ اس کے بھیجنے کی یہ وجہ کہ پہلے ان کے لکھنے سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ایسا کہا ہے۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ تم کو میرے سر کی قسم اب ہردیو سنگھ کو بلا لو۔ میں امر جزوی کے واسطے امرِ کلی کا بگاڑ نہیں چاہتا۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے وہ عرضی بھیجی اور لکھ بھیجا کہ راجہ مرنے والا ایسا نہ تھا کہ ان باتوں پر نگاہ کرتا۔ اس نے یہ عرضی گزرتے ہی میرے پاس بھیج دی۔ فقط۔ بارے خط آنے سے جانی جی کی طرف سے

---

[1] یعنی لال قلعہ یا دربار شاہی [2] مطلب یہ کہ جانی جی اور غالب کا دیوان اپنے آدمی کے ہاتھ جے پور بھیجا۔ مینڈھو لال نے راجہ کے پاس شکایت کی کہ ہردیو سنگھ جانی جی اور غالب کا دیوان پیش کر کے جانی جی کے لیے جے پور میں ملازمت کا بندوبست کرانا چاہتا ہے غالب کو معلوم ہوا تو فوراً جانی جی کو لکھا کہ ہردیو سنگھ کو واپس بلا لو۔ میری خاطر اپنے معاملات کیوں خراب کرو۔ "کلی امر" جانی جی کی ملازمت اور عزت تھی۔ "جزوی امر" غالب کے لیے مالی امداد کی سعی۔ لیکن جانی جی نے لکھا کہ راجہ ایسا نہ تھا، اس لیے عرضی میرے پاس بھیج دی اور وہی تحریر اب آپ (غالب) کے پاس بھیج رہا ہوں۔

میری خاطر جمع ہو گئی، مگر اپنی فکر پڑی۔ یعنی بابو صاحب آبو ہوں گے۔ اگر ہردیو سنگھ پھر کر آئے گا تو وہ بغیر ان کے ملے اور ان کے کہے مجھ تک کاہے کو آئے گا۔ خیر وہ بھی لکھتا ہے کہ راول کہیں گیا ہوا ہے۔ اس کے آنے پر رخصت ہو گی۔ دیکھیے وہ کب آوے اور کیا فرض ہے کہ اس کے آتے ہی رخصت ہو بھی جائے۔

تمھاری غزل پہنچی۔ یہ البتہ کچھ دیر سے پہنچے گی تمھارے پاس۔ گھبرانا نہیں۔ والدعا۔ جواب طلب

نگاشتہ سہ شنبہ روز ورود نامہ و مرسلہ چہارشنبہ اپریل ۱۸۵۳ء — اسد اللہ

—(۱۳)—

بھائی،

ہاں میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحبہ مر گئیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبر آباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ راجہ مرا، رانی نہیں مری، ابھی ریاست کا کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ صورت انتظام جانی بہتی ناتھ کے آنے پر موقوف ہے۔ یہاں تک اس دوست کی تحریر ہے۔ ظاہرا اس کو بابو صاحب کا نام نہیں معلوم۔ ان کے بھائی کانام یاد رہ گیا۔ صرف اس دوست نے بطریق اخبار لکھا ہے۔ اس کو میری اور جانی جی کی دوستی کا بھی علم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے تمھارے دوست کا کام بنا رہے گا۔ آمین یا رب العلمین۔

صاحب، جے پور کا مقدمہ اب لائق اس کے نہیں ہے کہ اس کا خیال کریں۔ ایک بنا ڈالی تھی، وہ نہ اٹھی۔ راجا لڑکا ہے اور چھچھورا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی بات نکل آتی اور یہ جواب آپ لکھتے ہیں کہ راجا تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیش نظر رکھتا ہے، یہ بھی تو آپ از رُوے تحریر منشی ہردیو سنگھ کہتے ہیں۔ ان کا بیان کیوں کر دل نشین ہو؟ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے، ہولی ہو چکی اور میں لے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ، نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے، آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور، بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈویاں بھیجی ہیں، سو سو روپے کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے، راجا صاحب کی طرف سے، تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بطریق نذر شاگردی۔ بعد اس کے دو ہنڈویاں سو سو روپے کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں، مع میر احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے۔ چار سو اور اس کے علاوہ تین سو، اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس میں اور اگر تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

ہاں صاحب، یہ وہی میر قاسم علی صاحب ہیں، جو میرے پُرانے دوست ہیں۔ پرسوں یا اترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا تھا، وہ ایک خط میر صاحب کے نام کا، کوئی میاں حکمت اللہ ہیں، ان کا میرے مکان کے پتے سے لایا تھا، وہ میں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میر صاحب آجاویں تو ان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حضرت، اگر میرے واسطے نہیں، تو اس خط کے واسطے آپ دِلّی آئیے۔

غالب



(۱۴)

بھائی،

تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپے کا نوکر یا پنسن دار قرار دیا ہے جو دس بیس روپے مہینا قسط کی آرزو رکھتے ہو؟ تمھاری باتوں پر کبھی کبھی ہنسی آتی ہے۔ اگر احیاناً تم کبھی دہلی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیل کمپنی ہوتے، تو مجھ کو بڑی مشکل پڑتی۔ بہرحال خوش رہو اور متفکر نہ ہو، پانچ روپے مہینا پنسن انگریزی میں سے قسط مقرر ہو گیا تا اداے زر۔ ابتداے جون ۱۸۵۳ء یعنی ماہ آیندہ میں سے یہ قسط جاری ہو گی۔[1]

بابو صاحب کا خط تمھارے نام کا پہنچا۔ عجب تماشا ہے۔ وہ درنگ کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں ان کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں، ہائے اتفاق، آج میں نے ان کو لکھا اور کل راجہ کے مرنے کی خبر سنی۔ واللہ باللہ اگر دو دن پہلے سن لیتا تو اگر میری جان پر آ بنتی تو بھی ان کو نہ لکھتا۔ جے پور کے آئے ہوئے روپے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی۔ شاید آج شام تک یا کل تک آ جائے۔ خدا کرے وہ آبو پہاڑ سے ہنڈوی روانہ کر دیں، ورنہ پھر خدا جانے، کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھیجنے میں کتنی دیر ہو جائے گی۔ خدا کرے زرِ مصارف ہردیو سنگھ اسی میں سے مجرا لیں۔ میری کمال خوشی ہے اور یہ نہ ہو تو پچیس روپے ہردیو سنگھ کو میری طرف سے ضرور دیں۔

منشی صاحب[2] کا ایک خط ہاترس سے آیا تھا۔ کل اس کا جواب ہاترس روانہ کر چکا ہوں۔ والدعا۔

محررہ دوشنبہ ۲ مئی ۱۸۵۳ء   اسد اللہ

(۱۵)

عجب تماشا ہے، بابو صاحب لکھتے ہیں کہ ہردیو سنگھ آ گیا اور پانسو روپے کی ہنڈوی لایا مگر اس کے مصارف کی بابت اٹھتیس روپے کئی آنے اس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے۔ سو میں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں۔ میں نے ان کو لکھا کہ مصارف ہردیو سنگھ کے میں مجرا دوں گا۔ تکلیف نہ کرو۔ "پچیس" یہ میری طرف سے ہردیو سنگھ کو اور دے دو اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈوی جلد روانہ کرو۔ سو بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ وجہ حیرانی کی یہ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے۔ وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آجکل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ جانتا ہوں وہ سیکڑا پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں؟ تیس روپے کی کون سی ایسی بات ہے؟ اگر مصارف ہردیو سنگھ میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہوا۔ اٹھتیس اور پچیس چوتن روپیہ نکال ڈالیں اور باقی ارسال کریں۔ لفافے خطوط کے جو میں نے بھیجے تھے، وہ بھی ابھی نہیں آئے۔ باایں‌ہمہ یہ کیسی بات ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بابو صاحب کہاں ہیں؟ پہاڑ پر ہیں یا بھرت پور آئے ہیں؟ اجمیر آنے کی ظاہرا کوئی

---

[1] یہ انکم ٹیکس کی رقم تھی جس کا بوجھ میرزا پر ایک دم آ پڑا تھا اور وہ رقم ماہانہ قسطوں میں پنسن سے کٹتی رہی۔ [2] منشی صاحب سے مراد غالباً منشی نبی بخش حقیر ہیں۔

وجہ نہیں ہے۔ ناچار کثرتِ انتظار سے عاجز آکر آج تم کو لکھا ہے۔ تم اُس کا جواب مجھ کو لکھو اور اپنی رائے لکھو کہ وجہ درنگ کی کیا ہے؟ زیادہ، زیادہ۔

مرقومہ پنجم جون ۱۸۵۳ء، روز یکشنبہ، جواب طلب — اسد اللہ

(۱۶)

تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی[1] کا ہاتھرس سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا سلام کہہ دینا۔

یہ تمہارا دعاگو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا، مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے، یعنی بہت محتاج۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمہاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ جے پور سے اگر مجھ کو دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی، تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے، سو وہ میرے صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سے کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے، وہ صرف انگریز سوداگر کے دینے تھے، قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے مشرب میں حلال[2] ہے۔ سو وہ دیے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آجاوے۔ بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کاغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے، وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کر دیے اور اس میں بھی لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ پنجشنبہ پندرہ دن آج پورے ہوئے۔

(۱۷)

بھائی،

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بابو صاحب نے پچیس روپے ہردیو سنگھ کو دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہر حال ہنڈوی بارہ دن کی میعادی تھی۔ چھ دن گزر گئے تھے چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں؟ منی کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٗ۔

بھائی صاحب آگئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط ان کو دے دو اور میرا سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تا کہ میں ان کو خط لکھوں۔ بابو صاحب بھرت پور آجائیں تو آپ کاہلی نہ کیجیے گا اور ان کے پاس جائیے گا کہ وہ تمہارے جویائے دیدار ہیں۔

سہ شنبہ ۱۴-جون ۱۸۵۳ء — اسد اللہ

---

[1] منشی نبی بخش حقیر [2] یعنی شراب۔

(۱۸)

بھائی،

میں نے مانا تمھاری شاعری کو۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ سخن سے فرصت نہ ہوگی۔ پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور ردولحنت شعر لکھنے کا، اس میں ضرور نشستِ معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو لکھو اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔

کیوں صاحب، یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجا اور وہ بھی دِلی سے سکندرآباد کو، آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا؟ کیا ہنسی آتی ہے تمھاری باتوں پر۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو، تم کو دے۔ جانی جی کی بڑی فکر ہے۔ میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ ان کا حال لکھو۔ تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ یقین ہے کہ اجمیر میں ہوں گے ... مگر خط نہیں بھیجا جاتا کہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے کب چل نکلیں۔ بہرحال تم بھرت پور کے قریب ہو اور ان کے متوسلوں کو جانتے ہو اور اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگوا لو اور جو کچھ تم کو معلوم ہو وہ بھی مجھ کو لکھو۔ منشی صاحب مع منشی عبداللطیف[۱] کول میں آ گئے۔ کل ان کا خط مجھ کو آیا تھا۔ آج اس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

یک شنبہ ۱۲۔ اگست ۱۸۵۳ء — اسداللہ

(۱۹)



صاحب،

دوسرا پارسل جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے، پہنچا۔ نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریرِ سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ ورق زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بہرحال اب مجھے چننے پڑے ہیں سوالات۔ اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑ توڑ کا گناہ سمجھنا، میرا قصور نہ جاننا۔

"بلا رہا ہے" اس میں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے "رہا" اس کا مخفف ہے ۱۲

خار را در راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن ۱۲

بہت خوب اور معقول۔ میں اس وقت نہ جانے کس خیال میں تھا۔ "چوں خواہد شدن"، و "کنوں خواہد شدن" ردیف قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ "بے پیر" نورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب اشعارِ اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو فارسی شعر میں کیوں کر اجازت دوں گا؟

میرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو

۱؎ ابن نبی بخش حقیر

غلط کہوں، لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے ۱۲

"شست بستن" جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے۔ یہ روزمرّہ ہے اور ہم روزمرّہ میں ان کے پیرو ہیں۔

"بے پیر" ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحب زبان ہونے میں اسیرؔ بھی ظہوری سے کم نہیں ۱۲

زاہدا ایں سخنت ہرزہ کہ گفتی چہ شدی

حق غفور است گناہے شدہ ام تا چہ شود

پہلے زاہد سے یہ سوال غلط کہ "چہ شدی"۔ "ترا چہ شد" سوال ہو سکتا ہے۔ پھر "گناہے شدہ ام"۔ یہ جواب مہمل۔ "گناہے کردہ ام" جواب ہو سکتا ہے۔ یہاں تم کہو گے "ہمہ تن گناہم" یا "سراپا گناہ" یا "سراسر گناہ شدہ ام" یہ جواب اس جواب سے سراسر بے ربط ہے۔ جب تک ہمہ تن گناہ نہ ہو، معنی نہیں بنتے۔ ہرگز ہرگز۔ اصلاح دیے ہوئے شعر میں مضمون تمھارا ہی رہا اور ٹکسال کے موافق ہو گیا۔ عجب ہے تم سے کہ صرف "شدہ ام" اور "تا چہ شود" کے پیوند میں الجھ کر حقیقت معنی سے غافل رہے۔

باز آر دل خود از چنیں کار آزار پہ می کنی دلم را

اہلی نے زبردستی کی ہے مگر ہاں اس نے ایک وجہ ٹھہرا لی ہے۔ یعنی "آزردن" مصدر اور "آزردہ" مضارع اور "آزار" امر۔ امر بمعنی اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد "کردن" کے ساتھ پیوند پاتا ہے۔ خیر رہنے دو۔

کند آں آہوے وحشی ز برم سر دارم

یہ شعر مؤید میرے کلام کا ہے۔ "بر دارم" و "زر دارم" و "سر دارم" و "فر دارم" یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں، الف ممدودہ کہیں نہیں۔ ہاں "بو دارد و رو دارد" و "فر و دارد" تمھارے عقیدے کی تائید کرتا ہے۔ مگر یہ شعر استاد کا نہیں مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاؤ الدین:

ما مقیمان کوے دلداریم

یہ ترجیع بند انھیں کا ہے۔ ان کو فقر و فنا و سلوک میں دستند سمجھنا چاہیے، نہ اندازِ کلام میں۔

"پر مور است شمشیرے کہ بر موے میاں دارد"

بھائی، خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی نازکی سند نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک مضمون ہے۔ "کمر" "مور" اور "تلوار" پر "مور" وجہ تشبیہ علاقۂ پر مور با مور، مانند علاقۂ شمشیر با میان۔ نزاکت وجہ تشبیہ کبھی نہیں، انصاف شرط ہے۔ تلوار کی خوبی "تیزی" ہے یا "نازکی"؟ یہ دھوکا نہ کھاؤ اور تلوار کو نازک نہ باندھو۔ "خو" میں اور "تلوار" میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو۔ شعر سے ہاتھ اٹھاؤ۔ ۱۲

میاں "خمیدن" بھی صحیح اور "چمیدن" بھی صحیح۔ اس میں کس کو کلام ہے، مگر لغت اور محاورے اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستان کے باتونی لوگوں کو خم و چم بولتے سنا ہے۔ آج تک کسی نظم و نثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا، مجھ کو بھی پسند مگر کیا کروں جو اپنے پیشواؤں سے نہ سنا ہو، اس کو کیوں کر صحیح جانوں؟ "چمید"

صیغہ ماضی کا ہے "چمیدن" سے اور "چمیدن" ایک مصدر ہے صحیح اور مسلم۔ "چمد" مضارع، "چم" امر۔ اس میں کیا گفتگو ہے؟ کلام "خم و چم" میں ہے۔

سوالات ڈھونڈھ ڈھونڈ کر ان کا جواب لکھ دیا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں، خدا کرے مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو اور تم بھی جب ان اوراق طلسمی کو دیکھو تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا۔ میں بہت گھبراتا ہوں۔ "خمیدست" و "رسیدست" میں "زنی دست"، یہ قافیہ درست ہے، مگر "است" کا الف سب جگہ اُڑا دو اور یاد رہے کہ سین تے کافی ہے الف ضرور نہیں۔

غالب

(۲۰)

تمھارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا۔ واقعی ان چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہوگا۔ دیکھو میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل میں ہوں۔ پر نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے۔ تمھارے اشعار غور سے دیکھ کر بھائی منشی نبی بخش صاحب کے پاس لفافہ تمھارے نام کا بھیج دیا ہے۔ جب تم آؤ گے تب تم کو دیں گے۔ جہاں جہاں تردّد و تامّل کی جگہ تھی، وہ ظاہر کر دی ہے اور باقی سب اشعار بدستور رہنے دیے ہیں۔ اب تم کو چاہیے کہ کول پہنچ کر مجھ کو خط لکھو۔ اس لفافے کی رسید اور اپنا سارا حال مفصّل لکھو۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں؟

اسداللہ

(۲۱)

واہ، کیا خوبی قسمت ہے میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب منشی جی کا خط آتا ہے اور ان کی خیر و عافیت معلوم ہوتی ہے۔ خط آیا اور خیر و عافیت معلوم نہ ہوئی یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے اور پانو میں چوٹ لگی ہے سنو صاحب، یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اتنا پھیلاؤ بھی اس سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کُہنہ ہو گئی۔ البتہ کچھ دیر میں افاقت ہو گا۔ بعد افاقت ہونے کے تم مجھ کو اطلاع کرنے میں دیر نہ کرنا۔ میرا دھیان لگا ہوا ہے۔

بابو صاحب کا خط آیا تھا۔ پھر انھوں نے تکلیف کی اور وہ کچھ بھیجا جو آگے بھیجا تھا۔ تمھاری مفارقت سے بہت ملول ہیں۔ طرزِ تحریر سے فراوانی محبت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی جی گئے نہیں، ضرورت کو کیا کریں؛ جلد پھر آئیں گے۔ آپ ان کو اپنے پاس ہی تصور فرمائیے۔

بابو ہرگوبند سنگھ تعطیل میں کول گئے ہوں گے جو آپ کے خط میں ان کی بندگی لکھی آئی۔ کیوں انھوں نے تکلیف کی؟ بہمہ جہت دو سو قدم پر میرے گھر سے ان کا مکان اور وہ جاتے وقت مجھ سے رخصت نہ ہو گئے۔ اب بندگی سلام کیا ضرور؟

ہاں صاحب! یہ تم نے اور بابو صاحب نے کیا سمجھا ہے کہ میرے خط کے سرنامے پر اہلی کے محلّے کا پتا لکھتے ہو۔

میں بلّی ماراں میں رہتا ہوں۔ اہلی کا محلہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔ وہ تو ڈاک کے ہرکارے مجھ کو جانتے ہیں، ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔ آگے کالے صاحب کے مکان میں رہتا تھا، اب بلی ماراں میں کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اہلی کا محلہ کہاں اور میں کہاں؟

منشی جی کو لکھتے ہو کہ حاکم کے ساتھ گئے ہیں اور پھر لکھتے ہو کہ نہ دورے میں بلکہ اپنے کام کو۔ بہ ہر صورت اب آگئے ہوں گے۔ میرا سلام کہیے گا اور اپنی خیر و عافیت کے ساتھ ان کی معاودت کی خبر لکھیے گا، ورنہ مجھ کو خط لکھنے میں تأمل رہے گا۔

"نظر شگفتن" و "گوش شگفتن" ہم نہیں جانتے، اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے

ایہو:

نظارہ راز خون دلم گل در آستین　　　خونش مگو، بگو کہ ز چشمم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ چمن از چشم چکیدن، شگفتن گوش و نظر کی مانند غرابت رکھتا ہے۔ یہ خونفشانی چشم کا استعارہ ہے اور خونفشانی صفت چشم ہو سکتی ہے۔ اگر نظر کا خوش ہونا اور کان کا شاد ہونا جائز ہوتا تو ہم اس کا استعارہ بشگفتگی کر لیتے۔ خوش ہونا جب صفت چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں؟

یاد رہے یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا۔ میری بات کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا، بلکہ خوش ہوتا ہوں۔ مگر ہاں ایسی تکرار جیسی بیش اور بیشتر کے باب میں کی تھی۔ ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر۔ جو میں آپ لکھوں گا، تم کو اس کے لکھنے سے کیوں منع کروں گا؟



اے صد ہزار راز نہاں اندریں سخن　　　گر کم سخن تو ئی، نگہت کم سخن مباد

ہر چہ بانفس خود کنم زہدی　　　نیکیش نام مے توانم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم ہیں رہنے دو۔

سرنا کا میم سلامت باد　　　کام را کام مے توانم کرد

میں نہیں سمجھا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ کام کو کام سب کر سکتے ہیں، اس میں لطف کیا ہے؟

ز ترکتازی، آں نازنین سوار ہنوز
ز سبزہ میدمد انگشت زینہار ہنوز[۲]

حزیں[۱] کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط

۱؎ ملی نام، حزیں تخلص، بڑے اونچے خاندان میں سے تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا، جب افغان اصفہان پر مسلط ہوئے اور صفوی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو حزیں ایران سے نکلا۔ جب نادر شاہ ایران پر مسلط ہو گیا تو سندھ کے راستے ہندوستان چلا آیا۔ ملتان، لاہور، دہلی اور آگرہ ہوتے ہوئے بنارس پہنچا اور وہیں رخت اقامت ڈال دیا۔ تھوڑی مدت کیلئے عظیم آباد پٹنہ گیا تھا۔ بنارس ہی میں فوت ہوا۔ آخری دور کا بلند مرتبہ فارسی شاعر مانا جاتا ہے۔

۲؎ یہ حزیں کے دو اگر ... مطلع یہ ہے:
ز ترک تازی آں نازنیں سوار ہنوز

مہمل محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبریل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

بھائی تمہارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اس میں تو مکنید متمم معنی ہے۔ "مکنید" زائد نہیں ہے مگر خرابی یہ ہے کہ فارسی رہنے دو تو اور اگر ہندی کرو تو مصرع مہمل اور بے معنی ہے:

چہ گل، چہ لالہ، چہ نسرین، چہ نسترن، مکنید

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ، کیا موتیا، کیا چمپا نہ کرو، زنہار نہ کرو، یعنی کیا نہ کرو؟ اور جب تمہیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو، تب کوئی جانے، ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ ذکر نہ کرو۔ اے، تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ذکر نہ کرو، حضرت ذکر مضاف کیونکر ہو سکتا ہے گل و لالہ و نسرین و نسترن کی طرف؟ کہو گے کہ ذکر کا لفظ نہیں، بیان کا لفظ اُوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ بیان کا لفظ رسّوں سے اور زنجیروں سے ان چار لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ لکھو، ترجیع بند لکھو، یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں۔ مہمل محض ہے۔ والسلام

اسداللہ

(۲۲)

صاحب! دیکھو، پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی "بیش و بیشتر" کا قصہ نکلا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو، یائے تحتانی تین طرح پر ہے۔

جزو کلمہ:

مصرع: ہمائے بر سر مرغاں ازاں شرف دارد

مصرع: اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزو کلمہ ہے، اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔ دوسری تحتانی مضاف ہے۔ حرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ "فدائے تو شوم"، "رہنمائے تو شوم" یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح، توحید و تنکیر، وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: "آشنائی"۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی "آشنائے" یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، دانا نہ کہاؤ گے۔ ۱۲

"نیم گناہ" و "نیم نگاہ" و "نیم ناز" یہ روزمرّہ اہل زبان ہے۔ نیم بمعنی اندک، ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کا ادھواڑہ اور ناز آدھا یہ مہملات میں سے ہے۔ ان چیزوں کا مناقشہ کیا؟ اگر تم کو "نیم گناہ" پسند نہیں "تازہ گناہ" رہنے دو۔

"خستہ"، "بستہ"، "تازہ"، "غازہ"، "خانہ"، "دانہ"، "آوارہ"، "بیچارہ"، "روزہ"، "بوزہ" ہزار

لفظ ہیں کہ ان کے آگے جب یاے توحید آتی ہے تو اس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ "زرہ"، "گرہ"، "کلاہ"، "شاہ"، "آگاہ"، "آگہہ"، "صبحگاہ"، "صبحگہ" ایسے الفاظ کے آگے تحتانی آتی ہے تو "زرہے"، "گرہے"، "کلاہے"، "شاہے"، "آگاہے"، "آگہے"، "گاہے"، "گہے" لکھ دیتے ہیں ۱۲

غالب

——(۲۳)——

"دیدمست" یہ لفظ نیا بنایا ہے، مقصود تمھارا تو میں نے سمجھ لیا، مگر زنہار اور کوئی نہ سمجھے گا۔ "المعنی فی بطن القائل" کے یہی معنی ہیں "چشمانِ پُرخمار" و "چشمانِ بےحیا" ان دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو۔ ان سب اشعار میں نہ عیب، نہ لُطف۔

دیکھو صاحب، خط میں تم پھر وہی "بیش و بیشتر" کا قصہ لائے ہو۔ "چہ جرم" و "چہ سبب" و "چہ گناہ" پر جو سند لاتے ہو:

عشق است و صد ہزار تمنا مرا چہ جرم

اس کی حاجت کیا ہے؟ "جاناں مددے"، "یاراں مددے" یہ تمام غزل اسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی، تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ ڈالتا؟ دیکھو رفیع السودا کہتا ہے:

نہ ضرر کفر کو، نے دین کو نقصان مجھ سے باعثِ دشمنی، اے گبر و مسلماں مجھ سے؟[1]

غالب کہتا ہے:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

یعنی "اب جو دور مجھ تک آیا ہے، تو میں ڈرتا ہوں"، یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں، مگر:

ہر سخن وقتے و ہر نقطہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں[2]

اگر دریافتی بر دانشت بوس وگر غافل شدی، افسوس، افسوس

روز جمعہ ۱۳ ۔ جنوری ۱۸۵۴ء از اسد اللہ

---

[1] یعنی جب دین و کفر کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچنے کا امکان نہیں تو پھر اے مسلمانو اور غیر مسلمو، میرے ساتھ تم لوگوں کی دشمنی کا کیا سبب ہے۔ [2] یعنی اس فرق کو بیان کے ذریعے سے سمجھانا یا بیان میں لانا مشکل ہے۔ یہ انسان کے ذوق و وجدان پر موقوف ہے۔

—— (۲۴) ——

بندہ پرور،

ایک مہربانی نامہ سکندرآباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا۔ یقین ہے کہ بابو صاحب تمھارے خط کے جواب میں کچھ حال لکھیں گے اور تم موافق اپنے وعدے کے مجھ کو لکھو گے۔ اب جب اس خط کا جواب تمھارے پاس سے آئے گا، تب تمھارے اشعار تم کو پہنچیں گے۔ ہائے ہائے! میر تفضل حسین خاں، ہائے ہائے:

رفتی و مرا خبر نہ کردی — بر بیکسیم نظر نہ کردی

یہاں سُنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا اُن کا، ان کے کام پر مقرر ہوا اور میر ارشاد حسین بدستور نائب رہے۔

۲۳۔ فروری ۱۸۵۴ء — اسداللہ

—— (۲۵) ——

منشی صاحب!

تمھارا خط اس دن، یعنی کل بدھ کے دن پہنچا مجھ میں چار دن سے لرزے میں مُبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت ہے، ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لُطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے۔ ہرگز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ بابو صاحب والا مناقب کا خط تمھارے نام کا دیکھا۔ اب اس ارسال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے۔ کیوں تکلیف کریں؟ اور اگر بہرحال ان کی مرضی ہے تو خیر میں فرمان پذیر ہوں، اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں بعد اچھے ہونے کے ان کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جر ثقیل[1] لکھی گئی ہیں۔

روز پنجشنبہ ۲۔ مارچ ۱۸۵۴ء — اسداللہ

—— (۲۶) ——

میر اسلام پہنچے۔ خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔ سابق اور حال ابھی سب یُوں ہی دھرے رہیں گے۔ اگرچہ گرمی رفع ہو گئی ہے، مینہ برسنے لگا، ہوا سرد چلنے لگی، مگر دل مکدر ہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔ بادشاہ کا قصیدہ بہاریہ اور ولیعہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہہ رکھا تھا۔ اس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کر لیا اور عید کو دونوں پڑھ دیے۔ منشی نبی بخش کو پرسوں یا اترسوں بھیجوں گا۔ اُن سے لے کر تم بھی دیکھنا۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی ہرگوپال صاحب کو بھی دینا کہ وُہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل بھی لے لیں۔ اس کے سوا جو کچھ تمھارے خط میں لکھا تھا، وہ جواب طلب نہیں اور یونہی ہے جو تم

---

[1] لفظی معنی بھاری چیز کا کھینچنا۔ مراد سخت مشقت و تکلیف سے۔

سمجھتے ہو۔

(جون ۱۸۵۴ء)[1] اسد اللہ

—(۲۷)—

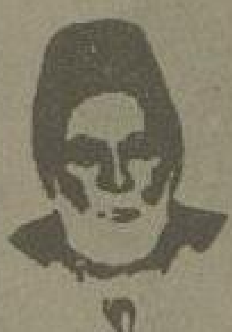
صاحب!

دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کیے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے، میں کہاں تک دیباچے لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے، دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔

صاحب، جہاں تقطیع میں الف نہ سمائے، وہاں کیوں لکھو؟

(۱۸۵۵ء) اسد

—(۲۸)—



صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ، میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان[2] سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار،

---

[1] ۲۷ شوال ۱۲۷۰ھ (۲۷ جون ۱۸۵۴ء) کو عید تھی۔ [2] انگریز

پنسن وار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہُوئے ڈرتا ہُوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام[1] میں نوکر ہُوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہُوا ہُوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں مَیں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا[2] اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہُوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہُوئے یا پکڑے ہُوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست[3] یازدہم مئی[4] سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکّام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے، انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں سے باہر اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہرحال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دے دیا۔

شنبہ ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء

(۲۹)

آج سنیچر بار (ہفتہ) کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمھارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا۔ وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔ میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلّی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آکر کیا کرو گے؟ بنک گھر میں سے خدا کرے تمھارا روپیہ مل جائے۔

بھائی، میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں ہونا جانتے ہیں، فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہُوں۔ کسی طرح کی بازپرس ہو تو بلایا جاؤں مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں لایا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہُوں مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگوبند سنگھ یہاں آئے ہُوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدعا

روز شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء وقت نیمروز — غالب

---

[1] انگریزوں کے خلاف ہنگامہ بپا رہنے کے دوران میں۔ [2] کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ بادشاہ کی غزلیں درست کرتے رہے؛ [3] مارشل لا کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے۔ [4] تاریخ ابتداء ہنگامہ ۱۸۵۷ء۔

(۳۰)

از عمر و دولت برخوردار باشند

بُدھ کا دن، تیسری تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری دیا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈوی، بل جو کچھ کہیے وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مُہری لے کر، "نیل کے کٹڑے" میں چلا گیا۔ سو روپے چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہُوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے، وہ دیے گئے۔ پچاس روپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہُوا ہے، اگر جلد آ گیا تو آج، ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی بڑی آبنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

چار شنبہ ۳۔ فروری ۱۸۵۶ء وقت دوپہر

غالب

(۳۱)

صاحب، تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرہ جاؤں گا۔ تمھارے اس خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ جواب تو لکھ سکتا تھا مگر کلیان کا پانو سُوج گیا تھا۔ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا، ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔ بعد چند روز کے جو کہار اچھا ہُوا، تو میں تم کو آگرہ میں سمجھ کر سکندر آباد خط نہ بھیج سکا۔ مولوی قمر الدین خاں کے خط میں تم کو سلام لکھا۔ کل ان کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرزا تفتہ ابھی یہاں نہیں آئے۔ اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں۔ میرا حال بدستور ہے۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔ حاکم اکبر نے اگر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب میرے آشنائے قدیم ہیں، مگر میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔ تم لکھو کہ اکبر آباد کب جاؤ گے۔ والدعا

جمعہ ۵۔ مارچ ۱۸۵۶ء

غالب

(۳۲)

جانِ من و جانانِ من!

کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کر خط بھیجا۔ شام کو تمھارا خط آیا۔ معلوم ہُوا کہ تم اکبر آباد پہنچے۔ خیر، وہ خط پوسٹ ہو گیا، شاید اُلٹا نہ پھرے۔ اگر پھر آئے گا تو خیر۔ آج یہ خط تم کو اکبر آباد بھیجتا ہوں۔ پہنچنے پر جواب لکھنا۔

تقطیع رباعی کی بہت خُوب، مگر خیر، ہر ایک بات کا وقت ہے۔ ہم کو ہر طرح سے لطفِ صحبت و لطفِ شعر اٹھا لینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کے نام کا خط پڑھ کر ان کو دے دینا اور اس کا مضمون معلوم کر لینا۔ جس حاکم کو میں نے یہ خط اور رقعہ بھیجا ہے، اس کے سررشتہ دار کوئی صاحب ہیں، من پھول ان کا نام ہے۔ مجھ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اگر تعارف ہوتا تو التماس کرتا کہ اس تحریر کو پیش کیجیے۔ کاش تم سے آشنائی ہوتی تو تمھیں اُوپر اُوپر ایک خط لکھ کر ان کو بھیج دیتے کہ غالب ایک فقیر گوشہ نشین اور بے گناہ محض اور واجب الرحم ہے۔ اس کے حصول مطالب میں دریغ نہ کرنا۔[1]

---

[1] من پھول غالباً وہی پنڈت من پھول ہے جو دہلی کالج کا تعلیم یافتہ تھا۔ اور پنجاب میں لفٹنٹ گورنر کا (باقی اگلے صفحہ پر)

چرخ کج رو را اگر دانیم کز یاران کیست　　نامۂ سفارش استغنا آورد تواں نمے

باقی جو حال ہے وہ بھائی کے نام کے ورق میں لکھ چکا ہوں۔ تم پڑھ لوگے، دوبارہ لکھنا کیا ضرور؟

شنبہ ۶۔ مارچ ۱۸۵۸ء۔ جواب طلب

(۳۳)

صاحب،

تمھاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفرین۔ تم کو یوں ہی چاہیے تھا، لیکن میں نے تو ایک بات بطریق تمنا لکھی تھی، جیساکہ عربی میں "لیت" اور فارسی میں "کاشکے"۔

اب تم روداد سنو۔ عرضی میری سر جان لارنس[1] چیف کمشنر بہادر کو گزری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ کلکٹر صاحب کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں توان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ کر بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے جو اس کو دیکھیں گے۔

بہر حال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور یہیں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور یہی کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا[2]۔

مولوی قمر الدین خاں کا کول نہ جانا اور راہ سے پھر آنا معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ ان کو زندہ اور سلامت رکھے۔ میرا سلام کہنا اور یہ خط پڑھا دینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو میرا سلام اور ان کے بچوں کو دعا کہنا اور یہ خط ضرور ضرور پڑھا دینا اور کہنا کہ بھائی بدایت[3] تو اچھی ہے، نہایت[4] بھی خدا اچھی کرے، وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴) میر منشی ہو گیا تھا۔ اسی کے زیر سرکردگی ایک وفد سیاسی حالات معلوم کرنے کیلیے جولائی ۱۸۶۵ء میں ترکستان بھیجا گیا، جو کم و بیش آٹھ مہینے وہاں رہا۔ اس میں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد مرحوم بھی شامل تھے، آزاد اور ایک منشی فیض بخش پشاوری ترکستان بھی گئے لیکن پنڈت من پھول فیض آباد سے آگے نہ بڑھا۔ [1] یہاں سر جان لارنس ہونا چاہیے جو سر ہنری لارنس کا چھوٹا بھائی تھا، اس لیے کہ اول پنجاب کا چیف کمشنر وہی مقرر ہوا تھا دوم سر ہنری لارنس اس خط کی تحریر سے کم و بیش آٹھ مہینے پیشتر لکھنؤ میں مارا گیا تھا۔ سر ہنری پنجاب میں انتظامی بورڈ کا صدر رہا تھا اور ۱۸۵۳ء میں بورڈ ختم ہو گیا تھا۔ [2] یعنی اہل ہنگامہ سے۔ [3] آغاز، ابتدا۔ [4] انجام۔

روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور راجنٹی وکمشنری و دیوانی و فوجداری وکلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے، مشتمل اس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جائے کہ یوں کرو، عملہ نے خط نہ لکھا، صرف وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔ خیر،

ہر چہ از دوست مے رسد نیکوست

سنو، میرزا تفتہ! اب میں جو اپنا حال تم کو لکھا کروں، وہ تم میرے بھائی کو اور مولوی قمرالدین خاں کو دکھا دیا کرو۔ تین تین جگہ ایک بات کو کیوں لکھوں؟

جمعہ ۱۲۔ مارچ ۱۸۵۸ء

(۳۴)

صاحب!

کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین کا سلام بھی آیا اور بھائی[1] منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنسن کے فکر میں تھے۔ ظاہرا یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالےٰ ان کی جو مراد ہو بر لائے۔ ان کو میرا سلام کہہ دینا۔ بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا۔ مولوی قمرالدین خاں کو بھی میرا سلام کہنا۔

تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔

یک شنبہ ۱۲۔ اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۵)

میرزا تفتہ!

عجب اتفاق ہوا۔ پنجشنبہ کے دن ۲۲۔ اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا۔ اس کے متعاقب پارسل کا ہرکارہ آیا اور تمہارا بھیجا ہوا پاکٹ لایا۔ رسید لکھنی میں نے زائد سمجھی اور اس کا دیکھنا شروع کیا۔ بے کار محض اور تنہا ہوں۔ پانچ پہر کا دن۔ میری بڑی دل لگی ہو گئی۔ خوب دیکھا۔ سچ تو یوں ہے کہ ان اشعار سے میں نے بہت حظ اٹھایا۔ جیتے رہو، تمہارا دم غنیمت ہے۔

بھائی[1] کا حال مفصل لکھو۔ پنسن کے طالب ہیں یا نوکری کے؟ منشی عبداللطیف[2] کہاں ہے؟ اور کس طرح ہے؟ علاقہ بنا ہوا ہے یا جاتا رہا؟ صاحب لفٹننٹ گورنری کا محکمہ بالکل الہ آباد کو گیا یا ہنوز کچھ یہاں بھی ہے؟ منشی غلام غوث صاحب کہاں ہیں؟ نوکر ہیں یا مستعفی؟ عدالت دیوانی کا محکمہ یہیں رہے گا یا الہ آباد جائے گا؟ اور اس کا اور گورنری

---

[1] منشی نبی بخش حقیر [2] حقیر کا فرزند۔

کے محکمے کا ساتھ ہے، چاہیے یہ بھی وہیں جائے۔ آج تمھارے اشعار کا کاغذ پمفلٹ پاکٹ اسی خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجا گیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ دن میں پہنچ جائے۔

یک شنبہ ۲۵۔اپریل ۱۸۵۹ء غالب

(۳۶)

صاحب!

۲۵۔اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں۔ آج ۳۰ ہے۔ یقین ہے خط اور پارسل دونوں پہنچ گئے ہوں گے۔ ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں۔ ایک میرا دوست اور تمھارا ہمدرد[1] ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ ۱۸-۱۹ برس کی عمر، قوم کا کھتری، خوب صورت وضعدار نوجوان۔ ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک "تاریخ" اس کے مرنے کی لکھوں، ایسی کہ وہ فقط "تاریخ" نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی، اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک۔ معہذا، یہ واقعہ تمھارے حسبِ حال ہے۔ جو خونچکاں شعر تم نکالو گے، وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بطریق مثنوی بیس پچیس شعر لکھ دو۔ مصرع آخر میں مادہ تاریخ ڈال دو۔ نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو "بابو" "بابو" کہتے تھے۔ چنانچہ میں بحر ہزج مسدس مخبوں میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں۔ چاہو اس کو آغاز میں رہنے دو اور آیندہ اسی بحر میں اور اشعار لکھ دو، چاہو کوئی اور طرح نکال لو۔ لیکن یہ خیال رہے کہ سائل کو متوفی کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور "بابو برج موہن" سوا اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ میرا شعر یہ ہے:

چکد خونِ دلِ ریش از لبِ من   برم چوں نام بابو برج موہن

نگاشتہ روز جمعہ سی، ام اپریل ۱۸۵۹ء غالب

(۳۷)

بھائی!

وہ پہلا خط تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارۂ ریوند[2] اور ارنڈی کا تیل[3] پیا۔ اس وقت تو بچ گیا مگر قصّہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں۔ میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنّا[4] اور آلو بخارے کا افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے خوفِ مرگ گیا ہے۔ صورت زیست

---

[1] یہاں "ہمدرد" کے معنی مونس اور غمخوار کے نہیں ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسے بھی وہی درد ہے جو تمھیں ہے۔ تفتہ کے ایک بیٹے پیتمبر سنگھ کا انتقال ہو گیا تھا، جس کی وفات پر نہیں سو بائیس شعر کا مرثیہ کہا تھا۔ جس شخص کا ذکر غالب نے کیا، اس کے بھی لے پالک بیٹے کا انتقال ہو گیا تھا۔

[2] ریوند ایک اسہال آور دوا، اسے پانی میں بھگو کر اور چھان کر پیتے ہیں، اسے عصارہ یا افشردہ کہتے ہیں۔ [3] انگریزی کیسٹر آئل۔ [4] شربت جو املی کو پانی میں ملا کر بناتے ہیں۔

کی نظر آئی ہے۔ آج صبح کو بعد دوا پینے کے تم کو یہ خط لکھا ہے۔ یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

صاحب! وہ جو میں نے بائیس شعر مرثیہ کے لکھ کر تم کو بھیجے، اس سے مقصود یہ تھا کہ تم اپنے اشعار دوسرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ تمہاری تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زدہ ہے اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ کچھ اوپر اسّی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ لیا۔ اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب دست و گریباں تھے۔ ایک کو ایک سے ربط۔ ایک یا دو شعر اس میں سے کیوں کر لیے جاتے؟ اشعار سب بڑے پسند، بے سقم، بے عیب۔ وہ جو تم لکھتے ہو کہ:

حرف بابو برج موہن سے زنم

اور اس کا دوسرا مصرع بھول گیا ہوں، مگر قافیہ اس "من" ہے، یہ شعر غالب کو برا معلوم ہوا ہوگا۔ واللہ باللہ جب تک تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہر حال بات وہی ہے، جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔

بارے، اب بھی بھائی منشی نبی بخش صاحب اور مولوی قمر الدین خاں صاحب روزوں کے متوالے، ہوش میں آئے یا نہیں آئے؟ آج ۱۰ شوال ۱۲۷۴ھ کی ہے۔ ششہ[1] عید کا بھی زمانہ گزر گیا۔ خدا کے واسطے ان کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کی نظر انور سے گزرانو۔ شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔

محررہ و مرسلہ دو شنبہ ۴۔ مئی ۱۸۵۸ء   غالب

—(۳۸)—

کیوں صاحب!

مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینا بھر ہو گیا ہوگا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلعے سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں[2] کے آنے کی توقع۔ اس میں دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔

سنو صاحب، اپنے اوپر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کام آ پڑا، دو خط، تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔ بھائی صاحب کا خط بھی دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا۔ اس کا جواب بھیج دیا گیا۔ مولوی قمر الدین خاں یقین ہے کہ الٰہ آباد گئے ہوں گے، کس واسطے کہ مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔ بہر حال اگر آپ آزردہ نہیں تو جس دن میرا خط پہنچے، اس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھیے۔ اپنی خیر و عافیت، منشی صاحب کی خیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال، اس سے سوا گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو

---

[1] عید الفطر کے بعد چھ دن، جن میں روزہ رکھنا سنت ہے۔ [2] ان سے مراد نبی بخش حقیرؔ، مولوی قمر الدین خاں اور تفتہؔ ہیں۔

معلوم ہوا ہو، وہ الفاظ مناسب وقت ہیں ضرور لکھنا۔ راجہ جو وہاں آیا ہوا ہے، اس کی حقیقت؛ دھول پور کا رنگ؛ صاحبانِ عالی شان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے؟ وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں؟

نگاشتہ شنبہ ۱۹۔ جون ۱۸۵۸ء غالب

(۳۹)

جیتے رہو اور خوش رہو:

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

زیادہ خوشی یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرواز دے دیا تھا۔ گرمی ہنگامۂ انطباع دیوان وغیرہ میں پہلے جانتا ہوں۔ بنک گھر کا روپیہ مصرف کا غذ و کاپی ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ مغتنمات سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور نے جو "فسانۂ عجائب" لکھا ہے، آغاز داستان کا شعر مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے اور "یاد رکھنا فسانہ" کے واسطے کتنا مناسب۔

منشی عبداللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے اور تہنیت کا بھائی کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جو ان سے ملو تو میرا سلام کہہ کر اس خط کے پہنچنے کی اطلاع لے لینا۔ مولوی معنوی[1] جب کانپور سے معاودت فرمائیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ میرا حال بدستور:

ہماں پہلو، ہماں بستر، ہماں درد

شنبہ ۲۶ جون ۱۸۵۸ء روز ورود نامہ غالب

(۴۰)

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور، پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر کرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا، اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھے بھی معلوم نہیں۔ میرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا اور میرا یہ شعر میری زبان سے پڑھ دینا:

شرطِ اسلام بود ورزش ایماں بالغیب
اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان من است

---

[1] مولوی قمرالدین کی طرف اشارہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اوپر کا شعر مظفر کا ہے۔ غالب نے اسے سرور کا نہیں لکھا صرف یہ لکھا ہے کہ آغاز داستان کا شعر... الخ

تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے۔ تمھاری توجہ فقط بہ طرف شعر و سخن کے تمھاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے اور بھائی یہ جو تمھاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے[1]۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے، اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو! ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔

(۴۱)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ بہت دنوں سے خط کیوں نہیں لکھا؟ آگرہ میں ہو یا نہیں؟ میرزا حاتم علی صاحب کا شفقت نامہ آیا، یہاں سے اس کا جواب بھیجا گیا۔ وہاں سے جواب آگیا۔ میر مکرم حسین کا خط پرسوں آیا۔ دو چار دن میں اس کا جواب لکھوں گا۔ میرا حال بدستور ہے:

نہ نوید کامیابی، نہ نہیب ناامیدی

بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور میرے خط کے جواب میں ہے۔ دو ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب ان کو خط لکھوں گا۔ تم اگر ملو تو ان سے کہہ دینا کہ بھائی قاسم علی خاں کے شعر نے مجھ کو بڑا مزا دیا۔ حسن اتفاق یہ کہ کئی دن ہوئے تھے، میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گز ولال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ لے کر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے

---

[1] یہ صرف اس لیے کہا کہ صرف یہی مقطع اور ایک مصرع یہاں لکھنا منظور تھا۔

وقت آیا۔

۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء　　　　غالب

(۴۲)

میرزا تفتہ، کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹا کرتا ہے، آیا اور اس نے پارسل موم جامے میں لپیٹا ہوا دیا۔ پہلے تو میں بھی حیران رہا کہ پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا۔ بارے اس کی تحریر دیکھی، تو تمھارے ہاتھ کا پمفلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے ہوے، مگر اس کے آگے کالی مُہر اور کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارے نے کہا، ایک روپیہ دس آنے دلوایئے۔ دلوا دیے اور پارسل لے لیا۔ مگر حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا۔ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمھارا آدمی جو ڈاک گھر گیا، اس کو خطوں کے بکس میں ڈال آیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے غور نہ کی اور اس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیج دیا۔

وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں، یعنی منشی بھگوان پرشاد مُشکوان، میرا سلام قبول کریں۔

۲۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء　　　　غالب

(۴۳)

میرزا تفتہ!

تمھارے اوراق مثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں ۱۵۔ اگست کو اور جناب میرزا[1] حاتم علی صاحب کی نثر شاید آغاز اگست میں روانہ کر چکا ہوں۔ اس نثر کی رسید نہیں پائی اور نہیں معلوم کہ میری خدمت مخدوم کے مقبول طبع ہوئی یا نہیں؟ نہیں معلوم مولوی قمرالدین خاں الہ آباد سے آ گئے یا نہیں؟ میر منشی قدیم[2] وہاں پہنچ گئے، اپنا کام کرنے لگے یا کر رہے ہیں! آپ کو تاکید لکھتا ہوں کہ ان تینوں باتوں کا جواب الگ الگ لکھیے اور جلد لکھیے۔ اس خط کے پہنچنے تک اغلب ہے کہ پارسل پہنچ جائے، اس کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا۔

اب ایک اور بات سنو۔ میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً تمھارا نام "منشی ہرگوپال"۔ منشی لفظ عربی ہے، نہیں لکھا گیا، اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے۔ یہ چھاپا۔ نہ گنجان، اوراق بے سطر پر اس طرح کہ کسی صفحہ میں بیس سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں انتیس سطر بھی آئے، چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔

۱؎ حاتم علی بیگ مہر　　　　۲؎ منشی غلام غوث خاں بے خبر

اگر لیبس سطرِ نئے سطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آجائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں کہ ایک ہے۔ اس میں کاپی نگار خوشنویس نہیں ہے۔ اگر آگرہ میں اس کا چھاپا ہو سکے، تو مجھ کو اطلاع کرو۔ اس نسخ و تین اور بے نوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں۔ لیکن صاحب مطبع اتنے پر کیوں مانے گا اور البتہ چاہیے، اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پان سات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین یا چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہوگی، رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہوگئی۔ حاشیے پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے بہرحال اگر ممکن ہو تو اس کا تکدمہ کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو۔ اگر منشی قمرالدین خاں آ گئے ہوں تو ان کو بھی شریک مصلحت کرلو۔ ان تینوں باتوں کا جواب اور پارسل کی رسید اور اس مطلب خاص کا جواب، یہ سب ایک خط میں پاؤں۔ ضرور، ضرور، ضرور، جواب طلب، واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا جاتا ہے۔

نگاشتہ و رواں داشتہ، سہ شنبہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء غالب

(۴۴)

بھائی!

تمہارا وہ خط جس میں اوراق مثنوی ملفوف تھے، پہنچا۔ اوراق مثنوی، اوراق "دستنبو" کے ساتھ پہنچیں گے۔ اب تمہارے مطالب کا جواب جدا جدا لکھتا ہوں۔ الگ الگ سمجھ لینا۔

صاحب، تم نے میرزا حاتم علی صاحب سے کیوں کہا؟ بات اتنی تھی کہ مجھ کو لکھ بھیجتے کہ نثر آئی اور مرزا نے پسند کی۔ اب ان سے میرا سلام کہو اور یہ کہو کہ آپ کے شکر بجا لانے کا شکر بجا لاتا ہوں۔

چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا۔

جیتے رہو۔ اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسایا۔ وہ کون مُلّا تھا، جس نے تم کو پڑھایا؟

گرچہ عمل کار خردمند نیست

"عمل کار"، "اہل کار"

یہ شعر شیخ سعدیؒ کا بادشاہ کی نصیحت میں ہے،

جز بخردمند مفرما عمل

یعنی خدمت و اعمال سوائے علماء اور عقلا کے اور کی تفویض نہ کر۔ پھر خود کہتا ہے،

گرچہ عمل کار خرد مند نیست

"یعنی اگرچہ خدمات و اشغالِ سلطانی کا قبول کرنا خردمندوں کا کام نہیں اور عقل سے بعید ہے کہ آدمی اپنے کو خطرے میں ڈالے۔" "عمل" الگ ہے اور "کار" مضاف ہے بطرف خردمند کے، ورنہ دہائی خدا کی "عمل کار"، "اہل کار" کے معنی پر نہیں آتا۔[۱] مگر قتیل[۲] اور واقف[۳] یا اور پورب کے ملکیوں کی فارسی۔

—(۴۵)—

صاحب،

عجب اتفاق ہے، آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط جاگیر کے گانو کی تہنیت میں اپنے شفیق[۴] کو ڈاک میں بھیج چکا تھا کہ دوپہر کو رضی الدین نیشاپوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ تضارا جب میں نے اس کو کھولا، اسی ورق میں یہ مطلع نکلا:

اگر بہ گنج گہر یلم او فتاد چہ باک
کف جواد ترا از برائے آں دارم

۱؎ مطلب یہ ہے کہ تفتہ نے "گرچہ عمل کار خرد مند نیست" میں "عمل کار" کو ایک لفظ بمعنی اہل کار سمجھا، حالانکہ عمل بمعنی شغل ملازمت ہے اور "کار"، "خرد مند" کی طرف مضاف ہے، جیسا کہ غالب نے کھول کر بتایا ہے۔ ۲؎ قتیل، اصل میں کھتری تھا، فرید آباد کا باشندہ مشہور تھا اور میرا خیال ہے اس سے فرید آباد قصبہ مراد نہیں بلکہ دہلی کے ایک محلے کا نام مراد ہے، جسے سید فرید بخاری مخاطب بہ مرتضیٰ خاں جہانگیری نے آباد کیا تھا۔ "مآثر الامرا" میں بہ سلسلہ احوال مرتضیٰ خاں اس کا ذکر آیا ہے۔ بعد میں قتیل مسلمان ہو گیا اور محمد حسن نام رکھا۔ فارسی نظم و نثر میں شہرت پا کر میرزا محمد حسن قتیل مشہور ہوا۔ لکھنؤ میں ۱۸۲۳ء میں بہ عہد غازی الدین حیدر وفات پائی۔ ۳؎ واقف، بٹالہ کے قاضی، نورالعین نام، قاضی امانت اللہ کے فرزند تھے۔ عام طور پر یہ واقف لاہوری مشہور ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے دوست تھے۔ آزاد نے ان کا حال "خزانہ عامرہ" میں لکھا ہے۔ عبدالحکیم حاکم لاہوری کے ساتھ حج کے لیے نکلے۔ اورنگ آباد ہوتے ہوئے سورت پہنچے۔ حاکم جہاز پر سوار ہو کر حجاز پہنچ گیا۔ واقف ضعف جسمانی اور ہجوم امراض کے باعث سمندر کا سفر نہ کر سکے اور سورت میں ٹھہرے رہے۔ حاکم کی واپسی پر اورنگ آباد گئے۔ وہاں سے پنجاب آ رہے تھے۔ راستے میں ڈاکوؤں نے سب کچھ لوٹ لیا۔ میر غلام علی آزاد کو حادثہ کی خبر دیتے ہوئے یہ شعر بھی لکھا:

عینکے و پارۂ سیماب با من ماندہ است
چشم حیران و دل بیتاب با من ماندہ است

سیماب اس لیے ساتھ تھا کہ واقف کو کیمیاگری کا شوق تھا۔ آزاد نے واپسی کا سر و سامان کر دیا۔ اس طرح بٹالہ پہنچے۔ ان کا دیوان چھپا ہوا موجود ہے۔ غالب، واقف یا قتیل کو فارسی میں مستند نہیں مانتے تھے۔

۴؎ غالباً حاتم علی بیگ مہر۔

چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ ناگاہ تمھارا خط آیا۔ مجھ کو لکھنا ضرور ہوا۔ آج تمھیں دو خط بھیجے ہیں، ایک تو صبح کو پوسٹ پیڈ اور ایک، اب بارہ پر تین بجے بیرنگ۔ اس شعر کو اب چاہیے رہنے دو۔

ہائے ہائے، تم بھائی صاحب سے ملے "غیاث اللغات" کھلوائی جواد کا لغت دیکھا، مگر میرا ذکر نہ کیا کہ وہ تمھارا جویائے حال ہے۔ "دستنبو" اور اس کے چھاپے کا ذکر نہ کیا۔ البتہ تم ذکر کرتے تو وہ دونوں کے باب میں کچھ فرماتے اور مجھ کو دعا سلام کہہ دیتے۔ چونکہ تم نے اپنے خط میں کچھ نہیں لکھا، اس سے معلوم ہوا کہ بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر اُنھوں نے کچھ نہیں کہا تو ان کا ستم اور ان کا کہا ہوا تم نے نہیں لکھا تو تمھارا کرم۔ بہرحال خوب مصرع حافظ کا تم نے مجھ کو یاد دلایا ہے:

یارب مباد کس را مخدوم بے عنایت

خواہی تم، خواہی منشی نبی بخش سلمہ اللہ تعالیٰ، یہ یاد رہے یہ مصرع اگر مجھ پر زنجیر سے باندھو گے تو بھی نہیں بندھے گا۔ اگر "دستنبو" کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تمھاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے۔

آخر روز دوشنبہ ۲۳۔ اگست ۱۸۵۸ء غالب

(۴۶)

نُورِ نظر و لختِ جگر، مرزا تفتہ!

تم کو معلوم رہے کہ رائے صاحب مکرم و معظم رائے امید سنگھ بہادر[۲] یہ رقعہ تم کو بھیجیں گے۔ تم اس رقعہ کو دیکھتے ہی ان کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں رہیں، تب تک حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو ان کا حکم ہو، بجالانا۔ ان کو پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کردیں گے، وہ لے لینا۔ جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بموجب ان کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا اور وہ جو میں نے پانچ جلد کی آرائش کے باب میں تم کو لکھا ہے، اس کا حال مجھ کو ضرور لکھنا۔

ہاں صاحب، ایک رباعی میرے سہو سے رہ گئی ہے۔ اس رباعی کو چھاپا ہونے سے پہلے حاشیے پر لکھ دینا۔ جہاں یہ فقرہ ہے: نئے نئے اختر بخت خسرو در بلندی بجائے رسید کہ رُخ از خاکیاں نہفت:

جائے کہ ستارہ شوخ چشمی ورزد   افسر افسار و گرزن ارزن ارزد[۳]
خورشید ز اندیشۂ جا در گردش[۴]   بر چرخ نہ بینی کہ چساں مے لرزد

چونکہ حاشیہ معنی لغات سے بھرا ہوا ہے، تو تم اس فقرے کے آگے نشان بنا کر اُوپر کے حاشیے پر رباعی لکھ دینا اور حاشیۂ یمین پر جہاں اور معنی لکھے ہوئے ہیں، وہاں رباعی کے لغات کے معنی خفی قلم سے لکھ دینا۔ "افسر"، "افسار"،

[۱] نبی بخش حقیر [۲] دہلی کالج میں تعلیم پاکر ہلکر کا اتالیق مقرر ہوا۔ ہلکر نے ۱۸۵۲ء کو حکومت سنبھالی تو امید سنگھ کو خلعت و انعام گراں بہا کے علاوہ وزیر الدولہ خطاب چھ ہزار کی جاگیر نسلاً بعد نسلٍ اور چھ ہزار سالانہ تنخواہ تاحیات مقرر کی [۳] افسر، تاج، افسار، گھوڑے کے ماتھے کا ساز، گرزن، تاج، ارزن، چینا [۴] جا در گردش، تغیر احوال۔

"گزن" (بہ ہر دو فتحہ)، "چادر گردش"۔

نگاشتہ ۲۸۔ اگست ۱۸۵۸ء　　　　غالب

(۴۷)

صاحب! عجب تماشا ہے۔ تمھارے کہے سے منشی شیو نرائن صاحب کو خط لکھا تھا، سو کل اُن کا خط آیا اور اُنھوں نے "دستنبو" کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو ان کے پاس لے نہ گیا ہوگا، آخر تمھیں نے بھیجا ہوگا۔ یہ کیا تم نے مجھ کو اس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا؟ اگر یہ گمان کیا جائے کہ تم نے رائے امید سنگھ کی ملاقات ہو لینے پر خط لکھنا منحصر رکھا ہے، تو وہ بھی ہو چکی ہوگی۔ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو۔ کتاب مطبع میں حوالے کر دی، اب اس کی تزیین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے درگزرا، سیکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے اور پھر اس وحشت کی وجہ کیا؟ بے تکلف قیاس چاہتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو؟ خدا کے واسطے خفگی کی وجہ لکھو۔ صبح کو میں نے یہ خط روانہ کیا ہے، بدھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ۔ اگر شام تک تمھارا خط آیا تو خیر، ورنہ تمھاری رنجش کا بالکل یقین ہو جائے گا اور بہ سبب وجہ نامعلوم ہونے کے جی گھبرائے گا۔ میں تو اپنے نزدیک کوئی سبب ایسا نہیں پاتا۔ خدا کے واسطے جلد خط لکھو۔ اگر خفا ہو تو خفگی کا سبب لکھو۔

جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے۔ عیاذاً باللہ! میں اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ دستنبو کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔

اگرچہ ایسے حال میں کہ مجھ کو تم پر الگ ہونے اور پہلو تہی کرنے کا گمان گزرا ہے، کوئی مطلب تم کو لکھنا نہ چاہیے، مگر ضرورت کو کیا کروں؟ ناچار لکھتا ہوں۔ صاحب مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے، "مرزا نوشہ صاحب غالب"۔ للہ غور کرو کہ یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اوّل کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ کیا "فارسی کا دیوان" یا "اُردو" یا "پنج آہنگ" یا "مہر نیمروز" چھاپے کی یہ کوئی کتاب اس شہر میں نہیں پہنچی جو میرا نام دیکھ لیتے؟ تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ دِلّی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے لیکن کلکتہ سے ولایت تک، یعنی وزراء کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا۔ میری محنت رائیگاں گئی۔ گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔ لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دیتے ہو یا نہیں۔

بدھ کا دن، ستمبر کی پہلی تاریخ ۱۸۵۸ء　　　　غالب

(۴۸)

للہ الشکر، تمھارا خط آیا اور دل سودا زدہ نے آرام پایا۔ تم میرا خط اچھی طرح نہیں پڑھا کرتے۔ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آجائے۔ میں نے لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔ بہ ہر حال اس نمونے کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں۔ اس کی روش دل آویز

اور تقسیم نظر فریب ہو۔ رباعی حاشیے پر لکھ دی، اچھا کیا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب سے نثر کے دو فقرے جس محل پر کہ اُن کو بنائے ہیں، ضرور لکھوا دینا۔ میں نے جو تم کو "میرزائی" کا خطاب دیا ہے، ان فقروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔

بہت ضروری یہ امر ہے اور میں منشی شیو نرائن صاحب کو آج صبح لکھ چکا ہوں، تیسرے صفحہ کے آخر یا چوتھے صفحہ کے اوّل یہ جملہ ہے:

"اگر دردم دیگر بہ نہیب "مباش" بہم زند"

"نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دینا۔

"بہ نوائے مباش بہم زند"

"نہیب" لفظ عربی ہے۔ اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔

رائے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی۔ حق تعالیٰ ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔

صاحب، کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آ پڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی کا ہو گیا ہے۔ چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ تمھارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیوں کر چاہیے۔ سُنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی پھیر دیتے ہیں تاکہ حروف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صنّاعی اور ہوشیاری اُن کی میرے کس دن کام آئے گی؟

میرزا تفتہ، تم بڑے بے درد ہو۔ دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسّر نہیں، صحّاف اور نقّاش کہاں؟ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ قصّہ مختصر، یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں۔ اگر وہ مجھ کو اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں، تو کیا عجب ہے، دو روپے فی جلد، اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے ہنڈوی بھیج دوں گا۔ چھ روپے، آٹھ روپے، دس روپے، حد بارہ روپے۔ میاں کو سمجھا دینا کمی کی طرف نہ گریں، اچھی چیز بنے۔ نہایت بارہ روپے میں چھ جلدیں تیار ہوں۔

منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلّص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے[1]، مگر ہاں نام کے بعد لفظ "بہادر" کا اور "بہادر" کے بعد تخلص "اسد اللہ خاں بہادر غالب"۔

بھائی، تم نے اوراق مثنوی کی رسید نہ لکھی۔ کہیں وہ پارسل میں سے گر تو نہ گئے ہوں۔ دیکھو کس لُطف سے میرے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ "میرزا نوشہ" نہ لکھیں اور نہ "نجم الدولہ، دبیر الملک"، "نظام جنگ" جو میرزا کے اجزائے خطاب تھے۔

نام کی حقیقت بیان ہوئی ہے اوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے مگر اس کی عبارت کیا بتاؤں۔ صاحبِ مطبع اس امر کو اردو میں آخر کتاب پر لکھ دیں۔ منشی جی سے نثر لکھوالو، منشی عبداللطیف کو یہ خط پڑھوا دو۔ "نہیب" کی جگہ "نواسے" بنا دو، صاحبِ مطبع کو میرا نام بتا دو۔ خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو۔ برخوردار عبداللطیف سے مقدار روپے کی دریافت کر کے مجھ کو لکھ بھیجو۔ اپنی مثنوی کی رسید لکھو۔ اپنے بجان و دل مصروف ہونے کا اقرار کرو۔ ان سب امور کی مجھے خبر دو۔

جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز

غالب

(۴۹)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ دونوں فقرے جس محل پر بتائے ہیں، حاشیے پر لکھ دیے ہوں گے! "نہیب" کے لفظ کو چھیل کر "نواسے" بنا دیا ہوگا۔ برخوردار منشی عبداللطیف کو میرا خط اپنے نام کا دکھا دیا ہوگا۔ ان کی سعادت مندی سے یقین ہے کہ میری التماس قبول کریں اور ادھر متوجہ ہوں۔ کاپی لکھی جانی اور چھاپا ہونا شروع ہو گیا ہو۔ اگر پتھر بڑا ہے تو چاہیے آٹھ آٹھ صفحے بلکہ بارہ بارہ صفحے چھاپے جائیں اور کتاب جلد منطبع ہو جائے۔

بھائی، منشی صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضرور نہیں۔ مجھ پر مہربان اور حسن کلام کے قدردان ہیں۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح[1] کے روادار ہوں گے؟ بھائی، تم نے بھی اور منشی شیو نرائن صاحب نے بھی لکھا۔ میں ایک عبارت لکھتا ہوں اگر پسند آ جائے تو خاتمہ کتاب میں چھاپ دو۔

"نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع "مفید خلائق" میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبانِ مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے پر جرأت نہ کریں۔"

اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیو نرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔

یہ سب باتیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اب دو امر ضروری الاظہار تھے، اس واسطے یہ خط لکھا ہے: ایک تو اردو عبارت، دوسرے یہ کہ میرے شفیق مکرم سید مکرم حسین صاحب کا خط میرے نام آیا ہے اور انھوں نے ایک بات جواب طلب لکھی ہے۔ اس کا جواب اسی خط میں لکھتا ہوں۔ تم کو چاہیے کہ ان سے کہہ دو، بلکہ یہ عبارت اُن کو دکھا دو۔

بندہ پرور نواب عطاءاللہ خاں میرے بڑے دوست اور شفیق ہیں۔ ان کے فرزند رشید میر غلام عباس المخاطب بہ سیف الدولہ یہ دونوں صاحب صحیح و سالم ہیں۔ شہر سے باہر دو چار کوس پر کوئی گاؤں ہے، وہاں رہتے ہیں۔ شہر میں اہل اسلام کی آبادی کا حکم نہیں اور ان کے مکانات قرق ہیں۔ نہ ضبط ہو گئے ہیں، نہ واگذاشت کا حکم ہے۔

---

[1] رسوائی



(۵۰)

مشفق میرے، کرمفرما میرے!

تمہارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں۔ ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحہ پر کتاب کا نام اور مصنّف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دُوسرے صفحہ پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہوگا۔ غرض کہ تقطیع اور شمار سطور اور کاپی کا حسن ضبط اور الفاظ کی صحت سب میرے پسند، صحت الفاظ کا کیا کہنا ہے، واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بدل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخہ میں سہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ تم میری طرف سے ان کو سلام کہنا بلکہ یہ خط دکھا دینا۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرز تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحہ کی صورت اور دوسرے صفحہ کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہوگی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ "فرنچ" کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذر حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو "شیورام پوری" پر اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلف محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ ہوں؟ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو تو خیر دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں "شیورام پوری" پر ہوں۔ باقی جلدوں میں تمہیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔ آگے اس سے میں نے برخوردار منشی عبداللطیف کو لکھا تھا کہ ان چھ کتابوں کی کچھ تزئین اور آرایش کی فکر کریں۔ معلوم نہیں تم نے وہ پیام ان کو پہنچایا یا نہیں۔ آپ اور منشی عبداللطیف اور میرزا حاتم علی صاحب مہر باہم صلاح کریں اور کوئی بات خیال میں آوے تو بہتر ورنہ ان چھ نسخوں کی جلدیں انگریزی ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو روپے کی لاگت سے بنوا دینا اور اس کا روپیہ تیاری سے پہلے مجھ سے منگوا لینا۔

آنکہ ہمہ را دریک دم بہ نوید "بشو" پدید آورد، اگر در دمِ دیگر بہ نہیب "مباش" بہم زند.... الخ

اس میں "نہیب" کا لفظ کچھ میری سہل نگاری سے اور کچھ سہو کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاقو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا، یعنی "بہ نوائے "مباش" بہم زند"۔ ضرور، ضرور اور اس کا انتظار نہ کیجیو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا تو بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے، نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزا لے اصل میرا میر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو ان کو یا بھائی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔

روز سہ شنبہ ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء

از غالب

(۵۱)

اچھا، میرا بھائی "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وُہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمّی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبا لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودہ میں بنا دیا تھا، لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔ لکھتے ہو کہ مرزا صاحب دو جلدیں درست

کریں گے۔ یہ تو صورت اور ہے، یعنی میں نے چھ جلدیں بارہ روپے کی لاگت میں بہ کارسازی و ہنر پروازی برخوردار منشی عبداللطیف چاہی تھیں۔ منتظر تھا کہ اب ان کا قبول کرنا مجھ کو لکھو گے اور روپیہ مجھ سے منگواؤ گے۔ ظاہرا عبداللطیف نے پہلوتہی کی۔ مرزا صاحب اگر کفیل ہوئے تھے تو چھ جلدیں بنواتے، نہ کہ دو۔ البتہ اس احتمال کی گنجائش ہے کہ وہ بہت پُرتکلف اور چار بہ نسبت اس کے کچھ کم۔ اگر یوں ہے تو یہ تو مدعائے دلی میرا ہے، مگر اطلاع ضرور ہے۔

رائے امید سنگھ کے نام کا خط بہ احتیاط رہنے دو۔ جب وہ آئیں ان کو دے دو۔ جو تم لکھتے ہو کہ "نہیب" کا لفظ لکھ دیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاپا شروع ہو کر دور تک پہنچ گیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ کتابیں جلد منطبع ہو جائیں۔

ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں؟

میرزا تفتہ، سنو: ان دنوں میں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں "آفتاب عالمتاب" کے خریدار ہوئے ہیں اور میں نے بموجب ان کے کہنے کے برادر دینی مولانا مہر کو لکھا ہے۔ حضرت نے لا و نعم جواب میں نہیں لکھا۔ تم ان سے کہو کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء سے خریدار ہیں۔ آج ۱۶ ستمبر کی ہے۔ دو نمبر اخبار کے، حکیم صاحب کے نام کا سرنامہ، "خان چند کے کوچے" کا پتا لکھ کر روانہ کریں۔ آئندہ ہفتہ بہ ہفتہ بھیجے جائیں اور حکیم احسن اللہ خاں کا نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے اخبار مذکور میں ایک صفحہ ڈیڑھ صفحہ بادشاہ دہلی کے اخبار کا ہوتا ہے۔ جس دن سے کہ وہ اخبار شروع ہوا ہے، اس دن سے صرف اخبار شاہی کا صفحہ نقل کرا کے ارسال کریں۔ کاتب کی اُجرت اور کاغذ کی قیمت یہاں سے بھیج دی جائیگی۔ بھائی، تم مرزا صاحب سے اس کو کہہ کر جواب لو اور مجھ کو اطلاع دو۔ "نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں، اس کی درستی کی خبر بھیجو۔ باقی جو چھاپے کے حالات ہوں، اس کی آگہی ضرور ہے۔

پنجشنبہ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

—(۵۲)—

بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔ آج صبح کو ایک خط بھیج چکا ہوں۔ اب اس وقت تمہارا خط اور آیا ہے۔ سنو صاحب! لفظ مبارک میم، حا، میم، دال (محمدؐ) اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے[1]۔ رہا "میرزا" و "مولانا" و "نواب"، اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے، جو چاہو سو لکھو۔

بھائی کو کہنا، اُن کے خط کا جواب صبح روانہ کر چکا ہوں۔ مرزا تفتہ اب تم تزئین جلد ہائے کتاب کے باب میں برادر زادۂ سعادت مند کو تکلیف نہ دو۔ مولانا مہربان[2] کو اختیار ہے جو چاہیں سو کریں۔

---

[1] مطلب یہ کہ تفتہ نے پوچھا تھا، کیا کتاب پر محمد اسد اللہ خاں لکھا جائے؟ نیز میرزا، مولانا اور نواب میں سے کیا لکھا جائے۔ [2] یعنی مرزا حاتم علی بیگ مہر۔

خط تمام کر کے خیال میں آیا کہ وہ جو مرزا صاحب سے مجھ کو مطلوب ہے، تم پر بھی ظاہر کروں۔ صاحب، وہاں ایک اخبار موسوم بہ "آفتابِ عالمتاب" نکلتا ہے۔ اس کے مہتمم نے التزام کیا ہے کہ ایک صفحہ یا ڈیڑھ صفحہ بادشاہ دہلی کے حالات کا لکھتا ہے۔ نہیں معلوم آغاز کس مہینے سے ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں یہ چاہتے ہیں کہ سابق کے جو اوراق ہیں جب سے ہوں، وہ چھاپے خانے میں مسودہ رہتے ہیں۔ اس کی نقل کاتب سے لکھوا کر یہاں بھیجی جائے۔ اجرت جو لکھی آئے گی وہ بھیجی جائے گی اور ابتدائے ۱۸۵۸ء سے ان کا نام خریداروں میں لکھا جائے۔ دو ہفتہ کے دو نمبر ان کو ایک لفافہ میں بھیج دیے جائیں اور پھر ہر مہینے۔ نقد در ہفتہ ان کو لفافہ اخبار کا پہنچا کرے۔ یہ مراتب جناب مرزا حاتم علی صاحب کو لکھ چکا ہوں اور اب تک آثارِ قبول ظاہر نہیں ہوئے۔ نہ لفافے حکیم صاحب کے پاس پہنچے، نہ ان صفحات کی نقل میرے پاس آئی۔ آپ کو اس میں سعی ضرور ہے اور ہاں صاحب "آفتابِ عالمتاب" کا مطبع تو کشمیری بازار میں ہے، مگر آپ مجھ کو لکھیں کہ "مفید خلائق" کا مطبع کہاں ہے؟ عجب ہے کہ ان صاحب شفیق نے میری تحریرات کا جواب نہیں لکھا۔ فرمائش حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی بہت اہم ہے۔ عند الملاقات میرا سلام کہہ کر اس کا جواب، بلکہ وہ اخبار ان سے بھجواؤ۔

جمعہ، ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۵۳)

بھائی،

آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔ کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا ہی تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک خط تمہارا اور ایک خط مرزا صاحب کا لایا۔ اب کیا کروں؟ خیر چپ ہو رہا۔ شکوہ محبت بڑھائے گا۔ مرزا صاحب کی عنایت کا شکر بجا لاتا ہوں۔ یقین ہے کہ جلدیں میرے خاطر خواہ بن جائیں گی۔ کس واسطے کہ جو آج کے خط میں انھوں نے لکھا ہے، وہ بعینہٖ میرا مکنون ضمیر[1] ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ میرا سلام کہہ دینا۔ ان کے خط کا جواب کل پرسوں بھیجوں گا۔

رائے امید سنگھ بہادر خوبانِ روزگار میں سے ہیں۔ فقیر کا سلام نیاز ان کو کہہ دینا۔ خدا کرے ان کے سامنے کتابیں چھپ چکیں۔ بارے، جب وہ گوالیار کو تشریف لے جائیں تو مجھ کو اطلاع لکھنا۔

"نہیب" کی جگہ "نوائے" بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی، میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزا کا، جن کے رو سے پہلی کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔ علم اس کا غیاث الدین رامپوری[2] اور حکیم محمد حسین[3] دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق ان اوراق کے ہو، نہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔ آگے اس سے تم کو بھی اور بھائی کو بھی لکھ چکا ہوں۔ اب صرف اس تحریر کا اشارہ لکھنا منظور تھا۔ آج جس طرح مجھ کو تمہارا اور مرزا صاحب کا خط پہنچا، لازم تھا کہ حکیم صاحب کو بھی لفافہ اخبار پہنچ جاتا۔ مگر اس وقت تک نہیں پہنچا اور یہ دوپہر کا وقت ہے،

---

۱ مکنون: پوشیدہ، چھپا ہوا۔ مطلب یہ کہ میرے دل میں بھی یہی تھا۔ ۲ صاحب غیاث اللغات ۳ صاحب برہان قاطع۔

خیر پہنچ جائے گا۔ میں نے تمھارا خط ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ انھوں نے تمھاری رائے منظور کی۔ اب تم وہ اخبار کہ جس طرح تم نے لکھا ہے ان کے پاس بھیج دو اور صاحب مطبع قیمت اخبار اور اجرت کاتب ان کو لکھ بھیجے۔ اپنے نام اور مسکن سے ان کو اطلاع دے۔ پس اس کو اپنے طور پر روپیہ بھیج دیں گے۔ ہم تم واسطۂ شناسائی ہمدگر ہو گئے۔ ہاں اگر احیاناً روپے کے بھیجنے میں دیر ہو گی تو میں کہہ کر بھجوا دوں گا۔ یہ البتہ میرا ذمہ ہے۔

——(۵۴)——

صاحب،

قصیدہ کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے مجھ کو بھی دی ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ کل مرزا صاحب کے خط میں ان کو ایک مصرع کسی استاد کا لکھ چکا ہوں۔ میرا سلام کہنا اور لفافے اخبار کے نہ پہنچنے کی اطلاع دینا میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا جانے اس پر کیا بجوگ پڑا۔ ظاہرا انھوں نے پوسٹ پیڈ بھیج دیا ہوگا۔ پھر پوسٹ پیڈ بھی کیوں تلف ہو؟

"شیہہ" بمعنی "صدائے اسپ" لغت فارسی ہے بہ شین مکسور و یائے معروف و ہائے ہوز مفتوح اور ہائے ثانی زدہ اور عربی میں اس کو "صہیل" کہتے ہیں۔ "صیہہ" کوئی لغت نہیں ہے۔ نہ عربی، نہ فارسی۔ اگر غنیمتؔ کے کلام میں "صیہہ" لکھا ہے تو کاتب کی غلطی ہے، غنیمتؔ کا کیا گناہ؟

اصل مصرع یوں ہے: "در خود ز روے ہندسہ گاہے شمار یافت" [۱]

میں نے سہو سے خدا جانے کیوں کر لکھ دیا ہے۔ بھائی "مہر خوان" کے دو معنی ہیں: ایک تو "خطاب" جو سلاطین امرا کو دیں اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں، یعنی "عرف" حاشیے پر شوق سے لکھوا دو، مگر تم نے دیکھا ہوگا کہ اس عبارت سے، جو تمھارے ذکر میں ہے، پہلے مہر خوان کے معنی حاشیہ پر چڑھ گئے ہیں؛ مکرر لکھنے کی حاجت کیا ہے؛ اور اگر لکھ بھی دو تو قباحت کیا ہے؟ بھائی صاحب کیوں مضائقہ فرمائیں؛ حال اوراق کی تحریر کا معلوم ہوا۔ صاحبان کونسل کی رائے ولایت آگرہ یعنی میرے محکمے میں منظور و مقبول۔[۲] نام میرا جس طرح چاہو لکھ دو۔ بھائی میرزا تفتہؔ کل کے میرزا صاحب کے خط میں اس مادۂ تاریخ کا قطعہ لکھ لینا۔ تم کو لکھ چکا ہوں ایک قطعہ میرزا صاحب کا، ایک تمھارا بلکہ ایک مولانا حقیرؔ سے بھی لکھواؤ۔

سی ام ستمبر ۱۸۵۸ء [۳]

---

[۱] ملکہ وکٹوریہ کے قصیدے کا ایک مصرع ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

نتواں شمار دولت جاوید یافتن
در خود ز روے ہندسہ گاہے شمار یافت

[۲] مطلب یہ کہ آگرہ میں میرے احباب کی جو مجلس ہے اس کا فیصلہ منظور ہے۔

[۳] خط نمبر ۵۴ کے بعد تمام نسخوں میں ایک رقعہ ہے جو بدیہی طور پر مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے نام تھا اسے خواہ مخواہ اس مکتوب کا ضمیمہ بنا دیا گیا تھا۔ اسے آپ مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے خطوط میں ملاحظہ فرمائیں۔

—(۵۵)—

کیوں صاحب، اس کا کیا سبب کیا ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی، نہ مرزا صاحب ہی آئے، نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک بار منشی شیونرائن صاحب نے کرم کیا تھا اور خط میں یہ رقم کیا تھا کہ اب ایک فرمہ باقی رہا ہے۔ اس راہ سے میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرمہ نثر باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہوگا اور اگر فرمہ قصیدہ کا تھا تو اب جلدیں بننی شروع ہوگئی ہوں گی۔

تم سمجھے؟ میں تمہارے اور منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے؟ اور کیا دیر ہے؟ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ بھائی صاحب کو کاپی کی تصیح سے فراغت ہوگئی؟ مرزا صاحب نے جلدیں صحاف کو دے دیں؟ اب میں ان کتابوں کا آنا کب تک تصور کروں؟ دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی۔ کہیں دوالی کی تاریخ تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

ہاں صاحب، تم نے کبھی کچھ حال قمرالدین خاں صاحب کا ذکر نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں ان کا آگرہ   کا آنا لکھا۔ پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے، وہاں تو منشی غلام غوث صاحب اپنا کام بدستور کرتے ہیں، پھر یہ اس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر معیّن ہوگئے ہیں؟ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے۔ مولوی قمرالدین خاں صاحب اس کے بندوبست کو آیا چاہتے ہیں، اس کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔ جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیغام کہیے کہ کتاب کا حُسن کانوں سے سنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا[۱]؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے، آپ کی تخفیف تصدیع چاہتا ہوں[۲]، یعنی اگر کاپی کا قصّہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔

منشی شیونرائن صاحب کی عنایتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجیے گا اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا۔ چونکہ میرے خط کا جواب تھا اور معہذا کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اس واسطے اس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ، زیادہ۔

نگاشتہ و رواں داشتہ صبح شنبہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء   غالب

—(۵۶)—

اللہ اللہ! ہم تو کل سے تمہارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔ ناگاہ کل جو خط آیا، معلوم ہوا کہ دو دن کول میں

۱؎ دیکھیے مرزا کس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ خوشگوار بن جائے۔ یہ ہے حسن بیان کی ایک شان۔ ۲؎ سبحان اللہ۔



رہ کر سکندر آباد گئے ہو اور وہاں سے تم نے خط لکھا ہے۔ دیکھیے اب یہاں کب تک رہو اور آگرہ کب جاؤ۔ پرسوں برخوردار شیونرائن کا خط آیا تھا۔ لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے۔ اب قریب ہے کہ بھیجی جائیں۔ مرزا مہر بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے کس دن کتابیں آجائیں۔ خدا کرے سب کام دلخواہ بنا ہو۔

ہاں صاحب، منشی بالمکند بے صبر[1] کے ایک خط کا جواب ہم پر فرض ہے۔ میں کیا کروں کہ اس خط میں انھوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا۔ بس میں ان کے خط کا جواب کہاں بھیجتا؟ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہہ دینا اور مطبع آگرہ سے کتابوں کا حال تم خود دریافت کر ہی لو گے، میرے کہنے اور لکھنے کی کیا حاجت؟

چہارشنبہ سیوم نومبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۵۷)

کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دِلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔ بہرحال:

کس نشنود و یا نشنود من گفتگوے می کنم

کل جمعہ کے دن ۱۲۔ تاریخ نومبر کی تینتیس جلدیں، بھیجی ہوئی برخوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا سب خوب۔ دل خوش ہوا اور شیونرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں، وہ بھی یقین ہے کہ آجکل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں، منشی شیونرائن نے اندر کو واسطے امید سنگھ کے کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں۔

صاحب، تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو۔ سکندر آباد کب تک رہو گے؟ آگرہ کب جاؤ گے؟

شنبہ ۱۳۔ نومبر ۱۸۵۸ء جواب طلب — غالب

(۵۸)

آج پنجشنبہ کے دن ۱۸۔ نومبر کو تمھارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمھارا خط پہنچتا ہے اور میرا خط نہیں پہنچتا۔ میرے خط نہ پہنچنے کی دلیل یہ ہے کہ تم نے اصلاحی غزل کی رسید نہیں لکھی۔ میں نے کتب کا پہنچنا تم کو لکھا تھا۔ اس کا تم نے ذکر نہ لکھا۔ صاحب تینتیس کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم ہو گئیں۔ سات کتابیں مرزا مہر کی بھیجی ہوئی

---

[1] بال مکند بے صبر، پسر کاتھ سنگھ یا کانجی مل۔ بھٹناگر کائستھ، تفتہ کا ہم وطن یعنی سکندر آباد کا باشندہ، پیدائش ۱۸۲۰ء، وفات ۱۸۹۰ء۔ فارسی اور سنسکرت کے علاوہ عربی بھی جانتا تھا۔ منطق و نجوم میں بھی خاصی دستگاہ تھی۔ سرکار انگریزی کے محکمہ مال میں منشی گری اور داروغگی کا منصب حاصل تھا۔ اسی سلسلے میں دہلی بھی رہا اور غالب سے براہِ راست روابط پیدا ہوئے۔

موافق ان کی تحریر کے آج شام تک اور مطابق منشی شیو نرائن کی اطلاع کے کل تک، میرے پاس پہنچ جائیں گی اور منشی شیو نرائن نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی بھی اطلاع دی ہے۔

منشی نبی بخش صاحب تمہارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں۔ شاید میں تم کو خط لکھ چکا ہوں۔ میر قاسم علی صاحب کی بدلی کا حال معلوم ہوا۔ یہ میرے بڑے دوست ہیں۔ دلّی ان دنوں میں آئے تھے۔ مجھ سے مل گئے ہیں۔ ان کو ایک کتاب ضرور بھیج دینا۔

بھائی، میں ہرگز نہیں جانتا کہ میر بادشاہ دہلوی کون ہیں اور پھر ایسے کہ جو کہیں کے منصف ہوں۔ کچھ ان کے خاندان کا حال اور ان کے والد کا نام لکھو تو میں کچھ غور کروں، ورنہ میں تو اس نام کے آدمی سے آشنا نہیں ہوں۔

غالب

پنجشنبہ ۱۰۔ نومبر ۱۸۵۸ء دوپہر

—— (۵۹) ——

برخوردار،

تمہارا خط پہنچا۔ اصلاحی غزل کی رسید معلوم ہوئی۔ مقطع اب اچھا ہو گیا، رہنے دو۔ کل جمعہ کے دن ۱۹۔ نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرایش ہے۔ آفتاب کی سی نمایش ہے مجھے یہ فکر ہے کہ کہیں ان کا روپیہ تیاری میں صرف نہ ہوا ہو۔ اچھا میرے بھائی، اس کا حال جو تم کو معلوم ہو مجھ کو لکھ بھیجو۔

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔

میر بادشاہ کی اور اپنی ناشناسائی آگے تم کو لکھ چکا ہوں۔ اب اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے اور امراؤ سنگھ کے آشنا ہیں۔ کچھ ان کے خاندان کا نام و نشان دریافت ہو تو مجھ کو بھی لکھ بھیجو تاکہ میں جانوں کہ یہ کس گروہ میں سے ہیں۔ میاں وہ "راست دروغ بر گردن راوی" نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے۔ واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی ہے وہ مجھ کو ضرور لکھو اور تاج گنج کے رہنے والوں کی ابتری کی حقیقت سے بھی اطلاع دو۔ حکمِ عفوِ تقصیرِ عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب و پیکار دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں[1]۔ یہ دو شخص کیسے مجرم تھے جو مقید ہوئے؟

غالب

محررہ صبح شنبہ ۲۰۔ نومبر ۱۸۵۸ء

—— (۶۰) ——

میرزا تفتہ، تمہارا خط آیا۔ نبقر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔ خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے

---

[1] مطلب یہ کہ جو لوگ "غدر" میں لڑتے رہے تھے، وہ اب ہتھیار حکومت کے حوالے کر کے اطمینان سے گھروں میں بیٹھتے جاتے ہیں۔ تاج گنج والوں سے مراد منشی نبی بخش حقیر ہیں جن پر کسی سلسلے میں مقدمہ چل گیا تھا یا وہ کسی مقدمے میں الجھ گئے تھے۔

تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں ان کو لکھتا۔ لکھتے ہو کہ میرزا تفتہ کے دو چار روپے زائد صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ حال یہ ہے کہ میں نے ان سے استفسار کیا تھا۔ انھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی درستی میں بارہ روپے صرف ہوئے ہیں۔ محصول کی ایک رقم خفیف اگر میں نے اپنے پاس سے دی تو اس کا کیا مضائقہ؟ مجھ کو تمھارا قول مطابق واقع نظر آتا ہے۔ البتہ ان کے دو تین روپے اٹھ گئے ہوں۔

لالہ گنگا پرشاد شاد تخلص[1] اپنے کو تمھارا شاگرد بتاتے ہیں، مگر ریختہ کہتے ہیں۔ کئی دن ہوئے یہاں آئے اور بالمشافہ سے تمہاری غزلیں اصلاح کو لائے۔ وہ دیکھ کر ان کے حوالے کر دیں۔

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے، مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمھارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ ان کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکریٹریوں کی نذر یہ پارسل ان شاءاللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔ دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

تا نہال دوستی کے بر دہد   حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

شنبہ، ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء غالب

—— (۶۱) ——

صاحب،

تمھارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے وہ حکیم سنائی[2] کا ہے اور وہ نقل "حدیقہ" میں مرقوم ہے۔

---

[1] اس کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ سکندر آباد کے ایک ہندو شاعر شاد کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کا نام درج نہیں غالباً یہ وہی شخص ہو۔

[2] حکیم سنائی غزنوی اکابر صوفی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

عطار روح بود و سنائی دو چشم ما   ما از پس سنائی و عطار آمدیم

"حدیقۃ الحقیقۃ" ان کی سب سے مشہور اور متداول کتاب ہے۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ قطعہ ان کا ہے۔

پسرے با پدر بزاری گفت　　　کہ مرا یار شو بہ ہمرہ جفت
گفت بابا، زنا کن و زن نے　　　پند از خلق گیرد از من نے
در زنا، گر بگیردت عسسے　　　بہلد، کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی، ہرگزت رہا نہ کند　　　ور تو بگذاریش، چہا نہ کند

بس نواب تم سکندر آباد میں رہو، کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو۔ اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے، وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل نے خوب کہا ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام؟　　　زیں ہوسہا بگذر یا مگذر، مے گذرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی، مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے۔ جو تقریر ہے، بہ سبیل حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔

غالب

یک شنبہ ۱۹۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۶۲)

کیوں صاحب، رُوٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب، دس دس دن بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو، صاحب، نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

غالب

سوموار ۲۷۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۶۳)

دیکھو صاحب!

یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔[1]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کو خط ملا اور یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو جواب دے دیا۔ کاتب بھی سچا اور مکتوب الیہ بھی۔

آج تک راجہ امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی نہیں جائیں گے۔ تمہارا مدعا حاصل ہو گیا ہے۔ جس دن وُہ آئے تھے، اُسی دن مجھ سے کہہ گئے تھے۔ میں بھول گیا اور اس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب، وُہ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مجلد مرزا تفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے "تضمین اشعارِ گلستان" کے ان کی خواہش کے بموجب، کوئی پارسی ہے بمبئی میں، اس کے پاس بھیج دیے ہیں۔ یقین ہے وُہ ایران کو ارسال کر دے گا۔ امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا، میں بھول گیا۔ اب جو تم کو اس خیال میں مبتلا پایا تو ان کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دو بار ان کے گھر بھی گیا ہوں، مگر محلے کا نام نہیں جانتا، نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجوں گا۔

میر بادشاہ سے عند الملاقات میری دعا کہہ دینا۔

لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفاؔ تخلص کہ میں نے آگے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ناگاہ مجھ سے آ کر ملے اور تمہارا پوچھتے رہے۔ میں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندر آباد میں ہیں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں؟ اُنھوں نے کہا: صاحب وُہ بزرگ اور اُستاد ہیں، میں اُن کا شاگرد ہُوں۔ کہیں مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں[1]۔ بسبیل ڈاک یہاں آئے تھے اور آج ہی بسبیل ڈاک انبالہ کو گئے۔ انبالہ اُن کا وطن ہے اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں۔

نگاشتہ دو شنبہ ۲۳۔ جنوری ۱۸۵۹ء　　　　غالب

—(۶۴)—

صاحب،

تمھارا خط مع رقعہ مرد سخن فہم پہنچا۔ سچ کہتا ہُوں کہ تمہارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ جواب میں درنگ اس راہ سے ہُوئی کہ میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے آیا۔ آج تم کو یہ خط بھجوایا۔

محررہ و مرسلہ چہار شنبہ ۲۶۔ جنوری ۱۸۵۹ء　　　　غالب

—(۶۵)—

صاحب،

میرٹھ سے آ کر تم کو خط لکھ چکا ہُوں، شاید نہ پہنچا ہو، اس لیے از رُوئے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو بسبیل ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبہ کے دن[2] دِلّی آ گیا اور چہار شنبہ کے دِن تم کو خط بھیجا۔ کل آخر روز راجہ امید سنگھ بہادر میرے گھر آئے تھے۔ تمھارا خط ان کے دکھانے کو رکھ چھوڑا تھا، وہ ان کو دکھایا، پڑھ کر یہ فرمایا کہ کسی اور مندر میں قصد اقامت نہیں ہے، نیا ایک تکیہ بنایا چاہتا ہُوں[3]۔ آدمی بندرابن گئے ہیں۔ کوئی مکان مول لیں گے۔ وہاں اپنی وضع پر رہوں گا۔ میر اسلام

---

[1] یعنی محکمہ تعلیمات میں　[2] ۲۷۔ جنوری کو　[3] مطلب یہ کہ اپنا مکان بنایا چاہتا ہُوں۔

لکھنا اور یہ پیغام لکھنا کہ آپ کا کلام بمبئی تک پہنچ گیا۔ اب طہران کو بھی روانہ ہو جائے گا۔

سواد ہند گرفتی بہ نظم خود تفتہ ‏ بیا کہ نوبت شیراز و وقت تبریز است

صبح یک شنبہ سی ام۔ جنوری ۱۸۵۹ء ‏ غالب

(۶۶)

صاحب، تم اچھے خاصے عارف ہو اور تمہارا کشف سچا ہے۔ میں راہ دیکھ رہا تھا کہ تمہارا خط آئے تو جواب لکھوں، کل تمہارا خط شام کو آیا، آج صبح کو جواب لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلّے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں مگر فارسی، انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلّے کا نہیں ہوتا، انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں۔ شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے اُن کی بلا، بلّی ماروں کا محلّہ کیا چیز ہے؟ وہ تو بہ نسبت[1] میرے بہت بڑے آدمی ہیں۔ سیکڑوں خطوط انگریزی ہر روز ان کو آتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے پھران کے پاس آدمی بھیجا اور آپ کا خط اپنے نام کا بھیج دیا۔ انھوں نے میرے آدمی کو کہا کہ نواب صاحب کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اس کا جواب کیا لکھوں۔ محلّے کا پتا آپ ہی لکھ بھیجیے۔ سو میں پہلے امر واقعی تم کو لکھ کر تمہاری خواہش کے موافق لکھتا ہوں۔ ان کے مکان کا پتا: بلّی ماروں کا محلّہ، دسّوں کا کوچہ۔

"دستنبو" کا حال یہ ہے کہ میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری ان سے منگوائی، پھران کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو انھیں کے ہاتھوں، وہیں سے بھجوائیں اور اس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے سردھنے کو بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور ان سے لے چکا ہوں مگر نقد۔ ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائی ہیں۔ ایک بار ہنڈوی اور دو بار ٹکٹ بھیج چکا ہوں۔ تم کو میری جان کی قسم سہل طور[2] پر ان کو لکھ بھیجنا کہ غالب نے کتنی منگوائی ہیں اور نقد منگوائی ہیں یا قرض اور جو وہ لکھیں مجھ کو لکھ بھیجنا۔

شنبہ ۱۹۔ فروری ۱۸۵۹ء ‏ غالب

(۶۷)

صاحب،

تمہارا خط آیا، دل خوش ہُوا۔ تمہاری تحریر سے معلوم ہوتا تھا کہ تم کو آگرہ سے کتابوں کا منگوانا بے ارسال قیمت منظور ہے۔ چنانچہ "حق تصنیف" تم نے لکھا ہے، بھائی کیا میں تم کو جھوٹ لکھوں گا؟ اور شیو نرائن نے اگر ارسال قیمت کے نہیں لکھا، یہ بھی تو نہیں لکھا کہ بے ارسال قیمت منگوائی ہیں۔ تم کو میرے سر کی قسم اور میری جان کی قسم، شیو نرائن سے اتنا پوچھو کر اس پچاس جلد کے بعد کے، جلدیں غالب نے اور منگوائیں اور قیمت بھیج کر منگوائیں یا قیمت اس سے لینی ہے؟ دیکھو

---

[1] مراد راجہ امید سنگھ ہیں جیسا کہ اگلے خط سے صاف واضح ہوتا ہے۔ "نامور آدمی کے واسطے محلّے کا پتا ضرور نہیں"، راجہ امید سنگھ ہی کے لیے لکھا تھا۔ [2] سرسری طور پر۔

میں نے قسم کھائی ہے، یوں ہی عمل میں لانا۔

راجہ امید سنگھ صاحب یہیں ہیں۔ مجھ سے ان دنوں میں ملاقات نہیں ہوئی تو تمھارے خط کا ذکر آتا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا اور یہ جو تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ اگر دستنبو کا کوچہ نہ ملے گا تو وہ خط تیرے پاس آئے گا، سو وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صاحب، تم کو وہم کیوں ہے؟ ایک امیر نامور آدمی ہے، اس کے نام کا خط کیوں نہ پہنچے گا؟

غالب

(۶۸)

اجی مرزا تفتہ،

بھائی منشی نبی بخش صاحب کو تمھارے حال کی بڑی پرسش ہے۔ تم نے ان کو خط لکھنا کیوں موقوف کیا ہے؟ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ اگر آپ کو مرزا تفتہ کا حال معلوم ہو تو مجھ کو ضرور لکھیے گا۔

یک شنبہ، ۲۷- فروری ۱۸۵۹ء

غالب

(۶۹)

کیوں مرزا تفتہ، تم بے وفا یا میں گنہ گار؟ یہ بھی تو مجھ کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ ابھی ایک صاحب میری ملاقات کو آئے تھے۔ تقریباً[1] تمھارا ذکر درمیان میں آیا۔ وہ کہنے لگے کہ وہ کول میں ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ خط کول بھیجوں یا سکندر آباد۔ اگر کول بھیجوں تو مسکن کا پتا کیا لکھوں؟ بہ ہر حال سکندر آباد بھیجتا ہوں۔ خدا کرے پہنچ جائے۔ تمھارا دیوان بطریق پارسل میرے پاس آیا۔ میں نے ہرکارے کو راجہ امید سنگھ بہادر کے گھر کا پتا بتا کر وہاں بھجوا دیا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ پانچ چار دن سے سنتا ہوں کہ وہ متھرا اور اکبر آباد کی طرف گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر نہیں گئے۔ بہ ہر حال اس خط کا جواب جلد لکھو اور ضرور لکھو۔

بھائی، تم سیاح آدمی ہو۔ جہاں جایا کرو، مجھ کو لکھ بھیجا کرو کہ میں وہاں جاتا ہوں یا جہاں جاؤ وہاں سے خط لکھو۔ تمھارے خط کے نہ آنے سے مجھ کو تشویش رہتی ہے۔ میری تشویش تم کو کیوں پسند ہے؟

محررہ یک شنبہ، ۲۷- مارچ ۱۸۵۹ء

غالب

(۷۰)

صاحب،

تمھارا خط صبح کو آیا۔ میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ تمھاری ناسازگاری طبیعت سن کر دل کڑھا۔ حق تعالیٰ تم کو زندہ اور تندرست اور خوش رکھے۔ اوراق مثنوی بھیجے ہوئے بہت دن ہوئے، جس میں حکایت طالب علم اور سنار کی تھی۔ واقعہ بلند شہر کا

---

[1] تقریباً کا مطلب یہاں "قریب" نہیں بلکہ "برسبیل ذکر" ہے۔

اور وہ اوراق ہیں تے پمفلٹ پاکٹ نہیں بھیجے، خط میں لپیٹ کر، چونکہ خط ڈبل تھا، دو ٹکٹ لگا کر ارسال کیے ہیں۔ رسید ملے تو اس کو دیکھ کر تاریخ معلوم ہو جائے۔ قیاس سے ایسا جانتا ہوں کہ پانچ سات دن ہوئے ہوں گے۔

منشی نبی بخش کا خط بہت دن سے نہیں آیا۔ گھر ان کا تاج گنج، وہ خود مع بعض متعلقین آگرہ۔ ایک بار تاج گنج کے پتے سے خط ان کو بھیجا تھا، جواب نہ آیا۔ اب ناچار برخوردار شبو مرزا سے ان کا حال پوچھوں گا۔ تم باہمہ کمالات خفقانی بھی ہو۔ راجا امید سنگھ سے خط کی امید کیوں رکھتے ہو؟ جب آگرہ جاؤ گے اور وہ وہاں ہوں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ میں خود واقف نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ از روے قیاس کہہ سکتا ہوں کہ آگرہ یا بندرابن۔ کبھی کہیں سے ان کا کوئی خط مجھ کو آیا ہو تو میں گنہ گار۔

یک شنبہ سیوم ذی القعدہ سنہ ۱۲۷۵ھ، پنجم جون سال حال سنہ ۱۸۵۹ء — غالب

(۷۱)

صاحب،

ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔ تمھارا حال سن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں، نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں، نہ اپنے عزیز دل کی خبر لے سکتا ہوں۔

ہر آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن کوئی پہر بھر دن چڑھا ہو گا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرہ سے آتا ہوں۔ ”بساون کی گلی“ میں جو ”حکیموں کی گلی“ کے قریب ہے“ جوڑس صاحب کی کوٹھی انھوں نے مول لی ہے اور اس کے قریب کی زمین افتادہ بھی خریدی ہے اور اس کو بنوا رہے ہیں۔ تمھارا میں نے ذکر کیا کہ ہر خط میں تم کو پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے کئی خط بھیجے، جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط ان کا آیا تھا، اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ پھر ان کو کوئی خط نہیں آیا۔

بہ ہر حال میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں بازدید کو نہیں گیا۔ شاید آج وہ گئے ہوں یا جاویں۔ پھر اکبر آباد کو جائیں گے۔ میں آج آدمی ان کے پاس بھیجوں گا۔ کل مرزا حاتم علی مہر کا خط آیا تھا، تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا میرزا تفتہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ بھائی ان کو خط لکھ بھیجو۔

محررہ ۱۷۔ جون سنہ ۱۸۵۹ء — غالب

(۷۲)

صاحب،

ایک خط تمھارا پرسوں آیا۔ اس میں مندرج تھا کہ میرٹھ جاؤں گا۔ آج صبح کو ایک خط تمھارا آیا۔ اس میں مندرج تھا کہ پہلی جولائی کو جاؤں گا اور تجھ سے ملتا جاؤں گا۔ پرسوں کے خط میں بھی اور آج کے خط میں بھی پارسل کا ذکر تھا کہ ۲۰۔ جون کو ہم نے بھیجا ہے۔ بیسویں جون کو آج دسواں دن ہے۔ اس دس دن میں کوئی پارسل، کوئی پمفلٹ پاکٹ میرے پاس نہیں پہنچا۔

آخری پمفلٹ پاکٹ دو مثنویوں کا وہ تھا، جس میں ایک مثنوی بلند شہر کے واقعے کی تھی کہ ایک لڑکا مر گیا، اس کی ارتھی بھٹکتی رہی، اس کا عاشق سامنے کھڑا جلتا رہا۔ سو ان دونوں مثنویوں کو میں نے اصلاح دے کر تمہارے پاس بھیج دیا، بلکہ یوں یاد پڑتا ہے کہ تم نے اس کی رسید بھی لکھ بھیجی ہے۔ لیکن مجھ کو گمان یہ ہے کہ یہ امر ۲۔جون سے آگے کا ہے۔ بہر تقدیر، بعد اس پارسل کے کوئی اور پارسل نہیں آیا۔ اصلاحی کاغذ ہر طرف کے عموماً اور تمہارے خصوصاً دو دن سے زیادہ میں نہیں رکھتا۔ جو کاغذ مجھ تک نہ پہنچے، میں ناچار ہوں، بلکہ خود میرے ایک خط کا جواب تم پر قرض ہے۔ یا تو وہ نہ پہنچا، یا تم نے اس کا جواب لکھنا ضرور نہ جانا۔ وہ خط جس میں میر بادشاہ کا دلی آنا اور ان کا مجھ سے ملنا اور تمہارا ذکر مجھ میں اور ان میں ہونا معتمد الراجا امید سنگھ کا دلی آنا اور بے خبر میرے گھر آ جانا اور تمہارا ان سے ذکر ہونا اور ان کا یہ کہنا کہ ان کا کل ایک خط میرے پاس آیا تھا، سو میں نے اس کا جواب لکھ بھیجا تھا[1]۔ اب میں کیا جانوں کہ تم کو یہ خط پہنچا یا نہیں پہنچا۔ تمہارا وہ پارسل جس کو تم مانگتے ہو میرے پاس ہرگز نہیں آیا۔

چہار شنبہ ۲۹۔جون ۱۸۵۹ء وقت نیمروز غالب

(۷۳)

میاں!

تمہارے انتقالات ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر داں نہ ہوگا، مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا[2] کے علم کو اور نظیری[3] کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیئے تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی[4]۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا؟

قطعات تاریخ آگرہ کیونکر بھیجوں؟ پھر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔

"خالق معنی" "المعنی" "معنی آفریں" صحیح اور مسلم اور جائز، لیکن جس طرح اللہ میں مشدد لام کو دو لام کے قائم مقام

---

[1] ملاحظہ ہو خط نمبر ۷۱ مرقومہ ۱۷ جون ۱۸۵۹ء۔ [2] بوعلی سینا مشہور حکیم و طبیب۔ [3] فارسی کا مشہور شاعر جو نیشاپور کا رہنے والا تھا اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا اور خان خاناں کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ احمد آباد گجرات میں متوطن ہو گیا تھا۔ وہیں جہانگیر کے عہد میں فوت ہوا۔

[4] یہ لطیفہ بازباں ہیں۔

قرار دیا ہے اللہ اور الٰہی میں الف ممدوہ کو دوسرا الف کیوں نہ سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا، اتفاقِ سلف شرط ہے۔ جب اور کسی نے الٰہی میں دو الف نہیں مانے تو ہم کیوں کر مانیں؟

"دویم" بروزن "جویم" غلط "دوم" ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں گے تو "دُیم" پڑھیں گے، اگرچہ لکھیں گے دویم۔ واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں "دومی" درست ہے مگر نہ بہ حذفِ تحتانی، مثل "زمی" بہ حذفِ نون (زمین) بلکہ بطریقِ قلبِ بعض "دویم" کا "دومی" ہو گیا۔ کنوے کی تاریخ کو بے تامل بھیج دو اور تاریخِ وفات کا اور مادہ سوچو، کس واسطے کہ جب الٰہی میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا۔ والدعا

روز ورودِ نامہ بعد خواندن نوشتہ شد۔ یک شنبہ

از غالب

(۷۴)

بھائی تمھارے ذہن نے خوب انتقال کیا! میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا:

بہ ہند آمدندے ز ایراں دیار

"آمدند" کی جگہ "آمدندے" بصیغۂ استمرار ٹکسال باہر معلوم ہوا،

رسیدند در ہند ز ایراں دیار



اس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی، لوستین کا بیچنا راہ میں واقع ہوا۔ پھر "رسیدند در ہند" بیجا، تمھارا تصرف مستحسن۔ جس طرح تم نے لکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔

صاحب، "سنبلستان" سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمھارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ "رخ" کو "گل"، "زلف" کو "سنبل" فرض کرتے ہیں۔ "سنبلستان" میں کیا عیب ہے؟ اور اگر پسند نہیں تو یہ قصہ ہی جانے دو۔ اس وقت تک کہ اکتوبر کی آٹھویں، ہفتے کا دن، تیسرے پہر کا وقت ہے۔ میر قاسم علی صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہاترس کے منصف اور دلی کے نامنصف ہیں۔

روز شنبہ، ہشتم اکتوبر ۱۸۵۹ء آخر روز

غالب

(۷۵)

صاحب،

تمھارا خط آیا، حال معلوم ہوا:

جہانیاں ز تو برگشتہ اند اگر غالبؔ ‏ ‏ ‏ ترا چہ باک؟ خدا لے کہ داشتی داری

خدا کے واسطے میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش[۱] جو شہزادوں میں ہیں، ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے

---

[۱] مرزا الٰہی بخش "غدر" میں برابر انگریزوں کے ساتھ رہا۔ اسی نے بہادر شاہ کو قید کرایا تھا۔ انگریزوں نے اسے رئیس خاندان بنانے کا چکمہ دیا تھا۔ جب کام نکل گیا تو صرف پنشن دے کر بٹھا دیا۔

کیا ہو؟ حکیم جی کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں:

تو بیکسی و غریبی تنا کہ می پرسد

نہ جزا، نہ سزا، نہ نفرین، نہ آفریں، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے شراب نہیں۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی فکر کچھ نہیں ہے۔ مگر تم کو میرے سر کی قسم، یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سنی؟ مجھے اس کے معلوم ہونے سے مزا ملے گا۔

شنبہ ۵۔ نومبر ۱۸۵۹ء

غالب

——(۷۶)——

میری جان!

کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں؟؟

ہر یکے را بہر کارے ساختند

انت متا سو متا[1]۔ مصری میٹھی، نمک سلونا۔ کبھی کسی شے کا مزا نہ بدلے گا۔ اب جو میں اس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھے گا کہ غالب کیا جانے کہ عبدالرحمٰن کون ہے اور مجھ سے اس سے کیا رسم و راہ ہے؟ بے شبہ جانے گا کہ تفتہ نے لکھا ہوگا۔ میں اس کی نظر میں سبک ہو جاؤں گا اور تم سے وہ اور بھی سرگراں ہو جائے گا اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اس شخص کو اپنے عزیزوں میں گنا ہے۔ بندہ پرور، میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ از راہ حسنِ اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے؟ زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اس کی سالی کا بیٹا۔ اس کو جو چاہو سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب ادھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اس کو لکھنا لغو و بے فائدہ، بلکہ مضر ہے۔

تمہارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اب تمہارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندرآباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہ، تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومہ جمعہ ۲۳۔ دسمبر ۱۸۵۹ء

غالب

——(۷۷)——

بھائی،

میں نے دلّی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹۔ کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰۔ کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ ۲۱۔ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے

---

[1] آخری نتیجہ ہی درست ہوتا ہے یعنی کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہانپور، پرسوں گڑھ مکتیشر رہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤنگا اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا۔ سرنامے پہ رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ اب اسی قدر لکھنا کافی تھا، باقی جو کچھ لکھنا ہے وہ رام پور سے لکھوں گا۔

مرقومہ چاشتگاہ شنبہ ۱۸۔ جنوری ۱۸۶۰ء — راقم غالب

(۷۸)

صاحب،

تمہارے یہ اوراق سکندر آباد سے دِلّی اور دلّی سے رام پور پہنچے، رام پور سے میرے بھیجے ہوئے سکندر آباد پہنچے، کہ سوائے ایک مصرع کے مجھے اور جگہ کی اصلاح یاد نہیں۔ تم جو اپنے فرزند کو ناشناسائے مزاج روزگار کہتے ہو، خود اس میں اس سے کیا کم ہو؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ رام پور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ کہاں مولوی وجیہ الزّماں صاحب، کہاں میں! ان کا مسکن میرے مسکن سے دُور، پھر در دولت رئیس کہاں اور میں کہاں! چار دن والیِ شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اس میں رہتا ہوں۔ بحسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلّی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رام پور کا نام اور میرا نام، محلّے کی اور عرف کی حاجت نہیں، بلکہ در دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔ دوسری بات جو تم نے لکھی ہے، وہ بھی مطابق واقع و مناسب حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی تو تم کو بلا لوں گا۔

۱۸۶۰ء — غالب ۱۲



(۷۹)

میری جان!

آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ بشرط اقامت بلاؤں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری، تو بے تمہارے نہ رہوں گا، نہ رہوں گا، زنہار نہ رہوں گا۔ منشی بالمکند بے صبر کا خط بلند شہر سے دلّی اور دلّی سے رام پور پہنچا، تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو یہاں سے اور اگر دلّی چلا گیا تو وہاں سے اصلاح دے کر ان کے اشعار بھیج دوں گا۔ بے صبر کو اب کی بار مہینے بھر کا صبر چاہیے۔ وہ لفافہ بدستور رکھا ہوا ہے۔ ازبسکہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں۔ فرصت مشاہدۂ اوراق نہیں ملی۔ تم اسی رقعے کو ان کے پاس بھیج دینا۔

سہ شنبہ ۱۴۔ فروری ۱۸۶۰ء — غالب

(۸۰)

برخوردار سعادت آثار منشی ہرگوپال سلمہ اللہ تعالیٰ!

اس سے آگے تم کو حالات مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مراد آباد

اور وہاں سے رام پور آئیں گے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہُوا تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ باہم بسر ہو جائیں۔ والدعا

یکم مارچ ۱۸۶۰ء
راقم غالب

(۸۱)

میرزا تفتہ!

اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمھارا ہی کام ہے۔ بھائی، "تضمین گلستان" چھپوا کر کیا فائدہ اٹھایا ہے؟ جو "الطباع" "سنبلستان" سے نفع اٹھاؤ گے؟ روپیہ جمع رہنے دو۔ آمد اچھی چیز ہے اگرچہ قلیل ہو اور اگر روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہوگا۔ اگر اچھا ہُوا ابھی تو ہوتے ہوتے اس کو مدت چاہیے۔ "رستخیز بیجا"[1] ہو چکا۔ اب ہو تو رستخیز ہو یعنی قیامت اور اس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی رستخیز کے ،، ۱۲۷ ہوتے ہیں۔ احتمال فتنہ سال آیندہ پر رہا، سو بھی موہوم[2]۔

میاں، میں جو آخر جنوری کو رام پور جا کر آخر مارچ کو یہاں آ گیا ہوں، تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں؟ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والیِ رام پور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا، دو سو روپے مہینا کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہُوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا۔ یہ تو سب سُن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سُنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے مہینا ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرطِ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

۳۰۔ مارچ ۱۸۶۰ء
غالب

(۸۲)

مرزا تفتہ!

ایک امرِ عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاط مفرط[3] ہوگا۔ میں اجرائے پنسن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشہ پنسن داروں کا، جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا

---

[1] یعنی "غدر" غالب نے اس کی تاریخ "رستخیز بیجا" نکالی تھی۔ [2] یعنی ۱۲۷۶ھ، ۱۲۷۷ھ آیندہ سال ہوگی۔ اگر قیامت اس عدد کے مطابق آئی تو اگلے برس آئے گی۔ [3] یعنی تعجب بھی زیادہ ہوگا اور خوشی بھی زیادہ۔

کہ یہ شخص پنسن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنسن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سُنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آیندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۶۔ اپریل سنہ ۱۸۶۰ء — غالب

(۸۳)

بھائی، آج اسی وقت تمہارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ زرِ سہ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے۔ سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپے، میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرضدار قدیم ہوں۔ اب وہ دو ہزار (روپے) لایا، اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا گیا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس ۲۶ سو ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو، پانسو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں، متفرقات گیارہ سو چکا دے، نو سو باقی رہے، آدھے تو لے لے، آدھے مجھ کو دے۔ پرسوں چوتھی[1] کو وہ روپے لایا ہے، کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی نہیں کرتا۔ دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں۔ ہفتے بیس جھگڑا فیصل ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن برات سے پھر کر آؤ، اسی دن مجھ کو اپنے ورود مسعود کی خبر دینا۔ والدعا

شنبہ ششم مئی سنہ ۱۸۶۰ء ہنگام نیمروز — غالب

(۸۴)

برخوردار میرزا تفتہ!

دوسرا مسودہ بھی پہنچا۔ تم سچے اور میں معذور۔ اب میری کہانی سُنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنسن داران قدیم ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بطریق ششماہہ فصل بفصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کڑواں دینا پڑے گا۔ ایک معقول رقم گھاٹے میں جائیگی۔

رسم ہے مردے کی چھماہی[2] ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھماہی ہو سال میں دو بار

دس بارہ برس سے اس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپے یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اُس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔

---

[1] ۴۔ مئی سنہ ۱۸۶۰ء۔ [2] چھ مہینے۔

مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے ورد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگادی۔ وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے، اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹگرہ ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ دوشنبہ ۹۔ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آگیا، وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہشت ہے اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلی ماروں کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلہ میں جا رہتا تو قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے، یعنی اب اکثر خطوط "لال کنوئے" کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ بہ ہر حال تم وہی "دلّی" "بلی ماروں" کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔ دو مسودے تمھارے اور ایک مسودہ بے صبر کا یہ تین کاغذ در پیش ہیں۔ دو ایک دن میں بعد اصلاح ارسال کیے جائیں گے، خاطر عاطر جمع رہے۔

صبح جمعہ ۲۰۔ جولائی ۱۸۶۰ء

غالب

(۸۵)

میرزا تفتہ،

کل تمھارا خط مع کاغذ اشعار آیا، آج تم کو یہ خط لکھتا ہوں اور اسی خط کے ساتھ خط موسومہ میر بادشاہ بھیجتا ہوں۔ کاغذ اشعار کل یا پرسوں روانہ ہوگا۔ فن تاریخ کو دون مرتبۂ شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔ بہ ہر حال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمر الدین خاں صاحب نے ناپسند کیا۔ قطعہ یہ ہے:

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق ‏ ‏ ‏ ‏ داشت مذاق سخن و فہم تیز

سال وفاتش ز پئے یادگار ‏ ‏ ‏ ‏ با دلِ زار و مژۂ دجلہ ریز

خواستم از غالبؔ آشفتہ سر ‏ ‏ ‏ ‏ گفت مدہ طول و بگو "رستخیز"

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں، بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے، جیسا کہ یہ مصرع:

در سال غُرس ہر آنکہ ماند بیند

انوریؔ[1] کے قصائد کو دیکھو۔ دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدہ کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعداد سال مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ "رستخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقعہ کے مناسب۔ اگر تاریخ ولادت

---

[1] فارسی کا مشہور شاعر اوحد الدین انوریؔ جسے مدت تک یکے از سہ پیمبران شعر فارسی قرار دیتے رہے:

در شعر سہ کس پیمبرانند ‏ ‏ ‏ ‏ ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را ‏ ‏ ‏ ‏ فردوسیؔ و انوریؔ و سعدیؔ

وفات ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء



یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نامستحسن تھا۔ قصّہ مختصر، اگر تاریخ کی فکر موجب ادائے حق مودت ہے تو میں حق دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

صبح دو شنبہ پنجم جمادی الاولیٰ (۱۲۷۷) و نوزدہم نومبر سال حال (۱۸۶۰ء) غالب

(۸۶)

صاحب،

تمھارا خط میرٹھ سے آیا۔ "مرآۃ الصحائف" کا تماشا دیکھا۔ "سنبلستان" کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمھاری آبرو کا نگہبان رہے۔ بہت گزر گئی ہے، تھوڑی رہی، اچھی گزری، اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفیؔ کے قصائد کی شہرت سے عرفیؔ کے ہاتھ کیا آیا، جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدیؔ نے "بوستان" سے کیا پھل پایا جو تم "سنبلستان" سے پاؤ گے؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے، نہ قصد ہے۔ لاموجود الا اللہ۔

جناب بھائی صاحب مصطفیٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا۔ ہمشیرہ[۱] کے پنسن کا جاری ہونا بہت خوشی کی بات ہے مگر خوشی سے تعجب زیادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات بروئے کار آوے، یعنی آپ کا پنسن[۲] بھی واگزاشت ہو جاوے۔ اللہ، اللہ، اللہ!

صبح یک شنبہ ۲۰۔ جنوری (۱۸۶۱ء) غالب

(۸۷)

اجی مرزا تفتہ!

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بُری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوق خوبرو ہے، بدلباس ہے۔ بہرحال دونوں لڑکوں[۳] کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلّم کو حکم دیا کہ اس کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہو گیا۔

مرقومہ سہ شنبہ ۹۔ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء غالب

(۸۸)

میاں مرزا تفتہ!

ہزار آفریں۔ کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ، چشمِ بد دُور، تسلسل معنی، سلاست الفاظ۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت[۴] بخاری سے توارد ہُوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے۔ وُہ مصرع

---

[۱] نواب مصطفیٰ خاں کی ہمشیرہ۔ [۲] نواب مصطفیٰ خاں [۳] باقر علی اور حسین علی [۴] فارسی کا درویش منش اور خوددار شاعر محمد اسحاق بخاری (وفات ۱۶۹۹ء)



یہ ہے:

چاک گر دیدم واز جیب بداماں رفتیم

پہلا مصرع تمھارا اگر اس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا[۱]۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس جزو قصائد کا کہہ لو۔ مگر خبردار قصائد بقید حروف تہجی نہ جمع کرنا۔

صاحب، مجھے اس بزرگوار کا معاملہ اور یہ جو تم نے اس کا وطن اور پیشہ اب لکھا ہے، سابق کا تمھارا لکھا ہوا سب یاد ہے۔ میں نے اس کو "دوست" بطریق طنز لکھا ہے۔ بہرحال وہ جو میں نے خاقانی[۲] کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا، اس کی ماں مرے، اگر میرے اس خط کا جواب لکھا ہو۔ بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ داغ کہنۂ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ[۳] کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر[۴] کے پاس گزرا اور جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ منظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے۔ انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ[۵] کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے، تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہیں بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے؟

دوشنبہ ۱۹۔ اگست ۱۸۶۱ء غالب

(۸۹)

مرزا تفتہ صاحب، اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ "خنجر را" "گوہر را" کو تم نے از قسم تنافر سمجھا اور اس پر اشعار اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ نہیں پیدا ہوتا، مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے

۱۔ خوبی کلام کا کمال دیکھیے کہ کہنا یہ چاہتے تھے، پہلا مصرع شوکت کے مصرعے سے اچھا نہیں، مگر مکتوب الیہ کے پاس خاطر سے انداز ایسا اختیار کیا کہ اسے ناخوشگوار نہ لگے۔ ۲۔ افضل الدین خاقانی شروانی وفات ۵۸۹/۱۱۹۳ مدفن تبریز۔ ۳۔ وزیر اعظم سلطنت اودھ در عہد نصیر الدین حیدر۔ ۴۔ فرمانروائے اودھ، غازی الدین حیدر کا بیٹا اور سعادت علی خاں کا پوتا۔ ۵۔ شیخ امام بخش ناسخ اردو کے مشہور شاعر تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ اصلاً پنجابی تھے۔ عمر لکھنؤ میں گزاری۔ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۸ء) میں وفات پائی۔

دل میں سلیم [۱]

شراب نقل نخواہد بگیر ساغر را　　کہ احتیاج شکر نیست شیرِ مادر را

یہ غزل شاہجہان کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب [۲] و قدسی [۳] و شعرائے ہند نے اس پر غزلیں لکھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ ممدوح کا پُورا نام بے تکلف آ سکتے ہُوئے خالی کیوں اڑادو۔ "ضیأالدین احمد خاں" نام ہے۔ ہندی میں رخشاں تخلص، فارسی میں نیّر تخلص؛

ہمانا نیّر رخشاں ضیاءالدین احمد خاں

دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے۔ یہ نہ کہنا کہ جو شعرا ممدوح کا نام نہیں لکھ جاتے ہیں وہ بجسب ضرورت شعر ہے۔ جس بحر میں پُورا نام نہ آئے، اس میں شوق سے نہ لکھو۔ جائز، روا، مستحسن۔ جس بحر میں نام ممدوح کا درست آ سکے، اس میں فروگزاشت کیوں کرو؟

دوشنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۱ئہ　　　　غالب

—(۹۰)—

صاحب،



قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا، آفرین ہے۔ پھر استاد کے شعر کی تضمین کیوں کرتے ہو؟ نہ اس کی کچھ حاجت، نہ اس میں کوئی افزائش حسن۔ تمھارے ایک شعر کو ایک شعر کے بعد رکھ دیا ہے تاکہ مقطع کلام ہو جائے۔ پہلا قصیدہ تمھارا "برآوردم" "درآوردم" کی ردیف کا سست ہے۔ اس کو ہم نے نامنظور کیا۔ مگر نظرِ ثانی میں جو شعر قابل رکھنے کے ہوں گے، وہ شعر تم کو لکھ کر بھیج دیں گے۔ بالفعل ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں تاکہ آیندہ اس پالغز [۴] سے احتراز کرو۔

نور سعادت از جبۂ قاصدم چکد

یہ کیا ترکیب ہے "جبہہ" بروزن "چشمہ" ہے یعنی دو ہائے ہوز ہیں۔ "جبۂ قاصد" ایک ہائے ہوز کہاں گئی؟

ہر کجا چشمۂ بود شیریں

"چشمہ" کی جگہ "چشہ" لکھتے ہو! یہ بات ہمیشہ کو یاد رہے۔ اتنے بڑے مشاق سے ایسی غلطی بہت تعجب کی بات ہے"

میاں:　　برگ دنیا نہ سازد نیش بود

یہ کوئی لغت نہیں، ایک لفظ نہیں کہ کسی فرہنگ میں سے نکل آئے۔ یہ طرزِ تحریر ہے۔ کس کو یاد ہے کہ اس کا نظیر کہاں موجود ہے؟ اس امر سے قطع نظر، وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی دان اور عالم ہے کہ ہم لڑکوں کی طرح بیت بحثی

---

[۱] میرزا محمد قلی سلیم فارسی کا مشہور شاعر بہ عہد شاہجہان کشمیر میں وفات پائی (۱۰۵۷ھ / ۱۶۴۷ء)۔ [۲] مرزا محمد علی صائب معروف ایرانی شاعر ہندوستان بھی آیا، کشمیر میں بھی رہا۔ اصفہان میں وفات پائی (۱۰۸۶ھ / ۱۶۶۹ء)۔ [۳] حاجی محمد جان قدسی، مشہدی، عہد شاہجہان کا ایرانی شاعر، وفات لاہور میں (۱۰۵۰ھ / ۱۶۴۰ء)۔ [۴] لفظی معنی پاؤں پھسلنے کی جگہ مراد ہے لغزش۔

کروں۔ دو جوتیاں آپ لگا دیں، ایک جُوتی تم سے لگوا دی۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔[۱]

میں "برہان قاطع"[۲] کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ "چار شربت"[۳] اور "غیاث اللغات" کو حیض کا لتّہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا؟ "برہان قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام "قاطع برہان" رکھا ہے۔ اب اس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا ورنہ کاتب سے نقل کروا کر قلمی ایک جلد بھیج دوں گا بہت سود مند نسخہ ہے۔

اس قصیدۂ متبرکہ کو موافق اصلاح کے، اس کاغذ سے اور کاغذ پر نقل کر کے اور جو مطالب کہ اس کاغذ پر مرقوم ہیں، ان کو حافظہ کے سپرد کر کے، اس ورق کو پھاڑ ڈالو اور اس قصیدے پر ناز کیا کرو۔ یہ قصیدہ تمہارا ہم کو بہت پسند آیا ہے۔

جمعہ ۴۔ اکتوبر ۱۸۶۱ء

غالب

(۹۱)

صاحب،

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔ حق تعالیٰ اس کا تمہیں صلہ دے۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں سے قصیدے کی رسید آ گئی۔ یقین ہے کہ تم کو بھی وہ خط لکھیں۔ وہیں ولا آیا چاہتے ہیں اور مجھ کو یہ لکھا تھا کہ قصیدہ پہنچا، کیا کہنا ہے، ایسا ہے اور ایسا ہے۔ میں چند روز میں وہاں آتا ہوں۔ عند الملاقات اس قصیدے کے باب میں باتیں ہوں گی۔ ضیاء الدین خاں صاحب کا بھی مقدمہ آجکل فیصل ہُوا چاہتا ہے۔[۴] وہ قصیدہ جو میرے پاس امانت ہے۔ ان کو دیا جائیگا۔ اِن شاء اللہ العلی العظیم۔

از من فراغ جُرد بریدم من از فراغ

"بریدم من از فراغ" یعنی "قطع نظر کردم از فراغ" و "نومید شدم از فراغ"۔

غالب

---

۱ معلوم ہوتا ہے کسی نے غالب کے اس مصرع پر اعتراض کیا تھا جو مثنوی بادِ مخالف میں ہے۔ ۲ "برہان قاطع" جو فارسی لغت کی مشہور کتاب ہے۔ ۳ "چار شربت" میرزا محمد حسن قتیل کی تصنیف اور غیاث اللغات مُلّا غیاث رام پوری کی۔ ۴ اس سے اشارہ غالباً اس مقدمے کی طرف ہے جو نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں میں لوہارو کے انتظام کے متعلق اکتوبر ۱۸۴۸ء میں شروع ہو گیا تھا۔ پہلے فیصلہ ہوا کہ ضیاء الدین احمد خاں انتظام میں دخل نہیں دے سکتا۔ صرف حصّے کا روپیہ لینے کا حقدار ہے۔ پھر ضیاء الدین احمد خاں کی ایک درخواست اس بنا پر رد ہو گئی کہ اس کا لب و لہجہ مناسب نہ تھا۔ اس کے بعد ضیاء الدین احمد خاں کی درخواست پر یہ حکم صادر ہُوا کہ اسے بارہ ہزار روپے کی بجائے اٹھارہ ہزار روپے سالانہ ملیں۔ اس کے خلاف امین الدین احمد خاں نے درخواست دے دی جو کورٹ آف ڈائرکٹرز میں بھیجی گئی۔ یہ مسترد ہو گئی اور پہلا فیصلہ بحال رہا۔ تیسرے مرحلے پر مقررہ رقم کی ادائیگی کے بارے میں مقدمہ چلا۔ آخر کار بقیہ رقم کے متعلق ضیاء الدین احمد خاں نے دعویٰ دائر کر دیا۔ غالباً یہی مقدمہ تھا جس کا ذکر میرزا نے کیا ہے۔

(۹۲)

تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں؟ اُن کو میں نے تمہاری فکر او رتلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے۔ تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے یہ کون؟ یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب اور دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاءُ الدین خاں، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۱ء میں یا اوائل جنوری ۱۸۶۲ء میں حاضر ہوں گے۔

غالب

(۹۳)

بھائی،

"ریمیا" و "ہیمیا" خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بوعلی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ "کیمیا" اور "سیمیا" دو علم شریف ہیں۔ جو اشیاء کی تاثیر سے تعلق رکھے، وہ "کیمیا" اور جو اسمائے سے متعلق ہو، وہ "سیمیا":

جاں غم "سیمیا" نخورد گمے دل سوے "کیمیا" نیا وردم

شعر بامعنی ہوگیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟ "زمان و زمانہ" کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا؟ ہزار جگہ میں نے نظم ونثر میں "زمان" و "زمانہ" لکھا ہوگا۔

وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو، پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں "نبرد" کا فاعل معدوم۔ حلقہ زا کی زے پر نقطہ نہ تھا؛ میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ "حلقہ را" درست، نہ "حلقہ زا" درست۔ مگر یہ فارسی "بیدلانہ" ہے[1]۔ خیر رہنے دو۔ مرتا ہوں، مجھے سمجھاتے ہو کہ "صد جا در کلام اہل زبان خواہند یافت"۔ مگر میں بانی کلام اہل زبان نہیں؛

گردش چرخ استخواں سائید

اس سے یہ بہتر ہے:

سودہ شد استخواں ز گردش چرخ

باقی اور مصرعے سب اچھے بنائے ہیں۔

غالب

(۹۴)

صاحب،

دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف، ایک فارسی، ایک عربی۔ ہرچند اس منطق[2] میں لغات ترکی بھی آجاتے ہیں مگر کمتر۔ میں عربی کا عالم نہیں، مگر نِرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علمائے سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدأ فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے اور اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزین ہیں، جیسے فولاد میں جوہر۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت

---

[1] یعنی میرزا بیدل کی سی فارسی [2] یعنی بول چال میں۔

ہیں: ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان، دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے، سو دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔

جُود لغت عربی ہے بمعنی بخشش، "جواد" صیغہ ہے صفت مشبہ کا، بے تشدید۔ اس وزن پر صیغہ فاعل میری سماعت میں جو نہیں آیا تو میں اس کو خود نہ لکھوں گا، مگر جبکہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا، تو میں نے مانا۔

کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا۔ اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف، قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل، قصیدہ لکھنے لگا۔ تم کہتے ہو نظیری کا دیوان وقت تحریر قصیدہ پیش نظر ہوگا اور جو اس کے قافیہ کا شعر دیکھا، اس پر لکھا ہوگا۔ واللہ اگر تمھارے اس خط کے دیکھنے سے پہلے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس زمین میں نظیری کا قصیدہ بھی ہے چہ جائے آنکہ وہ شعر۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

"زمان" لفظ عربی "ازمنہ" جمع، دونوں طرح فارسی میں مستعمل۔ "زمانے" "یک زماں" "ہر زماں" "زماں زماں" "دریں زماں" "دراں زماں" سب صحیح اور فصیح۔ جو اس کو غلط کہے، وہ گدھا۔ بلکہ اہل فارس نے، مثل "موج" و "موجہ" یہاں بھی "ہ" بڑھا کر "زمانہ" استعمال کیا ہے۔ یک زماں کو میں نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا۔ سعدیؒ کے شعر لکھنے کی کیا حاجت؟

سنو میاں، میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھاگس[1]، عبدالواسع ہانسوی، لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا پٹھا "قتیل" "صفوت کدہ" "شفقت کدہ" "نشتر کدہ" کو اور "ہمہ عالم" و "ہمہ جا" کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زماں" کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ للہ الحمد واللہ الشکر۔

مرقومہ چہار شنبہ ۲۷۔ ماہ اگست ۱۸۶۲ء — غالب

(۹۵)

میرزا تفتہ،

جو کچھ تم نے لکھا ہے، یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ تم سے اور آزردگی؟ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولاء رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو؟ رہا غمّاز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا۔ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً

---

[1] ایک قسم کا دوغلا مرغ۔

وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری بُرائی کہتا تو میں اُس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔ بھائی، مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہوگئی۔ خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں، بکار آمدنی نہیں۔ خیر کبھی دیکھ لوں گا۔ جلدی کیا ہے۔ تین بات جمع ہوئیں، میری کاہلی، تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظر بریں مراتب پر کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے۔ آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب[۱] کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں:

ضعف نے غالبؔ نکمّا کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔ آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا، اس کو دیکھا، لفافہ کیا، آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا۔

۲۷۔ نومبر ۱۸۶۲ء　　　　غالبؔ

(۹۶)

میرزا تفتہ کہ پیوستہ بہ دل جا دارد
ہر کجا ہست خدایا بسلامت دارش

صاحب،

کئی بار جی چاہا کہ تم کو خط لکھوں، مگر متحیر کہ کہاں بھیجوں۔ اب جو تمھارا خط آیا، معلوم ہوا کہ حضرت ابھی لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ خط نہ بھیجوں تو گنہ گار۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مجھ میں اصلاح کی مشقت کی طاقت نہیں رہی۔ معہذا تمھارا کلام پختگی کو پہنچ گیا ہے۔ اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئینِ شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہوجاتا ہے تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ تم مجھے اپنے کلام کے دیکھنے سے محروم رکھو۔ جو غزل، قصیدہ لکھا کرو، نہ مسودہ بلکہ ایک نقل اس کی ضرور بھیجا کرو۔　　غالبؔ

(۹۷)

صاحب بندہ!

میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا۔ سوائے تین کاغذوں کے اور کوئی کاغذ تمھارا نہ نکلا اور اس وقت بہ سبب کم فرصتی کے میں ردیف ان تینوں قصیدوں کی نہیں بتا سکتا اور وہ مقدمہ پچاس کا باقتضائے حالات زمانہ سست ہوگیا ہے، مٹ نہیں گیا۔ دیر آید درست آید۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

---

[۱] نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور

اب میرا حال سنو،

در نومیدی بسے امید است   پایانِ شب سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ "کیننگ" صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلّی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے۔ دِلّی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی انبالہ جاؤ۔ شریک ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی، کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری، گویا مُردہ جی اٹھا۔ ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سنّاٹا گزرا کہ سامان سفر انبالہ اور مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں؟ اور طرّہ یہ کہ نذرِ معمولی میرا قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، ادھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ وہ روپے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ بھی مشکل آسان کرے گا، مگر ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں تمھیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب گورنر صاحب کو لکھ کر بھیج دی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالہ سے آ کر خط لکھوں گا۔

روز چہار شنبہ ۱۳۔ رمضان ۱۲۷۹ھ

۴۔ مارچ (۱۸۶۳ء)   غالب

——(۹۸)——

لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت، اور خلعت پہ قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے؟

(۱۸۶۳ء)   غالب

——(۹۹)——

حضرت،

پرسوں صبح کو تمھارے سب کاغذ ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک گھر بھجوا دیے۔ سمجھا کہ اب چند روز کو جان بچی۔ اسی دن شام کو ایک خط آپ کا اور پہنچا۔ اس کو بھی روانہ کرتا ہوں۔ اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصّل لکھ چکا ہوں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں، وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال باور نہیں اور کسی نے جو کہہ دیا کہ غالب کے پانو کا ورم اچھا ہو گیا اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا۔ بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں یا پیش از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی میں مجرا لے[۱] لیتا تھا۔ اس

[۱] گویا ۱۸۴۳ء تک یہ حالت تھی کہ رات کے وقت شراب پینے کا ایک پیمانہ مقرر کر لیا تھا اور التزام کے ساتھ پیتے تھے۔ اس کے علاوہ دوپہر کے کھانے سے قبل اور شام کے قریب تین تین پیگ پی جاتے تھے۔ بعد ازاں دن کی شراب چھوڑ دی اور شراب شب کی مقدار بھی گھٹا دی۔

بیس برس میں بیس برسائیں ہوئیں۔ بڑے بڑے مینہ برسے۔ پینا ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا، بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی ہے۔ پانو کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہو گئی۔ حکما، جو دو تین یہاں ہیں، اُن کی رائے کے مطابق کل سے نیب کا بنرنا بندھے گا۔ وہ پکالائے گا، تب اس کو پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی۔ تلوا زخمی، پنڈلی زخمی۔ اگر وہ نامرد بے درد جھوٹا ہے تو اس پر ہزار لعنت[1] اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت ۱۲

غالب

(۱۰۰)

حضرت،

آپ کے سب خط پہنچے، سب قصیدے پہنچے۔ بعد اصلاح بھیج دیے گئے۔ ستّر برس کی عمر، آلام روحانی نہ میں کہوں، نہ کوئی باور کرے۔ امراض جسمانی میں کیا کلام ہے؟ بائیں پانو میں مہینے بھر سے ورم ہے۔ کھڑے ہونے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افعال دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ قصّہ مختصر، ایک قصیدہ سابق کا اور ایک کل کا آیا ہُوا، یہ دونوں ایک لفافے میں آج روانہ کرتا ہوں۔

جمعہ ۱۳۔ جولائی (۱۸۶۳ء) غالب

(۱۰۱)



مرزا تفتہ،

یہ غلطی تمھارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ کہ "اعم" بہ تشدید لفظ عربی ہے:

دیگر نتواں گفت اخص را کہ اعم است

مگر بحر درہم ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی زبان عجم نے یُوں بھی لکھا ہو، کاف کے اسقاط کی کیا توجیہہ کرو گے؟ اور پھر اس صورت میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے۔ ناچار اس شعر کو نکال ڈالو۔ ہمیں نے قصائد لکھنے کو کہا تھا، اب ہم منع کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو۔ مدح بشرط ضرورت لکھو، مگر بہ فکر و غور ۱۲ غالب

(۱۶۔ جولائی ۱۸۶۳)

(۱۰۲)

سچ ہے، اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بروے استادن رنگ" کو کہاں سے سمجھتا:

بر از من نصیحت گرے بایدت ندانم پس از من چہ پیش آیدت

میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں، اس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدّت مرض کا بیان مبالغۂ شاعرانہ ہے، اس کو بھی آپ نے سچ جانا ہوگا۔ حال آنکہ یہ دونوں کلمے از راہ طنز تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرح بیان واقعی کو باور نہ کیا تو میں نے تمھیں لکھ بھیجا کہ اچھا

---

[1] وہ شخص جس نے تفتہ کو بتایا کہ غالب کا پانو اچھا ہو گیا۔

ہوں اور یہ کلمہ تمھیں میں نے جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم اور ہاتھ میں جنبشِ قلم ہے، جب تک موقع اصلاح خیال میں آسکتا ہے، آج جو تمھارا دفتر پہنچے گا، اس کو کل روانہ کر دیا کروں گا۔

مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب مرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوڑے[1]، پانو میں ورم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں، نہ یہ رفع ہوتا ہے[2]۔ بیٹھ نہیں سکتا، لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ کل تمھارا دو ورقہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اس کو دیکھ کر تمھیں بھجوایا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجتے رہو۔ ایک دن سے زیادہ توقف نہ کروں گا۔ قریب مرگ ہوں تو بلا سے۔

صبح پنجشنبہ ۲۳۔ جولائی ۱۸۶۳ء غالب

—(۱۰۳)—

"انگشتری" اور "خاتم" دونوں ایک ہیں۔ تم نے "خاتم" بمعنی "نگین" باندھا، یہ غلط۔

"جنس وفائے کس مخر" کیا ترکیب ہے؟ "جنس کس مخر وفا" البتہ درست ہے۔ نظر اول میں بہ سبب تکدر حواس اور کثرت درد و ورم پا کے میں نے خیال نہ کیا ہو گا ۱۲

یہ خط لکھ کر بند کر رکھا تھا کہ کل صبح روانہ کروں گا۔ چشم بد دور! آج اسی وقت کہ دو گھڑی دن ہے، آپ کا نوازش نامہ پہنچا، وہ سطر جو میں نے خالی چھوڑ دیا ہے، اس کو کتر کر، یہ سطریں لکھ کر، پھر بند کرتا ہوں:

سبحان اللہ: "دیگر نتواں گفت اخص را کہ اثم ست ایں"

اس کا وزن کب درست ہے؟ کیا فرماتے ہو؟ غور کرو۔ بعد غور کے اس کی ناموزونی کا خود اقرار کرو گے۔

شرفؔ قزوینی[3] کے مطلع میں:

"ساغر غم درکشیدہ ایم" "دم درکشیدہ ایم"

دوسرے شعر میں: "پیمانہ ہائے زہر ستم درکشیدہ ایم"

"درکشیدن" کو ربط پیمانے کے ساتھ ہے یا زہر کے ساتھ؟ اگر "زہر درکشیدن" جائز ہوتا تو وہ "سم" کے قافیہ کو کیوں چھوڑتا؟ تیسرے شعر میں "قلم درکشیدن" ہے۔ چوتھے شعر میں "آب درکشیدن" ہے۔ پانچویں شعر میں "سر درکشیدن" ہے۔ کیا زہر پانی ہے؟ اگر مثل زہراب ہوتا تو روا تھا۔

سبحان اللہ! یہ عبارت "چہ جائیکہ شرف قزوینی ساغر و پیمانہ زہر درکشید"۔ اے برادر، شرف زہر کجا درکشید بلکہ پیمانۂ زہر درکشید۔ شما ہم ساغر سم درکشید۔ سم درکشیدن کجا و پیمانۂ غم درکشیدن کجا۔ ہم نے تو تم کو اجازت دی ہے۔ خیر رہنے دو۔ ہند میں اس کو کون سمجھے گا؟ چاہو یوں کر دو:

دانی من دردل آنچہ ہم درکشیدہ ایم — دریک نفس دو ساغر سم درکشیدہ ایم

---

[1] پھوڑے [2] ورم [3] بلند پایہ معاملہ گو فارسی شاعر وفات (۹۶۲/۱۵۵۵)

سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو؟

گمان زلیست بود بر منت زبے دردی   بداست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

خیر، شرف قزدینی کی سند پر وہ مطلع رہنے دو ۱۲ غالب ۱۲

میں ایسا جانتا ہوں کہ "درّاعہ"[1] بہ تشدید ہے اور "درع"[2] بوزن "زرع" اور لغت ہے ۱۲

صاحب، یہ قصیدہ تم نے ایسا لکھا ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا کہنا ہے۔ ایک خیال رکھا کرو کہ شعر کے اخیر میں کوئی ایسی بات آجائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔

ایک قصیدہ اصلاح دے کر بھیج چکا ہوں اور اسی ورق پر فلانے صاحب کے باب میں تم کو ایک نصیحت کر چکا ہوں۔ ادھر کے جواب کا ہرگز خیال نہ رکھو اور ادھر سے اگر قصیدے کے ارسال میں دیر ہوا کرے، تو گھبرایا نہ کرو۔ اب میرے پاس دو قصیدے ہیں۔ ایک "لشکر بر آورم" اور ایک کل آیا ہے "بر جا ماند و در جا ماند" خوب کہی کہ "مضمون سے پہلے ممدوح ڈھونڈھنا پڑتا ہے"۔ اگر میں تم کو ممدوح بتا سکتا تو قصیدہ اس کے نام کا تم سے منگا چکا ہوتا اور اس ممدوح تک پہنچا چکا ہوتا۔ بھائی، ایک دقیقہ ہے کہ لکھنے کے قابل نہیں ہاں ملاقات ہوئے پر کہہ سکتا ہوں۔ اللہ اللہ!

جولائی ۱۸۶۳ء   غالب

———(۱۰۴)———

صاحب،

"گوہر را"، "خاور را" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔ ہم نے اصلاح دے کر تمھارے پاس بھیج دیا ہے۔ جب تم صاف کر کے بھیجو گے، ہم تمھارے ممدوح کو دے دیں گے۔ کل تمھارا قصیدہ پہنچا۔ ہم نے دوپہر کو دیکھ کر درست کیا۔ آج پنجشنبہ ۱۲۔ ستمبر (۱۸۶۳ء) کو ڈاک میں بھجوا دیا۔

صاحب، آج میر بادشاہ آئے۔ تمھاری خیر و عافیت ان کی زبانی معلوم ہوئی۔ اللہ تمھیں خوش رکھے اور مجھ کو تمھارے خوش رکھنے کی توفیق دے۔ ممدوح کا نام کیا لکھوں؟ بات اسی قدر ہے کہ رام پور میں کوئی صورت کسی طرح بنتی نظر نہیں آتی، ورنہ کیا تمھارا قصیدہ وہاں نہ بھجواتا؟

"درّاعہ" کو یہ نہ کہو کہ تشدید نہیں ہے، اصل لغت مشدد ہے۔ شعرا اس کو مخفف بھی باندھتے ہیں۔ سعدیؒ کے مصرع سے اتنا مقصود حاصل ہوا کہ "دراعہ" بے تشدید بھی جائز ہے۔ یاد رہے "جادّہ" اور "درّاعہ" دونوں عربی لغت ہیں۔ وہ دال کی تشدید سے اور وہ رے کی تشدید سے۔ مگر خیر "جادہ" اور "دراعہ" بھی لکھتے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ درّاعہ ہرگز نہیں ہے، یہ کہو کہ درّاعہ بے تشدید بھی جائز ہے۔

۱۲۔ ستمبر ۱۸۶۳ء   غالب

---

[1] جامہ خصوصاً جامۂ صوف [2] زرہ آہن۔

(١٠٥)

بھائی صاحب،

"کشیدن" کی جگہ "درکشیدن" بلکہ "برکشیدن" کی جگہ "درکشیدن" نہ چاہیے۔ "برآمدن" و "درآمدن" کا استعمال بعض متاخرین نے عام کر دیا ہے، یعنی "درآید" سے "برآید" کے معنی لیے ہیں، لیکن "درکشیدن" اور ہے اور "برکشیدن" اور۔ میں قریبِ مرگ ہوں۔ پانو کے ورم نے اور ہاتھ کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ باور کرنا اور میرے سب آدمی بلکہ دوست جو روز آتے ہیں وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے۔ اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے، سب کو منع کر دیا۔ ایک رئیس رام پور اور ایک تم، ان کی اصلاح رہ گئی ہے۔

غالب

(١٠٦)

لاحول ولا قوۃ، کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریقِ قہرِ درویش بجانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

(١٠٧)

نورِ چشمِ غالبِ از خود رفتہ، مرزا تفتہ،

خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔ نہ دوست بخیل، نہ میں کاذب۔ مگر بقول میر تقی،

اتفاقات ہیں زمانے کے

بہر حال کچھ تدبیر کی جائے گی اور ان شاءاللہ صورت فروغ جلد نظر آئے گی۔[1] تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہ ہوا؛

یا کرم خود نہ ماند در عالم — یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد

اغنیاے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعارِ عاشقانہ بطریقِ غزل کہا کرو اور خوش رہا کرو۔

سہ شنبہ، ۲۴۔ نومبر ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب غالب

(١٠٨)

صاحب،

کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اس پر یہ لکھ کر کہ یہ پارسل ہے، خط نہیں، ڈاک میں بھیج دیا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمت گار ناخواندہ آدمی، اس کا حکم بجا لایا اور اس کو خطوں کے صندوق میں ڈال دیا۔ وہ لفظ یہ کہ خط نہیں ہے پارسل ہے، دستاویز معقول ہے اگر وہاں کے ڈاکیے تم سے خط کا محصول مانگیں تو تم اس جملے

---

[1] بظاہر یہ کسی مدحیہ قصیدے کے صلے کا معاملہ ہے۔

کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔

مکان میرے گھر کے قریب، حکیم محمود خاں کے گھر کے نزدیک، عطار بھی پاس، بازار بھی قریب۔ ڈھائی روپے کرایہ کو موجود، مگر مالک مکان سے یہ وعدہ کہ ہفتہ بھر کسی اور کو نہ دوں گا۔ بعد ایک ہفتے کے اگر تمھارا مسافر نہ آیا تو مجھے اور[1] کرایہ دار کے دینے کا اختیار ہے۔

رام پور کے باب میں مختصر کلام یہ ہے کہ نہ میں والی رام پور کو لکھ سکتا ہوں، نہ اس کے لکھنے کی وجہ تم کو لکھ سکتا ہوں۔ اگر ریل میں بیٹھ کر آؤ گے تو زبانی کہہ دوں گا۔

سہ شنبہ ۳۔ ربیع الثانی (۱۲۸۱ھ)۔ ششم ستمبر ۱۸۶۴ء　　غالب

(۱۰۹)

بھائی،

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت، دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا جو دالان میرے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے۔ اگرچہ گرا نہیں، چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔



میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمھاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے۔ بیمار ہیں، احسن اللہ خاں معالج ہیں۔ فصد ہو چکی ہے۔ جونکیں لگ چکی ہیں اب مسہل کی فکر ہے۔ سوا اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آ جائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔ لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ!

صبح ۱۴۔ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء　　غالب

(۱۱۰)

منشی صاحب،

میں سال گزشتہ بیمار تھا۔ بیماری میں خدمتِ احباب سے مقصر نہیں رہا۔ اب مردہ ہوں۔ مردہ کچھ کام نہیں کر سکتا۔

---

[1] کسی دوسرے۔

کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترک ملاقات ہے، مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختار کار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکرودر صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ ریٹی گن صاحب مقرر ہوئے۔ ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے اُن کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے، بقید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے، نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو، فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں نیّرؔ اور اردو میں رخشاںؔ تخلص کرتے ہیں، اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد۔ نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد، اردو میں شیفتہؔ اور فارسی میں حسرتیؔ تخلص کرتے ہیں۔ اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔ منشی ہرگوپال معز زقانون گو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں تفتہؔ تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد۔ ظاہرا، بعد اس فہرست بھیجنے کے انھوں نے کچھ اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہو گا، پھر کچھ آپ لکھا ہو گا۔ مجھ کو اس حال سے کچھ اطلاع نہیں۔ تمھارے خط کی رُو سے میں نے اطلاع پائی۔ اب میں مولوی مظہر الحق ان کے منشی کو بلاؤں گا اور سب حال معلوم کروں گا۔ اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی و فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ہو گا۔ خدا کرے کچھ تم کو فائدہ ہو جائے۔ ورنہ بظاہر سوائے درج ہونے نام کے اور کسی بات کا احتمال نہیں ہے۔ ریٹی گن صاحب اب عدالت خفیہ کے جج ہو گئے۔ ڈکرودر صاحب بہادر پہاڑ سے آ گئے، اپنا کام کرنے لگے۔ ریٹی گن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر جا رہے ہیں۔ معہذا جاڑے کا موسم، بڑھاپے کا عالم، وہاں تک جانا دشوار اور پھر کوئی مطلب نکلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بہرحال مولوی مظہر الحق پرسوں یک شنبہ کے دن میرے پاس آئیں گے۔ حال معلوم کر کے اگر میرا جانا یا لکھنا تمھاری فلاح کا موجب ہو گا تو ضرور جاؤں گا۔

روز جمعہ ۹۔ دسمبر ۱۸۶۴ء — غالبؔ

(۱۱۱)

آؤ میرزا تفتہؔ، میرے گلے لگ جاؤ اور میری حقیقت سنو۔ یک شنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ اُن سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ریٹی گن صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں دیوان تمھارے اور نشتر عشق اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے معتقد ہیں کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہو گا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے۔ باقی ما بخیر شما بسلامت۔ ہاں ان کے تحت میں پندرہ بیس روپے مشاہرے کے علاقے ہیں۔ اگر تمھاری اجازت ہو تو اس امر میں اُن سے کلام کروں۔

میرا عجب حال ہے، حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا؟

گمان زلیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

سامعہ مرگیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا. جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں. حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا. شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سو روپے مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا. متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوضِ خدماتِ سابقہ میں شمار کیجیے تو میں سکّہ لمبر سہی ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بشرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے، وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آتا. فتوح مقرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب ازراہِ جوانمردی دیے جاتے ہیں اور بھائی تمھاری مشق، چشم بد دور، صاف ہوگئی۔ سطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان میرے بعد کیا کروگے؟ میں چراغِ دمِ صبح و آفتابِ سرِ کوہ ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

نجات کا طالب غالب

۱۴- رجب سنہ ۱۲۸۱ھ (۱۴- دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء)

—(۱۱۲)—

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ غالب کی دعائے درویشانہ قبول کریں۔

ہم آپ کو سکندر آباد قانونگویوں کے محلے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجہ مان سنگھ کی حویلی، مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدارِیہ حقہ[1] لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نولکشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یک شنبہ ہے، اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے تو پنجشنبہ حد جمعہ کو پہنچتا ہے۔

مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو؟ کیسے ریٹی گن صاحب، کہاں ریٹی گن صاحب! پنجشنبہ کے دن ۱۹- جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلعے میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔ اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقاتِ تودیع[2] کو نہیں گیا۔ انوار الحق گھاٹ پر نوکر ہیں۔ پندرہ روپے مشاہرہ پاتے ہیں۔ زیادہ، زیادہ۔

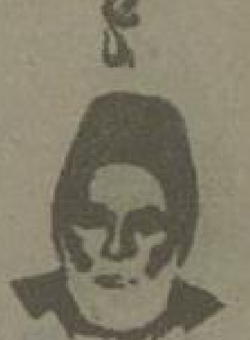
نجات کا طالب، غالب

صبح یک شنبہ ۱۲- فروری سنہ ۱۸۶۵ء

—(۱۱۳)—

صاحب،

واقعی "سداب[3]" کا ذکر کتب طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔ تمھارے ہاں اچھا نہیں بندھا تھا، اس واسطے کاٹ دیا۔ قراب[4] کونسا لفظ غریب ہے، جس کو اس طرح پوچھتے ہو؟ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام



---

[1] ادنیٰ درجہ کا حقہ جس کی نے سیدھی ہو۔ [2] رخصتی ملاقات۔ [3] پودینہ جیسی ایک گھاس جسے تتلی کہتے ہیں۔ دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہے نیز بمعنی قوت و قدرت۔ [4] تلوار کا میان نیز مشکیزہ و نزدیکی۔

میں ہزار جگہ آیا ہے۔ قراب اور سداب دونوں لغت عربی الاصل صحیح ہیں۔ غالب ۱۲

(۱۱۴)

حضرت، اس غزل میں پروانہ و پیمانہ و بت خانہ تین قافیے اصلی ہیں "دیوانہ" چونکہ علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ متشخص ہوگیا ہے، اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی "غلامانہ" و "مستانہ" و "مردانہ" و "ترکانہ" و "دلیرانہ" و "شکرانہ" سب ناجائز، نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوافی پر رکھی۔ "کاشانہ" و "شانہ" و "افسانہ" و "جانانہ" و "فرزانہ" یہ قافیے کیوں ترک کیے؟ یاد رہے۔ ساری غزل میں مردانہ یا مستانہ یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظرثانی ہو گئی اور غزل لکھ کر بھیجو تاکہ اصلاح دی جائے۔ عفو کا طالب، غالب

(۱۱۵)

مرزا تفتہ،

پیر شو، بیاموز۔ تم خوش گو اور زود گو مقرر ہو، لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو، وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو، وہ قیاس کہیں مطابق واقع ہوتا ہے، کہیں خلاف۔ عرفی کہتا ہے:

روح را ناشتا فرستادی

یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا "ناشتا" اس کو کہتے ہیں، جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اس کی "نہار منہ"۔ تم لکھتے ہو:

"کہ عجب ناشتا فرستادی"

یعنی غذائے صبح جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے، اس نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں۔ واقف کہتا ہے:

نے محرم قفس، نہ بہ دام آشنا شدیم نفریں کنیم ساعت پرواز خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے۔ "بُری گھڑی" اور "سبھ گھڑی" اہل زبان ایسے موقع پر "طالع" لکھتے ہیں:

نفریں کنیم طالع پرواز خویش را

قتیل کہتا ہے:

یک وجب جائے بکوے تو زخوں پاک نہ بود کشتہ بر کشتہ تپاں بود دگر خاک نہ بود ؎

یہاں پر "ہیچ نبود" کا محل ہے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں اور پھر صاحب "برہان قاطع" کا ذکر کرتے ہو! وہ تو ہر لغت کو تین حرکتوں سے لکھتا ہے۔ زیر، زبر، پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا۔ لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا ہے۔ جس لغت کو کاف عربی سے لکھے گا، کاف فارسی سے بھی بیان کرے گا۔ جس لفظ کو طائے حطی سے لائے گا، تائے قرشت سے بھی ضرور لکھے گا۔ فضلائے کلکتہ کے حاشیے دیکھو کہ وہ اس کی کیا تحمیق کرتے ہیں۔

---

[1] ناپسند، نامنظور۔

نبیا نبوت کے مشتقات میں سے ہرگز نہیں۔ امامن امام کے مشتقات ہیں سے زنہار نہیں۔ نبی بخش کا مخفف ہے تبیا
اور امام کا متعلق اگر مذکر ہے تو امامی اور اگر مؤنث ہے تو امامن۔ طغرا[1] نے ہندی لغت کے لانے کا التزام کیا ہے؛

وقت آں آمد کہ مینا راگ ہندی سر کند

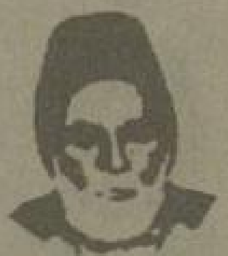
اور اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں، مگر کیا کریں، بگڑ گانواں نام ہے ایک گاؤں کا، اس کو کیوں کر بدلیں؛ ہاں "گڑ" بہ رائے قرشت کہیں گے۔ لکھنؤ نام ہے ایک شہر کا، وہ لکنؤ بغیر ہائے مخلوط کے کہیں گے۔ فی زمانا چھاپے کو چاپ بولتے ہیں۔ عرفی جھگڑے کو "جکر" بولتا ہے؛

آں باد کہ در ہند گر آید جکر آید

رائے ثقیلہ، ہائے مخلوط، تشدید، یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں۔ صاحب "برہان قاطع" اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہل ہند میں بھی اس کو مشترک جانتا ہے۔ اپنے کو رسوا اور خلق کو گمراہ کرتا ہے؛

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت جانیں؛ گائے کا بچہ بہ زور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔ یہ جھگڑے قصے جانے دو۔



دو باتیں سنو۔ ایک تو یہ کہ ارغنون کو بغین مضموم میں نے سہو سے لکھا۔ دراصل ارغنون بغین مفتوح اور مخفف اس کا ارغن اور مبدل منہ ارگن ہے۔ دوسرے یہ کہ جب موسوی خاں نے ایواے کو ایوا لکھا، تو اس لفظ کی صحت میں کچھ تامل نہ رہا۔

رام پور سے اپریل کے مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب[2] آگیا۔ آئندہ جو خدا چاہے۔

یک شنبہ ۱۴۔ مئی ۱۸۶۵ء
غالب

(۱۱۶)

تم نے "تن تن" کا ذکر کیوں کیا؛ میں نے اس باب میں کچھ لکھا نہ تھا۔ "تن تن" اور "تننا" اصوات ہیں تار کے، ہندی اور فارسی میں مشترک۔ "نبیا" اور "امامن" کے لکھنے کو میں نے منع ہرگز نہیں کیا۔ شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھا کہ "نبیا" مخفف "نبی بخش" اور "امامن" متعلق بہ "امام" ہے۔ مشتقات میں اس کو تصور نہ کرو۔ قاعدہ دانان اشتقاق تم پر ہنسیں گے

---

[1] طغرا مشہدی، کچھ عرصہ مراد بخش بن شاہجہان کے پاس گزارا پھر کشمیر میں گوشہ نشین ہوگیا۔ وہیں وفات پائی۔ نثر میں بہت مشہور ہوا۔ [2] نواب یوسف علی خاں کی وفات پر نامہ تعزیت اور جانشینی نواب کلب علی خاں کے جلوس پر نامہ تہنیت۔

الواے کے جتنے شعر تم نے لکھے ہیں، سب مانع ہیں "الوا" کے اور سند "الواے" کی۔ موسوی خاں نے بحسبِ ضرورتِ شعر "الوا" لکھا۔

"تہمتن" بر وزن "قلمزن" ہے۔ فردوسی نے سو جگہ شاہنامے میں "تہمتن" بسکون ہاے ہوز لکھا ہے۔ پس کیا اس لغت کی دو صورتیں قرار پا گئیں؟ لاحول ولا قوۃ۔ لغت وہی بحرکت ہاے ہوز ہے ۱۲

میں نے کس قدر کلام کو طول دیا۔ صائب کے شعر کی حقیقت شرح و لبسط سے لکھی۔ تم نے ہرگز اعتنا نہ کیا۔ "الوا" کو الگ سمجھے۔ "مصیبتاہ" کو جدا سمجھے۔ بھلا میرے قول کو گوز شتر سمجھتے ہو؟ نرا "مصیبتاہ" یا "حسرتاہ" برہان قاطع میں یا "بہارِ عجم" میں ہم کو دکھا دو۔ وہی "واے" ہے کہ جب اس کے بعد "مصیبتا" یا "حسرتا" یا "ویلا" آتا ہے، تو تحتانی کو حذف کر کے "وا ویلا" وغیرہ لکھتے ہیں۔ چاہو "اے واویلا" لکھو، چاہو آخر میں ہاے ہوز لکھو، جیسا کہ "وامصیبتاہ" چاہو بے ہاے ہوز "وامصیبتا" اور یہی حال ہے "حسرت" و "درد" و "اسف" و "دریغ" کا۔ جہاں "اے" کے ساتھ وامصیبتا پاؤ، وہاں "اے" کے حرف کو ندا، اور منادیٰ یعنی ہمنشین اور ہمدم کو مقدر سمجھو۔ فرہنگ لکھنے والوں نے اشعار قدما میں ترکیبیں دیکھیں، اپنا قیاس دوڑا کر اس کی حقیقت ٹھہرا لی۔ کہیں ان کا قیاس غلط، کہیں صحیح۔ سو ان میں بہ دکنی ایسا کج فہم ہے کہ اس کا قیاس سو لغت میں شاید دس جگہ صحیح ہو۔ میں نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ موسوی خاں کے شعر کی سند پر "الوا" کو رہنے دو، مگر صائب کے شعر میں "الوا" کو الگ اور "مصیبتاہ" کو جدا نہ سمجھو۔ تمھارے قیاس نے پھر تمھیں کہیں کا کہیں پھینکا اور تم نے بھی کہا کہ صائب نے "الوا" لکھا ہے۔

نجات کا طالب، غالبؔ

(۱۱۷)

دل بلسے داغدار بود، نماند
در نظرہا بہار بود، نماند

اگر بود کے آگے واو کو موقوف اور محذوف کر دو گے تو ہمارے نزدیک کلام سراسر بلیغ ہو جائے گا۔[1] میری جان جو خجالت کہ مجھ کو تم سے ہے، شاید بسبب عبادت نہ کرنے کے قیامت میں خدا سے بھی نہ ہو گی اور بسبب خلافِ شرع کرنے کے پیمبر سے بھی نہ ہو گی۔ مگر خدا ہی جانتا ہے جو میرا حال ہے۔

مرگِ ناگاہ کا طالب، غالبؔ

---

[1] تفتہ کا شعر غالباً اس طرح تھا:

دل بلسے داغدار بود و نماند
در نظرہا بہار بود و نماند

—(۱۱۸)—

میاں،

سُنو اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے، جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائل دینی سے۔ بلکہ ہم تم باوجود عدم واقفیتِ امورِ دینی سے نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ آتالیق کہاں؟ وہاں سے نکالے گئے۔ دلّی میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں، جب سے آئے ہیں، ایک بار میرے پاس نہیں آئے۔ نہ میں ان کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، چہ جائے آنکہ مدح کیجیے۔ بقول انوری:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

غالب

—(۱۱۹)—

میرے مہربان، میری جان، میرزا تفتۂ سخنداں،

تمھارا سکندر آباد اور میرے خط کا تمھارے پاس پہنچنا تمھاری تحریر سے معلوم ہوا۔ زندہ رہو اور خوش رہو۔ میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب[1] از روئے صورت روحِ مجسم اور باعتبار اخلاق، آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال غلّے محصول معاف کر دیا۔ ایک اہل کار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا[2]۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے، مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ مصطفیٰ خاں صاحب بتقریب تہنیت مسند نشینی و شمولِ جشن آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵۔ دسمبر خلعت[3] کا آنا مسموع۔

دوشنبہ ۲۸۔ نومبر ۱۸۶۵ء، بوقت چاشت

نجات کا طالب، غالب

—(۱۲۰)—

لو صاحب

کھچڑی کھائی دن بہلائے، کپڑے پھاٹے گھر کو آئے

۸۔ جنوری ماہ و سال حال، دوشنبہ کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا[4]۔ تمھارا خط مضامین دردناک

---

[1] نواب کلب علی خاں والی رام پور [2] علی بخش خان سامان [3] خلعت سرکار انگریزی [4] رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی کا ذکر ہے۔

سے بھرا ہُوا رام پور ہیں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدرالصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ اُنھوں نے بیمارداری اور غمخواری بہت[1] کی۔ کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا، جس کو اُتار پھینکو گے؟ ترک لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پئے گزارا نہ ہو گا۔ سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو؛

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

(جنوری ۱۸۶۶ء) اس خط کی رسید کا طالب، غالبؔ

—— (۱۲۱) ——

میرزا تفتہؔ صاحب،

پرسوں تمھارا دوسرا خط پہنچا۔ تم سے پردا کیا ہے، ایک فتوح کا منتظر ہوں۔ اس میں مَیں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے۔ زمانہ فتوح کے آنے کے قریب آ گیا ہے۔ اِن شاء اللہ خط میرا مع حصّہ فتوح جلد پہنچے گا۔ پنڈت بدری ناتھ یا بدری داس ڈاک منشی کرنال باآنکہ مجھ سے اس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، مگر میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے[2] کے میں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہؔ کے پاس بھیج دیا کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی ان کو اطلاع لکھو۔ میں زندہ ہوں اور کے طور میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے، وہ باعتبارِ ترکِ اصلاحِ نظم لکھا ہے، ورنہ زندہ ہوں، مُردہ نہیں۔ بیمار بھی نہیں۔ بُوڑھا، ناتوان، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرا، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار۔

غالبؔ

---

[1] خود میرزا نے دہلی پہنچ کر نواب کلب علی خاں کو حالات سفر مراجعت کی جو تفصیل بھیجی اس سے پتا چلتا ہے کہ دریائے رام گنگا میں سرمائی بارش کے باعث سیلاب آ گیا تھا۔ میرزا پالکی میں دریا سے پار آ گئے پھر پُل ٹوٹ گیا۔ سامان کی گاڑی اور نوکر چاکر دوسرے کنارے پر رہ گئے۔ میرزا نے سرائے مراد آباد میں رات کمبل کے ساتھ گزاری۔ سردی کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں نے دو آدمی بھیج دیے۔ وہ میرزا کو سعید الدین خاں کے لے گئے۔ پھر مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مراد آباد پہنچ گئے اور اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا چنانچہ میرزا نے پانچ روز ان کے ہاں گزارے۔ ذرا طبیعت سنبھلی۔ گاڑی اور نوکر چاکر آ گئے تو دہلی روانہ ہوئے۔ نواب کلب علی خاں کو نواب مصطفیٰ خاں کی زبانی علالت کا علم ہُوا تو فوراً مراد آباد کے پتے سے میرزا کو لکھا کہ اگر طبیعت کی ناسازی کے باعث مراد آباد میں قیام کا ارادہ ہو تو بہتر یہ ہو گا کہ رامپور آ جائیں اور یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئے گا۔ مگر اس وقت تک میرزا دہلی پہنچ چکے تھے۔

[2] مطلب یہ کہ جب میں اصلاح دینے کے قابل نہ رہا، جیسا کہ آگے چل کر خود میرزا نے واضح کر دیا ہے۔

(۱۲۲)

حضرت،

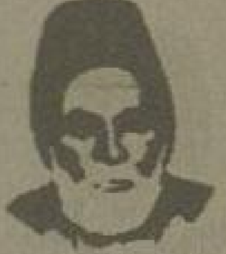
اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں، لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہٖ وہ حال ہے کہ ایک مزبلے[۱] پر سیب کا یا بہی کا درخت اُگ جائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ دُکان بے رونق کے خریدار رہو[۲] ۱۲

(۱۲۳)

میرزا تفتہ،

کیا کہنا ہے، نہ ظہیر کا پتا، نہ غالب کا۔ مداح شایستہ صد ہزار آفریں اور ممدوح سزاوار صد نفریں[۳]۔

مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ



میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے پردادا نادر شاہ کے ساتھ اصفہان سے ہندستان آئے تھے۔ ان کے دادا رکن الدولہ امراؤ علی خاں بہادر غالباً ہندستان میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کے ندیم خاص بن گئے تھے۔ علاقہ دلمئو کے ناظم تھے۔ مہرؔ کے والد کا نام میرزا فیض علی بیگ تھا۔ وہ انگریزی عملداری میں تحصیلداری کے عہدے پر فائز رہے۔ مہرؔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان مستقل طور پر مقیم تھا۔ ابھی کم عمر ہی تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ والدہ نے بڑے اہتمام سے تعلیم دلائی۔ ۱۸۴۰ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے چنارگڑھ ضلع مرزاپور میں منصف مقرر ہوئے۔ خود لکھتے ہیں:

از بسکہ سوزِ ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم
منصف چنارگڑھ میں مقرر ہوئے ہیں ہم

حاتم علی بیگ کے ایک بھائی عنایت علی بیگ تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ بڑے تھے اور بعض انھیں چھوٹا بتاتے ہیں۔ غرض دونوں بھائیوں کو تقریباً ایک ہی وقت میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ عنایت علی بیگ نے ماہؔ تخلص رکھا اور آتشؔ کے شاگرد ہوئے، حاتم علی بیگ نے مہرؔ تخلص اختیار کیا اور ناسخؔ کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

"غدر" میں مہرؔ نے اپنے ماموں سعادت علی بیگ کی امداد سے سات انگریزوں کو اپنے گھر میں پناہ دے کر ان کی جان بچائی۔ اس خدمت کے صلے میں انھیں بائیس پارچے کا خلعت، مالائے مروارید اور ایک گھوڑا مع اسلحہ کے نیز دو گاؤں جاگیر میں عطا ہوئے۔ غالب نے خط نمبر ۲۸ میں اسی اعزاز کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد میرزا مہرؔ لکھنؤ کی اقامت

---

[۱] کوڑا کرکٹ ڈالنے کا مقام۔ [۲] معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ تفتہ نے خود غالب کی مدح میں لکھا تھا۔ [۳] ظاہراً یہ قصیدہ بھی غالب ہی کی مدح میں تھا۔

چھوڑ کر آگرہ میں مقیم ہو گئے اور وکالت شروع کر دی۔ آگرہ میں وہ نواب معتمد خاں کی مسجد کے متصل رہتے تھے۔ بیچ میں آنریری مجسٹریٹ بھی ہو گئے تھے۔

۱۸۷۹ء میں اپنے بیٹے میرزا سخاوت علی بیگ تحصیلدار سے ملنے کے لیے ایٹہ گئے۔ وہیں وفات پائی۔ بڑے بے تعصب آدمی تھے۔ مہاراجہ بلوان سنگھ خلف مہاراجہ چیت سنگھ نے مہرؔ کی شاگردی اختیار کر لی تھی اور سنا ہے کہ پچاس روپے ماہانہ بطور نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

مہرؔ کا ابتدائی منظوم کلام غدر میں لٹ گیا۔ وہ خود کہتے ہیں:

اس عہد میں ہر اک تہِ چرخِ کہن لٹا
اوروں کا زر لٹا، مرا نقدِ سخن لٹا

بقیہ تصانیف کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ دیوان اردو موسوم بہ "الماس درخشاں" یا "خیالاتِ مہرؔ"
۲۔ رسالہ "پیرایۂ عروض"
۳۔ ایاغ فرنگستان (یعنی ابتدائے عہد انگلشیہ کی تاریخ جو ۱۸۷۲ء میں طبع ہوئی)
۴۔ "داغ دل مہرؔ" (واسوخت)
۵۔ "داغ نگار" (مثنوی)
۶۔ "شعاع مہرؔ" (مثنوی)
۷۔ "بیان بخشایش" (مثنوی)

اس کے علاوہ "ہمدم آخرت"، "پنجۂ مہرؔ"، "توقیر شرف" وغیرہ کے نام سنے جاتے ہیں۔ غارت شدہ کلام میں "خارِ عشق"، "انجام عشق"، "کشکول" وغیرہ شامل تھے، جن کی مفصل کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

ان شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جن سے مہرؔ کی ملاقات تھی اور اس کا نام "محیط آشنا" رکھا تھا۔ "قاعدۂ نظم" کے نام سے بھی ایک تصنیف کا ذکر دیکھا ہے۔

---

(۱)

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کیا کم ہے؛ غلام ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے؟

علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علیؑ کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اس کے اجارے میں آئی ہے، یہ بھی دلیل آشنائی

۱؎ بینائی۔ ۲؎ شنوائی۔

ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہو لے اپنے کو بیگانہ یک دگر سمجھیں، البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں، اگر سمجھیں۔ سلام لکھا تھا، آپ کی نظر سے گزر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دوبالا کیجیے گا۔

ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ، اس کا شیوہ یہ تھا کہ اُردو کے فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انھیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ، چشم بدور۔ اُردو کی راہ کے تو سالک ہو، گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوبی میں کم نہیں۔ مشق شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے، لطف پاؤ گے۔ میرا تو گویا بقول طالب آملی اب یہ حال ہے:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود، بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے مجھے لکھا ہو تو کیونکر مجھے اپنے خط کے جواب کی تمنا نہ ہو۔ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ میں نے سُنا تھا آپ کہیں کے صدر امین ہیں، پھر اکبر آباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اس ہنگامے[1] میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی؟ راجہ بلوان سنگھ[2] کا بھی حال لکھنا ضرور ہے۔ کہاں ہیں اور وہ دو ہزار روپے مہینا جو ان کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا، اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟

ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے[3]؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگاہی ہوگی۔ امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ پتا مسکن مبارک کا کشمیری بازار سے زیادہ نہیں معلوم۔ ظاہرا اسی قدر کافی ہوگا، ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔

میرزا تفتہ کو دعا کہیے گا اور ان کے اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا، جس میں آپ کے خط کی انھوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام



—— (۲) ——

خود شکوہ دلیل رفع آزار بس است
آید بہ زبان ہر آنچہ از دل برود

---

[1] "غدر"۔ [2] فرزند راجہ چیت سنگھ والی بنارس۔ چیت سنگھ وارن ہیسٹنگز کی سختیوں سے تنگ آکر بنارس سے نکلا تو گوالیار میں جا بیٹھا تھا۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا بلوان سنگھ اور رانی آگرہ میں مقیم ہو گئے۔ راجہ بلوان سنگھ مرزا غالب اور حاتم علی بیگ مہر کے دوست تھے اور آخر الذکر کے شاگرد بھی۔ راجہ تخلص کرتے تھے۔ [3] ان سے مراد غالباً مجتہد العصر سید محمد بن غفران مآب سید دلدار علی ہیں۔

بندہ پرور!

فقیر شکوے سے بُرا نہیں مانتا، مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خُوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے منہ نہ موڑے اور مُعہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے[1]۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا، اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا؟ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس عرصے میں کئی خط بھجوائے اور وہ اُلٹے پھر آئے؟ آپ شکوہ کا ہے کو کرتے ہیں، اپنا گناہ میرے ذمے دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ میں کہاں جاتا ہوں؟ نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں، کل آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آج میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ کہیے اپنے دعوے میں صادق ہوں یا نہیں؟ پس دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ مرزا تفتہ سے آپ فقط ان کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ان دنوں کہاں ہیں۔ آج توکلت علی اللہ، سکندر آباد خط بھیجتا ہوں، دیکھوں کیا دیکھتا ہوں۔

(۵۔ مارچ ۱۸۵۶ء)

—— (۳) ——

صاحب میرے!

عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجیے، پریوں کو تسخیر کیا کیجیے۔ مثنوی پہنچی۔ جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں۔ کیا خوب بول چال ہے۔ انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف۔ جبشنوں کا استغاثہ کیا کہوں کیا مزہ دے رہا ہے:

بگم صاحب پھسوڑے میں پھنسایا
چُھٹا بیگم نے بے حرمت کرایا[2]

اس مثنوی نے اگلی مثنویوں کو تقویم پارینہ[3] کر دیا۔ "بیان بخشائش[4]" ہم گنہ گاروں تک کیوں کر پہنچے گا؟ مگر اس راہ سے:

کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

"بخشش" کا متوقع ہوں۔ میں ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھا کہ وہ نسخہ نظم ہے یا نثر ہے اور مضمون اس کا کیا ہے۔

میرزا یوسف علی خاں آٹھ دس مہینے سے مع اہل و اطفال اسی شہر میں مقیم ہیں۔ ایک ہندو امیر کے گھر پر مکتب کا سا طور کر لیا ہے۔ میرے مسکن کے پاس ایک مکان کرایہ کو لے لیا ہے، اس میں رہتے ہیں۔ اُن کو خط بھیجو تو میرے مکان کا پتا لکھ دینا اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ میرے خط کے سرنامے پر محلّے کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام، قصّہ تمام۔ ہاں، یا عزیز کے خط پر میرے مکان کے قریب کا پتا ضرور ہے۔ دو روز سے "شعاع مہر" کو دیکھ رہے ہیں۔ اکثر تمھارا ذکر خیر

---

[1] شکوے کی کتنی عمدہ اور جامع تعریف ہے کہ بات سچّی کہے اور دُوسرے کے لیے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے [2] یہ شعر "شعاع مہر" کا ہے جس نے پہلی مثنویوں کو تقویم پارینہ کر دیا۔ [3] پرانی جنتری جو بالکل بیکار ہوتی ہے۔ [4] مہر کی ایک مثنوی۔

رہتا ہے۔ وہ نواب ہر وقت یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ رات کو نو پہر چھ گھڑی کی نشست روز رہتی ہے۔ ابھی یہیں سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ تم کو سلام کہتے ہیں اور "شعاع مہر" کے مداح اور "بیان نخشائش" کے مشتاق ہیں۔

(۱۸۵۸ء)

(۴)

بھائی صاحب،

تمہارا خط اور قصیدہ پہنچا۔ اصل خط تمہارا لفافے میں لپیٹ کر مرزا تفتہ کو بھیج دیا تاکہ حال ان کو مفصل معلوم ہو جائے۔ بعد اس رپورٹ کے تم کو تہنیت دیتا ہوں۔ پروردگار بہ تصدق ائمۂ اطہار پیش آمد اقبال تم کو مبارک کرے اور منصب ہائے خطیر اور مدارج عظیم کو پہنچاوے۔ واقعی یہ کہ تم نے بڑی جرأت کی۔ فی الحقیقت اپنی جان پر کھیلے تھے۔ بات پیدا کی، مگر اپنی مردمی و مردانگی سے۔ دولت کا ہات آنا مع نیکنامی، اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ اب یقین یہ ہے کہ خدمت منصبی ملے اور جلد ترقی کرو[1]، ایسا کہ سال آیندہ تک صدر الصدور ہو جاؤ۔ اللہ اللہ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ "مغل[2]" نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اس کے حسن کے وصف میں لکھے تھے، تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجھ کو دکھائے تھے، اب یہ ایک زمانہ ہے کہ طرفین سے نامہ و پیام آتے جاتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ دن بھی آجائے گا کہ ہم تم بیٹھیں اور باتیں کریں۔ قلم بیکار ہو جائے، زبان برسر گفتار آئے۔ انشاء اللہ خاں کا قصیدہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشین۔ زیادہ کیا لکھوں؛

غالب



(۵)

بندہ پرور،

آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہرانگیز اور محبت خیز باتوں نے غمِ بیکسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے! کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے!! آفریں! آفریں! تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے[3]:

نامہ خود سال خویش داد نشاں

مرزا تفتہ کا خط ہاترس سے آیا۔ ان کے لڑکے بالے اچھے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ آئے کے آئے۔ اگر تمہیں بدوں ان کے آرام نہیں تو ان کو بغیر تمہارے چین کہاں؟

---

[1] مرزا مہر نے غدر میں چند انگریزوں کی جان بچائی تھی۔ جس کے صلے میں گراں بہا خلعت اور دو گانوں جاگیر میں ملے تھے۔ ان فقروں میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ [2] مغل جان طوائف میں سے تھی۔ سنا ہے کہ گاتی بہت اچھا تھی۔ [3] ظاہراً یہ مطلب ہے کہ مرزا مہر نے "دستنبو" کی تاریخ لکھی تھی جس میں ید بیضا کے الفاظ بھی تھے۔ "دستنبو" اور "ید بیضا" کی مناسبت ظاہر ہے۔

صاحب بندہ، اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲۔ ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں، تم جو مجھ سے محبت کرو گے یا میری غمگساری میں محنت کرو گے، کیا تم کو غیر جانوں جو تمھارا احسان مانوں؛ تم سراپا مہر و وفا ہو، واللہ اسم بامسمےٰ ہو۔

مبالغہ اس[1] کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے بسبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحت الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیو نرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی۔ سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ ان کو لکھ بھیجا ہے۔ اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو ۱۲

حضرت، چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ اللہ! کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر! بہرحال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ اب چھ جلدوں کی کچھ تزیین اور آرائش کی جاوے۔ آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبد اللطیف اور منشی شیو نرائن یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور بہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جاوے کہ کیا کیا جاوے۔ معہذا دو دو روپے کتاب سے زیادہ مقدور بھی نہیں۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ چار جلدیں چھ روپے میں اور دو جلدیں چھ روپے میں تیار ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ یارب آرائش کی گنجایش کہاں؟ ناچار چار کتابوں کی جلد ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کی اور دو کتابوں کی جلد تین تین روپے کی بنائی جائے۔ قصہ مختصر کچھ کیا جائے یا یہی کہہ دیا جائے کہ تیری رائے کونسل[2] میں مقبول اور صرف چھ جلدوں کی تیاری منظور ہوئی، بارہ روپے بھیج دے ۱۲ مطالب اور مقاصد تمام ہوئے اور ہم تم بہ زبان قلم باہمدگر ہم کلام ہوئے۔

(دستمبر ۱۸۵۸ء)

—— (۶) ——

بھائی صاحب،

از روئے تحریر مرزا تفتہ آپ کا چھ کتابوں کی تزیین کی طرف متوجہ ہونا معلوم ہوا۔ پھر بھائی منشی نبی بخش صاحب نے دو بار لکھا کہ میں باجمال لکھتا ہوں، مفصل میرزا حاتم علی صاحب نے لکھا ہوگا۔ یارب! ان کے دو خط آ گئے، میرزا صاحب نے اگر لکھا ہوتا تو ان کا خط کیوں نہ آتا؟ اپنے حسن اعتقاد سے یوں سمجھا کہ نہ لکھنا بمقتضائے یک دلی ہے۔ جب اپنا کام سمجھ لیے تو مجھ کو لکھنا کیا ضرور ہے؛ مگر اس کو کیا کروں کہ جواب طلب باتوں کا جواب نہیں۔

مطبع اخبار "آفتاب عالمتاب" میں یکم ستمبر ۱۸۵۸ء حال سے حکیم احسن اللہ خاں کا نام لکھوا دینا اور نمبروں کا اخبار ایک بار بھجوا دینا اور آیندہ ہر ہفتے اس کے ارسال کا طور ٹھہرا دینا۔ کیوں صاحب یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے

---

[1] دستنبو جو آگرہ میں چھپ رہی تھی۔ [2] یعنی میرزا تفتہ، میرزا مہر، منشی نبی بخش حقیر، منشی شیو نرائن آرام کی مجلس شوریٰ۔

نہ کیا؟ اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتا، پوچھتا ہوں کہ آیا یہ امور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں؟[1] مرزا تفتہ کے ایک خط میں یہ قصہ لکھ چکا ہوں۔ کیا انھوں نے بھی وہ خط تم کو نہیں پڑھایا؟ ہر چند عقل دوڑائی، کوئی درنگ کی وجہ خیال میں نہ آئی۔ اب حصولِ مدعا سے قطع نظر، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں چھ مہینے بعد، برس دن بعد، اگر مرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امرِ خاص کا کیا جواب لکھتے ہیں؟ میں بھی شاعر ہوں۔ اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے خیال میں آجاتا۔ کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابلِ سماعت کے ہو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو؟

۲۰۔ ستمبر ۱۸۵۸ء　　　　غالب

(۷)

مرا بہ سادہ دلیہائے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم



کل دوشنبہ کا دن، ۲۰۔ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا، تمہارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا۔ کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ لگانے لگا۔ بکس میں سے تمہارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو بعد چاہنے عفوِ جرم کے آپ کے کل کے خط کا جواب لکھتا ہوں۔

سبحان اللہ! جلد کی آرایش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے۔ میرے دل میں بھی ایسی ہی باتیں تھیں۔ یقین ہے کہ متاعِ شاہوار ہو جائیں گی۔ ابار مہرہ[2] اگر ہو جائے گا تو حرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں بھی رہے۔ بارہ روپے کی ہنڈوی پہنچتے ہی روپیہ وصول کر کے مجھ کو اطلاع دیجیے گا، ورنہ میں متشوش رہوں گا۔

حضرت، یہاں دو چیزیں مشہور ہیں۔ ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں: ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں، اگرو میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ کہ جناب اڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ کے چیف سکرٹر اکبرآباد کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں، خدا کرے سچ ہوں اور سچ ہونا ان کا آپ کے خط لکھنے پر منحصر ہے۔

ہاں صاحب ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے۔ میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے، "تہنیت فتح ہند اور عملداری شاہی۔" ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک لوح

---

[1] شکایت کا کتنا بدیع اسلوب ہے کہ مخاطب سے کہہ رہے ہیں، ابھی شکایت نہیں کر رہا۔ صرف یہ پوچھتا ہوں کہ آیا یہ بات مقتضی شکایت ہے یا نہیں؟ [2] ابار، لئی کو کہتے ہیں جو کاغذ پر پھیر کر وصلی بناتے ہیں۔ پھر اس کا مہرہ کیا جاتا ہے، یہ ابار مہرہ کہلاتا ہے۔

کاغذ مذہبؔ[۱] پر لکھ بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے یعنی چھاپا ہوئی ہے، اگر یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ، منشی شیو نرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو یہ چھپ جائے۔

دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے اور لگا یا جائے پہلے کتاب سے۔ دوسری یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو اور پہلے صفحہ پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں اسی طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ "قصیدہ در مدح جناب ملکۂ انگلستان خلد اللہ ملکہا"۔ میرا نام کچھ ضرور نہیں۔ کتاب کے پہلے صفحے پر تو ہوگا۔ ہنڈوی کی رسید اور اس مطلب خاص کا جواب باصواب، یعنی نویدِ قبول، جلد لکھیے!

(۱۲۔ ستمبر ۱۸۵۸ء) غالب

—— (۸) ——

بھائی صاحب،

خدا تم کو دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے اور ہم تم ایک جگہ رہا کریں۔ خدا کرے قصیدے کے چھاپے کی منظوری اور ہنڈوی کی رسید آئے، گویا صفر کے مہینے میں عید آئے۔ ہنڈوی کا روپیہ جب چاہو منگوالو اور کتابوں کی لوحیں اور جلدیں موافق اپنی رائے کے بنوالو۔

اب آپ دو ورقے کا ڈاک میں بھیجنا موقوف رکھیں اور کتابوں کی درستی پر ہمت مصروف رکھیں۔ قصیدے کے مسودے کا ورق مرزا تفتہ کے خط میں پہنچ گیا ہوگا۔ آپ نے اور مرزا تفتہ نے اور بھائی نبی بخش صاحب نے قصیدے کو دیکھا ہوگا۔ قصیدے کا شاملِ کتاب ہونا بہت ضرور ہے، پر دیکھا چاہیے کہ صاحبِ مطبع کو کیا منظور ہے۔ اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں تو ہم پانچ سات روپے سے اور بھی ان کا بھرنا بھریں گے۔

جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر سے میں صورت آشنا نہیں۔ کبھی میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ خطوں کی میری ان کی ملاقات ہے اور نامہ و پیام کی یوں بات ہے کہ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نئے آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ بطور نذر جاتا ہے۔ بے ذریعۂ جناب صاحب ایجنٹ بہادر دہلی اور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ بھجواتا ہوں اور صاحب سکرتر بہادر گورمنٹ کا خط اس کی رسید میں بسبیل ڈاک پاتا ہوں۔ جب لارڈ کیننگ صاحب بہادر نے کرسی گورنری پر جلوس فرمایا تو موافق دستور کے قصیدہ ڈاک میں بھجوایا۔ ایڈمنسٹن صاحبؔ[۲] بہادر چیف سکرتر کا جو مجھ کو خط آیا تو انھوں نے

---

[۱] سنہری کاغذ۔ اس زمانے میں عام طریقہ یہی تھا کہ پادشاہوں کے قصیدے سنہری یا افشانی کاغذ پر لکھے جاتے تھے۔ [۲] سر جارج فریڈرک ایڈمنسٹن (۱۸۱۳ - ۱۸۶۴) مختلف عہدوں پر مامور رہنے کے بعد فنانشل کمشنر پنجاب (۱۸۵۳) وزیر خارجہ حکومتِ ہند پھر لفٹنٹ گورنر صوبہ شمالی و غربی (۱۹۔ جنوری ۱۸۵۹ء - ۲۷۔ فروری ۱۸۶۳ء)

باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا۔ قبل ازیں "خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں" میرا القاب تھا، اس قدر شناس نے ازراہ قدر افزائی "خاں صاحب مشفق بسیار مہربانِ مخلصان" لکھا۔ اب فرمائیے۔ ان کو کیوں کر اپنا محسن و مربّی نہ جانوں؟ کیا کافر ہوں جو احسان نہ مانوں؟

برخوردار میرزا تفتہ کو دعا کہتا ہوں۔ بھائی اب میں اس کا منتظر رہتا ہوں کہ تم اور میرزا صاحب مجھ کو لکھو کہ لو صاحب، "دستنبو" کا چھاپا تمام کیا گیا اور قصیدہ چھاپ کر ابتدا میں لگا دیا گیا۔ مادۂ تاریخ میں کیا بُرائی ہے، جو تمھارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہو؟ مادّہ اچھا ہے۔ قطعہ لکھو اور خاتمۂ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ میرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا، یہ دونوں قطعے رہیں اور اگر وہاں کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ کہیں۔ اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روئے سخن ساری خدائی کی طرف ہے، بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی کی طرف ہے۔ مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیے اور ان کا نام بھی اس کتاب میں چاہیے۔ اس خط کو لکھ کر بند کر چکا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ میرے مشفق منشی شیو نرائن صاحب کا خط لایا۔ بارے قصیدے کا مسوّدہ پہنچ گیا اور منشی صاحب نے اس کا چھاپا قبول کیا۔ یہ تشویش بھی رفع ہو گئی۔ اب اُن سے میرا سلام کہیے گا اور یہ کہیے گا:

شکرِ رافت ہائے تو چندانکہ رافت ہائے تو

اور یہ اُن کو اطلاع دیجیے گا کہ اخبار کا لفافہ ہرگز مجھ کو نہیں پہنچا، ورنہ کیا امکان تھا کہ میں رسید نہ لکھتا۔

(۲۹۔ ستمبر ۱۸۵۸ء) غالب

(۹)

شفیقِ بالتحقیق مولانا مہر ذرّۂ بے مقدار کا سلام قبول کریں۔ کل آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ آج یا کل پہنچ جائے گا۔ رات ایک بات اور خیال میں آئی ہے لیکن چونکہ تحکّم و کار فرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی، ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں، جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔ ان کی صورت یہی ٹھیری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ کیوں بھائی صاحب قرار داد اور تجویز یہی ہے؟ اور پھر سمجھا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نظر ہیں؟ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بد وضعی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب ایک جلد ان کی نذر بہت ضروری ہے۔ آپ گنجایش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں، ایک اور بھی ایسی ہی بنوا لیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ پانچ بنوا لیں گے۔ یہ عرض مقبول اور یہ گستاخی کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔[1]

۳۰۔ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

---

[1] یہ رقعہ میرزا تفتہ کے رقعے میں ملفوظ بھیجا تھا۔ اس لیے اردوئے معلّٰی میں خطوطِ تفتہ میں درج ہو گیا۔ چونکہ اصل رقعہ میرزا مہر کے نام تھا، لہٰذا میں نے اسے الگ کر کے خطوطِ مہر میں شامل کر دیا ہے۔

(۱۰)

بھائی صاحب،

آپ کے خامۂ مشکبار کی صریر نے کتابوں کی لوحِ طلائی کا آوازہ یہاں تک پہنچایا، بلکہ مجھ کو ان کی لوحوں کا خطِ طلائی مانند شعاعِ آفتاب نظر آیا۔ کیا پوچھنا ہے اور کیا کہنا! مجھ کو تو بموجب اس مصرع کے:

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

دل میں خوش ہو کر چپ رہنا ہے!

حضرت، مدح کو ایک موقع ضرور ہے، مجھ کو آپ کے حکم کا بجا لانا منظور ہے۔ اس نظر کے پہنچنے کے بعد جب کوئی ان کا عنایت نامہ آئے گا تو بندۂ درگاہ مدح گستری کا جوہر دکھائے گا۔ اس نظم میں آپ کا ذکرِ خیر بھی آجائے گا۔ اب یہ تو فرمایئے کہ مدّت انتظار کب انجام پائے گی اور کتابوں کی خبر مجھ کو کب آئے گی؟ آپ کی فرطِ توجہ کا مجھے سب طرح یقین ہے۔ سیارۂ قلم کی پانچوں لوحیں بھی اگر بن گئی ہوں تو عجب نہیں ہے۔ جلدوں کا بنانا البتہ چھاپے کے اختتام پر موقوف ہے۔ معلوم تو ہوتا ہے کہ بھائی نبی بخش صاحب اور ہمارے شفیق منشی شیو نرائن صاحب کی ہمت اس کے جلد انجام ہونے پر مصروف ہے۔ یارب اسی اکتوبر کے مہینے میں یہ کام انجام پا جائے اور چالیس جلدوں کا پشتارہ میرے پاس آجائے۔

میرزا تفتہ کو کیا دوں اور کیا لکھوں؟ مگر دعا دوں اور دعا لکھوں۔

صاحب، اب ڈھیل نہ کرو، کام میں تعجیل کرو:

اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

خدا کرے نثر کی تحریر انجام پا گئی ہو اور قصیدے کے چھاپنے کی نوبت آگئی ہو۔ قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا، از راہِ اکرام و اعزاز ہے، ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم کا اور انداز ہے۔ یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سررشتۂ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدے کے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک، ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔

رائے امید سنگھ کا کوئی خط اگر اندور سے آیا ہو تو مجھ کو بھی آگہی دو۔ چاہو تمھیں ابتدا کرو اور ایک خط ان کو لکھو اور اس کا پرداز اس بات پر رکھو کہ اب وہ کتابیں تیار ہونے کو ہیں، آپ کی خدمت میں کہاں بھیجی جائیں اور کیا پتا لکھا جائے؟ یہ خط جواب طلب ہو جائے گا اور اُن کو جواب لکھنا پڑے گا۔

(۱ اکتوبر ۱۸۵۸ء) غالب

(۱۱)

مرزا صاحب،

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے

کہ تمھارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بورا بھجوایا۔

مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہُوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمھاری چالیس کتابیں بعد لینے منہائی سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ کرو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دُور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایت سے بھی آئیں تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاءُالدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا اُنھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہُوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں:



غزل

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہُوا — میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — اک تماشا ہُوا، گِلا نہ ہُوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟ — لے کے دل، دلستاں روا نہ ہُوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا، روا نہ ہُوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا!
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا!
جان دی، دی ہُوئی اسی کی تھی — حق تو یُوں ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہُوا

(۱۲)

بھائی صاحب،

مطبع میں سے سادہ کتابیں، یقین ہے کہ آجکل پہنچ جائیں اور پس و پیش سات جلدیں آپ کی بنوائی ہُوئی آئیں۔

بالفعل ایک اور عقدہ سررشتۂ خیال میں پڑا ہے، یعنی ازروے اخبار "مفید خلائق" ذہن لڑا ہے کہ اس ہفتے میں جناب اڈمنسٹن صاحب بہادر آگرہ آئیں گے اور وسادۂ[1] لفٹنٹ گورنری پر اجلاس فرمائیں گے۔ اس صورت میں اغلب ہے کہ ولیم میور صاحب بہادر ان کی جگہ چیف سکرتر بن جائیں گے۔ پھر دیکھیے کہ محکمہ لفٹنٹ گورنری میں اپنا سکرتر کس کو بنائیں گے؟ میر منشی اس محکمہ کے تو وہی منشی غلام غوث خان بہادر رہیں گے۔ دیکھیے ہمارے منشی مولوی قمرالدین خاں کہاں رہیں گے؟ بہر حال آپ سے یہ استدعا ہے کہ پہلے کتابوں کا احوال لکھیے اور پھر جُدا جُدا جواب ہر سوال لکھیے[2]۔ جب تک اڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکرتر تھے تو یہ خیال بھی آتا تھا کہ ان کی نذر اور نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر یعنی دو کتابیں مع اپنے خط کے ان کے پاس بھیجوں گا۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں؟ آیا ان کی جگہ سکرتر کون ہوا؟ اور یہ جو لفٹنٹ گورنر ہوے، تو انھوں نے سکرتر کس کو کیا؟ میر منشی لفٹنٹ گورنر کا کون رہا اور گورنر جنرل کا میر منشی کون ہے؟ جو آپ کو معلوم ہو، وہ، اور جو نہ معلوم ہو وہ دریافت کر کے لکھیے۔ قمرالدین خاں کا حال ضرور۔ منشی غلام غوث خاں کا حال ضرور ضرور۔ بھائی، میرے سر کی قسم، اس خط کا جواب ضرور لکھنا اور ایسا واضح لکھنا کہ مجھ سا کند ذہن اچھی طرح اس کو سمجھ لے۔ زیادہ کیا لکھوں؟

غالب

(۱۳)

بھائی صاحب،

نیئتیس کتابیں، بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی، کل جمعہ کے دن ۱۲۔ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے ازروے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے مجھ کو اُن کا دیکھنا کب تک میسّر ہو؟ آپ پر گمان تساہل کا گزرے، یہ تو کیوں کر ہو؟ ہاں صحاف جلد کے بنانے کی نسبت سے میرے حق کا جلاد نہ بن جائے، یعنی مدت مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔

اور ہاں حضرت، کچھ ایسی پختگی ارسال کے وقت کر لیجیے گا کہ وہ پارسل آشوب تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یا الٰہی! یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے۔ اس میں مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے:

یا رب ایں آرزوے من چہ خوش است

تو بدیں آرزو مرا برساں[3]

مرسلہ شنبہ، ۱۳۔ نومبر ۱۸۵۸ء

---

[1] مسند۔ [2] یہاں جامعین مکاتیب نے "جواب ہر سوال کا لکھیے" بنا دیا۔ حالانکہ "کا"، غالب نے یقیناً نہ لکھا ہو گا۔ انھوں نے "احوال لکھیے" کے مقابل میں "جواب ہر سوال لکھیے" رقم کیا ہو گا اور یہی صحیح ہے۔ "کا" بڑھا دینے سے تحریر کا طبعی حسن زائل ہو جاتا ہے۔ [3] یہ خط بھی مہر کے نام تھا۔ اگرچہ میرزا تفتہ کے خط میں ملفوف بھیجا گیا تھا، لیکن جامعین مکاتیب نے اسے (باقی بر صفحہ ۱۹۰)

(۱۴)

بھائی جان،

کل جو جمعہ، روزِ مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامہ فرحت ترجام اور چار گھڑی کے بعد، وقتِ شام،

سات جلدوں کا پارسل پہنچا واہ کیا خوب، بر محل پہنچا

آدمی کو موافق اس کی تمنّا کے آرزو بر آنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصوّر میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصوّر میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ جب تک جہان ہے، تم جہان میں رہو۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی امان میں رہو۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل ان چار کے بن جائے، نہ یہ کہ دو کتابوں کا سارنگ دکھلائے۔ اب میں حیران ہوں کہ آیا شمار ائمہ نے ان بارہ روپے میں برکت دی یا کچھ تمہارا روپیہ صرف ہوا۔ دو پارسلوں کا محصول، دو رجسٹریوں کا معمول، تین کتابوں کی لوحیں طلائی، یہ ساری بات اس روپے میں کیونکر بن آئی؟ اور کیوں کر معلوم کروں؟ کس سے پوچھوں؟ خدا کرے، تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو۔ خفقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے بار کیے آرام نہیں آتا۔ جہاں محبتیں دینی اور روحانی ہوں، وہاں تکلف کام نہیں آتا۔ زیادہ اس سے کہ شکر گزار ہوں اور شرمسار ہوں، کیا لکھوں؟

چارہ خاموشی است چیزے را کہ از تحسیں گزشت

(۱۵)

بندہ پرور،

آپ کا خط کل پہنچا، آج جواب لکھتا ہوں، داد دینا کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے، تو شکایت کی کیا گنجایش ہے؛ بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں درخورِ افزایش ہے۔ بقول غالب علیہ الرحمۃ:

کسی کو دے کے دل، کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

ہے ہے حسنِ مطلع،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۹) میرزا تفتہ کے خطوں میں شامل کر دیا۔ حالانکہ ۱۳۔ نومبر کو تفتہ کو جو خط بھیجا گیا تھا وہ الگ تھا اور اس میں ۳۳ کتابوں کی رسید ہے نیز اس امید کا اظہار کہ میرزا حاتم علی مہر والی کتابیں بھی جلد پہنچ جائیں گی۔ تعجب ہے کہ منشی بہیش پرشاد صاحب بھی جامعین مکاتیب کی اصل غلطی کو نہ سمجھ سکے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ؟
ہُوا تو دوست جس کا دشمن اس کا آسماں کیوں ہو[1] ؟

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے۔

اگر خدانخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہم درد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اٹھا رہے ہیں، تم بھی اٹھاؤ اگر مرد ہو، بقول غالب مرحوم:

ولا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

"سحر ہوگی" "خبر ہوگی" اس زمین میں وہ شعر یعنی:

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہُوں نظر ہو گی

کتنا خوب ہے اور اردو کا کیا اچھا اسلوب ہے؛ قصیدے کا مشتاق ہُوں، خدا کرے کہ جلد چھاپا جائے تو ہمارے دیکھنے میں بھی آجائے۔ "کیا کہیے" "بھلا کہیے" یہ زمین ایک بار یہاں طرح ہُوئی تھی مگر بحر اور ہی تھی:

کہوں جو حال، تو کہتے ہیں مدعا کہیے	تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے	کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب	خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

اور جو "فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن" یہ بحر ہے، اس میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین[2] ایک میرے دوست تھے۔ انھوں نے مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ، اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی۔ اب سوچ رہا ہُوں، جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہُوں:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی	زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے	ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے	خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے

---

[1] مروجہ دیوان میں ہے:

ہُوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

[2] مولوی کرم حسین بلگرامی شاہ اودھ کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے۔ شمس العلما سیّد علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی کرم حسین کے پوتے تھے۔

حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض ۔۔۔ نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز ۔۔۔ میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے ۔۔۔ سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے[۱]

غرض بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ اخیر کی بیت ہے:

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

لو حضرت آپ کے خط کے جواب نے انجام پایا۔ اب میرا دردِ دل سنو۔ برخوردار منشی شیو نرائن نے میرے دو خطوں کا جواب نہیں لکھا اور وہ خطوط جواب طلب تھے۔ تم ان کو میری دعا کہو اور کہو کہ میاں میرا کام بند ہے۔ اس مطلب خاص کا جواب جلد لکھو۔ یعنی اگر وہ کتاب بن چکی ہے تو جلد بھیجو اور اگر اس کے بھیجنے میں دیر ہے تو یہ لکھ بھیجو کہ وہ سیاہ قلم کی لوح کی ہے یا طلائی؟

—— (۱۶) ——

خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔ میرزا تفتہ کا خط جو آپ نے نقل کر کے بھیج دیا ہے، میں نے منشی شیو نرائن کو بھیجا ہوا اصل خط دیکھ لیا ہے۔ اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ "رقعات عالمگیری" یا "انشاءِ خلیفہ" اپنے سامنے رکھ لیا کرو، جو عبارت اس میں سے پسند آیا کرے، اپنے خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔ اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا، اس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا۔



براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو

واقعی، جو اخبار آگرہ سے دِلّی آتے ہیں، وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب، ہوش میں آؤ اور مجھ کو

---

[۱] یہ شعر اصل میں یوں ہے:

مسی آلودہ سرانگشت حسیناں لکھیے ۔۔۔ داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے ۔۔۔ سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

اس کے باقی اشعار یہ ہیں:

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے ۔۔۔ حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق ۔۔۔ رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے ۔۔۔ کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے ۔۔۔ کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ مجنوں لکھیے ۔۔۔ کیوں اسے نقشِ پَےِ ناقۂ لیلیٰ کہیے

بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں "فرنچ" اور "شام پین" کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں، میں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا اور وہ مال کیوں کر اٹھاؤں گا؛ بس اب زیادہ باتیں نہ بنائیے اور وہ قصیدہ مجھ کو بھجوائیے۔ میں نے کتابیں جابجا بسبیل پارسل ارسال کی ہیں، اگرچہ پہنچنے کی خبر پائی ہے، مگر نوید قبول ابھی کہیں سے نہیں آئی ہے ؛

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیسا ہے ؛

جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟ — کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا ؛
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؛
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؛

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؛

غزل ناتمام ہے[1]؛

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؛ جب اٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا — ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند — ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے — جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور[2]

---

[1] اس کے باقی دو شعر یہ ہیں ؛

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؛
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا ؛

[2] اس میں سے دو شعر چھوڑے ہیں؛

(باقی صہ ١٩٤ پر)

دوشنبہ کا دن، ۲۰۔ دسمبر کی صبح کا وقت ہے۔ انگیٹھی رکھی ہوئی ہے، آگ تاپ رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آگئے، تم کو لکھ بھیجے۔ والسلام

۲۰۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۷)

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب
اے تو غائب ز نظر، مہرِ تو ایمانِ من است

حلیہ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ میرزا یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا، اس کا منشا کیا ہے؟ کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہوگا کہ میرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرحدار آدمی ہیں اور بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے "مغل جان" سے سنا تھا، جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھی اور ان میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر "مغل" سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔

بہرحال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں، مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بقول شیخ علی حزیں:

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر[۱] میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈوایا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کیا بک رہا ہوں!



(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۳) ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا — ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین — کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

[۱] دلی۔

صاحب، بندہ نے "دستنبو" جناب اشرف الامراء جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی۔ سوان کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی بطریق ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کے قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک مرقومہ چہاردہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا۔ کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آگیا۔ پنسن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو ملے جاتی ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق سچا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام، وہ اب پہنچاویں گے۔

۹ اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۸)

جناب میرزا صاحب،

دِلّی کا حال تو یہ ہے،

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر، سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا؟ وہ خبر محض غلط ہے۔ اگر کچھ ہے تو یہ ہے غلط ہے کہ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہل فوج[1] نے بہ اتفاق ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔ ناسخ مرحوم جو تمہارے استاد تھے، میرے بھی دوست صادق الوداد تھے، مگر یک فنّے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدے اور مثنوی سے ان کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ سبحان اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا کہ انشاء[2] کو رشک آیا۔ مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے، کیا کہوں کیا حظ اٹھایا۔

خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر فروغ "میرزا حاتم علی مہر"

---

[1] سول اور ملٹری [2] سید انشاءُ اللہ خاں ان کے والد حکیم ماشاءُ اللہ خاں علی وردی خان کے زمانے میں بعض اہم خدمات پر مامور رہے۔ پھر دہلی آ گئے تھے۔ انشاء کی زندگی کا ابتدائی دور دہلی میں گزرا، پھر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں بڑا نام پایا۔

اُنداسی انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اُردو کہلائے گی۔ خدا تم کو جیتا رکھے تمھارا دم غنیمت ہے۔ صاحب، میں تم سے پُوچھتا ہُوں کہ "معیار الشعرا" میں تم نے اپنا خط کیوں چھپوایا؟ تمھارے ہاتھ کیا آیا؟ سنو تو سہی اگر سب کا کلام اچھا ہو، تو امتیاز کیا رہے؟

(۱۹)

میرزا صاحب،

آپ کا غم فزانامہ[۱] پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ اُنھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا، یعنی اُس کی اطاعت اور تمھاری اُس سے محبت، سخت ملال ہُوا اور رنج کمال ہوا۔ سُنو صاحب، شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اُس کے سامنے مری تھی، تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہُوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی "مغلچے[۲]" بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی "مغلچہ" ہُوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہُوئے ہیں۔ مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہُوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑ دو:

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی　　عشق محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

اللہ بس، ماسوی ہوس

غالب



(۲۰)

میرزا صاحب،

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو[۳]۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو

---

[۱] میرزا مہر نے اپنی محبوبہ "چنا جان" کی وفات پر جو خط بھیجا تھا اسے "غم فزا نامہ" کہا۔ [۲] ایک نسخے میں مغلچے کی جگہ مغل بچے دیکھا۔
[۳] شہد کی مکھی پھنس کر نکل نہیں سکتی۔ مصری کی مکھی جب چاہے اڑ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ ایسا تعلق پیدا نہ کرو کہ اس میں اُلجھ کر رہ جاؤ۔ واضح رہے کہ مرشد کامل فرضی ہے۔

تو "چنا جان" نہ سہی "منا جان" سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ! چشم بددور، وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ:

زن نو کن اے دوست در ہر بہار

کہ تقویم پارینہ ناید بکار

میرزا مظہر کے اشعار کی تضمین کا مسدس دیکھا، فکر سراپا پسند، ذکر بہمہ جہت ناپسند۔ اپنے نام کا خط مع ان اشعار کے میرزا یوسف علی خاں عزیز کے حوالے کیا۔

مکرمی نواب محمد علی خاں صاحب کی خدمت میں سلام۔ پروردگار ان کو سلامت رکھے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب کو میرا سلام۔ دم دے کر مجھ سے فارسی عبارت میں خط لکھوایا، میں منتظر رہا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے، وہ عبارت جناب قبلہ و کعبہ کو دکھائیں گے۔ اُن کے مزاج اقدس کی خیر و عافیت مجھ کو رقم فرمائیں گے۔ کیا جانوں کہ حضرت میرے وطن میں جلوہ افروز ہیں:

یار در خانہ و من گردِ جہاں مے گردم

اب مجھے اُن سے یہ استدعا ہے کہ دستخط خاص سے مجھ کو خط لکھیں اور لکھنؤ نہ جانے کا سبب اور جناب قبلہ و کعبہ کا حال جو کچھ معلوم ہو، وہ سب اس خط میں درج کریں۔

غالب

(۱۸۶۰ء)

منشی شیو نرائن آرام

منشی شیو نرائن آرام کے پردادا رائے اجاگر چند ۱۷۸۴ء کے قریب اجمیر سے آگرہ میں منتقل ہوئے اور وہاں راجا چیت سنگھ (والی بنارس) کے وزیر ہو گئے تھے۔ آرام کے دادا منشی بنسی دھر داروغہ پولیس، ناظر محکمہ نمک کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔ آخر میں شہر کے کوتوال بن گئے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر میرزا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی جائداد کا انتظام سنبھال لیا۔ آرام کے والد منشی نند لال پہلے منصفی میں ناظر بعد ازاں راجا جوتی پرشاد کی سرکار میں مختار عام رہے۔ ان کی وفات پر ہرگوپال تفتہ نے مرثیہ کہا تھا۔

منشی شیو نرائن ۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ زمانے کے رواج کے مطابق اردو اور فارسی کی تعلیم پائی۔ انگریزی مسٹر فیلن سے پڑھی اور خاصی استعداد پیدا کر لی، بلکہ میرزا غالب کو لکھا تھا کہ کوئی خط یا عرضی انگریزی میں لکھوانی ہو تو مجھ سے لکھوا لیا کیجیے۔ آگرہ کالج میں تعلیم پانے کے بعد وہاں پروفیسر بھی رہے۔ پروفیسری چھوڑ کر آبکاری اور انکم ٹیکس کے محکموں

میں ملازم رہے پھر چنگی کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ دھول پور اور فرولی کی ریاستوں نے بھی انھیں چنگی کی تنظیم کے لیے بلایا۔

"مفید خلائق" کے نام سے آگرہ میں ایک مطبع جاری کیا، جہاں "دستنبو" پہلی مرتبہ چھپی۔ اصل میں "مفید خلائق" ایک اخبار کا نام تھا جو گارساں دی تاسی کے بیان کے مطابق شیو نرائن صاحب نکالتے تھے مطبع کا یہی نام رکھا۔ "آفتاب عالمتاب" "معیار الشعرا" "بغاوت ہند" وغیرہ اخبار بھی نکالتے تھے۔ "خمخانۂ جاوید" میں ہے کہ تمام عمر عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہے۔ لیکن ان کی نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔ آخر میونسپل کمیٹی کے سکرٹری بن گئے تھے جہاں انھوں نے حسنِ انتظام کے جوہر دکھائے اور رفاہی کاموں میں بھی نمایاں حصہ لیا رہا۔ ستمبر ۱۸۹۶ء میں پینسٹھ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے، دونوں ڈپٹی کلکٹر بن گئے تھے۔

غالب کے ساتھ ان کا تعلق "دستنبو" کی اشاعت کے سلسلے میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء تک خاصی خط و کتابت رہی۔ پھر یہ سلسلہ گھٹتے گھٹتے مئی ۱۸۶۳ء پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اگر کوئی خط لکھا گیا تو وہ نہیں ملا۔ اس سلسلے میں بیشتر معلومات مالک رام صاحب کی کتاب "تلامذۂ غالب" سے ماخوذ ہیں۔

---

(۱)

صاحب،

خط پہنچا، اخبار کا لفافہ پہنچا، لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟ لفافے بنانا، دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے؟ بہ ہر حال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے[۱]:

ہر چہ از دوست می رسد، نیکوست

یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو، مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں۔ وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں، بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ روپیہ مہینے کا کیوں مول لیں گے[۲]؟

کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ اکیس شعروں کا قصیدہ کہہ کر تمھارا حکم بجا لایا[۳]۔ میرے دوست خصوصاً میرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدہ میں ایک روش خاص سے اظہار ۱۸۵۸ء کا کر دیا ہے۔ خدا کرے تمھارے پسند آئے، تم خود قدر دانِ سخن ہو اور تین استاد[۴] اس فن کے تمھارے یار ہیں، میری محنت کی داد مل جائے گی۔

---

[۱] مطلب یہ کہ شیو نرائن نے یہ سن کر کہ غالب ہاتھ سے لفافے بناتے ہیں، اپنے پاس سے لفافوں کا بنڈل بھیجنے کی اطلاع دی تھی [۲] غالب کی نگارش کا ایک کمال ان چند فقروں سے سورج کی طرح روشن ہے۔ مہاجنوں کی پوری سیرت کا خاکہ مختصر الفاظ میں اس طرح کھینچ دیا ہے کہ اس سے بہتر خاکہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ یہ لکھنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ شیو نرائن نے اپنے اخبار کے لیے خریدار پیدا کرنے کی درخواست کی ہو گی [۳] یہ قصیدہ شیو نرائن نے غالب سے لکھوا کر امین برادران کی خدمت میں پیش کیا تھا [۴] تفتہ، حقیر اور مہر۔

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر، پناہ، شہر و سپاہ
جناب عالی ایلن برون والا جاہ

بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
کہ باج، تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وہ محض رحمت و رافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ

وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پرسش کی
بنے ہے شعلۂ آتش انیسِ پرۂ کاہ

زمیں سے سودۂ گوہر اٹھے بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اس کے جولانگاہ[1]

وہ مہرباں ہو، تو انجم کہیں: "الٰہی شکر"
وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے، "خدا کی پناہ"

یہ اس کے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہ ہر سرِ راہ

ق

ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوئی دُمِ روباہ[2]

نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ

خدا نے اس کو دیا ایک خوب رُو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ

زہے ستارۂ روشن کہ جو اسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اس کا تارِ نگاہ

خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ

جوان ہو کے کرے گا یہ وہ جہاں بانی
کہ تابع اس کے ہوں روز و شب سپید و سیاہ[3]

کہے گی خلق اسے "داورِ سپہر شکوہ"
لکھیں گے لوگ اسے "خسروِ ستارہ سپاہ"

عطا کرے گا خداوند کارساز اسے
روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے
پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ[4]

یہ ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس
یہ لے گا بادشہِ چیں سے چھین تخت و کلاہ

سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون
یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ

ق

یہ جتنے سیکڑے ہیں سب ہزار ہو جائیں
دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ

امیدوارِ عنایات شیو نرائن ہے
کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ

---

[1] یعنی جہاں اس کی حشمت کا گھوڑا دوڑتا ہے، وہاں غبار کے بجائے گوہر کا سفوف اڑتا ہے۔ [2] ایک دوسرے کے دشمن اس طرح مل گئے ہیں کہ اگر لومڑی کی دم میں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو شیر اپنے پنجے کو شانہ بنا کر الجھاؤ درست کر دیتا ہے۔ [3] منشی مہیش پرشاد نے "روز و شب سپید و سیاہ" یعنی سپید دن اور سیاہ رات لکھا ہے۔ میرے نزدیک روز و شب، سپید و سیاہ ہی بہتر ہے یعنی دن رات بھی اس کے تابع ہو اور سپید و سیاہ بھی۔ [4] اسے مخفی بھیدوں کے جاننے والی ایسی عقل ملے گی کہ جب کوئی مقدمہ اس کے سامنے پیش ہو گا تو اسے طے کرنے کے لیے گواہیاں لینے کی ضرورت نہ پڑے گی بلکہ گواہیوں کے بغیر ہی سب کچھ طے کر دیا کرے گا۔

یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
تمھیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

(۲)

شفیق میرے، مکرم میرے، منشی شیو نرائن صاحب،

تم ہزاروں برس سلامت رہو۔ تمھارا مہربانی نامہ اس وقت پہنچا اور میں نے اسی وقت جواب لکھا۔ بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کتاب دو جز یا چار جزو کی ہو۔ چھ جزو سے کم نہ ہو مسطر دس گیارہ سطر کا ہو، مگر حاشیہ تین طرف سے بڑا رہے، شیرازہ کی طرف کا کم ہو۔ یہ سب باتیں میرزا تفتہ کو لکھ چکا ہوں۔ اس یار بے پروا نے تم سے شاید کچھ نہیں کہا۔ اس کے سوا یہ ہے کہ کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامہ کی حاجت نہ پڑے۔ آپ خود متوجہ رہیے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیے گا تو وہ بھی شریک رہیں گے اور میرزا تفتہ تو مالک ہی ہیں۔ کاغذ "شیو رام پوری" ہو، خیر، مگر سفید اور مُہرہ کیا ہوا اور لعاب دار ہو۔ پھر یہ کہ حاشیہ پر جو لغات کے معنی لکھے جائیں تو اس کی طرزِ تحریر اور تقسیم دل پسند اور نظر فریب ہو۔ حاشیہ کا قلم بہ نسبت متن کے خفی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان جلدوں میں سے دو جلدیں ولایت کو جائیں گی: ایک جناب فیض مآب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر اور ایک آقائے قدیم لارڈ الن برا بہادر کی نذر اور چار جلدیں یہاں کے چار حاکموں کی نذر کروں گا۔

میرزا تفتہ کو پانچ جلدوں کے لیے لکھا تھا، لیکن اب چھ جلدیں تیار کر دیجیے گا، یعنی شیرازہ اور جدول اور ان چھ جلدوں کی جو لاگت پڑے، ایک روپیہ جلد سے لے کر دو روپے جلد تک، وہ مجھ سے منگوا بھیجیے گا۔ میں بمجرد طلب کے فوراً ہنڈوی بھیج دوں گا۔ ایک خریدار پچاس جلد کے وہاں پہنچے ہیں، واسطے خدا کے میرزا تفتہ سے کہیے کہ ان سے ملیں، یعنی راجا امید سنگھ بہادر اندور والے۔ وہ "چھلی اینٹ" میں پولیس کے پچھواڑے رہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ کا خط آ گیا اور میرزا تفتہ نے مجھے پارسل کی رسید نہیں لکھی۔ اب میرا خط فارسی اپنے نام کا اور یہ خط، دونوں خط ان کو دکھا دیجیے گا اور راجا امید سنگھ سے ملنے کو کہیے گا اور ہاں صاحب یہ ان کو تاکید کیجیے گا کہ وہ رباعی جو میں نے لکھ بھیجی ہے اس کو سب سے پہلے جہاں اس کا نشان دیا ہے، اسی فقرے کے آگے ضرور بالضرور لکھ دیجیے گا اور وہ رباعی بیسویں صفحہ میں اس فقرے کے آگے ہے،[۱]

"نے نے اخترِ بختِ خسرو در بلندی بجائے رسید کہ رُخ از خاکیاں نہفت۔"

تم ان کو یاد دلا کر ان سے لکھوا لینا، ضرور ضرور۔

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا۔ کیوں کر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے۔ اس کی جو حقیقت ہو مفصل لکھو۔ زیادہ، زیادہ۔ جواب طلب ضروری۔

سہ شنبہ ۳۱۔ ماہ اگست ۱۸۵۸ء

راقم اسد اللہ



۱؎ اس خط میں تمام ہدایات دستنبو کے چھاپے کے متعلق ہیں۔ صاحب کے اظہار پسند کا تعلق بھی دستنبو سے ہے۔

—— (۳) ——

مہاراج !

سخت حیرت میں ہوں کہ منشی ہرگوپال صاحب نے مجھ کو خط لکھنا کیوں چھوڑا۔ اگر مجھ سے خفا ہیں تو کیوں خفا ہیں اور اگر شہر میں نہیں ہیں تو کہاں گئے اور کیوں گئے ہیں اور کب تک آئیں گے؟ آپ مہربانی فرما کر یہ امور مجھ کو لکھ بھیجیے۔ اس سے علاوہ ایک رباعی میرزا تفتہ کو بھیجی ہے اور ان کو لکھا ہے کہ اس کو "دستنبو" میں فلاں جگہ درج کر دینا اور ایک دو فقرے بھائی نبی بخش صاحب کو لکھے ہیں اور ان کو بھی "دستنبو" میں لکھنے کا محل بتا دیا ہے۔ میں نہیں جانتا، ان دونوں صاحبوں نے میرے کہنے پر عمل کیا اور انھوں[1] نے نظم کو اور انھوں[2] نے نثر کو کتاب کے حاشیہ پر چڑھا دیا یا نہیں؟ تم سے بہ ہزار آرزو خواہش کرتا ہوں کہ اگر وہ رباعی اور فقرے حاشیہ پر چڑھ گئے ہیں تو مجھ کو ان کے لکھے جانے کی اطلاع دیجیے کہ تشویش رفع ہو اور اگر ان دونوں صاحبوں نے بے پروائی کی ہے تو واسطے خدا کے آپ میرزا تفتہ سے رباعی اور منشی نبی بخش صاحب سے دونوں فقرے لے لیجیے اور محل تحریر میرے خط سے معلوم کر کے ان کو جا بجا حاشیے پر رقم کیجیے اور مجھ کو اطلاع دیجیے۔ ضرور، ضرور، ضرور۔ ایک اور کام آپ کو کرنا چاہیے کہ شاید تیسرے صفحے کے آخر میں یا چوتھے صفحے کے اول میں یہ فقرہ ہے:

"اگر در روم دیگر بہ نہیب مباکش بہم زند"

"نہیب" کا لفظ عربی ہے، یہ سہو سے لکھا گیا ہے، اس کو چھیل ڈالیے گا اور اس کی جگہ "نوائے مباکش" بنا دیجیے گا۔ حقیقت لکھ کر اب سوالات الگ الگ لکھتا ہوں:

پہلا سوال: میرزا تفتہ کا حال اور ان کے خط نہ آنے کی وجہ لکھیے۔

دوسرا سوال: میرزا تفتہ نے اگر رباعی "دستنبو" کے حاشیے پر لکھ دی ہے تو اس کی اطلاع، ورنہ ان کے نام کے خط سے رباعی اور تحریر کا حال معلوم کر کے، آپ حاشیے پر لکھ دیں اور مجھ کو اطلاع دیں۔

تیسرا سوال: منشی نبی بخش صاحب نے اگر میری بھیجی ہوئی نثر درج کر دی ہے تو اس کی اطلاع، ورنہ ان سے لے کر اور محل معلوم کر کے حاشیہ کتاب پہ لکھ دیجیے اور مجھ کو لکھ بھیجیے۔

چوتھا سوال: آپ، جس طرح لکھ آیا ہوں، "نہیب" کی جگہ "نوا" کا لفظ بنا کر مجھ پر عنایت کیجیے۔

پانچواں سوال: خریدار پچاس جلدوں کے پہنچے؟ میرزا تفتہ سے ملے؟ روپیہ پچاس جلدوں کی قیمت کا دیا؟ یا ہنوز یہ امور وقوع میں نہیں آئے۔ اس کی اطلاع ضرور دیجیے۔

چھٹا سوال: چھاپا شروع ہو گیا یا نہیں؟ اگر شروع نہیں ہوا تو کیا سبب؟

متوقع ہوں کہ میرے یہ سب کام از راہِ عنایت بنا کر ان چھ سوالوں کا جواب اسی طرح جدا جدا لکھیے اور ضرور لکھیے اور جلد لکھیے۔

راقم اسد اللہ خاں

روز جمعہ، ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

---

۱ ہرگوپال تفتہ ۲ نبی بخش حقیر

(۴)

برخوردار منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہُوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ گار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھ سے سُنو:

"تمہارے دادا کے والد عہد نجف[۱] خاں و ہمدانی[۲] میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پر دادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب جوان ہُوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر، خاں صاحب[۳] کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک، دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دُور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیارنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک "کھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور "کالے محل" سے لگی ہُوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا کہلاتا تھا اور ایک کٹرا "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور کٹروں کا کرایہ اوگاہ کر ان کے پاس جمع کراتا تھا۔

بھائی، سُنو تو سہی، تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول لیے تھے اور زمینداره اپنا کر لیا تھا، دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مالگزاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمہارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اس کا حال از رُوئے تفصیل



---

[۱] نجف خاں صفوی ایران کے شاہی خاندان سے تھا۔ اس کی ہمشیر کی شادی نواب وزیر اودھ کے بھائی کے ساتھ ہُوئی تھی۔ اس سلسلے میں خود بھی ہندوستان آگیا۔ جب شاہ عالم ثانی الٰہ آباد سے دہلی آیا تو نجف خاں ساتھ تھا۔ جنگ و سیاست دونوں میں یکساں قابل تھا۔ ذوالفقار الدولہ خطاب پایا اور زندگی کے آخری سانس تک مغل سلطنت کا مختار رہا۔ ۱۷۸۲ء میں فوت ہوا۔ مغل اُمرا میں سے یہ آخری بڑا امیر تھا۔ [۲] ہمدانی سے مراد بظاہر محمد بیگ ہمدانی ہے۔ نجف خاں کے لیسری اولاد نہ تھی۔ افراسیاب خاں نام ایک لڑکے کو پال لیا تھا۔ ایک رشتہ دار مرزا شفیع اس کے پاس رہتا تھا۔ افراسیاب اور شفیع کے درمیان نجف خاں کی جانشینی کے متعلق جھگڑا پیدا ہُوا۔ یکے بعد دیگرے دونوں مارے گئے۔ ان جھگڑوں میں محمد بیگ ہمدانی اور اس کے بھتیجے اسماعیل بیگ ہمدانی نے بھی بڑا حصہ لیا۔ محمد بیگ ۱۷۸۶ء میں راجپوتوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اسماعیل بیگ بعد میں غلام قادر روہیلے کے ساتھ شامل ہو گیا۔ [۳] خاں صاحب سے مراد خواجہ غلام حسین خاں ہیں، جو غالبؔ کے نانا تھے۔



جلد مجھ کو لکھو۔

روز سہ شنبہ ۱۹۔ اکتوبر (۱۸۵۸ء) وقت ورود خط　　　　اسداللہ

(۵)

نورِ بصرت، لختِ جگر، منشی شیونرائن کو دعا پہنچے۔ خط اور رپورٹ کا لفافہ پہنچا اور سب حال تمھارے خاندان کا دریافت ہُوا۔ سب میرے جگر کے ٹکڑے ہیں اور تم اپنے دودمان کے چشم و چراغ ہو۔

"العلم طاقتہ" شوق سے لکھو۔ آخر کے صفحے کی دو سطریں از روے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے۔ تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سو ابتداء ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱۔ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہُوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔ خُوب ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا، ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں، سو کرو۔ پہلے سوچو کہ تقسیم یُوں ہے کہ تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس کتاب کا نام۔ کیوں میاں، تقسیم یُوں ہی ہے؟ اب میں دوسرے صفحہ پر ساتویں سطر لکھ دیتا ہوں۔ اس کو ملاحظہ کرو اور میرا کہنا مانو، ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔

اس صفحے میں دو ایک باتیں اور سمجھا دوں کہ وہ ضروری ہیں۔ سُنو، میری جان، نوابی کا مجھ کو خطاب ہے "نجم الدولہ" اور اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو "نواب" لکھتے ہیں بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر "نواب اسداللہ خاں" لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ "میرزا" یا "میر" نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے یا "نواب اسداللہ خاں" لکھو یا "میرزا اسداللہ خاں" لکھو اور "بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

(۶)

برخوردار اقبال نشان منشی شیونرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو۔ تمھارے دو خطوط متواتر پہنچے۔ میرے بھی دو خط پس و پیش پہنچے ہوں گے۔ موافق اس تحریر کے عمل کیا ہوگا۔ دو جلدیں پُر تکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اس کے کم تکلف میرزا حاتم علی صاحب کے عہدۂ اہتمام میں ہیں۔ اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں، وہ جیسی چاہیں بنوا کر بھیج دیں۔ تم ایک جلد، بس، زیان صرف کیوں کرو، اپنے طور پر اپنی طرف سے جیسی چاہو، بنوا کر بھیج دو۔ میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی نشانی جانتا ہوں۔ اس کو تمھاری نشانی جان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ باقی حال اپنے خاندان اور تمھارے خاندان کا اور باہم پل کر اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہونا سب تم کو لکھ چکا ہوں، مکرّر کیا لکھوں؟

بادشاہ کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اُجڑا ہُوا شہر، نہ آدمی، نہ آدم زاد، مگر ہاں دو ایک مصوّروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لُٹنے کے آباد ہُوے ہیں۔ تصویریں بھی اُن کے گھروں سے لُٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں، وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مصوّر کے پاس ایک تصویر ہے، وہ بیس روپے سے کم کو

نہیں دینا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے، اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے۔ پھر خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو۔ اتنا صرف بیجا کیا ضرور ہے؟ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آجائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوروں سے خرید کرنے کا نہ مجھ میں مقدور، نہ تمھارا نقصان منظور۔

اب چھاپا تمام ہو گیا ہوگا۔ وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں ہیں وہ، اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دینی کی ہے، وہ سب لوح اور جلد کی درستی کے بعد پہنچ جائیں گی، مگر وہ چالیس سر سری، جو مجھے چاہییں ہیں، وہ تو آج کل میں روانہ کر دو اور ہاں میری جان، یہ چالیس کتابوں کا پشتارہ کیونکر پہنچے اور محصول اس کا کیا ہوگا؟ اور یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں راے امید سنگھ کے پاس کہاں بھیجی جائیں گی؟ میرزا تفتہ ہاترس کو جاتے ہوئے ان کا اندور نہ ہونا اور پھر شاید آگرہ اور دلی کا آنا مجھ کو لکھ چکے ہیں۔ ان باتوں کا جواب مجھ کو لکھو۔ تصویر کے باب میں جو کچھ لکھو وہ کروں اور ان مقدمات سے اطلاع پاؤں۔ جواب جلد لکھو اور مفصل لکھو۔

نگاشتہ و رواں داشتہ، شنبہ ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۷)

برخوردار کامگار کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ "دستنبو" کے آغاز کی عبارت از روے احتیاط دو بارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہوگی اور چھاپی گئی ہوگی اور آپ نے اُسی عبارت سے اشتہار بھی اخبار میں چھاپا ہوگا یا چھاپیے گا۔

بہر حال اس شہر کے اخبار سنیے۔ حکم ہوا کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔ آپ کے پاس اس کی نقل بھیجتا ہوں۔ اگر تمھارا جی چاہے تو اس کو چھاپ دو اور جس نمبر میں یہ چھاپا جائے، وہ نمبر میرے دیکھنے کو بھیج دینا۔

اور اب فرمائیے کہ میں کتابوں کے آنے کا کب تک انتظار کروں؟[1]

قطعہ

دریں روزگار ہمایوں و فرخ — کہ گوئی بود روزگارِ چراغاں
شدہ گوش پُر نور چوں چشم بینا — ز آوازۂ اشتہارِ چراغاں
مگر شہر دریاے نور است، کاینجا — نگہ گشتہ ہر سو دوچارِ چراغاں
بسر بردہ بر چرخ مہرِ منوّر — ہمہ روز در انتظارِ چراغاں

۱؎ اس خط پر تاریخ ثبت نہیں، لیکن یہ اکتوبر ہی کا معلوم ہوتا ہے اور اس میں جو قطعہ درج ہے وہ "دستنبو" کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

گواہِ من اینک خطوطِ شعاعی　　کہ دارد دلش خار خارِ چراغاں
دریں شب روا باشد از چرخِ گرداں　　کند گنجِ انجم نثارِ چراغاں
نبود است در دہر زیں پیش ہرگز　　بدیں روشنی روے کارِ چراغاں
شد از فیضِ شاہنشہِ انگلستان　　فزوں رونقِ کاروبارِ چراغاں
جہاندار وکٹوریہ کز فروغش　　ز آتش دمد لالہ زارِ چراغاں
ز عدلش چناں گشت پروانہ ایمن　　کہ شد دیدہ بانِ حصارِ چراغاں
بفرمانِ سر جان لارنس صاحب　　شد ایں شہر آئینہ دارِ چراغاں
بدہلی فلک رُتبہ سانڈرس صاحب　　بر آراست نقش و نگارِ چراغاں
شد از سعی ہنری اجرٹن بہادر　　رواں ہر طرف جویبارِ چراغاں
سخن سنج غالب ز روے عقیدت　　دعا مے کند در بہارِ چراغاں

کہ بادا فزوں سالِ عمرِ شہنشہ
بروے زمین از شمارِ چراغاں

(۸)

میاں، تمھارے کمال کا حال معلوم کر کے میں بہت خوش ہُوا۔[ل] اگر مجھ کو کبھی انگریزی لکھوانا ہو گا تو یہاں سے اردو میں لکھ کر بھیج دوں گا، تم وہاں سے لکھ کر بھیج دیا کرنا۔ "قصۂ قاصدانِ شاہی" میں نے دیکھا۔ اصلاح کے باب میں سوچا کہ اگر سب فقروں کو مقفیٰ اور عبارت کو رنگین بنانے کا قصد کروں تو کتاب کی صورت بدل جائے گی اور تم کو بھی شاید یہ منظور نہ ہو۔ ناچار اس پر قناعت کی کہ جو الفاظ ٹکسال باہر تھے، وہ بدل ڈالے۔ مثلاً "وے" "کہ یہ گنوار بولی ہے" "وہ" "یہ ٹھیٹ اردو ہے۔" "کرانا" "یہ بیرونجات کی بولی ہے،" "کروانا" "یہ فصیح ہے۔" "راجے" "یہ غلط ہے،" "راجہ" "صحیح ہے۔ کہیں کہیں روابط و ضمائر نامربُوط تھے، ان کو مربوط کر دیا ہے ایک جگہ "گھنے بلسے" یہ لفظ میری سمجھ میں نہ آیا، اس کو تم سمجھ لینا۔ باقی اور سب مربوط اور خوب صاف ہے۔ حاجت اصلاح کی نہیں۔

صاحب، کتابیں کب روانہ ہوں گی؟ دوالی بھی ہو لی۔ اگر گنگا جانے کا قصد ہو تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا اور ہاں یہ میں نہیں سمجھا کہ میرزا مہر کی بنوائی ہُوئی سات کتابیں بھی انھیں کتابوں کے ساتھ بھیجو گے یا وہ اپنے طور پر جُدا روانہ کریں گے؟ وہ تم نے اپنی بنوائی ہُوئی کتاب کا آٹھ دن کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدہ سے یہ بات تراوش کرتی تھی کہ سادہ کتابیں پہلے روانہ ہوں گی اور وہ ایک کتاب ہفتہ کے بعد۔ سو وہ ہفتہ بھی گزر گیا۔ یقین ہے کہ اب وہ سب یکجا پہنچیں اور شاید کل پرسوں آجائیں۔

ل یعنی شیو نرائن نے لکھا ہو گا کہ میں انگریزی بھی جانتا ہوں۔ اگر آپ کو ضرورت پیش آجائے تو مجھ سے لکھوا لیا کریں۔

وہ لمبر اخبار کا جو تم نے مجھ کو بھیجا تھا، اس میں ایڈ منسٹن صاحب کے لفٹنٹ گورنر ہونے کی اور بہت جلد آگرہ آنے کی خبر لکھی تھی۔ یہاں مجھ کو کئی باتیں پوچھنی ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ چیف سکرتر نواب جنرل کے تھے، جب یہ لفٹنٹ گورنر ہوئے تو اب وہاں چیف سکرتر کون ہوگا؟ یقین ہے کہ ولیم میور صاحب اس عہدہ پہ مامور ہوں۔ پس اگر یوں ہی ہے تو ان کے محکمے میں چیف سکرتر کون ہوگا؟

دوسری بات یہ کہ میر منشی ان کے تو وہی منشی غلام غوث خاں رہیں گے، یقین ہے کہ ان کے ساتھ آویں۔

تیسری بات یہ کہ گورنر جنرل کے فارسی دفتر کے میر منشی ایک بزرگ تھے، بلگرام کے رہنے والے، منشی سید جان خان۔ آیا اب بھی وہی ہیں یا ان کی جگہ کوئی اور صاحب ہیں؟

ان سب باتوں میں سے جو آپ کو معلوم ہوں، وہ اور جو نہ معلوم ہوں، اس کو معلوم کر کے مجھ کو لکھیے اور جلد لکھیے اور ضرور لکھیے۔ یقین تو ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیوں پوچھتا ہوں۔ کتابیں جا بجا بھیجنی ہیں جب تک نام اور مقام معلوم نہ ہو تو کیونکر بھیجوں۔ جواب لکھو اور شتاب لکھو۔ کتاب بھیجو اور جلد بھیجو۔

سہ شنبہ ۹۔ نومبر ۱۸۵۸ء

(۹)

برخوردار کامگار، منشی شیو نرائن طول عمرہ، وزاد قدرہٗ۔

کل جمعہ کے دن ۱۲۔ نومبر کو تینتیس کتابیں آ گئیں۔ میں بہت خوش ہوا اور تم کو دعائیں دیں۔ خط تمھارے نام کا ابھی میرا کہار ڈاک میں لے گیا ہے۔ اس رقعہ کی تحریر سے مقصود یہ ہے کہ میاں عبدالحکیم بہت نیک بخت اور اشراف اور ہنرمند آدمی ہیں۔ "دلی گزٹ" میں حرفوں کے چھاپے کا کام کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ چھاپے خانہ اب آگرہ میں ہے، یہ بھی وہیں آتے ہیں۔ تمھارے پاس حاضر ہوں گے اور ان پر مہربانی رکھنا بھلا۔ وہ شہر بیگانہ ہے۔ ان کو تمھاری خدمت میں شناسائی رہے گی، تو اچھی بات ہے۔ صحافی کا کام بھی بقدر ضرورت کر سکتے ہیں۔ شاید اگر "دہلی گزٹ" میں ان کا طور درست نہ ہو تو اس صورت میں بشرط گنجائش اپنے مطبع میں ان کو رکھ لینا۔

نگاشتہ ۱۳۔ نومبر ۱۸۵۸ء

راقم اسداللہ

(۱۰)

صاحب،

تمھارا خط آیا، دل خوش ہوا۔ دیکھیے میرزا تفتہ کب روانہ کرتے ہیں[1]۔ اگر بھیج چکے ہیں تو یقین ہے کہ آج یہاں آ پہنچیں۔ آج نہ آئیں، کل آئیں۔ کل سے میں شام تک راہ دیکھتا ہوں۔

"مہر نیم ماہ" نہیں، اس کا نام "مہر نیم روز" ہے اور وہ سلاطین تیموریہ کی تواریخ ہے۔ اب وہ بات ہی گئی گزری، بلکہ وہ کتاب اب نہ چھاپنے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل۔ اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زاید بات

[1] یعنی کتابیں۔

ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطعِ نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے۔

محررہ پنجشنبہ ۱۸۔ نومبر ۱۸۵۸ء

(۱۱)

برخوردار اقبال نشان کو دعا پہنچے۔ کل جمعہ کے دن ۱۹۔ نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے۔ واقعی کتابیں جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا، اسی رُوپ کی ہیں۔ حق تعالیٰ میرزا مہرؔ کو سلامت رکھے۔ رقعوں کے چھاپنے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں، البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور میرزا تفتہؔ کو عمل کرنا ضرور ہے۔

مطلب عمدہ جو اس خط کی تحریر سے منظور ہے، وہ یہ ہے کہ جو کتاب تم نے بنوائی ہے اور میں نے تم کو لکھا تھا کہ پہلے ورق کے دوسرے صفحہ پر انگریزی عبارت لکھ کر بھیجنا، خدا کرے وہ عبارت تم نے نہ لکھی ہو۔ اگر لکھ دی ہو تو ناچار اور اگر نہ لکھی ہو تو اب نہ لکھنا اور سادہ رہنے دینا اور اسی طرح میرے پاس بھیج دینا۔ یہ بھی معلوم رہے کہ اب ان کتب کی تقسیم اس کتاب کے آنے تک ملتوی رہے گی اور وہ کتاب میرے پاس جلد پہنچ جائے تو بہتر ہے۔ جواب طلب بلکہ کتاب طلب

۲۰۔ نومبر ۱۸۵۸ء غالب

(۱۲)

صاحب، تم کندھولی سے کب آئے اور جب آئے تو میرا خط بیرنگ کہ جس میں سات روپے کی ہنڈوی ملفوف تھی پایا یا نہیں پایا؟ اگر پایا تو موافق اس تحریر کے عمل کیوں نہ فرمایا؟ اور اس خط میں ایک مطلب جواب طلب تھا، اس کا جواب کیوں نہ بھجوایا؟ اچھا، اگر تم ایک آدھ دن کے واسطے کندھولی گئے تھے تو کارپردازان مطبع نے خط لے کر رکھ چھوڑا ہوگا اور جب تم آئے ہو گے تو وہ خط تمہیں دیا ہوگا۔ پھر کیا سبب جو تم نے جواب نہ لکھا؟ یا ابھی کندھولی سے تم نہیں آئے، یا وہ میرا خط تلف ہوگیا۔ تاریخ تحریر خط مجھے یاد نہیں۔ اب یہ لکھتا ہوں کہ اگر خط پہنچا تو مجھ کو خط کی اور ہنڈوی کی رسید اور میرے سوال کا جواب لکھو اور اگر خط نہیں پہنچا تو اس کی تدبیر بتاؤ کہ اب میں ساہوکار سے کیا کہوں اور ہنڈوی کا مثنیٰ کس طرح سے مانگوں؟ جواب طلب، شتاب طلب۔

روز سہ شنبہ۔ ۳۰۔ نومبر ۱۸۵۸ء از اسد اللہ مضطرب

(۱۳)

صاحب، تم خط کے جواب نہ بھیجنے سے گھبرا رہے ہوگے۔ حال یہ ہے کہ قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہوگیا اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے۔ بہرحال اب اچھا ہوں۔ "پنج آہنگ" تم نے مول لے لی، اچھا کیا۔ دو چھاپے ہیں، ایک بادشاہی چھاپے خانے کا اور ایک منشی نورالدین کے چھاپے خانے کا۔ پہلا ناقص ہے، دوسرا سراسر غلط ہے۔ کیا کہوں، تم نے؟ ضیاء الدین خاں، جاگیردار لوہارو، میرے سبھی بھائی اور

میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں میں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ "کلیاتِ نظم فارسی" چوّن چھپّن جزو اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیمروز" اور "دیوان ریختہ" سب مل کر سوا سو جزو مطلا و مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اس مجموعِ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ خوان یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے، کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ "قلمی" فارسی کا کلیات "قلمی" ہندی کا کلیات "قلمی" "پنج آہنگ" "قلمی" "مہر نیمروز" اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے، تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا۔

جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔[1] ان کی فرمائش ہے اردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر بھائی، تم غور کرو، اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں؟ کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں؟ تمھاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ۔ ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو دستنبو کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں الہ آباد سے تمھارے پاس حکم پہنچے۔

روز شنبہ ۱۱۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۴)

بھائی،

یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر، دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔ تمھارا خط آیا۔ اس کے دوسرے دن میں نے جواب بھجوایا۔ آج تم نے اس کا جواب نہ بھیجا، حال آنکہ اس میں جواب طلب باتیں تھیں۔ یعنی میں نے اپنی نظم و نثر کی کتب کا حال تم کو لکھ کر تم سے استدعا کی تھی کہ قلمی جو نسخہ تمھارے ہاتھ آ جائے، وہ تم خرید کر مجھے بھیج دینا۔

ریڈ صاحب کے باب میں میں نے یہ لکھا تھا کہ جب اردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو "دستنبو" کی خریداری کی خواہش کروں گا۔ معہذا تم سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اردو کروں؟ تم نے اس بات کا بھی جواب نہ لکھا۔

۱؎ ریڈ صاحب صوبجات متحدہ (یو۔ پی) میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ اس کے بعد کے خط سے ظاہر ہوتا ہے، شیو نرائن نے میرزا کو لکھا تھا کہ "دستنبو" کی خریداری کے لیے ریڈ صاحب کو لکھیے۔ وہ سکولوں کے لیے کافی تعداد میں کتابیں خرید لیں گے۔ لیکن غالب اس لیے متوقف تھے کہ ریڈ صاحب نے اردو نثر کے لیے فرمائش بھیج رکھی تھی اور اس کی فرمائش کو پورا کیے بغیر اپنے مطلب کے لیے لکھنا غیر مناسب معلوم ہوتا تھا۔

سید حفظ الدین احمد کی مُہر کھدوانے کو تم نے لکھا تھا کہ ملتوی رہے۔ پھر اس کا بھی کچھ بیورا نہ لکھا۔ میں اس کو ابھی کچھ نہیں سمجھا۔ اس کو یکسو کرو۔ ہاں، ناں کچھ لکھ بھیجو۔ تمھاری مُہر بدر الدین علی خاں کو دی گئی ہے۔ یقین تو یہ ہے کہ اسی دسمبر کے مہینے میں تمھارے پاس پہنچ جائے اور ۱۸۵۸ء سن کھُد ے۔ شاید کچھ دیر ہو تو جنوری ۱۸۵۹ء میں کھُدے۔ اس سے زیادہ درنگ نہ ہوگی۔ تم کو روپیہ حرف، آٹھ آنہ حرف سے کیا علاقہ؟ تم کو اپنی مُہر سے کام۔

سچ تو کہو، کیا پھر کندھولی گئے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کس شغل میں ہو؟ یا مجھ سے خفا ہو؟ اگر خفا ہو تو اور کچھ نہ لکھو، خفگی کی وجہ لکھو۔ بہر حال اس کا جواب شتاب بھیجو اور اسی خط میں بعد ان سب باتوں کے جواب کے مولوی قمر الدین خاں کا حال لکھو کہ وہ کہاں ہیں؟ اور کس طرح ہیں؟ برسرِ کار ہیں یا بیکار ہیں؟ اچھا، میرا بھائی اس خط کے جواب میں درنگ نہ ہو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

مرسلہ چہار شنبہ ۱۵۔ دسمبر ۱۸۵۸ء　　　　غالب

(۱۶)

برخوردار،

آج اس وقت تمھارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا۔ دل خوش ہُوا۔ میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔ یہ لفافے ازمقام و درمقام و تاریخ و ماہ مجھ کو پسند نہیں۔ آگے جو تم نے مجھے بھیجے تھے وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ دیے[۱]۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ اُن کے عوض یہ لفافے جو "درمقام و ازمقام" سے خالی ہیں، جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو اور اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو ان کی کچھ ضرورت نہیں۔

مُہر کے واسطے صاحب، زمرد کا نگینہ اور پھر چنے کی دال کے برابر اور ہشت پہلو، اس اجڑے شہر میں کہاں ملے گا۔ عقیق بہت خوش رنگ، سیاہ یا سُرخ رنگ، جیسا تم نے آگے لکھا ہے، ہشت پہلو ہوگا۔ یہ مُہر میری طرف سے تم کو پہنچے گی۔ تم کو چار آنے حرف چھ آنے حرف سے کچھ مدعا نہیں۔ آپ اپنی مُہر چاہو زمرد پر، چاہو الماس پر کھدواؤ۔ میں تو عقیق کی مُہر تم کو دوں گا۔ وہ دوسری مُہر، جب تمھاری مہر کھُد چکے گی، جس طرح تم کہو گے، کھُد جائے گی۔

میاں، کیا قرینہ بتاؤں گورنمنٹ کی خریداری کا؟ ایک بات ایسی ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خدا کرے اس کا ظہور ہو جائے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ جناب ریڈ صاحب صاجی کرتے ہیں۔ میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجایش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا، میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اردو کے فصیح ہوگا۔ خیر بہر حال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زورِ قلم دکھاؤں گا۔ قے کا ہونا اور دستوں کا آنا یہ چاہتا ہے کہ تم نے رات کو بُری قسم کی

---

[۱] شیونرائن نے لفافے بھیجے لیکن اپنے خیال کے مطابق میرزا کی سہولت کے لیے ان پر "ازمقام، درمقام"، تاریخ و ماہ وغیرہ چھپوا دیا۔ میرزا کو یہ پسند نہ تھا، لہٰذا جتنے لفافے آئے تھے وہ متفرق دوستوں میں بانٹ دیے اور شیونرائن کو اطلاع نہ دی۔ اس عقیدت مند نے دوبارہ ویسا ہی بنڈل بھیج دیا۔ اُسے میرزا نے واپس کیا اور ساتھ ہی واپسی کی وجہ ظاہر کر دی۔

میرے شاگردِ رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں میں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ "کلیاتِ نظمِ فارسی" چوتن پچپن جزو اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیمروز" اور "دیوانِ ریختہ" سب مل کر سَو سوا سَو جزو مطلّا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اس مجموعِ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لُٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ خوانِ یغما ہوگیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے، کہیں سے اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی "فارسی کا کلیات" "قلمی" ہندی کا کلیات "قلمی" پنج آہنگ "قلمی" مہر نیمروز "اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہُوا آوے، تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا۔

جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب[1] کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اُردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر بھائی، تم غور کرو، اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہُوں کہ کیا لکھوں؟ کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں؟ تمھاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ۔ ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہُوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو دستنبو کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں الٰہ آباد سے تمھارے پاس حکم پہنچے۔

روز شنبہ ۱۱۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۴)

بھائی،

یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر، دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔ تمھارا خط آیا۔ اس کے دوسرے دن میں نے جواب بھجوایا۔ آج تم نے اس کا جواب نہ بھیجا، حالانکہ اس میں جواب طلب باتیں تھیں۔ یعنی میں نے اپنی نظم و نثر کی کتب کا حال تم کو لکھ کر تم سے استدعا کی تھی کہ قلمی جو نسخہ تمھارے ہاتھ آجائے، وہ تم خرید کر مجھے بھیج دینا۔

ریڈ صاحب کے باب میں میں نے یہ لکھا تھا کہ جب اُردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو "دستنبو" کی خریداری کی خواہش کروں گا۔ معہذا تم سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اُردو کروں؟ تم نے اس بات کا بھی جواب نہ لکھا۔

---

[1] ریڈ صاحب صوبجات متحدہ (یو۔پی) میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ اس کے بعد کے خط سے ظاہر ہوتا ہے، شیونرائن نے میرزا کو لکھا تھا کہ "دستنبو" کی خریداری کے لیے ریڈ صاحب کو لکھیے۔ وہ سکولوں کے لیے کافی تعداد میں کتابیں خرید لیں گے۔ لیکن غالب اس لیے متوقع تھے کہ ریڈ صاحب نے اُردو نثر کے لیے فرمائش بھیج رکھی تھی اور اس کی فرمائش کو پورا کیے بغیر اپنے مطلب کے لیے لکھنا غیر مناسب معلوم ہوتا تھا۔

سید حفظ الدین احمد کی مُہر کھدوانے کو تم نے لکھا تھا کہ ملتوی رہے۔ پھر اس کا بھی کچھ بیورا نہ لکھا۔ میں اس کو ابھی کچھ نہیں سمجھا۔ اس کو یکسو کرو۔ ہاں، ناں کچھ لکھ بھیجو۔ تمھاری مُہر بدر الدین علی خاں کو دی گئی ہے۔ یقین تو یہ ہے کہ اسی دسمبر کے مہینے میں تمھارے پاس پہنچ جائے اور ۱۸۵۸ء سن کھُدے۔ شاید کچھ دیر ہو تو جنوری ۱۸۵۹ء میں کھُدے۔ اس سے زیادہ درنگ نہ ہوگی۔ تم کو روپیہ حرف، آٹھ آنہ حرف سے کیا علاقہ؟ تُم کو اپنی مُہر سے کام۔

سچ تو کہو، کیا پھر کندھولی گئے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کس شغل میں ہو؟ یا مجھ سے خفا ہو؟ اگر خفا ہو تو اور کچھ نہ لکھو، خفگی کی وجہ لکھو۔ بہرحال اس کا جواب شتاب بھیجو اور اسی خط میں بعد ان سب باتوں کے جواب کے مولوی قمر الدین خاں کا حال لکھو کہ وُہ کہاں ہیں؟ اور کس طرح ہیں؟ برسرِ کار ہیں یا بیکار ہیں؟ اچھا، میرا بھائی اس خط کے جواب میں درنگ نہ ہو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

مرسلہ چہار شنبہ ۱۵۔ دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۱۶)

برخوردار،

آج اس وقت تمھارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا۔ دل خوش ہُوا۔ میں اپنے مزاج سے ناچار ہُوں۔ یہ لفافے ازمقام و درمقام و تاریخ و ماہ مجھ کو پسند نہیں۔ آگے جو تم نے مجھے بھیجے تھے وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ دیے[۱]۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہُوں کہ اُن کے عوض یہ لفافے جو "درمقام و ازمقام" سے خالی ہیں، جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو اور اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو ان کی کچھ ضرورت نہیں۔

مُہر کے واسطے صاحب، زمرد کا نگینہ اور پھر چنے کی دال کے برابر اور ہشت پہلو، اس اجڑے شہر میں کہاں ملے گا۔ عقیق بہت خوش رنگ، سیاہ یا سُرخ رنگ، جیسا تم نے آگے لکھا ہے، ہشت پہلو ہوگا۔ یہ مُہر میری طرف سے تم کو پہنچے گی۔ تم کو چار آنے حرف چھ آنے حرف سے کچھ مدعا نہیں۔ آپ اپنی مُہر چاہو زمرد پر، چاہو الماس پر کھدواؤ۔ میں تو عقیق کی مہر تم کو دوں گا۔ وہ دوسری مُہر، جب تمھاری مہر کھُد چکے گی، جس طرح تم کہو گے، کھُد جائے گی۔

میاں، کیا قرینہ بتاؤں گورنمنٹ کی خریداری کا؟ ایک بات ایسی ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خدا کرے اس کا ظہور ہو جائے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اُردُو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہُوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا، میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اُردو کے فصیح ہوگا۔ خیر بہرحال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زورِ قلم دکھاؤں گا۔ قے کا ہونا اور دستوں کا آنا یہ چاہتا ہے کہ تم نے رات کو بُری قسم کی

---

[۱] شیو نرائن نے لفافے بھیجے لیکن اپنے خیال کے مطابق میرزا کی سہولت کے لیے ان پر "ازمقام، درمقام"، تاریخ و ماہ وغیرہ چھپوا دیا۔ میرزا کو یہ پسند نہ تھا، لہٰذا جتنے لفافے آئے تھے وہ متفرق دوستوں میں بانٹ دیے اور شیو نرائن کو اطلاع نہ دی۔ اس عقیدت مند نے دوبارہ ویسا ہی بنڈل بھیج دیا۔ اُسے میرزا نے واپس کیا اور ساتھ ہی واپسی کی وجہ ظاہر کر دی۔

شرابِ مقدار سے زیادہ پی ہوگی۔ کچھ تبرید کرو اور شراب زیادہ نہ پیا کرو۔ میرا رقعہ تمھارے نام کا اور تفتہ کا رقعہ تمھارے نام کا حسب الحکم تمھارے واپس بھیجا جاتا ہے۔ میں نے تفتہ کا خفا ہونا اسی طرح لکھا تھا، جیسا تم کو تمھارا خفا ہونا لکھا تھا۔ بھلا وہ میرے فرزند کی جگہ ہیں، مجھ سے خفا کیوں ہوں گے؟ اس دن سے آج تک دو تین خط ان کے آچکے ہیں۔ چنانچہ ایک خط ابھی تمھارے خط کے ساتھ ڈاک کا ہرکارہ دے گیا ہے۔

محررہ شنبہ ۱۸۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

غالب

(۱۷)

اب ایک امر خاص کو سمجھو۔ دو جلدیں دستنبو کی مجھ کو لکھنؤ بھیجنی ہیں اور میرے پاس کوئی جلد نہیں ہے۔ اب جو تم سے منگاؤں اور یہاں سے لکھنؤ بھجواؤں، تو ایک قصہ ہے۔ یہ صاحب لوگ اطراف و جوانب سے مجھ پر فرمائشیں بھیجتے ہیں، ہم سے بقیمت کوئی نہیں منگواتا۔ چالیس جلدیں پہلی اور بارہ یہ حال کی سب تقسیم ہوگئیں۔ ان دونوں صاحبوں کی خاطر مجھ کو بہت عزیز ہے۔ ایک روپے کے تیئیس ٹکٹ اور دو آنے کے دو ٹکٹ اس خط میں ملفوف کر کے تم کو بھیجتا ہوں۔ دو پارسل الگ الگ لکھنؤ کو ارسال کرو۔ آنے آنے کا ٹکٹ اس پر لگا دو۔ ایک پارسل پر یہ لکھو:

"این پارسل بصیغۂ پم فلٹ پاکٹ، اسٹامپ پیڈ، در لکھنؤ بہ محلہ نخاس، در امام باڑہ اکرام اللہ خاں، بہ مکان میرزا عنایت علی، بخدمت میر حسین علی برسد۔ مرسلہ شیونرائن، مہتمم مطبع مفید خلائق آگرہ۔"

دوسرے پارسل پر بھی یہی عبارت، مگر مکان کا پتا اور نام اور:

در لکھنؤ بہ احاطہ خانساماں، متصل تکیہ شیر علی شاہ، بہ مکانات مولوی عبدالکریم مرحوم، بخدمت مولوی سراج الدین احمد صاحب برسد۔

سمجھ لیجیے؟ یعنی دو پارسل اسٹامپ پیڈ، دونوں لکھنؤ کو، ایک بنام میر حسین علی اور ایک بنام سراج الدین احمد بسبیل ڈاک روانہ کر دو۔ اور ہاں صاحب، ان دونوں پارسلوں کی روانگی کی تاریخ مجھ کو لکھنا کہ اپنے خط میں ان کو اطلاع دوں۔[1]

ایک امر اور ہے اگر تم بھی اس رائے کو پسند کرو۔ یعنی جس طرح سے تم نے ایک جلد ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو

---

[1] ظاہر ہے کہ دوسرے بیسیوں افراد کی طرح میر حسین علی اور مولوی سراج الدین احمد سے بھی میرزا کی خط و کتابت ہوگی۔ مولوی سراج الدین احمد تو میرزا کے عزیز دوست تھے۔ ایک غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں۔

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگ غزل خوانی مرا

لیکن ان میں سے یا دوسرے صدہا خطوط میں سے کسی کا سراغ اب تک نہیں مل سکا۔

اپنی طرف سے بھیجی ہے، اسی طرح دو جلدیں ان دونوں صاحبوں کو، جن کا نام کاغذ میں لکھا ہوا ہے بھیج دو، مگر اپنی ہی طرف سے، میرا اس میں اشارہ نہ پایا جائے اور یہ دونوں صاحب بالفعل دلّی میں وارد ہیں۔ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ خواہی نخواہی اس کو کیا ہی چاہیے۔ ایک صلاح ہے اور نیک صلاح ہے۔ مناسب جانو کرو، ورنہ جانے دو۔

میاں، اُردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو؟ خیر ہُوئی۔ اب میں کہانیاں قصّے کہاں ڈھونڈتا پھروں؛ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔ پنسن مل جائے، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ "پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں"[1]۔ زیادہ، زیادہ۔ جواب طلب

روز سہ شنبہ، ۴- جنوری ۱۸۵۹ء

غالب

(۱۸)

پرسوں اور کل، دو ملاقاتیں جناب آرنلڈ صاحب[2] بہادر سے ہُوئیں۔ کیا کہوں کہ مجھ پر بے سابقہ معرفت کیا عنایت فرمائی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ گویا مجھ کو مول لے لیا۔ آج وہ یہاں اور ہیں، کل جائیں گے۔ "دستنبو" تمھاری بھیجی ہُوئی ان کے پاس نہیں پہنچی۔ ناچار ایک "دستنبو" اور ایک "پنج آہنگ" اپنے پاس سے ان کو نذر کر آیا ہُوں۔ لکھنؤ کے دونوں پارسلوں کی رسید مجھ کو آج تک نہیں آئی۔ آخر رسید تو تم کو پارسلوں کی ملی ہوں گی۔ ڈاک سے معلوم کر کے مجھ کو لکھ بھیجو۔ دیر نہ کرو ورنہ میں مشوش رہوں گا۔

نگاشتہ صبح شنبہ ۱۵- جنوری ۱۸۵۹ء

از غالب

(۱۹)

صاحب،

میں ہندی[3] غزلیں بھیجوں کہاں سے، اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے، وہ لُٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہُوا نظر آجائے لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا اور ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے کہ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں[4] ہوتی۔ جس غزل کے تم نے پانچ شعر لکھے ہیں، یہ نو شعر کی ہے۔ ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے، اس نے کہیں کہیں سے مسوّدات متفرق بہم پہنچا لیے ہیں۔ چنانچہ "پنہاں ہو گئیں"، "ویراں ہو گئیں"۔ یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آگئی ہے۔ اب میں نے اس کو لکھا ہے اور تم کو یہ خط لکھ رہا ہُوں۔ خط لکھ کر رہنے دوں گا۔ جب اس کے پاس سے ایک غزل یا دو غزل آجائے گی تو اسی خط میں ملفوف کر کے بھیج دوں گا۔ یہ خط یا آج روانہ ہو جائے یا کل۔

---

[1] پنجابی کی مثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیٹ بھرا ہُوا ہو تو باتیں سُوجھتی ہیں۔ [2] بظاہر ولیم ڈیلافیلڈ آرنلڈ مراد ہے (۱۸۲۸ء۔ اپریل ۱۸۵۹ء) پہلے پنجاب میں اسسٹنٹ کمشنر رہا۔ ۱۸۵۶ء میں ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب مقرر ہوا۔ ولایت جاتے ہُوئے جبل طارق میں وفات پائی۔ [3] مراد اردو غزل۔ [4] یہ کلیہ نہیں۔ غالب کی متعدد غزلیں نو شعر سے کم کی ہیں۔

میں نے ایک قصیدہ اپنے محسن و مربیِ قدیم جناب فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح[1] میں اور ایک قصیدہ جناب منٹگمری لفٹنٹ گورنر بہادر ملک پنجاب کی تعریف[2] میں لکھا ہے۔ اگر کہو تو بھیج دوں، مگر فارسی میں اور چالیس چالیس پینتالیس پینتالیس شعر ہیں۔

کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔ خدا کرے، جس کو دی ہو، وہ تین غلطیاں جو معلوم ہیں، وہ بنادی ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندوستانیوں نے لیں؟ تم مجھ کو یہ بات ضرور ضرور لکھو۔ دیکھو صاحب، تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔ بھائی، ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں اُن میں سیکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے (آزاد) اس میں مقدور نہیں۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبان انگریز کی خریداری آئی ہو گی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ پورب میں کم بکی ہوں گی۔

میاں، میں تم کو اپنا فرزند جانتا ہوں۔ خط لکھنے نہ لکھنے پر موقوف نہیں ہے۔ تمھاری جگہ میرے دل میں ہے۔ اب میں طبع آزمائی کرتا ہوں اور جو غزل تم نے بھیجی ہے اس کو لکھتا ہوں۔ خدا کرے نو کے نو شعر یاد آ جائیں:

غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"؟ — تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن — ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا — کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز، جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے؟

پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟

---

[1] یہ قصیدہ کلیات نظم فارسی میں ص ۴۴۳ پر ہے۔ کل چھیالیس شعر ہیں۔ ردیف "باد" ہے۔ اس میں سے دو شعر درج ذیل ہیں:

کلبۂ درویش را بنود چراغ — برق در شبہاے تار آورد باد

دیدہ ور داند کہ از نظم بہ بزم — سلک دُرِّ شاہوار آورد باد

[2] یہ کلیات نظم فارسی پر ص ۴۴۵ پر ہے۔ اس میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:

داورا! غالبِ عاجز کہ ستایش گر تست — گلہ از گردش ایں چرخ ستم گر دارد

ذکر ایں فتنہ کہ برخاست ز انبوہِ سپاہ — بہ زبانے کہ قلم راست سراسر دارد

بندہ مے خواست کہ بیروں رود اما بوجہ — نتوانست کہ از گوشہ قدم بر دارد

ماند و آئین وفا داشت در آں عہد ہنوز — نیز آں قاعدہ با خویش مقرر دارد

جز ثناے بہ دعاے کہ ہمے گفت، نگفت — و آنچہ مے گفت دریں وقت ہم از بر دارد

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے — وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

یہ تمہارا اقبال ہے کہ نو شعر یاد آ گئے۔ ایک غزل یہ اور دو غزلیں وہ جو آیا چاہتی ہیں، تین ہفتے کا گودام تمہارے پاس فراہم ہو گیا[1]۔ اگر منگواؤ گے تو قصیدے دونوں بھیج دوں گا۔

مرقومہ سہ شنبہ ۱۹۔ ماہ اپریل ۱۸۵۹ء — غالبؔ

(۲۰)

بھائی،

حاشا، ثم حاشا، اگر یہ غزل میری ہو۔ مصرع "اسد اور لینے کے دینے پڑے" اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں؟ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر! شاباش، رحمت خدا کی

میں نے بھی ان سے کہا تھا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسدؔ ہو گزرے ہیں۔ یہ غزل ان کے کلامِ معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسدؔ تخلص رکھا ہے، ورنہ غالبؔ ہی لکھتا رہا ہوں[2]۔ تم طرزِ تحریر اور روشِ فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا کلام اور ایسا مزخرف! یہ قصّہ تمام ہوا۔

وہ غزل جو تمھارے پاس پہنچ چکی ہے، چھاپنے سے پہلے ایک نقل اس کی میرزا حاتم علی مہرؔ کو دے دینا۔ جس دن یہ میرا خط پہنچے، اسی دن وہ غزل نقل کر کے ان کو بھیج دینا۔

"دستنبو" کی خریداری کا حال معلوم ہو گیا۔ میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔ جناب میکلوڈ صاحب فنانشل کمشنر پنجاب نے بذریعہ صاحب کمشنر دہلی مجھ سے منگوائی تھی۔ ایک جلد ان کو بھی بھیج چکا ہوں۔ قصیدے میں نے دونوں لکھے ہیں۔ ایک اپنے مربّیِ قدیم جناب فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر کی تعریف میں اور ایک جناب منٹگمری صاحب بہادر

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اپنے اخبار میں ہر ہفتہ ایک غزل چھاپ سکتے ہیں۔ [2] یہ بتانا مشکل ہے کہ اردو میں کب سے غالبؔ تخلص اختیار کیا، لیکن دو چار برس کی بات قابلِ تسلیم نہیں۔ غالبؔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے گویا ان کی شعر گوئی کا آغاز ۱۸۰۸ء کے قریب ہوا۔ اس کے بعد دس بارہ برس تک اسدؔ تخلص رکھنے کی شہادتیں موجود ہیں۔ بلکہ غالبؔ تخلص اختیار کر لینے کے بعد بھی ضرورت کے موقع پر اسدؔ لکھ جاتے تھے اور بعض وقت پورا نام "اسد اللہ خاں"۔

کی مدح ہیں ، ایک پچپن شعر کا، ایک چالیس بیت کا اور پھر فارسی[1]۔ ان کو ریختہ کی غزلوں میں کیا چھاپو گے ؟ جانے بھی دو۔ رہیں غزلیں سابق کی، وہ جو میرے ہاتھ آتی جائیں گی، بھجواتا جاؤں گا۔ میاں تمھاری جان کی قسم، نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے، نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریق قصیدہ تمھاری خاطر سے لکھ کر بھیجے تھے[2]۔ سوائے اس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہو گا، تو گنہگار۔ بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی، صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے۔ پرسوں ایک خط تمھیں اور لکھ چکا ہوں۔ اب اس کا جواب نہ لکھنا۔ والدعا

چہار شنبہ، ۲۷۔ اپریل ۱۸۵۹ء

(۲۱)

برخوردار منشی شیو نرائن کو دعا پہنچے۔ خط تمھارا مع اشتہار کے پہنچا۔ یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں[3]، نواب حامد علی خاں[4]، حکیم احسن اللہ خاں[5]۔ سو ان کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں متذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں؟ حکیم احسن اللہ خاں نے "آفتاب عالمتاب" کی خریداری کرلی ہے، اب وہ مکرر "حالات دربار شاہی" کیوں لیں گے؟ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم ادھر کا خیال دل سے دھو ڈالو۔ رہا نام اس رسالے کا، تاریخی جانے دو، "رستخیز ہند"، "غوغاے سپاہ"، "فتنۂ محشر" ایسا کوئی نام رکھو۔ اب تم یہ بتاؤ کہ رئیس رام پور کے ہاں بھی تمھارا اخبار یا "معیار الشعرا" جاتا ہے یا نہیں[6]؟ اب کے تمھارے "معیار الشعرا" میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ اکبر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں، ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہو گا، ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر[7] تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے

---

[1] صحیح یہ ہے کہ ایک چھیالیس شعر کا اور دوسرا پینتیس شعر کا۔ [2] یعنی وہ قصیدہ جو شیو نرائن کی فرمائش پر لکھا تھا اور خط ۱۹ میں درج ہے۔ [3] نواب نجابت علی خاں والی جھجر کے چھوٹے بیٹے، تین ہزار روپے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔ [4] اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر شاہ اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ فضل علی کی وفات پر حامد علی خاں دہلی چلے آئے۔ روپیہ شاہی خزانہ میں جمع کرا دیا۔ ساڑھے چار ہزار ماہانہ سود ملتا تھا۔ غدر کے بعد چودہ مہینے حوالات میں رہے۔ فروری ۱۸۵۹ء میں رہا ہوئے۔ [5] یہ مشہور طبیب تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں عروج پایا۔ غدر میں انگریزوں کے طرفدار بن گئے تھے۔ اس وجہ سے لوگوں کی نظروں میں گر گئے۔ ۱۸۷۳ء میں بڑودہ میں فوت ہوئے۔ "حکیم غریب" مادہ تاریخ وفات ہے۔ [6] اس خط سے ظاہر ہے کہ شیو نرائن کے اخبار کا نام "آفتاب عالمتاب" تھا۔ اس کے ساتھ دربار شاہی کے حالات بھی چھپنے لگے تھے۔ نیز ایک ادبی رسالہ "معیار الشعرا" کے نام سے نکالا تھا جس میں شعرا کا کلام چھپتا تھا۔ یہ پانزدہ روزہ تھا۔ غدر کے حالات کے متعلق ایک الگ رسالہ نکالنے کی تجویز تھی جس کے لیے نام غالب نے تجویز کیے تھے۔ آخر "بغاوت ہند" اس کا نام رکھا گیا۔ جیسا کہ خط ۲۳ سے ظاہر ہوتا ہے۔ [7] اس سے مراد امیر مینائی مرحوم ہیں جو اگرچہ اس زمانہ میں بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ لیکن چنداں مشہور نہ تھے۔ لکھنؤ سے رام پور میں نواب یوسف علی خاں کے پاس پہنچ گئے تھے۔

روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ مَیں ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو، یعنی غزلیں غالبؔ نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا۔ نام اور حال وہ جو میں اوپر لکھ آیا ہوں، اس کو اب کے "معیار الشعرا" میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چہار ورقہ رام پور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر یہ لکھو:

"در رام پور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیرؔ تخلص برسد۔"

اور مجھ کو اس امر کی اطلاع دو کہ رام پور کو تمھارا اخبار جاتا ہے یا نہیں؟

مرسلہ یک شنبہ ۱۲۔ جون ۱۸۵۹ء غالب

(۲۲)

برخوردار نورِ چشم منشی شیو نرائن کو دعا پہنچے۔ صاحب، میں تو منتظر تمھارے آنے کا تھا، کس واسطے کہ منشی بہاری لال بھائیوں میں ہیں ماسٹر رامچندر[۱] کے، اُنھوں نے پرسوں مجھ سے کہا تھا کہ منشی شیو نرائن دو تین دن میں آیا چاہتے ہیں۔ آج صبح ناگاہ تمھارا خط آیا۔ اب مجھ کو اس کا پوچھنا تم سے ضرور ہُوا کہ آنے کی خبر تمھارے جھوٹ تھی یا ارادہ تھا اور کسی سبب سے موقوف رہا؟

بابو ہرگوبند سنگھ سہائے[۲] کا میں بڑا احسان مند ہوں۔ حق تعالیٰ اس کوشش کے اجر میں ان کو عمر و دولت دے۔ سعادتمند اور نیک بخت آدمی ہیں۔

تمھاری خواہش کو اچھی طرح سمجھا نہیں۔ مصرع تم نے لکھا اور وہ چھاپا گیا۔ ہزار پانسو دو ورقے چھپ گئے۔ اب جو مصرع اور کہیں سے بہم پہنچے گا وہ کس کام آئے گا؟ خود لکھتے ہو کہ پہلا جُز، وتم کو بھیجا ہے۔ صبر کرو، وہ جزو آنے دو۔ میں اس کو دیکھ لوں۔ یقین ہے کہ قلمی ہوگا۔ اس کو دیکھ کر اور مضامین کو سمجھ کر مصرع بھی تجویز کر دوں گا، مگر اتنا تم اور بھی لکھو کہ آیا یُوں منظور ہے کہ اس مصرع کی جگہ اور مصرع لکھو یا یہی چاہتے ہو کہ یہ بھی رہے اور وہ بھی رہے؟ خط تمھارا آج آگیا ہے۔ ہم فلٹ پاکٹ یا آج شام کو یا کل شام تک آجائے گا۔

سہ شنبہ ۱۹۔ جولائی ۱۸۵۹ء غالب

(۲۳)

برخوردار کو بعد دعا کے معلوم ہو، تمھارا خط پہنچا اور خط سے کئی دن پہلے رسالہ "بغاوت ہند" پہنچا۔ تمھارے تصمیم عزیمت سے بہت خوش ہُوا[۳]۔ اللہ اللہ اپنے یا بنسی دھر کے پوتے کو دیکھوں گا۔ رسالہ "بغاوت ہند" ماہ بماہ

---

[۱] غالباً وہی ماسٹر رام چندر جو عیسائی ہو گئے تھے۔ دہلی کالج میں پروفیسر تھے اور ایک یا دو اخبار بھی جاری کیے تھے۔ [۲] میرزا کے شاگرد ہرگوبند رائے نشاط (۸۔ دسمبر ۱۸۲۸ - ۳ مئی ۱۸۹۱) مختلف عہدوں پر مامور رہنے کے بعد وکالت پاس کی ریاست کوٹہ میں جج مقرر ہو گئے تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ [۳] یعنی دہلی آنے کا ارادہ۔

اور " معیارالشعرا" ہر مہینے میں دو بار پہنچتا رہے۔ باقی گفت گو عندالملاقات ہو رہے گی۔ اپنے شفیق دلی ماسٹر رامچندر صاحب کو تمھارے آنے کی اطلاع دی۔ وہ بہت خوش ہُوئے۔ جو رقعہ اُنھوں نے میرے رقعے کے جواب میں لکھا ہے، وُہ تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ لینا۔ اگر " دستنبوئیں" باقی ہوں تو اپنے ساتھ لے آنا۔

شنبہ ۲۳۔ جولائی ۱۸۵۹ء — غالب

(۲۴)

میاں، یہ کیا معاملہ ہے؟ ایک خط اپنی رسید کا بھیج کر پھر تم چپکے ہو رہے۔ نہ " معیارالشعرا"[1]، نہ " بغاوت ہند"، نہ میرے خط کا جواب، نہ ہنڈوی کی رسید۔ برخوردار نواب شہاب الدین خاں نے اگست سے دسمبر تک" پنج ماہۂ معیارالشعرا اور " بغاوت ہند" کا بھیجا ہے۔ یعنی تین روپے بارہ آنے مجھ کو دیے اور میں نے ہنڈوی لکھوا کر وہ ہنڈوی اپنے خط میں لپیٹ کر تم کو بھیجی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ خط پہنچا یا نہیں پہنچا؟ جب ان مطالب جزوی کا یہ حال ہے تو کتاب اور انگریزی عرضی کا ابھی کیا ذکر ہے؟ خدا کے واسطے ان سب مقاصد کا جواب جُدا جُدا لکھو۔ آج اگست کی ۱۷۔ بدھ کا دن ہے۔ پہلا مجلد " معیارالشعرا" کا بھی نہیں آیا۔ یہ ہے کیا؟ مُہر تمھاری کھُدنی شروع ہو گئی ہے۔ اسی اگست کے مہینے میں تمھارے پاس پہنچ جائے گی۔ اچھا میرا بھائی اس خط کا جواب جلد پاؤں اور کتاب اور عرضی کا بھی تقاضا کروں تو بعید نہیں۔ مگر آج شام تک اس خط کو رہنے دوں گا۔ اگر تمھارا خط یا " معیارالشعرا" یا " بغاوت ہند" یا کوئی لفافہ شام تک آیا تو اس خط کو پھاڑ ڈالوں گا، ورنہ کل صبح کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ اپنے والد کو دعا اور اشتیاق دیدار کہہ دینا۔

مرقومہ چہار شنبہ ۱۷۔ اگست ۱۸۵۹ء وقت دوپہر — غالب

(۲۵)

کیوں میری جان، تم نے خط نہ لکھنے کی قسم کھائی ہے یا لکھنا ہی بھول گئے ہو؟ شہر میں ہو یا نہیں؟ تمھارے مطبع کا کیا حال ہے؟ تمھارا کیا طور ہے؟ تمھارے چچا کا مقدمہ کیونکر فیصل ہُوا۔ میرا کام تم نے کس طرح درست کیا؟ کرو گے یا نہیں؟ " معیارالشعرا" کا پارسل پہنچ گیا، " بغاوت ہند" کا پارسل ابھی نہیں آیا۔ ان سب مطالب کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

محررہ پنجشنبہ ۲۲۔ ستمبر ۱۸۵۹ء — غالب

(۲۶)

میری جان!

دو جلدیں " بغاوت ہند" کی پرسوں میرے پاس پہنچیں۔ اس وقت برخوردار میرزا شہاب الدین خاں بیٹھے ہُوئے تھے، ایک جلد ان کو دی۔ کل ایک پارسل اور میرے نام کا آیا۔ میں خوش ہُوا کہ ولایت کی عرضی اور " دستنبو" کا پارسل ہوگا۔



---

[1] اس خط میں جا بجا " معیارالاشعار" چھپا ہے۔ کیا یہ سمجھا جائے کہ غالب یا کاتب کا سہو تھا یا شیو نرائن نے رسالہ کا نام " معیارالشعرا" کے بجائے " معیارالاشعار" تجویز کر لیا تھا؟ میں نے " معیارالاشعار" کے بجائے " معیارالشعرا" بنا دیا ہے۔

دیکھا تو وہی دو جلدیں "بغاوت ہند" کی ہیں۔ حیران رہ گیا کہ یہ کیا؛ ظاہراً مہتمان ارسال نے ازراہ سہو دوبارہ بھیج دی ہیں۔ چاہتا تھا کہ لفافہ بدل کر ڈبل ٹکٹ لگا کر بھیج دوں، پھر سوچا کہ پہلے تم کو اطلاع کر دوں۔ شاید یہیں کسی اور کو دلوا دو۔ بس اب تمھارے کہنے کا انتظار ہے۔ جو کہو سو کروں۔ کہو تم کو بھیج دوں، کہو کہیں اور تمھاری طرف سے بھیج دوں۔ میرے کسی کام کی نہیں۔ والدعا۔

مرقومہ ۲۰۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء

راقم اسداللہ

(۲۷)

برخوردار شیو نرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو۔ کیا میرے خط نہیں پہنچتے کہ جواب ادھر سے نہیں آتا؛ دو مجلد "بغاوت ہند" کے زیادہ پہنچے ہیں۔ اس واسطے تم سے پوچھا گیا تھا۔ اس کا بھی تم نے جواب نہ لکھا۔ میں نے یوسف علی خاں عزیز کے خط میں کچھ عبارت تمھارے نام لکھی تھی، کیا انھوں نے تم کو نہ پڑھائی ہو گی؟ ولایت کی عرضی اور کتاب کے باب میں تو میں کچھ کہتا ہی نہیں، جو اس کا جواب مانگوں۔ کچھ مجھ سے خفا ہو گئے تو ویسی کہو۔ یہ خط تم کو بیرنگ بھیجتا ہوں تاکہ تم کو تقاضا معلوم ہو۔ اے لو، ایک اور بات سنو۔ تمھارا تو یہ حال کہ مجھ کو خط لکھنے کی گویا تم نے قسم کھائی ہے اور میری خواہش کہ نواب گورنر جنرل بہادر کی خبر، جو وہاں تم کو معلوم ہوا کرے، مجھ کو لکھا کرو خصوصاً اکبر آباد[۱] میں آ کر جو کچھ واقع ہو، وہ مفصل لکھو۔ آیا جناب نفٹنٹ گورنر بہادر بھی ساتھ آئیں گے یا جدا جدا آ کر یہاں فراہم[۲] ہو جائیں گے؟ دربار کی صورت، خیر خواہوں کے تقسیم انعام کی حقیقت، کوئی نیا بندوبست جاری ہو اس کی کیفیت، یہ سب مراتب مجھ کو لکھا کرو۔ دیکھو، خبردار اس امر میں تساہل نہ کرنا۔ اب کیا سنتے ہو؛ لکھنؤ سے کہاں آئے ہیں؟ کانپور فرخ آباد ہوتے ہوئے آگرہ آئیں گے؟ کہاں کہاں کون کون رئیس ملے گا؟ لکھنؤ کے دربار کا حال جو کچھ سنا ہو، وہ لکھو۔ اگرچہ یہاں لوگوں کے ہاں اخبار آتے رہتے ہیں اور میری بھی نظر سے گزر جاتے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تمھارے خط سے آگہی پاتا رہوں۔ تم جو لکھو گے مفصل اور منقح لکھو گے۔ یقین ہے کہ برادر زادۂ عزیز یعنی تمھارے والد ماجد نے میرزا یوسف علی خاں کے کام کی درستی لالہ جوتی پرشاد کی سرکار میں کر دی ہو گی۔ اس کی بھی اطلاع ضرور ہے۔

صبح چہارشنبہ ۲۔ نومبر ۱۸۵۹ء

جواب کا طالب غالب

(۲۸)

برخوردار،

دو خط آئے اور آج یک شنبہ ۱۳۔ نومبر کو لفافہ اخبار آیا۔ یہ اودھ اخبار بھائی ضیاء الدین خاں کے ہاں آتا ہے اور وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ اس کی حاجت نہیں۔ اپنے اور میرے ٹکٹ کیوں برباد کرو؛ میرا مقصود اسی قدر ہے کہ فرخ آباد کے اخبار بہ سبب قرب کے وہاں معلوم ہوتے ہوں گے۔ جو سنو، وہ مجھ کو لکھو اور جب نواب معلی القاب آگرہ میں آ جائیں تو اپنا مشاہدہ مجھ کو لکھتے رہو۔ بس غرض اتنی ہی ہے۔ آج کا اخبار لفافہ بدل کر آج ہی بھیج دیتا ہوں اور دونوں

---

[۱] آگرہ [۲] اکٹھے

کتابیں" بغاوت ہند" پرسوں بھیج چکا ہوں۔

تمھارے والد کی طرف سے مجھ کو بڑی تشویش ہے۔ دعا کر رہا ہوں، خدا میری دعا قبول کرے اور ان کو شفاے کامل دے۔ میری دعا ان کو پہنچا دینا۔

میرزا یوسف علی خاں عزیز کا حال معلوم ہوا۔ یہ عالی خاندان اور ناز پروردہ آدمی ہیں۔ ان کو جو راحت پہنچاؤ گے اور جو ان کی خدمت بجا لاؤ گے، اس کا خدا سے اجر پاؤ گے۔ زیادہ سواے دعا کے کیا لکھوں؟

روز یک شنبہ ۱۳۔ نومبر ۱۸۵۹ء   غالب

(۲۹)

برخوردار منشی شیو نرائن کو دعاے دوام دولت پہنچے۔ کل رات تمھارا خط پہنچا۔ دل خوش ہوا۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں یہ دونوں میرے پوتے اور تم بھی میرے پوتے ہو۔ چونکہ تم عمر میں بڑے ہو تو پہلے تم اور بعد تمھارے یہ۔ میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ یہاں آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں[1]۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ کتاب اور عرضی اواسط ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے۔ یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔

بہ بینیم کہ تا کردگارِ جہاں
دریں آشکارا چہ دارد نہاں

اپنے والد کو میری دعا کہہ دینا۔ میرزا یوسف علی خاں کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ میں تمھاری فکر سے فارغ نہیں ہوں۔ اگر خدا چاہے تو کوئی راہ نکل آئے۔

سہ شنبہ ۶۔ مارچ ۱۸۶۰ء   غالب

(۳۰)

برخوردار اقبال آثار منشی شیو نرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ ایک نسخہ "بغاوت ہند" اور ایک ورقہ "معیار الشعرا" کا معرفت برخوردار میرزا شہاب الدین خاں کے پہنچا اور آج چہار شنبہ ۱۴۔ مارچ کی ہے کہ ایک نسخہ "بغاوت ہند" بھیجا ہوا تمھارا رام پور پہنچا۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اب میں شنبہ کے دن ۱۷۔ مارچ کو دلی روانہ ہوں گا۔ تم کو بطریق اطلاع لکھا ہے۔ اب بدستور ارسال خط دلی کو ہے، یہاں نہ بھیجنا۔

ہاں بھائی ان دنوں میں برخوردار میرزا یوسف علی خاں وہاں آئے ہوئے ہیں[2]، آج ہی ان کا خط مجھ کو پہنچا ہے۔ تم ضرور ان سے ملنا۔ منشی امیر علی صاحب کے ہاں وہ اترے ہوئے ہیں۔ ان کو

---

[1] یہ خط رام پور سے لکھا گیا تھا۔ جہاں غالب پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۰ء میں گئے تھے اور دو مہینے رہ کر مارچ میں واپس آئے تھے۔ اس وقت پنشن بند تھی۔ [2] یوسف علی خاں عزیز کے آگرہ پہنچنے کا ذکر غالب نے پہلے پہل ۲۔ نومبر ۱۸۵۹ء کے خط میں کیا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ شیو نرائن کے والد نے عزیز کے روزگار کی تلاش کا بندوبست کر دیا ہوگا۔ ۱۳۔ نومبر کے (باقی ص ۲۱۹ پر)



بلاکر میری دعا کہنا اور کہنا کہ اچھا ہے دلی چلے آؤ۔ وہاں جو مجھ سے ملوگے تو زبانی سب کام ہو رہے گا اور اگر وہ ہاترس گئے ہوں تو یہ رقعہ جو تمھارے نام کا ہے، ایک کاغذ میں لپیٹ کر ٹکٹ لگا کر ہاترس کو شیخ کریم چوکیداروں کے وعدہ دار گھر کے پتے سے بھیج دینا، ضرور، ضرور۔

رواں داشتہ چہارشنبہ ۱۴ مارچ ۱۸۶۰ء وقت دوپہر غالب

(۳۱)

میاں،

دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سن لو۔ تب کچھ کلام کرو۔ میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا، سرنامہ پر لکھا تھا: عرضداشت "عظیم الدین احمد من مقام میرٹھ"۔ واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہرحال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چپ ہو رہا۔ جب میں رام پور سے میرٹھ آیا، بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ اپنا اردو دیوان مجھ کو بھیج دیجیے گا۔ عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو: دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا، تو بھائی ضیاءُ الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لے کر، اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر، مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاءُ الدین خاں کو دلی بھیج دیا۔

آمدم برسر مدعائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی: "اچھا دیوان میں ضیاءُ الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟" نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ "میں"۔ اب کہو کہ میں کیا کرتا؟ دلی آکر ضیاءُ الدین خاں سے دیوان لے کر، ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا؟ آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے، اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان آگیا تو فوراً تمھارے پاس بھیج دوں گا اور اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو میں ناچار ہوں۔ میرا کچھ قصور نہیں ہے۔ اگر سرگزشت کو سن کر مجھ کو گنہ گار ٹھہراؤ، تو اچھا میرا بھائی، میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرا میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے۔

۱۹ یا ۲۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کر کے رام پور گیا ہوں۔ تین مہینے کی جہاز کی آمد و رفت ہے، سو گزر چکی ہے۔ خواہی اس مہینے میں، خواہی آغاز ماہ آئندہ یعنی مئی میں جواب کے آنے کا مترصد ہوں۔ دیکھیے آئے

(بقیہ حاشیہ صہ ۲۱۸) خط میں عزیز کے عالی خاندان ہونے کا ذکر ہے۔ یقیناً شیونرائن کو معلوم ہوگا کہ عزیز کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس خط میں میرزا نے عزیز کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے گویا شیونرائن کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

یا نہ آئے۔ آئے تو خاطر خواہ آئے یا ایسا ہی سرسری آئے۔

(اپریل ۱۸۶۲ء)

(۳۲)

صاحب،

میں تمہارا گنہ گار ہوں۔ تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش اور محنت سے وہاں اسے چھپنے نہ دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن، ۲۵۔ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے۔ لو، اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھ کو اطلاع دو۔ یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا، اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو، میں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو۔ جو تمہاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو اور اچھا، میرا میاں، ذرا[1] تصحیح کا بہت خیال رکھو۔

(۳۳)

میاں،

تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے، اتم و اکمل ہے اور وہ کون سی دو چار غزلیں ہیں جو میرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں؟ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔ معہذا ان سے بھی کہوں گا اور وہ غزلیں ان سے منگا کر دیکھ لوں گا۔

تصویر میری لے کر کیا کرو گے؟ بیچارہ عزیز کیوں کر کھچوا سکے گا؟ اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھ کو لکھو۔ میں مصور سے کھچوا کر تم کو بھیج دوں۔ نہ نذر درکار، نہ نیاز۔ میں تم کو اپنے فرزندوں کے برابر چاہتا ہوں اور شکر کی جگہ ہے کہ تم فرزند سعادت مند ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور مطالب عالیہ کو پہنچائے۔

غالب

سہ شنبہ ۲۔ جولائی ۱۸۶۲ء

(۳۴)

میاں!

میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کریں کہ دلی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمہارا بھیجا ہوا نسخہ مجھ کو دیں اور وجہ میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی، یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمہارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو، میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم[2] نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمہاری ناخوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا؟ یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں؟ تم نے جو خط لکھنا موقوف کیا، میں سمجھا کہ تم خفا ہو۔

---

[1] غالب "ذرا" کو "ز" سے لکھتے تھے۔ ہندوستانی اکیڈیمی کے مجموعہ خطوط میں اس خط کا جو نوٹو چھپا ہے اس میں "ذرا" "ز" ہی سے لکھا ہے۔ [2] خط نمبر ۳۱ میں اس کا نام عظیم الدین لکھا ہے۔

میں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ برخوردار شیونرائن سے میری تقصیر معاف کروا دینا۔ بھائی خدا کی قسم میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں، اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے؛ رام پور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا[۱]، دلّی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں۔ وہ تمھارا مال ہے، چاہو اپنے پاس رکھو، چاہو کسی کو دے ڈالو، چاہو پھاڑ کر پھینک دو۔ تم نے "دستنبو" کی جدول بنوا کر ہم کو سوغات بھیجی تھی۔ ہم نے اپنی تصویر اور اُردو کا دیوان تم کو بھیجا۔ میرے پیارے دوست ناظر بنسی دھر کی تم یادگار ہو۔

اے گل بہ تو خورسندم تو بوے کسے داری

۱۰۔جنوری ۱۸۶۲ء خوشنودی کا طالب، غالب

—(۳۵)—

برخوردار منشی شیونرائن کو دعا کے بعد معلوم ہو: تصویر پہنچی، تحریر پہنچی۔ سنو میری عمر ستّر برس کی ہے[۲] اور تمھارا دادا میرا ہم عمر اور باہم[۳] باز تھا اور میں نے اپنے نانا صاحب خواجہ غلام حسین مرحوم سے سُنا کہ تمھارے پر دادا صاحب کو اپنا دوست بتاتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں بنسی دھر کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ سَو سوا سَو برس کی ہماری تمھاری ملاقات ہے۔ پھر آپس میں نامہ و پیام کی راہ و رسم نہیں اور اس راہ و رسم کے مسدود ہونے کا حاصل یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہیں۔ اگر تم کو میرے حال سے آگاہی ہوتی تو مجھ کو بسبیل ڈاک کبھی اکبر آباد نہ بلاتے۔

لو اب میری حقیقت سنو۔ چھٹا مہینا ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت پیدا کی۔ پھوڑا پک کر، پھوٹ کر، ایک زخم، زخم کیا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جرّاحوں کا علاج رہا۔ بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ اُسترے سے گوشت کٹ رہا ہے۔ بیس دن سے صورت افاقت کی نظر آنے لگی ہے۔

اب ایک اور داستان سُنو۔ غدر کے رفع ہونے اور دِلّی کے فتح ہونے بعد میرا پنسن کُھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہُوا۔ مگر لاٹ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی اور مقرری تھا، مسدُود ہوگیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبّر، مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکّامِ شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا۔ بڑے لاٹ صاحب کے ورود کے زمانے

---

[۱] یہ عجیب دعویٰ ہے کہ دیوان ضیاءُالدین خاں نیّر کے کہنے پر کاتب سے نقل کرا کے رام پور سے بطریق ڈاک دِلّی بھیجا تھا اور وہی نسخہ نیّر سے لے کر میرٹھ ارسال کیا تھا۔ خط ۳۲ میں ہے کہ اسے میرٹھ میں نہ چھپنے دیا اور واپس منگوا لیا۔ وہی نسخہ شیونرائن کو بھیجا۔ اب فرماتے ہیں کہ یہ دیوان شیونرائن کے واسطے لکھوا کر لائے تھے۔ نیز سمجھ میں نہ آیا کہ جب دیوان کا ایک ہی نسخہ موجود تھا، جو میرزا رام پور سے لائے تھے تو پھر دہلی والوں کو کون سا نسخہ چھپنے کے لیے دیا؟ [۲] ۱۸۶۳ء میں غالب کی عمر بہ حساب سنین قمری ستّر ستّھ برس کی تھی اور بہ حساب شمسی چھیاسٹھ برس کی۔ [۳] ساتھ کھیلنے والا۔

ہیں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے، دربار کیا۔ خیر، کرو، مجھ کو کیا؛ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی یہ آخر فروری ہے اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس داہنے ہاتھ کے زخم کے، سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں۔ اُٹھنا دشوار ہے۔ بہرحال سوار ہوا، گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا، بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی، وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سی عنایت! اخلاق سے اخلاق! وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔ حال عرض کیا گیا۔ فرمایا۔ خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔ اس پھوڑے کا بُرا ہو۔ انبالہ نہ جا سکا۔ آگرہ کیوں کر جاؤں؟ بابو ہرگوبند سنگھ سہائے کو سلام۔ مضمون واحد۔

غالب

۳۔ مئی (۱۸۶۳ء)

منشی نبی بخش حقیر



منشی نبی بخش حقیر کے والد کا نام حسین بخش تھا۔ وہ غالب کے ہم وطن یعنی اکبرآبادی تھے اور میرا خیال ہے کہ پہلے سے ان کے ساتھ میرزا کے تعلقات تھے یا کم از کم شناسائی ضرور ہوگی۔ حقیر علی گڑھ (کول) میں سررشتہ دار تھے۔ پختگی علم و عقل کے زمانے میں روابط بہت بڑھ گئے اور وہ غالباً ۱۸۴۷ء میں میرزا سے ملنے دہلی آئے اور انہی کے پاس ٹھہرے۔ ان کی سخن فہمی اور سخن سنجی کے متعلق میرزا نے تفتہ کو جو کچھ لکھا، اس سے ظاہر ہے کہ حقیر اپنے عہد کے ممتاز افراد میں سے تھے۔ میرزا لکھتے ہیں:

"میں حیران ہوں، اس فرزانۂ یگانہ (منشی نبی بخش حقیر) کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ میں شعر کہتا ہوں، شعر کہنا جانتا ہوں، لیکن جب تک اس بزرگوار کو نہیں دیکھا تھا، نہیں سمجھا تھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے؛ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں۔ آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا۔"

غالباً ۱۸۵۶ء میں حقیر نے پنشن لی۔ باقی وقت آگرہ میں گزارا اور ۱۸۶۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے عبداللطیف صحافی بھی جانتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ اور میرزا حاتم علی بیگ مہر سے بھی حقیر کے دوستانہ روابط تھے۔ اردوئے معلیٰ میں حقیر اور ان کے صاحبزادے عبداللطیف کے نام صرف تین خط ہیں، لیکن جو مجموعہ "نادراتِ غالب"

ا۔ نشاط تلمیذ غالب

کے نام سے شائع ہُوا ہے اس میں دونوں کے نام چوہتّر خط ہیں۔ حقیر شاعر بھی خاصے تھے، اگرچہ ان کا جو منتخب کلام تذکروں میں چھپا ہے، وہ چنداں بلند نہیں۔ ان کی سخن فہمی کے متعلق میرزا کا حُسنِ اعتقاد آخری دم تک قائم رہا۔ دُوسرے خطوں میں بھی اس بات کا ذکر آیا ہے اور میرزا خود بھی اپنی غزلیں انھیں بھیجتے رہتے تھے۔ بعض خطوں میں لکھتے ہیں:

حیف بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نہ رسد

کوئی وجہ نہیں حقیر کے منتخب کلام کی بناء پر ان کے فہمِ سخن یا معنی رسی کو محلِ نظر قرار دیا جائے یا میرزا غالبؔ کی پختہ رائے میں بے دلیل تضعیف کا پہلو پیدا کیا جائے۔ شعر گوئی کے لیے ذوقِ معنویّت کے علاوہ بھی کئی چیزیں درکار ہیں مثلاً مشق و ریاضت اور انہماک و اشتغال۔ جو فرد بسلسلۂ معاش شعر گوئی سے بے تعلق مشغلے میں مصروف ہو، ضروری نہیں کہ وہ دوسرے اوصاف بھی بقدرِ ضرورت پیدا کر لے۔

---

(۱)

بھائی،

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حال معلوم ہُوا۔ میاں کا غذ[1] مقبول و مطبوع۔ حق تعالیٰ ان کو زندہ و تندرست اور خوش و خرم رکھے اور دولت و اقبال عطا کرے۔ بالفعل جناب میرزا حاتم علی صاحب کا خط آیا۔ اُنھوں نے جو صُورت چھ کتابوں کی آرایش کی، جس تفریق سے ٹھہرائی ہے، وہ مجھ کو پسند آئی ہے۔ کل میں نے ان کو اجازت اسی طرح کی تزیین کی لکھ بھیجی ہے۔ حال تصحیح کا بہ تصریح آپ کو لکھ چکا ہُوں۔ اسی پر عمل رہے۔ میں نے میرزا تفتہ کو کہ وہ "غیاث اللغات" کے بہت معتقد ہیں، اس امر کی اطلاع کر دی ہے۔

بھائی جان، میں نے ایک قصیدہ جناب ملکۂ معظمۂ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔ ساٹھ شعر ہیں[2]۔ چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر دستنبو سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدے سے عزّت اور قصیدے کو کتاب کے سبب شہرت ہو جائے گی۔ کل جناب میرزا صاحب کو یہ خط لکھ چکا ہُوں۔ یقین ہے کہ وہ بھی آپ سے کہیں گے اور آپ، میرزا صاحب، میرزا تفتہ اور منشی شیو نرائن صاحب اس خواہش کو منظور اور اس قاعدے کو مقبول کریں گے اور جب باتفاق تم چاروں صاحب پسند کرو گے تو گویا باجلاس کونسل اس قانون کا اجرا منظور ہو جائے گا۔ امیدوار ہُوں کہ اجرائے قانون سے پہلے مجھ کو منظوری کی اطلاع ہو جائے تاکہ مسودہ اس قصیدے کا بھیج دُوں۔ مہتممِ مطبع کو اگر کچھ تامل ہو، تو ہو، ورنہ بات آسان ہے۔

منشی عبداللطیف کو دعا کہنا اور ان کے عذر کے مقبول ہونے کی ان کو اطلاع دینا۔ بیگم کو دعا پہنچے اور سب لڑکے بالوں کو۔ میاں باقر علی اور حسین علی تم کو بندگی اور اپنے بھائی بہنوں کو علی قدرِ مراتب بندگی، سلام، دعا کہتے ہیں۔

---

[1] یہ بھی "دستنبو" کے چھاپے کا ذکر ہے۔ [2] یعنی "شماریافت" "روزگاریافت" والا قصیدہ۔

ہاں حضرت، اب ایک امر مختصر کے واسطے جُداگانہ خط میرزا تفتہ کو کیا لکھوں؟ میری طرف سے دعا کہہ کر ان کو کہیے گا کہ اخبار گزشتہ کے اوراق مع خط مہتمم مطبع "آفتاب عالمتاب" حکیم صاحب[۱] کو پہنچ گئے۔ کل وہ چار روپے کی ہنڈوی اور ان کے خط کا جواب روانہ کریں گے۔ آپ چتر بھوج سہائے سے کہہ دیجیے گا اور تاکید کر دیجیے گا کہ چار نمبر سابق کا منتخب کاتب سے نقل کروا کر جلد بھیجیں۔

بھائی، مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور میرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آدھ آنہ ہے ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہوتا۔ جو باتیں جواب طلب ہیں ان کا جواب طلب ہے۔

چہارشنبہ ۲۲۔ ستمبر ۱۸۵۸ء — غالب

—(۲)—

بھائی،

میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ آج میرے پاس لکھنؤ کے ایک پارسل کی رسید آ گئی۔ دوسرا بھی یقینی پہنچ گیا ہو گا۔ خاطر جمع رکھو۔ جناب آرنلڈ صاحب بہادر[۲] آج تشریف لے گئے۔ سنتا ہوں کہ کلکتہ جائیں گے۔ میم اور بچوں کو ولایت بھیج کر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک ان کا شکر گزار رہوں گا۔ میرزا حاتم علی صاحب اگر آ جائیں تو ان کو میرا سلام کہنا۔ میرزا تفتہ کو اگر کبھی خط لکھو تو میری دُعا کہنا۔

دوشنبہ ہفتدہم جنوری ۱۸۵۹ء — غالب

منشی عبداللطیف صاحب

صاحب،

آگے تمہارا ایک خط، پھر بارہ کتابوں اور ایک جنتری کا پارسل پہنچا۔ بعد اس کے کل ایک خط اور آیا۔ ریڈ صاحب کے وہاں آنے کا حال معلوم ہوا۔ آج ۶۔ دسمبر کی ہے۔ ۷۔ کو بموجب تمہارے لکھنے کے وہ وہاں سے جانے والے ہیں اور مجھ کو معلوم ہے کہ میرٹھ آئیں گے۔ دو دن کے بعد بمقام میرٹھ خط روانہ کروں گا۔ خاطر جمع رکھو۔ وہ صاحب مُہر جیسا لکھیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ رہی تمہاری مُہر، اس کا کچھ خیال نہ کرو۔ وہ جس طرح تم نے لکھا ہے، بن جائے گی۔ مگر بھائی، ۱۸۵۸ء میں کے دن باقی رہے ہیں۔ آج ۶۔ دسمبر کی ہے۔ ۲۴، ۲۵ دن باقی رہے ہیں۔ ۱۸۵۹ء جنوری مہینے میں خدا چاہے تو کھد جائے گی

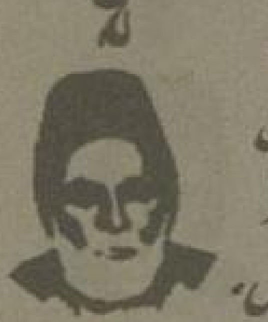
---

[۱] حکیم احسن اللہ خاں۔ [۲] دیکھیے مکتوب ۱۸ (موسومہ شیو نرائن آرام) کا حاشیہ۔

تم میرے بجائے فرزند ہو، میرے بھتیجے ہو، جو تمھارا کام ہو، بے تکلّف کہو۔ شرم کیا اور تکلّف کیوں؟ یہ مُہر کا کھُدنا کون سا کام ہے؟ میرزا حاتم علی صاحب ملیں تو میرا سلام کہنا اور میرزا تفتہ کو خط لکھو تو میری سفارش لکھنا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں اور خط نہیں لکھتے۔

۶۔ دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

مجروحؔ، سرفراز حسین اور میرنؔ



میر مہدی مجروحؔ میر حسین فگارؔ کے بیٹے ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ غالبؔ کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ ہنگامۂ "غدر" میں دہلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے تھے۔ پھر الور میں ملازم ہو گئے، لیکن بدقسمتی نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ آخری زمانے میں نواب حامد علی خاں مرحوم والی رام پور کی نوازش سے کسی قدر اطمینان کا سانس میسر آ گیا تھا۔ ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں ان کا دیوان "مظہر معانی" کے نام سے مرتب ہُوا تھا۔ اس کی جمع و ترتیب رفیق قدیم میر افضل علی عرف میرنؔ نے کی تھی، جیسا کہ "مظہر معانی" کے دیباچے اور خاتمے میں مذکور ہے۔ یہ دیوان چھپا ہُوا ملتا ہے۔ مجروحؔ کا انتقال ۱۱۔ صفر ۱۳۲۱ / ۱۵۔ مئی ۱۹۰۳ کو بروز جمعہ ہُوا۔ قدم شریف دہلی کے صدر دروازے سے باہر فصیل سے متصل ان کی قبر ہے، جس پر سعید الدین احمد خاں طالبؔ کا قطعہ تاریخ وفات کندہ ہے۔ "مظہر معانی" کے علاوہ دو رسالے نثر میں لکھے تھے۔ اول معجزات رسول اکرم صلعم بنام انوار الاعجاز دوم ہدیۃ الائمہ۔ "طلسم راز" کے نام سے ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا لیکن یہ چیزیں اب ناپید ہیں۔

میر سرفراز حسین میر مجروحؔ کے بھائی تھے۔ یہ بھی نوکری کرتے رہے۔ میرنؔ صاحب کا اصلی نام میر افضل علی تھا۔ میرزا نے انھیں غالباً اس وجہ سے "میرن" کہنا شروع کیا کہ لکھنؤ میں مجتہد العصر کے بھائی کا عرف "میرن" تھا اور میرزا نے جب سرفراز حسین کو مجتہد العصر کہا تو میر افضل علی کے لیے "میرن" مناسب معلوم ہُوا۔ یہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ غالبؔ نے ایک مرتبہ سرفراز حسین اور میر افضل علی کو ایک تعارفی مکتوب خان ساماں علی بخش خاں کے نام دے کر رام پور بھیجا تھا۔ لیکن یہ بیچارے بے نیل مرام واپس آئے۔ نواب یوسف علی خاں مرحوم کو اطلاع ملی تو انھوں نے اس بارے میں غالبؔ سے استفسار کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ ہیں اور میرن صاحب مرثیہ خواں۔ میں نے اسی غرض سے انھیں رام پور بھیجا تھا کہ محرم میں جہاں دس پانچ اور مرثیہ خواں مقرر ہوتے ہیں، میرن بھی مقرر ہو جائیں اور ریاست میں جہاں اور ملازم ہیں، وہاں سرفراز حسین جیسے ہوشیار اور کارگزار آدمی کو بھی نوکری مل جائے۔

یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک ہو جاتا تو بہتر تھا، نہ ہُوا، بہتر۔ درحقیقت سپارشِ نہ تھی معرّف ہونا تھا، سپارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا؟

مولانا عبدالحق نے لکھا ہے کہ میرن صاحب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ ایک شہزادے نے بیٹوں کی طرح پالا۔ گانے بجانے سے ان کی طبیعت کو بہت مناسبت تھی۔ اسی میں لگ گئے۔ وقت کے اچھے اچھے استادوں سے فیض حاصل کیا۔ چونکہ تھوڑا بہت مذہبی لگاؤ بھی تھا۔ سوزخوانی میں خوب کمال حاصل کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بھاگ کر

پانی پت پہنچے۔ پھر الور گئے۔ مہاراجا نے ان کی قدر فرمائی۔ جب مہاراجا کے اختیارات سلب ہو گئے تو الور چھوڑنا پڑا۔ کچھ مدت نواب پٹودی کی ملازمت میں گزاری پھر دلی آ گئے۔ نواب سعید الدین احمد خاں طالب جب تک زندہ رہے، ان سے سلوک کرتے رہے۔

حیدر آباد بھی گئے۔ نواب محسن الملک کے چچیرے بھائی سید علی حسن نے نواب وقار الامراء سے ملا دیا۔ جب تک نواب زندہ رہے ہر سال پانسو روپے میرن صاحب کو پہنچا دیتے تھے۔ مولانا کو ایک مرتبہ انھوں نے میرزا غالب کی یہ غزل گا کر سنائی تھی:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان کے ایک استاد بے پتا ہو گئے تھے۔ ان کی دو لڑکیاں بے یار و مددگار رہ گئیں۔ میرن صاحب نے انھیں بیٹیوں کی طرح پالا اور ایسی محبت و شفقت کی کہ وہ باپ کو بھی بھول گئیں۔ ان کی اپنی بھی ایک بیٹی تھی، جس کی شادی سید عبدالرؤف بیرسٹر سے ہوئی تھی۔

حلیہ یہ تھا: میانہ قد، سرخ و سفید رنگ، سفید ڈاڑھی، پوری تو نہیں کسی قدر چڑھی ہوئی، گول چہرہ، ہونٹ نہ موٹے نہ پتلے، پیشانی چوڑی۔ جوانی میں ضرور حسین ہوں گے۔

مولانا عبدالحق لکھتے ہیں: کسی مرید کو اپنے مرشد سے شاید ہی ایسی عقیدت ہو، جیسی میرن صاحب کو میرزا سے تھی۔ ایک بار حیدر آباد کے ایک وکیل کسی سے ذکر کر رہے تھے کہ میرزا غالب شراب پیتے تھے۔ میرن صاحب قریب کے کمرے میں کپڑے بدل رہے تھے۔ ان کے کان میں بھنک جا پڑی۔ ویسے ہی باہر نکل آئے۔ وکیل صاحب پر بہت بگڑے۔ ذرا ٹھنڈے ہوئے تو مولانا عبدالحق نے پوچھا: کیا میرزا کی عرق نوشی کا واقعہ غلط ہے؟ بولے:

یہ لوگ کیا جانیں؟ یونہی جو جی میں آیا، بک دیتے ہیں۔ پھر بیان کرنا شروع کیا کہ پاک صاف انگور سے بیں تھوڑی سی ڈالی جاتی، اس میں گلاب ملایا جاتا، اس پر صافی لپیٹ کر ادھر ہوا میں لٹکا دیا جاتا۔ رات کے وقت جب کوئی نہ آتا، صرف میں یا مجروح ہوتے، تو پیتے۔ اس کے بعد توبہ استغفار کرتے۔ غرض مے نوشی کا واقعہ ایسے انداز میں بیان کیا گویا میرزا آب کوثر پیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے میرزا کا کوئی شعر پڑھا۔ اس میں کوئی لفظ بدل گیا تھا۔ سن کر فرمانے لگے: میرزا صاحب کا شعر غلط نہ پڑھنا چاہیے۔ گناہ ہوتا ہے۔

ان کے دوستوں میں ایک صاحب نصیر الدین تھے، جنھیں غالب "شیخ نصیر الدین" "چراغ دہلی" کے نام کی مناسبت سے کبھی کبھی "چراغ دہلی" لکھتے تھے۔ یہ شاہ محمد عالم کی اولاد میں سے تھے جو مولانا فخر الدین فخر عالم کے خلیفہ تھے۔ ایک حکیم صاحب میر اشرف علی تھے، ان کا ذکر متعدد خطوں میں آیا ہے۔ میر سرفراز حسین کو غالب اکثر مجتہد العصر لکھتے تھے۔

(۱)

میاں،

آج یک شنبہ کا دن، ساتویں فروری (۱۸۵۸ء) کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی (۱۲۷۴ھ) کی ہے۔ دوپہر کے وقت شیخ مشرف علی، رہنے والے استاد حامد کے کوچہ کے، میرے پاس آئے اور انھوں نے تمھارا خط لکھا ہوا ۱۵ جمادی الثانی کا دیا۔ ڈاک کا خط ہرگز مجھ تک نہیں پہنچا اور نہ میں شہر سے کہیں گیا۔ جہاں رہتا تھا، وہیں ہوں۔ خدا جانے وہ خط مسترد کیوں ہوا؟ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تمھارا خط آوے اور میں پھیر دوں؟ تم خود کہتے ہو کہ اس پر یہ لکھا ہوا آیا کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں ہے۔ میں ہوتا اور یہ لکھتا کہ میں نہیں ہوں؟ آگرہ اور الور اور کول سے برابر خط چلے آتے ہیں۔

تمھاری والدہ کا مرنا سُن کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ خدا تم کو صبر دے اور اس عفیفہ کو بخشے۔ میرا حقیقی بھائی میرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔

کیسا پنسن اور کہاں اس کا ملنا! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں:

ہے موج زن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔ تم کہتے ہو کہ آیا چاہتا ہوں۔ اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا۔ میر احمد علی صاحب کو لکھتے ہو کہ یہاں ہیں۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ کہاں ہیں۔ مجھ سے ملتے تو اچھا کرتے۔ میں مخفی نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، حکام جانتے ہیں کہ یہاں ہے، مگر نہ باز پرس و گیرو دار میں آیا ہوں، نہ خود اپنی طرف سے قصد ملاقات کا کیا ہے۔ بایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہے۔

نثر کیا لکھوں اور نظم کیا کہوں گا۔ وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو، وہی دو چار ورق اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں[۱]۔ بھیجنا ممکن نہیں۔ جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا پاؤ گے تو دیکھ لو گے۔ میکش[۲] چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا، اب شہر میں آ گیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی اور لڑکے کو بہرام پور، میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔ میرن[۳] صاحب کی خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ مگر نہ معلوم ہوا کہ وہاں مع قبائل ہیں یا تنہا ہیں۔ اگر تنہا ہیں تو قبائل کہاں ہیں؟

تمھارے چھوٹے بھائی کو تو میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں ہیں اور اچھی طرح ہیں۔ بڑے بھائی کا حال کیوں نہ لکھا؟ یقین ہے کہ وہ اور تم یک جا ہو۔ گو ان کو ربط مجھ سے زیادہ نہیں لیکن فرزند ہونے میں تم اور وہ برابر ہو۔ خط بھیجنے میں تردّد نہ کرو اور ڈاک میں بے تامل بھیجا کرو۔ زیادہ، زیادہ۔

یک شنبہ ہفتم فروری ۱۸۵۸ء۔ وقت رسیدن نامہ — غالب

۱؎ یہ غالباً دستنبو کی طرف اشارہ ہے۔ ۲؎ میر احمد حسین میکش جنھیں بعد میں پھانسی ملی۔ ۳؎ یعنی میر افضل علی عرف میرن۔

(۲)

صاحب،

دو خط تمھارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دو پہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی آنکھوں والے، تشریف لائے۔ تمھارا خط دیا۔ صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا، فرمایا: "اشرف علی"۔ قومیت کا استفسار ہوا۔ معلوم ہوا، سیّد ہیں۔ پیشہ پوچھا۔ حکیم نکلے۔ یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔

کتنے اچھے ہو۔ "مصطلحات الشعراء"، "مصطلحات الشعراء" بھائی وہ کتاب تمھاری ہے۔ میں نے غصب نہیں کی، میرے پاس مستعار ہے۔ دیکھ چکوں گا، بھیج دوں گا۔ تقاضا کیوں کرو؛ میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں۔ جلدی نہ کرو۔ دیر آید درست آید۔ سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعائیں۔

غالب

صبح چہار شنبہ ہفتم رمضان (سنہ ۱۲۷۴ھ)
بستم اپریل (سنہ ۱۸۵۸ء)[1]

(۳)

کیوں یار، کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ تمھارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

کلّو کو مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ آپ کہیں جائیے گا نہیں۔ میں آتا ہوں۔ بھلا بھائی، اچھی حکمت کی۔ کیا وہ میرے باپ کے نوکر تھے کہ میں ان کو بلاتا؟ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ تکلیف نہ کریں، میں حاضر ہوتا ہوں۔ دو گھڑی کے بعد وہ آئے۔ ادھر کی بات، ادھر کی بات۔ کوئی انگریزی کاغذ دکھایا، کوئی فارسی خط پڑھوایا۔ "اجی۔ کیوں حضرت! آپ میرن صاحب کو نہیں بلاتے؟" صاحب، میں تو ان کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ اور ایک مقام کا ان کو پتا لکھا ہے کہ وہاں ٹھہر کر مجھ کو اطلاع کرو، میں شہر میں بلا لوں گا۔" صاحب، اب ضرور آجائیں گے۔" آخر کار ان سے اجازت لے کر اب تم کو لکھتا ہوں کہ ان سے مختصر یہ کہہ دو کہ "بھائی یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو، تو باسی عید یہاں کرو۔



---

[1] اس تاریخ میں دو غلطیاں تھیں جن کی تصریح ضروری ہے۔ مطبوعہ نسخوں میں مرقوم ہے ہفتم رمضان (۱۲۷۵ھ) ہشتم مارچ (سنہ ۱۸۵۹ء) میرے اندازے کے مطابق ان میں سے ایک غلطی خود غالب سے سرزد ہوئی اور دوسری کاتب یا ناقل سے۔ ۷۔ رمضان سنہ ۱۲۷۵ھ کو دن یقیناً چہار شنبہ تھا۔ غالب نے اس کے ساتھ انگریزی تاریخ "بستم" لکھی تھی۔ کاتب یا ناقل نے اسے ہشتم بنا دیا۔ مہینا مارچ کا نہیں، اپریل کا ہونا چاہیے تھا۔ یہ غلطی غالباً خود غالب سے ہوئی۔ میں نے دونوں غلطیوں کی تصحیح کر دی ہے۔

میرا حال سُنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آئندہ خدا رازق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو، تو پھر کیا غم ہے؟

میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا اور شفیع احمد صاحب کو اور میر احمد علی صاحب کو سلام کہنا۔ میرن صاحب کو نہ سلام نہ دُعا۔ یہ خط پڑھا دو اور ادھر کو روانہ کرو۔

کیا خوب بات یاد آئی ہے۔ کیوں وہ شہر سے باہر ٹھہریں اور کیوں کسی کو بلانے کی راہ دیکھیں؛ شکرم ہیں، کرانچی ہیں، چوپہتے ہیں یعنی ڈاک میں آئیں۔ بلی ماروں کے محلے میں میرے مکان پر اتر پڑیں۔ مرزا قربان علی بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں۔ میرے ان کے مسکن میں ایک میر خیراتی کی حویلی درمیان ہے۔ ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا۔ یہ صلاح تو ایسی ہے کہ اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو بھی عید یہیں کریں۔

(مئی ۱۸۵۸ء) غالب

(۴)

خوبی دین و دنیا روزی باد۔ میر اشرف علی نے تمھارا خط دیا۔ وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا، صاحب قصور تمھارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلّی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ ہم تخلّص بہم پہنچایا۔ فقط

پنسن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اُس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کے دن ساتویں اگست کی مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بُلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں یا صرف آیندہ کو مقرر ہوتی ہے۔

غلام فخر الدین[1] خاں کی دو ایک روبکاریاں ہوئی ہیں۔ صورت اچھی ہے۔ خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔

صاحب ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی[2] کو تمام کیا، دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آیندہ لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرہ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تا کہ میں اس سے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔ ہاں صاحب میر اشرف علی صاحب بھی یہی فرماتے تھے کہ میر سرفراز حسین پانی پت آیا چاہتے ہیں۔ اگر آ جائیں تو مجھ کو اطلاع کرنا۔

۸۔ اگست ۱۸۵۸ء غالب

---

[1] میرزا علی بخش خاں (غالب کے نسبتی بھائی) کے فرزند اور میرزا کی بھتیجی (یوسف خاں کی بیٹی) کے خاوند۔ [2] "دستنبو"۔

(۵)

میاں،

تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنسن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنسن جاری ہو تو میں تم کو اطلاع نہ دوں؟ ابھی تک کچھ حکم نہیں۔ دیکھوں، کیا حکم ہو اور کب ہو؟ میرن صاحب جے پور پہنچے؟ تم شاہ پور ہی بتاتے ہو۔ شاید سچ یہی ہو۔ ہاں میر محمود علی اور یہ ، بیر بر اور ابوالفضل تو تھے، مگر دیکھا چاہیے درخت جگہ سے اکھڑ کر بدشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں۔ سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے؟ سُنی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا۔ میر سرفراز حسین کو دعا، میر نصیر الدین کو پہلے بندگی، پھر دعا۔ کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا۔ آگرہ میں چھاپی جاتی ہے۔ تم سے تمھارے ہاتھ کے اوراق لکھے لوں گا۔ تب ایک کتاب تم کو دوں گا۔

روز ورود نامہ۔ پنجشنبہ ۷۔ ستمبر ۱۸۵۸ء — از غالب

(۶)

سید صاحب،

تمھارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی، جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو دیے۔ ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں۔ ڈھائی سو کیسے ہیں سبحان اللہ۔ باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے، آبرو بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ الور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔ پنسن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم، خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملے میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا، کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہرحال اتنا سُنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنسن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم، نہ کسی کو خبر۔

میاں، کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقۂ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ اُنھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اُس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمّہ لیا۔ مسوّدہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنہ فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرہ کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرما چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر

میں قصہ تمام ہو جائے۔ بھائی، میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں ملی، بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے مسودہ ان کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟ اہلِ خطہ کا حال ازروے تفصیل مجھ کو کیونکر معلوم ہو؟ سنتا ہوں کہ دعوی خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سو وا ہو گیا، مسودہ ہو رہا ہے۔ بلیک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے۔ گورنر مدعی نہ ہوے، قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ سرِ رہ از جورہ پا چہ خالی
درکیشِ روزگاراں گُل خوں بہا نہ دارد

خیر جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ بعد وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو؟

اکتوبر ۱۸۵۹ء

(۷)

بھائی،

ایک خط تمھارا پہلے پہنچا اور ایک خط کل آیا۔ پہلے خط میں کوئی امر جواب طلب نہ تھا، اگرچہ کل کے خط میں بھی صرف کتابوں کی رسید تھی، لیکن چونکہ دو امر لکھنے کے لائق تھے، اس واسطے ایک لفافہ تمھاری پسند کا تمھاری نذر کرنا پڑا۔ پہلا امر یہ ہے کہ آج نصیر الدین دوپہر کو میرے پاس آئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تم نے بھی خط میں لکھا تھا کہ میر سرفراز حسین الور گئے تھے اور میر نصیر الدین بھی کہتے تھے کہ میں اور وہ ایک دن پانی پت سے چلے۔ وہ اُدھر گئے، میں ادھر آیا۔ ظاہرا پارسل کے پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہوے ہیں۔ اُن کی کتاب رہ گئی۔ اب ان تک کیوں کر پہنچے گی؟ خدا خیر کرے۔

میاں لڑکے، سنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ اس واسطے میر نصیر الدین کو پہلے بندگی لکھتا ہوں اور پھر تمھارے علاقے سے دُعا۔ صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں:

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

یہ جواب ہے تمھارے اس سوال کا کہ جو پہلے خط میں تم نے لکھا تھا۔ اب کے خط میں تم نے میرن صاحب کی خیر و عافیت کیوں نہ لکھی؟ یہ بات اچھی نہیں۔ میں تو ڈر گیا کہ اگر تمھارے خط میں ان کو دعا سلام لکھوں گا تو ان سے تم کا ہے کو کہو گے۔ پیرزادہ صاحب یعنی میر نصیر الدین نے اُن کی بندگی مجھ سے کہی ہے۔ خدا کے واسطے میری دعا اُن سے کہہ دینا۔

(۸)

واہ وا سید صاحب، تم بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، نثر میں خودنمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے

خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں جو سخن پردازی کروں۔ بھائی تم اُردو کے میرزا قتیل بن گئے ہو۔ اُردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل، کیا رودِ نیل۔ یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سنو، اب تمھاری دلّی کی باتیں ہیں۔

چوک[1] میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلّی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام، کچھ نہیں۔ پنسن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، میرزا قیصر، میرزا جواں بخت کے سالے میرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے۔ بادشاہ، میرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے کیپ[2] میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے ازروئے قیاس، جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنسن داروں کی جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲۔ دسمبر کی ہے۔ اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو۔ اب کیا صورت ہے اور آیندہ عزیمت کیا ہے؟ اشرف علی صاحب آپ تو دائر و سائر تھے۔ پانی پت میں مقیم کیوں ہو گئے؟ کچھ لکھیے تو جانوں۔ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاقِ دیدار۔ "میرن صاحب کہاں ہے؟ کوئی جائے اور بلا لائے"۔ حضرت آئے "سلام علیکم"، "مزاج مبارک، کہیے، مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز علی کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں؟ میں کہیں، تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں کر سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جب ایک جا ہوں گے، انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیوں کر ایک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔ اللہ، اللہ، اللہ!

بدھ ۲۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

غالبؔ



(۹)

سیّد صاحب،

نہ تم مجرم، نہ میں گنہ گار۔ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتہ کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے

---

[1] چاندنی چوک [2] کیپ سے مراد بظاہر جنوبی افریقہ ہے (کیپ ٹاؤن)۔ ممکن ہے بادشاہ کو جنوبی افریقہ بھیجنے کی تجویز بھی ہو۔

نواں دن ہے[1] انتظار میں تھا کہ تمھارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمھارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا: بھائی، تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیلے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل برون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے[2]۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان و کان[3] کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھادو اور آیندہ کی ممانعت کا حکم سُنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے، دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نورچشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے جو وہ چاہیں قبول کریں۔

غالب

(بدھ ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

---

[1] گویا ۲۲۔ جنوری کو گئے ۲۵ کو واپس آئے۔ [2] اسی صاحب کے متعلق وہ لطیفہ مشہور ہے کہ غدر کے بعد میرزا سامنے آئے تو اس نے پوچھا، ول ٹم مسلمان؟ میرزا نے کہا: آدھا۔ کرنل نے کہا: اس کا مطلب؟ میرزا نے کہا: شراب پیتا ہوں، سوٗر نہیں کھاتا۔ دیا لگا) حقیقتہً لطیفہ ایک سارجنٹ سے متعلق جیسا کہ آگے چل کر خود میرزا کی تحریر سے معلوم ہوگا۔

[3] یہ مکان کا تابع مہمل ہے نہ کہ دُکان۔

(۱۰)

میاں،

کیوں تعجب کرتے ہو یوسف میرزا کے خطوط نہ آنے سے؟ وہ وہاں اچھی طرح ہے۔ حاکموں کے ہاں آنا جانا، نوکری کی تلاش۔ حسین میرزا صاحب بھی وہیں ہیں۔ وہاں کے حکام سے ملتے ہیں۔ وہاں پنسن کی درخواست کر رہے ہیں۔ ان دونوں صاحبوں کے ہر ہفتے میں ایک دو خط مجھ کو آتے ہیں، جواب بھیجتا ہوں۔

بھائی، لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن و امان ہوگا، نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا۔ امرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں، بقدر رُتبہ تعظیم و توقیر، پنسن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

اور ایک نقل سُنو۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں، اہل اسلام نہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دِلّی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے، جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ مَیں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے: "ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ"۔ مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھیے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔

یہ کیفیت عموماً شہر کی ہے۔ خصوصاً میرا حال سنو: بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کا حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنسن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آیندہ کو پنسن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہروں گا۔ چھ مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے کا۔

میرن صاحب جو بلائے گئے ہیں، اس طلب کے جواب میں یہی کیوں نہیں لکھتے کہ ٹکٹ میرے نام کا حاصل کر کے بھیج دو تو میں آؤں؟ دیکھو اب دس پانچ دن میں سب حال کھلا جاتا ہے۔ میر سرفراز حسین کو دعا اور میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا اور میرن صاحب کو مبارکباد کہنا۔

(فروری ۱۸۵۹ء) غالب

(۱۱)

میری جان،

خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہونے کو آیا۔ ڈاڑھی میں بال سفید آ گئے، مگر بات سمجھنی نہ آئی۔ پنسن کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بے جا اُلجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دِلّی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینا ہے۔ چند اشخاص کو بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے

روپے کے باب میں اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہُوا۔ تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعے سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں؟ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے؛

چیل بسولا لے گئی تو کانہے سے پھٹکوں راب؟

علی بخش خاں[۱] پچاس روپیہ مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں ان کو چھ سو روپیے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں، سو روپیہ مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپیے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو روپیے ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیے مہینا، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں، اس کو اٹھارہ سو روپیے ملے۔ مناجا عنہ اردس روپیہ مہینا کا سکہ لمبر۔ سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مددِ خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مددِ خرچ سو روپیے مل جائیں۔ میں نے وہ سو روپیے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں سال بھر کے ساڑھے سات سو روپیے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپیے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب[۲] بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دِلّی کے حمقا، جو باہر پڑے ہُوے ہیں، مُنہ کھول کر رہ گئے۔ اب وہ جب معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

غالب

(فروری ۱۸۵۹ء)

(۱۲)

میری جان، سُنو داستان: صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بُلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہُوئی۔ کُرسی دی۔ بعد پُرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب[۳]، حاکم اکبر

۱؎ علی بخش خاں، میرزا غالب کے برادرِ نسبتی۔ ۲؎ فلپ ہنری ایجرٹن آئی سی ایس (۱۸۲۴ء۔ ۱۸۹۳ء)، ۱۸۴۲ء میں ہندوستان آیا۔ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۹ء تک دہلی میں مجسٹریٹ کلکٹر رہا۔ ایامِ "غدر" میں رخصت پر تھا۔ بعدازاں امرتسر اور راولپنڈی میں کمشنر رہا۔ ۳؎ میکلوڈ (۱۸۱۰ء۔ ۱۸۷۲ء) مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۸۴۹ء میں جالندھر کا کمشنر بنا۔ "غدر" کے دنوں میں لاہور میں تھا۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک لفٹنٹ گورنر رہا۔ سندھ، پنجاب اور دہلی ریلوے کا چیئرمین تھا۔ کہتے ہیں عوام کا ہمدرد تھا۔ پنجاب یونیورسٹی اسی کے زمانے میں قائم ہُوئی۔ ۱۸۷۲ء میں لندن کی زمین دوز ریلوے کے حادثے میں مضروب ہُوا۔ اسی صدمے سے وفات پائی۔

صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمھارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کرکے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوادیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ "کل حاضر کروں گا"۔ پھر پنسن کا حال پُوچھا، وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

دیکھو، میر مہدی، حاکم پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل بہادر ہُوا ہے۔ یہ صورت مقدمۂ فتح و فیروزی ہے۔ غرضکہ دوسرے دن یک شنبہ یوم تعطیل تھا، میں اپنے گھر آیا۔ دوشنبہ ۲۸۔ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا اچھا توقف کرو۔ بعد تھوڑی دیر کے گڈھ کپتان[1] کی چِٹھی آئی۔ سواری مانگی۔ جب سواری آگئی، باہر نکلے۔ میں نے کہا: وہ کتابیں حاضر ہیں۔ کہا: منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ ادھر سوار ہو گئے میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات[2] اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا، وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا۔ وہ دے کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ "بہت اچھا" کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمھاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر کو کچھ لکھا ہے، تم اُن سے ملو۔ عرض کیا بہتر۔ اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا، گئے ہُوئے تھے۔ کل وہ آئے۔ آج میں نے ان کو خط لکھا ہے۔ جیسا کہ وہ حکم دیں گے، اُس کے موافق کروں گا۔ جب بلائیں، تب جاؤں گا۔ دیکھو سیّد اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمے سے کہ وہ آج سلطنت کا دھندہ ہے، میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزّت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہُوا تھا، میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟ میر سرفراز حسین کو یہ خط پڑھوا دینا اور ان کو اور نصیر الدین "چراغ دہلی" کو اور میرن صاحب کو دعا کہنا۔

(۵ مارچ ۱۸۵۹ء)

—— (۱۳) ——

میر مہدی!

جیتے رہو آفرین، صد ہزار آفرین۔ اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سُنو، دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پتی، انصاریوں کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔[3] مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔

---

[1] قلعے کا افسر اور نگران [2] منشی مہیش پرشاد کے یہاں لفظ "استنباط" ہے جس کا کوئی مفہوم یہاں درست نہیں بیٹھتا۔ "انبساط" ہوسکتی ہے۔ "التفات" کی بھی ایک روایت ہے۔ [3] اس سے مراد میر مہدی ہیں جو غدر کے زمانے میں دہلی سے نکل کر پانی پت چلے گئے تھے اور انصاریوں کے محلّے میں رہتے تھے۔ یہ تصریح خود خواجہ حالی نے کی جن کی طرف پانی پت اور انصاریوں کے محلّے کی بنا پر لوگوں کا خیال گیا تھا۔

میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کما ہو حقہٗ سمجھ لو۔ والرحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنسن کے چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر، ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل بطرز مناسب ہوگی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپیہ کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانہ سے منگوا لو۔ میں نے کہا، صاحب، یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا۔ اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر نہ آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔ آج دو شنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگاؤں، پر یار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے، مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب بھی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھیے حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔ اس وقت تمھارا ایک خط اور یوسف میرزا کا ایک خط آیا۔ مجھے باتیں کرنے کا مزا آتا، دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میر سرفراز حسین، میرن صاحب، میر نصیر الدین کو دعا۔

از غالب

(۷۔ مارچ ۱۸۵۹ء)
یکم شعبان ۱۲۷۵ھ

(۱۴)

سید،

خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے۔ ایک غریب سید مظلوم[۱] کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے، تم کو سرمایۂ آرایش گفتار بہم پہنچا ہے۔ میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی، یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷۔ مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام

۱؎ مراد ہے میرن صاحب۔

الہ آباد سے سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنسن کے ملنے کا حکم بھی آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور خط دکھا دینا۔

(۲۷۔ مارچ ۱۸۵۹ء)

(۱۵)

مار ڈالا یار، تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم، دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

یاد رہے۔ یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

"کل سے مجھ کو میکش[1] بہت یاد آتا ہے"۔ سو صاحب، اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو، اور تو کچھ بن نہیں آتی۔ مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی، یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہرحال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو، کیا لکھتا ہوں۔

سنو، پنسن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال معلوم نہیں۔ دیر آید درست آید۔

بھئی، میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت۔ بلکہ اس طرح سے لکھا گیا ہے گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے، جیسے آگے تھے۔ اُچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کر رہے ہے، کیا غضب ہوا، یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہو گا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں:

کیوں نہ "میرن" کو مغتنم جانیں؟ دِلّی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یہ ہے:

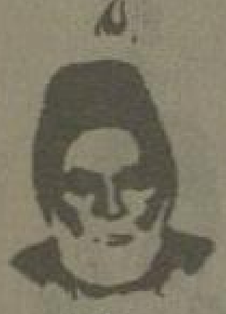
میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں؟ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

"میر" کی جگہ "میرن" اور "رہا" کی جگہ "بچا" کیا اچھا تصرف ہے!

ارے میاں، تم نے کچھ اور بھی سنا؟ کل یوسف میرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان

---

[1] میرا خیال ہے یہ فقرہ میر مجروح نے میرزا کو لکھا تھا۔ میرزا اسے نقل کر کے لکھتے ہیں کہ جب تمھیں ان بچھڑے ہوئے دوستوں کی صحبتیں اور تقریریں یاد آتی ہیں تو مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔



والدان کا دائم الحبس ہوگیا۔ حیران ہُوں کہ یہ کیسی آفت آئی۔ یوسف میرزا تو جھوٹ کا ہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اس نے جھوٹ سُنا ہو۔

لو بھئی، اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہے جاؤ اپنے گھر، میں تو روٹی کھانے جاتا ہُوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں، جس کا روزمرہ ہے "کھلونے منگا دو، میں بجار (بازار) جاؤں گا۔" میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور یہ خط ان کو ضرور سُنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو دُعا پہنچے۔

(اپریل ۱۸۵۹ء) غالب

—(۱۶)—

برخوردار کامگار میر مہدی،

قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ مچ میرا حُلیہ ہے۔ واہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں بھیجنے کے واسطے لکھا، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان چلو کھانا تیار ہے، ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے ہُوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا کر، سرنامہ لکھ کر، کلیان کے حوالے کر، میں گھر چلا گیا اور وہاں ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو وہی ہُوا۔ تم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ لو، اب بتاؤ خط لکھنے بیٹھا ہُوں، کیا لکھوں؟ یہاں کا حال زبانی میرن صاحب کے سُن لیا ہوگا۔ مگر وہ جو تم نے سُنا ہوگا، بے اصل باتیں ہیں۔ پنسن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیش نظر، یہاں کے حاکم نے ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی، میرا اس میں کیا ضرر۔

یہاں تک لکھ چکا کہ دو آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا، باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہُوئی۔ چراغ روشن ہُوا۔ منشی سیّد احمد حسین سرہانے کے طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہُوا ہُوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمانِ علم و یقین سیّد نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اس کے سر پر ٹوکرا، اس پر گھاس ہری بچھی ہُوئی۔ میں نے کہا آہا ہا! سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہُوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اور ہے۔ فیض خاص نہیں، لطف عام ہے۔ شراب نہیں، آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے، بلکہ نعم البدل ہے[1]۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا، بادۂ انگوری سے بھرا ہُوا۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے، پندرہ بگڑ گئے، بلکہ سڑ گئے۔ تا اُن کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا، بھائی، یہ کیا کم ہیں۔ اگرچہ تمھاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہُوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں ہے جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد، دولت زیادہ۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ پہلے شراب بھیجی تھی، اب آم بھیجے۔

لیکور[1] ایک انگریزی شراب ہوتی ہے، قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی، جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو، اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے۔ ہاں فرہنگ سروری میں ہو تو ہو۔

"مجتہد العصر"[2] اور حکیم میر اشرف علی کو کہ وہ ان کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں، میری دعا کہہ دینا۔

غالب

(۱۸۵۹ء)

(۱۷)

بھائی،

تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جو ماجرا سُنا تھا، وہ البتہ موجب تشویش تھا۔ تمھاری تحریر سے وہ تشویش رفع ہو گئی۔ پھر تم کیوں ہائے، واویلا کرتے ہو؟ اوپر کا حاکم موافق ہے۔ ماتحت کا حاکم جو مخالف تھا، سو گیا۔ پھر کیا قصہ ہے؟

"قاطع برہان" کے سب مسودے میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اس کی صورت بدلتی گئی۔ وہ تحریر بالکل مغشوش ہو گئی۔ ہاں اس کی نقلیں صاف کہ جن میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کر لی ہیں۔ ایک میرے واسطے، ایک عالی جاہ ضیاء الدین خاں کے واسطے۔ میری ملک کی جو کتاب ہے اس کی جلد بندھ جائے تو بطریق مستعار بھیج دوں گا۔ تم اس کی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھیر دینا اور یہ امر بعد محرم واقع ہو گا۔ مگر یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے، صرف "برہان قاطع" کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی، وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو۔ دوسرے فنِ لغت کو جانتا ہو۔ تیسرے فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو۔ اساتذۂ سلف کا کلام بھی بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو۔ چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔ پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔"

"فہمائش" کا لفظ میاں بدھا ولد میاں جما اور لالہ گنیش داس ولد لالہ بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے۔ میری زبان سے کبھی تم نے سُنا ہے؟ اب تفصیل سُنو: امر کے صیغے کے آگے شین آتا ہے، تو وہ امر معنی مصدری دیتا ہے اور اس کو "حاصل بالمصدر" کہتے ہیں۔ "سوختن" مصدر، "سوزد" مضارع، "سوز" امر، "سوزش" حاصل مصدر، اسی طرح: خواہش و کاہش و گزارش و گدازش و آرایش و پیرایش و فرمایش۔ "فہمیدن" فارسی الاصل نہیں ہے، مصدر جعلی ہے۔ فہم لفظ عربی الاصل ہے۔ طلب لفظ عربی الاصل ہے کہ ان کو موافق قاعدۂ تفریس "فہمیدن"، "طلبیدن" کر لیا ہے اور اس قاعدہ میں یہ کلیہ ہے کہ لغت اصل عربی آخر کو امر بن جاتا ہے: "فہم"، یعنی "بفہم"، یعنی "سمجھ"، "طلب" یعنی "بطلب"، یعنی "مانگ"۔ "فہمد" مضارع بنا، "طلبد" مضارع بنا۔ خیر یہ فرض کیجیے کہ جب ہم نے مصدر اور

۱؎ (LIQUEUR) ۲؎ معلوم نہیں ان سے کون مراد ہے۔

مضارع اور امر بنایا تو اب حاصل بالمصدر کیوں نہ بنائیں؟ سنو حاصل بالمصدر "فہمش" اور "طلبش" ہونا چاہیے۔ "فہم" تنہا صیغہ امر "فہمد" سے نکلا تھا۔ "الف" اور "ے" کہاں سے لایا؟ "فہمائی" تو نہیں ہے، جو "فہمایش" درست ہو۔ کہیں "فرمایش" کو اس کا نظیر گمان نہ کرنا۔ وہ مصدر اصلی فارسی "فرمودن" ہے۔ "فرماید" مضارع، "فرمائے" امر، حاصل مصدر "فرمائش"۔ زیادہ، نہ زیادہ ۱۲!

پہلے حکیم میر اشرف علی کو دعا اور بیٹیا ہونے کی مبارکباد۔ میاں، میں نے رات عالم سرخوشی میں تاریخی نام کا خیال کیا: "میر کاظم دین" بارہ سو پچھتر ہوتے ہیں، لیکن یہ اسم بھی مانند لفظ "فہمایش" ٹکسال سے باہر ہے۔

[جولائی ۱۸۵۹ء] غالب

—(۱۸)—

میری جان،

تم کو تو بیکاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے، اگر خط پہنچا ہے، تو جواب، ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔ حکیم اشرف علی آئے تھے۔ سر منڈوا ڈالا ہے۔ "محلقین رؤسکم"[1] پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے لگے: "دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم"۔ واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ میر احمد علی صاحب آ گئے اور بحال و برقرار رہے۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی اچھی خبر سنی جائے۔ میرا سلام کہنا اور مبارکباد دینا۔ بھول نہ جائیو۔

تمھاری شکایت ہائے بیجا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی، میں نے یہ تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط آئے گا تو میں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ ۱۵۔ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں۔ تبرید پی کر بیٹھا ہوں کہ تمھارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بیمار ہے۔ ایاز کو خط دے کر ڈاک گھر روانہ کیا۔ بولو، تمھارا گلہ بے جا یا بجا؟ بھائی گلہ کرو تو اپنے سے کرو کہ تم نے کرنال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی؟ اور ہاں یہ کیا سبب ہے کہ بہت دن سے میر نصیر الدین کا نام تمھارے قلم سے نہیں نکلتا؟ ان کی بندگی نہ لکھتے تو خیر و عافیت تو لکھتے۔ یہ باتیں اچھی نہیں۔ میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں۔ تنہا تمھارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ ان کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چند روز کے یہاں آ جائیں گے؟ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں: میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کے بود و باش کی حقیقت لکھو۔ رہا میرا پنسن، اس کا ذکر نہ کرو۔ اگر ملے گا تو تم کو اطلاع دے دی جائے گی۔ شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرایے کو مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔ آیندہ کیا ہوگا۔

سلطان العلما مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو، اگرچہ نظر ان کے مدارج علم و عمل پر، بندگی چاہیے، مگر خیر میں

---

[1] حلق راس کے معنی ہے سر منڈانا۔ یہ قرآن مجید کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔

عزیزداری و یگانگی کی راہ سے دُعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دُعا اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

[۱۵۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء]   از غالب

(۱۹)

بھائی!

نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے، اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ اور ٹکٹ منگالوں گا۔ شنبہ ۸۔ نومبر صبح کا وقت ہے، جس کو عوام بڑی فجر کہتے ہیں۔ پرسوں تمھارا خط آیا تھا، آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں، اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

برخوردار میر نصیر الدین پیران کی بیٹی کا قدم مبارک ہو۔ نام تاریخی تو مجھ سے ڈھونڈا نہ جائے گا، ہاں عظیم النسا بیگم نام اچھا ہے کہ اس میں ایک رعایت ہے۔ شاہ محمد عظیم صاحب رحمۃ اللہ کے نام کی۔ مجتہد العصر[۱] کو میری دُعا کہنا۔ تم کو کیا ہُوا ہے کہ ان کو اپنا چھوٹا بھائی جان کر مجتہد العصر نہیں لکھا کرتے؟ یہ بے ادبی اچھی نہیں۔ میرن صاحب کو بہت بہت دُعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔

شہر کا حال کیا جانوں کیا ہے؟ "پون ٹوٹی[۲]" کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا[۳] فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔ حاکم اکبر کی آمد آمد سن رہے ہیں۔ دیکھیے دلّی آئیں یا نہیں؟ آئیں تو دربار کریں یا نہیں؟ دربار کریں تو میں گنہگار بلایا جاؤں یا نہیں؟ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں؟ ہنّوز نام نہ کہیں ذکر ہے، نہ کسی کو خبر ہے۔

سہ شنبہ ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء   غالب

(۲۰)

میری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانا۔ صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟ کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں[۴] کی پرورش میں کرتا ہوں؟ استغفر اللہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔ یا تم سمجھتے ہو کہ میں شیخ چلّی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مُرغی مول لوں گا اور اس کے انڈے بچے بیچ کر

---

[۱] میر سرفراز حسین [۲] ٹون ڈیوٹی یعنی چنگی۔ [۳] مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم کی قائم کی ہوئی درس گاہ، جس میں ادب، حکمت اور علوم دین کی تعلیم ہوتی تھی اور تمام طلبہ کا کھانا اور لباس اور کتابیں درس گاہ کی طرف سے ملتی تھیں۔ [۴] باقر علی خاں اور حسین علی خاں، فرزندان عارف۔

ذیعی عرید کروں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہو گا ؟ بھائی، یہ تو میں نے اپنا رازِ دل تم سے کہا تھا کہ آرزو یوں ہی تھی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا، نہ خواہش کا۔

دیکھا، اس پنسن قدیم کا حال ؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ لیکن جب تک جواب نہ پاؤں، کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں ؟ حاکمِ اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے، دیکھیے کب آئے ؟ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے ؟ خلعت ملے یا نہ ملے ؟ اس پیچ میں ایک اور پیچ آ پڑا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر اسی کا انتظار نہیں، اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنسن کے ملنے نہ ملنے کا تردد بدستور رہے گا۔ سبک سر کیوں کر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں ؟ پنسن جاری ہوئے پر بھی تو سوا رام پور کے ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثباتِ قدم اختیار کیا، اب انجامِ کار میں اضطراب کی کیا وجہ ؟ بےچکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے، ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب، میرن صاحب نے دو سطریں دستخطِ خاص سے لکھی تھیں۔ واللہ میں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمے کا ذکر ہے۔

غالب

(۲۱)

بھائی،

کیا پوچھتے ہو ؟ کیا لکھوں ؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں ؟ ہاں کوئی شہر قلمروِ ہند میں اس نام کا تھا۔[۱]

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵۔ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار[۲] تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو، چار معدوم محض ہیں[۳]۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحتِ حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں[۴] کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس۔ دربارِ عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلّی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

---

[۱] مراد یہ ہے کہ دلّی کی رونق ان ہنگاموں پر موقوف تھی۔ وہ ہنگامے نہ رہے تو رونق بھی نہ رہی [۲] یہ دہلی کے آس پاس سات ریاستیں تھیں، جنھیں ہفت گانہ کہتے تھے۔ نام غالب نے خود بتا دیے ہیں۔ [۳] یعنی جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور فرخ نگر۔ یہ ریاستیں غدر میں مٹ گئیں۔ [۴] دوجانہ و لوہارو۔

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم الملک اشرف علی کو دُعا، قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔

۶۔ جمادی الاولیٰ، صبح جمعہ (۱۲۷۶ھ) — از غالب

۲۔ دسمبر، سال حال (۱۸۵۹ء)

—— (۲۲) ——

بے مے نہ کند در کف من خامہ روائی

سرد است ہوا، آتشِ بے دود! کجائی؟

میر مہدی صاحب، صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ آتش سیال[1] کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

میاں تم پنسن پنسن کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں؛ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنسن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو گا تم کو لکھا جائے گا۔

اجی وہ یوسفِ ہند نہ سہی، یوسفِ دہر سہی، یوسفِ عصر سہی، یوسف ہفت کشور سہی، ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے کہ میں ساڑھے سات روپے مہینا بھیجے جاؤں گا اب اس کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں۔ خرچ جلد بھیجو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہر حال میرن صاحب کو یہ پڑھوا دینا۔ میر سرفراز حسین کو دُعا۔ حکیم میر اشرف علی کو دُعا۔ یوسف ہفت کشور کو دُعا۔

سہ شنبہ ۱۳۔ دسمبر ۱۸۵۹ء — از غالب

—— (۲۳) ——

میاں لڑکے!

کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو۔ دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلی کے علاقے کے جاگیردار، بموجب حکم

---

[1] بہنے والی آگ، یعنی شراب۔

کمشنر دہلی میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرضکہ پنجشنبہ ۲۹۔ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہُوئے۔ اُسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے مِلا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں، یہ جواب سُن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔ ہر چند پنسن کے باب میں ہنوز لا و نعم نہیں، مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں ممکن۔ تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی، دیکھیے کیا صورت پیش آئے گی۔

مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرایے پر ملی ہے، ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یک شنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے، پہر دن چڑھا ہے کہ یہ خط تم کو لکھا ہے۔ اگر مناسب جانو تو آؤ، اپنی املاک پر قبضہ پاؤ، چاہو یہیں رہو، چاہو پھر چلے جاؤ۔ میر سرفراز حسین، میر نصیر الدین، میرن صاحب کو میری دعائیں کہنا اور حکیم میر اشرف علی کو بعد دعا کے یہ کہہ دینا کہ وہ حبوب جو تم نے مجھ کو دی تھیں، اُن کا نسخہ جلد لکھ کر بھیج دو۔ اللہ موجود، ماسوا معدوم۔

[یکم جنوری ۱۸۶۰ء] اپنی مرگ کا طالب، غالب

(۲۴)

اہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رام پور[1] ہے، دار السرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے، وہ اور کہاں ہے؟ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شُبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے، لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا؟

خط تمھارا پہنچا۔ تردّد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست۔ نہ عرف لکھنے کی حاجت، نہ محلّے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجیے اور جواب لیا کیجیے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں، دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

[فروری ۱۸۶۰ء] از غالب

(۲۵)

میر مہدی، تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہُوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور کیوں رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے، مگر بھائی، میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یک شنبہ کو غرّہ ماہ مقدس ہُوا۔ اُسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سُنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا

---

[1] یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا، جب میرزا غالب پہلی مرتبہ بزمانہ نواب یوسف علی خاں رام پور گئے تھے۔

ہُوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہُوں اور سرد پانی پیتا ہُوں۔ واہ وا کیا اچھی طرح گزر بسر ہوتی ہے۔[1]

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں دم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ[2] بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں، مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس۔ بہرحال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے، کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپے سالانہ ٹھہرے۔ ایک صاحب[3] نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال، اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔

عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے، بنا رہا۔ "خان صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب۔ خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں، مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو میری جان، یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھڑی میں بیٹھا ہُوں۔ ٹٹی لگی ہُوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقّہ پی رہا ہُوں، یہ خط لکھ رہا ہُوں، تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کر لیں۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین صاحب کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔

جمعہ ۶۔ اپریل [۱۸۶۰ء]

(۲۶)

میاں،

کیوں ناسپاسی و حق ناشناسی کرتے ہو؟ چشمِ بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے؟ تمھارا منہ چشمِ بیمار کے لائق کہاں! چشمِ بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشمِ بیمار کو کیا جانو؟ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت حال مفصّل لکھو۔ تم زحیر[4] کی عادت رکھتے ہو، عوارضِ چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نورِ چشم کی آنکھ کیوں دُکھی؟ میں نے خط تمھیں جان کر نہیں لکھا، تم نے لکھا تھا کہ بعد عید میں وہاں آؤں گا۔

---

[1] یہ محض سخن گستری اور عبارت طرازی ہے۔ جیسا کہ اگلے پارے میں "اصل حقیقت سنو" کے جملے سے واضح ہے۔ [2] تنہا۔
[3] نواب احمد بخش خاں [4] پیچش، مروڑ۔



مجھ کو خط بھیجنے میں تامل ہوا۔ لکھتے کچھ ہو، کرتے کچھ ہو۔

تنخواہ کی سنو۔ دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ تنو مدِ خرچ کے جو پائے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اٹھ گئے[1] مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں، روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ حساب کیا۔ سود مول سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کرو۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے۔ میں کہتا ہوں، یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے۔ نو سو بچے، آدھے تو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پان سو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی، دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا کرامت[2] اسداللّٰہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ یداللّٰہی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں، حاکم صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے!

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جواب ترکی، ترکی، جواب عربی، عربی۔ جو انھوں نے لکھا وہ میں نے بھی لکھا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں، دعا لکھوں، کیا لکھوں؟ نہیں بھئی، وہ مجتہد ہوں، ہوا کریں، میرے تو فرزند ہیں۔ میں دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیر الدین کو دعا۔

[مئی ۱۸۶۰ء]

—(۲۷)—

جانِ غالب،

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں، تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے کئی بار، مگر میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ اب کے بار دورے میں مجھ کو غفلت بہت رہی۔ احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں، سید صاحب نہیں آئے۔ تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اُڑی، اس کو آپ نے ازراہِ محبت آنکھوں میں جگہ دی۔ بہر حال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا تاکہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر اطلاع پائیں۔

چہار شنبہ ۶ - جون ۱۸۶۰ء

---

[1] خطوطِ غالب مرتبہ مہیش داس میں ہے: "ڈیڑھ سو عملہ فعلہ کے نذر ہوئے"۔ (ص ۲۶۳) [2] مجموعہ مہیش داس میں "کرامت" کی جگہ "معجزہ" ہے۔

(۲۸)

میاں!

تمھارے خط کا جواب منحصر تین باتوں پر ہے۔ دو باتوں کا جواب لکھتا ہوں، تیسری بات کا جواب تم بتاؤ کہ تمھیں کیا لکھوں؟ پہلی بات: میاں محمد افضل تصویر لے گئے۔ اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار۔ دوسری بات: میر نصیر الدین آئے اور تینوں صاحبوں کا جیند کے جانے کا حال مفصل معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمائے۔ تیسری بات: میرن صاحب کو، جب تک تم کہو، میں دلّی نہ بلاؤں۔ گویا ان کے عاشق تمھیں ہو، میں نہیں۔ بھائی، ہوش میں آؤ، غور کرو۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے مہینا مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوراں خاں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اے میر مہدی، تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے، میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلّی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غمہائے جانگداز کی تاب لاؤں؟ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا۔ اللہ! اللہ! اللہ!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سہ شنبہ ۴۔ جمادی الثانی [۱۲۷۷ھ] ۱۸۔ دسمبر [۱۸۶۰ء] غالب

(۲۹)

میاں!

تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی، انھوں نے واپس دی اور اس کی نقل کے باب میں یہ کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے۔ جب وہ تیار ہو جائے گی، ان کو روپیہ دے کر لے لوں گا۔ خاطر جمع رکھو۔

پنسن سراسر سب کو ششماہی ملنے کا حکم ہو گیا۔ ہر مہینے میں سودی لو اور کھاؤ۔ کشمیری کٹرا بگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھڑیاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہو گئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہگزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ چار دن سے پُروا ہوا چلتی ہے۔ ابر آتے ہیں، مگر صاف چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ مینہ نہیں برستا۔ گیہوں، چنا، باجرا تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں۔ نو سیر ساڑھے نو سیر۔

میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا کہ جیند میں ہیں یا یہاں ہیں۔ میر نصیر الدین دو بار میرے پاس آئے۔ اب مجھ کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ قاسم علی خاں "قطب الاقطاب" ایک دن کہتے تھے کہ میر احمد صاحب کے قبائل یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آخر وہ شادی، بھئی[1] کب ہونے والی ہے اور کہاں ہونے والی ہے؟ اس خط کا جواب لکھو، سب حالات مفصل لکھو۔

صبح چہار شنبہ، نہم جنوری ۱۸۶۱ء غالب

---

[1] یہاں سب نے "بھی" پڑھا ہے، لیکن بھی کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اصل لفظ "بھئی" ہے۔

(۳۰)

لو صاحب!

یہ تماشا دیکھو۔ میں تو تم سے پوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کہاں ہیں۔ حالانکہ میر نصیر الدین شہر میں ہیں اور مجھ سے نہیں ملتے۔ میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اترے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اتر نا کیسا، ملنے کو بھی نہیں آئے۔ افسوس ہے جن کو میں اپنا سمجھتا ہوں، وہ مجھ کو بیگانہ جانتے ہیں۔ اب تم یہ پوچھو کہ نصیر الدین کا دلّی میں ہونا اور مجتہد العصر کا یہاں آنا تو نے کیونکر جانا؛

بھائی، آج جمعہ کا دن ۲۸ جمادی الثانی کی اور ۱۱۔ جنوری کی۔ صبح کے وقت، منہ اندھیرے اسی وقت میری آنکھ کھلی تھی۔ لحاف میں لیٹا ہوا پڑا تھا کہ ناگاہ میر نصیر الدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ اب میں جاتا ہوں اور میر حسن صاحب بھی جاتے ہیں۔ میں سمجھا سرفراز حسین۔ جب بعد تکرار معلوم ہوا، تو میر حسن جے پور سے آئے اور خدا جانے کہاں اترے اور اب کہاں جاتے ہیں۔ ہے ہے! مجھے غیر سمجھا یا مرا ہوا سمجھا کہ میرے ہاں نہ آئے اور مجھ سے نہ ملے۔ اپنی سسرال میں رہے اور میکے کو چھوڑا۔ واللہ میرا جی ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا تھا۔ اب اٹھا ہوں۔ سردی رفع ہولے۔ دھوپ نکل لے۔ آغا جان کے ہاں آدمی بھیجتا ہوں۔ میں کم بخت یہ بھی تو نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے ہیں۔ اب میر احمد علی کی بی بی پاس، حبش خاں کے پھاٹک، آدمی بھیجوں گا۔ جب آغا جان کے گھر کا پتا معلوم ہو جائے گا اور آدمی دیکھ آئے گا اور یہ بھی معلوم کر آئے گا کہ میر حسن صاحب ہیں تو میں سوار ہو کر جاؤں گا اور ان سے ملوں گا۔ تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے چچا کے یہاں آنے کا منشا اور اس کا حال لکھو۔ تصویر کا حال آگے لکھ چکا ہوں۔ خاطر جمع رکھو اور "مجتہد العصر" اور میرن صاحب کا حال لکھو۔

صبح جمعہ، ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۱ء — نجات کا طالب، غالب

(۳۱)

جانِ غالب،

تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے:

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے[1]

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔

اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی![2]

---

[1] کچھ نہیں کہا جا سکتا، اصل مصرع کیا تھا۔ دیوان مجروح میں یہ شعر یوں ہے:

نہیں لیتا ہوں فرط رشک سے نام
ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

[2] ایک نسخہ: اے میر صاحب تجھیں:

میاں یہ اہل دلّی کی زباں ہے [1]

ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں، یا خاکی [2] ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تُو کس زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

خس کی ٹٹی، پُروا ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہرحال مے گزرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہُوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ [3] یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرا، دھوبی واڑا، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ [4] قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

اللہ اللہ۔ دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلّی واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہدرلے [5] کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً ان کی مصاحبت نہیں، ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

[۱۸۶۰ء]

---

[1] مجروح کے دیوان میں ایسا کوئی شعر نہیں۔ غزل کا مقطع یوں ہے:

سخن گو، یوں تو اک عالم ہے مجروحؔ
مرے استاد کی پر کیا زباں ہے

[2] خاکی سے مراد غالباً فوجی ہیں، جن کی وردی خاکی تھی۔ [3] یہ اس آبادی کے انہدام کی کیفیت ہے جو جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان تھی۔ اس میں سے صرف شیخ کلیم اللہ کا مزار باقی رہ گیا۔ [4] یہ اس آبادی کی سرگزشت ہے جو جمنا کے پُل سے شروع ہوتی تھی۔ اب اس کی جگہ سٹیشن اور لائنیں ہیں۔ [5] اس کا باپ فرانسیسی تھا جس نے ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی۔ ہدرلے اردو کا بڑا اچھا شاعر تھا۔ زین العابدین خاں عارفؔ سے تلمذ تھا۔ مستقل تخلص آزادؔ تھا، لیکن کبھی کبھی الکؔ بھی تخلص کرتا تھا جو الیگزینڈر کا مخفف تھا۔ تیس برس کی عمر میں فوت ہُوا۔ اس کا دیوان اس کے چھوٹے بھائی ٹامس ہدرلے نے ۱۸۶۳ء میں بمقام آگرہ چھپوایا تھا۔

(۳۲)

او میاں سیدزادۂ آزادہ، دلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھیے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنونؒ کہاں! ذوقؔ کہاں! مومن خاں کہاں! ایک آزردہؔ سو خاموش، دوسرا غالبؔ، وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی؛ ہائے دِلّی! وائے دِلّی! بھاڑ میں جائے دِلّی۔

سنو صاحب، پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سرفراز خاں ولد دلاور خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد صاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح و مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ احمد حسین خاں کی عمر کیا ہے؟ لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی خوب چھان کر لکھو اور جلد لکھو۔

پنجشنبہ ۲۳۔ مئی ۱۸۶۱ء

(۳۳)

اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم!

حضرت، آداب!

"کہو صاحب، آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

"حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟"

"نہیں، میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔"

"حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے؟"

"بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سبحان اللہ، اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟"

کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ میں پنجشنبہ کو روانا ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے بھیجے گا۔

میاں، بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ۔"

سنو، میر مہدی صاحب، میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہوگئی، پیچش رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔

حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو، بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں۔ حکیم میر اشرف علی میں اور ان میں کچھ کونسل تو ہو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کیجیو کہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد"، اس کے معنی کیا ہیں؟ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک یہ نہ بتائیں۔

اس وقت پہلے تو آندھی چلی، پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر چھوڑ دوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ! تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمھیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں؟ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

[مئی ١٨٦١ء]

(٣٤)

برخوردار،

تمھارا خط آیا، حال معلوم ہوا۔ میں اس خیال میں تھا کہ الور کا کچھ حال معلوم کروں اور کپتان الگزنڈر کا خط آئے اور میں اس کو میر سرفراز حسین کے مقدمے میں لکھوں، تو اس وقت تمھارے خط کا جواب لکھوں۔ چونکہ آج تک ان کا خط نہ آیا، میں سوچا اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا مہدی خفا ہوگا۔ ناچار جو کچھ الور کا حال سنا ہے وہ اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں۔

ہر چند میں نے دریافت کرنا چاہا، حکیم محمود علی خاں کا وہاں پہنچنا اور یہ کہ وہاں پہنچنے کے بعد کیا طور قرار پایا، کچھ معلوم نہیں ہوا۔ صرف خبر واحد ہے کہ ان کو راؤ راجا نے صاحب ایجنٹ سے اجازت لے کر بلا لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب ایجنٹ الور نے راجا کے بالغ اور عاقل ہونے کی رپورٹ صدر کو بھیجی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ان کا راج ان کو مل جائے۔

* مرزا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آگئی۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں، دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔

کسے کیں مرادش میسّر بود
اگر جم نہ باشد سکندر بود

میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین کو دعائیں اور دیدار کی آرزوئیں۔[1]

(۳۵)

میاں،

کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں ان کی سسرال میں تقعے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہمسایے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا کہ یہی ہو گا کہ میرن صاحب بات تم سے چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے، ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودۂ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے۔ "بھائی میں دلّی سے آیا ہوں اور قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں۔" زنہار نہ باور کیجیو۔ مالِ مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ میں گنگا جلی دو، بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا اور سنو، مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر بازار تک ان کے پہنچانے کو گئے، رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون بُرا اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں، عورتیں صدقے جاتی ہیں۔ مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلماء مولوی سرفراز حسین کو میری دُعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں، کس قضیے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہے، خدا کے بعد نبیؑ اور نبیؑ کے بعد امام، یہی ہے مذہبِ حق۔ والسّلام والاکرام "علی" "علی" کیا کر فارغ البال رہا کر۔

[جون سنہ ۱۸۶۱ء]

---

[1] مجموعۂ خطوط غالب میں اس خط کو دسمبر ۱۸۶۲ء کا قرار دیا گیا ہے جو حقیقتہً غلط ہے اس لیے کہ اس میں کپتان الگزنڈر ہدرلے کے خط کا انتظار مذکور ہے اور الیگزینڈر ہدرلے ۱۸ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء کو فوت ہوا جیسا کہ مجموعہ مذکور کے خط ع ۳۵ سے ظاہر ہے۔ زیرِ غور خط لازماً جولائی سنہ ۱۸۶۱ء سے پیشتر کا ہے۔

(۳۶)

سیّد صاحب،

کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے، ان کی زبانی سُن لو گے۔ میں کیا لکھوں؟ میں نے بھی جو کچھ سنا ہے، اُنھیں سے سُنا ہے۔ ان کا اس طرح ناکام پھر آنا میری تمنّا اور میرے مقصود کے خلاف ہے، لیکن میرے عقیدے اور میرے تصوّر کے مطابق ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ سو روپے کی زیر باری ناحق ہُوئی چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسے پر ہُوئی تو مجھے شرمساری ہُوئی۔[۱] میں نے اس چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار داغ ہیں، ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ "لسان الغیب"[۲] نے دس برس پہلے فرمایا تھا:

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعدِ رفعِ فسادِ ہوا سمجھ لیا جائے گا۔[۳]

کلیاتِ اردو[۴] کا چھاپا تمام ہُوا۔ اغلب ہے کہ اسی ہفتے میں، غایت اسی مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔

کلیاتِ نظمِ فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا، تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ "قاطع برہان" کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھا دیے گئے ہیں، اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکتِ غیر اس کو چھپواؤں گا، مگر یہ خیال محال ہے۔



---

[۱] غالبؔ نے سرفراز حسین اور میرن کو رام پور بھیجا تھا۔ وہاں ملازمت کی کوئی صورت نہ بنی۔ ان فقروں میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ [۲] لفظی معنی "غیب کی زبان"۔ یہ خواجہ حافظ کا لقب ہے اس لیے کہ ان کے دیوان سے لوگ فال نکالتے ہیں اور اسے درست سمجھتے ہیں۔ یہاں میرزا کا اشارہ خود اپنی طرف ہے۔ [۳] غالبؔ نے ایک قطعہ کہا تھا:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیریؔ نہ ماند و طالب مرد
در بہ پرسند در کدامیں سال — مرد غالبؔ، بگو کہ "غالب مُرد"

اس سے ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے اور غالبؔ نے دوستوں کو لکھا تھا کہ میں ۱۲۷۷ھ میں مرجاؤں گا۔ یہ پیش گوئی غلط ثابت ہُوئی تو اب نکتہ نوازی کر رہے ہیں۔ ۱۲۷۷ھ میں اس لیے نہ مرا کہ وبا پھیل گئی اور اس میں میرا مرنا باعثِ کسرِ شان تھا۔ وبا ہیضے کی تھی، اس لیے اسے "فسادِ ہوا" سے تعبیر کیا۔

[۴] اس سے مراد دیوانِ اُردو ہے جسے غالباً اس لیے کلیات کہا کہ اس میں قصائد، قطعات، رباعیات اور مثنوی بھی شامل ہے۔

میرے مقدور کی نیاری کا حال "مجتہد العصر[1]" کو معلوم ہے۔ واللہ علیٰ کلِ شیئٍ قدیر۔ خدا کا بندہ ہوں۔ علیؑ کا غلام۔ میرا خدا کریم، میرا خداوند سخی؛

"علی دارم، چہ غم دارم؟"

وبا کی آنچ مدہم ہوگئی ہے۔ پانچ سات دن بڑا زور شور رہا۔ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلّی میں آیا۔ کل رات کو اس کا نو برس کا لڑکا ہیضہ کر کے مرگیا۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا الیہِ راجِعُون۔ الور میں بھی وبا ہے۔ الگزنڈر ہدرلے مشتہر بہ الکٹ صاحب مرگیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اسی جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر، یہ عالمِ اسباب ہے، اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

جولائی ۱۸۶۱ء (محرم ۱۲۷۸ھ)

―――(۳۷)―――

بھائی،

تم سچ کہتے ہو؛

بر سرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگزرد

لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیرباری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہوئی۔ جس طرح یہ آئے ہیں اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے منافی ہے، لیکن واللہ میرے عقیدے اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے، یعنی میں یہی سمجھا تھا کہ البتہ یوں ہی ہوگا۔

"دیوانِ اُردو" چھپ چکا ہے۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حُسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت! صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا۔ بہ ہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلد اصحابِ ثلثہ[2] کے پاس پہنچ جائیں، نہ میں خوش ہوا ہوں، نہ تم خوش ہوگے۔

اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلّال نہیں، سوداگر نہیں، مہتمم مطبع نہیں۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں، مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلّی شہر، رائے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت چھ آنے۔ محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔ طالبانِ کتاب کو اطلاع دو۔ دو، چار، دس، پانچ جلدیں جس کو منگانی ہوں، محمد حسین خاں کے نام پر، دلّی رائے مان کے کوچے، مصوروں کی حویلی کا پتا لکھ کر ڈاک میں بھجوا دو۔ کتاب

---

[1] اشارہ میر سرفراز حسین کی طرف ہے۔ [2] میر مہدی مجروح، میرن اور سرفراز حسین

ڈاک میں پہنچ جائے گی۔ قیمت چاہو نقد، چاہو ٹکٹ ارسال کر دو۔ مجھ کو اور تم کو کیا؟ جو کچھ اس کا جواب ہو دے دو[1]۔

وبا تھی کہاں، جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد[2]، ایک چونسٹھ برس کی عورت[3]، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا! پنجشنبہ، ۸ ماہ۔ اگست کی۔ قمری کے مہینے کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کل شام کو دو مونڈھے رکھ کر کئی آدمی دیکھا کیے۔ ہلال نظر نہیں آیا۔

نجات کا طالب غالب

[۸۔ اگست ۱۸۶۱ء]

(۳۸)

ہاں صاحب، تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسوّدے کو اصلاح دے کر بھیج دیا، اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں، میں فقیر نہیں جو دُعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کُریدا کرو، مسوّدے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں: "یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسوّدہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دُعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔"

کیوں، سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے، کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یُوں نہ لکھوں، وُہ خط ہی نہیں ہے۔ "چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نُور ہے"۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو، تم جانتے ہو، ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے، تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسوّدے کے ساتھ لکھی تھی، اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو، خفا نہ ہو۔



میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے، پھر نہ آئے۔ فارسی نئی میں نے کہاں لکھی کہ تمھارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں؟ نواب فیض محمد خاں[4] کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں[5] کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی۔ کلو داروغہ بیمار ہو گیا تھا۔ آج اس نے غسل صحت کیا۔ باقر علی خان کو مہینے بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔ شہر چپ چاپ۔ نہ کہیں بھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے۔ نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دِلّی شہر، شہر خاموشاں ہے۔ کاغذ بڑھ گیا ورنہ تمھارے دل کی خوشی کے واسطے اور لکھتا۔

یک شنبہ ۲۲۔ ستمبر ۱۸۶۱ء

---

[1] لطف کی بات یہ ہے کہ دلّالی اور سوداگری سے انکار بھی کیا اور پوری کیفیت بھی لکھ دی۔ [2] غالب [3] بیگم غالب۔ [4] والیِ جھجر [5] اعتماد الدولہ میر فضل علی کے داماد۔ دہلی کے آخری دور کے مشہور امیر اور غالب کے عزیز دوست، لکھنؤ سے دہلی آئے تھے تو اپنا روپیہ شاہی خزانے میں داخل کر دیا تھا۔ ڈگری کا تعلق غالباً اسی روپیہ کے کسی حصّہ سے تھا۔

(۳۹)

صاحب، آج تمہارا خط دوپہر کو آیا۔ اس میں میں نے مسودہ تاریخ کا پایا۔ قلمدان میں رکھ لیا۔ میر سرفراز حسین کو بھیج دیا۔ کل وہ کہتے تھے کہ انتیس روپے کو تین گاڑیاں مقرر ہو گئی ہیں۔ میں کل یعنی شام کو سوار ہو جاؤں گا۔ اب اس وقت جو میں خط لکھ رہا ہوں، پہر دن باقی ہے۔ لکھ کر کھلا رکھ چھوڑوں گا۔ شام کو "مجتہد العصر" میرے گھر ضرور آئیں گے۔ اگر آج جائیں گے تو ان کے واسطے تو دیے کے اور اگر نہ جائیں گے تو موافق معمول کے آئیں گے۔ ان کے جانے نہ جانے کا حال صبح اسی ورق پر لکھ کر، بند کر کے بھیج دوں گا۔ خدا کرے اردو کی نثر کا لفافہ انھوں نے ڈاک میں بھیج دیا ہو۔ شام کو مجھے دے جائیں تو میں کل اس خط کے ساتھ اسے بھی بھجوا دوں۔

مہاراج[1] اگر دورے کو گئے تو کیا اندیشہ ہے، گرمی کا موسم ہے، لمبا چوڑا سفر کریں گے؟ آٹھ سات دن میں پھر آئیں گے۔ یہاں کی تلاش کا نتیجہ دیکھو، تب کہیں جائیو۔

میرن صاحب کی تمہاری چوماچاٹی کے لکھنے کا مجھ میں دم نہیں، تم جانو وہ جانیں۔ کلیات[2] کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا، اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔ "قاطع برہان" کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آ گئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو انچاس جلدیں منگواؤں۔ دیکھیے نو من تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے۔

میاں، کل شام کو میر سرفراز حسین میرے گھر نہیں آئے یا تو الور کو، مجھ سے بغیر رخصت ہوئے، گئے یا نہیں گئے۔ میں تو آج جمعہ ۱۶ مئی صبح کے وقت یہ خط ڈاک میں بھیجتا ہوں۔[3]

۱۵ مئی (۱۸۶۲ء) نجات کا طالب غالب

۱۵ ذی قعدہ (۱۲۷۸ھ)

(۴۰)

سید صاحب،

اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے کہ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پہ مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال یہ کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں، عاشق زار نہیں۔ بندہ مہر و وفا ہوں، گرفتار نہیں۔ تمہارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ



---

[1] مہاراجہ الور [2] کلیات نظم فارسی [3] اس خط کے آغاز میں تاریخ یوں درج ہے۔ پنجشنبہ ۱۵ ذی قعدہ و مئی باہم یعنی ذی قعدہ ۱۲۷۸ھ اور مئی ۱۸۶۲ء دونوں کی ۱۵ تاریخ تھی۔ آخری سطروں میں مرقوم ہے: "آج جمعہ ۱۶ مئی صبح کے وقت"۔ اصل خط ۱۵ ہی کو لکھا تھا۔ آخری سطریں دوسرے دن جمعہ کو لکھیں۔

بعد محرم کے میں بھی آؤں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں، وہ آئیں گے تو میں ان کو دوں گا۔ محرم تمام ہُوا۔ آج سہ شنبہ غرّۂ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہرا برسات نے نہ آنے دیا۔

برسات کا نام آگیا، سو پہلے مجملاً سُنو: ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنۂ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے، جس طرح بجلی چمک جاتی ہے[1]۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سُنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزار ہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہُوا۔ یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہُوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔ سُن لیا دِلّی کا حال؛ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔ جناب میرن کو دُعا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

سہ شنبہ یکم صفر (سنہ ۱۲۷۹ھ) ۲۹۔ جولائی (سنہ ۱۸۶۲ء) غالب

—(۴۱)—



برخوردار نورچشم میر مہدی کو بعد دعاے حیات و صحت کے معلوم ہو۔ بھائی، تم نے بخار کو کیوں آنے دیا؟ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو تم مانع نہ آئے؟ کیا تپ اتَن بن کر آئی تھی، جو اس کو روکتے ہُوئے شرمائے؟ حکیم اشرف علی ابھی آگئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ یہ خط بھی آج روانہ ہوتا ہے، کیا عجب ہے کہ دونوں خط ایک دن، بلکہ ایک وقت پہنچیں۔ دل تمھارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے اور تمھاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنائے۔

سُنو میاں سرفراز حسین[2]! ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا۔ وہ بھی اس طرح کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے:

بہ غیر در شکر آب است رو بما دارد

پڑھتا ہُوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے؟ مجھ کو کیا پیام ہے؟ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا، آغاز تحریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا، یہ کیا سِیر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم نہ کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا[4]۔

اور ہاں میاں پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سُنا ہے کر چچا نے اس کا مرنا سنا ہوگا[3]؟ اس غریب کا

---

[1] یہ مضمون نظیری کے ایک شعر میں بھی بندھا ہے: "آفتاب امروز چوں برق از دیار ما گزشت"۔ [2] سُنو میاں سرفراز حسین سے یہاں تک مخاطب سرفراز حسین ہے [3] "اس کا" بظاہر مبہم ہے، لیکن خوانندۂ کتاب کے لیے نہ کہ مکتوب الیہ (میر مہدی) (باقی صفحہ ۲۵۹ پر)

قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے؟ اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلواؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔ توضیح لقبید نام لکھو۔

—(۴۲)—

واہ حضرت،

کیا خط لکھا ہے؟ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا، میرا بچھونا مجھ کو ملا، میرا حمام مجھ کو ملا، میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور" کوئی آئیو، کوئی آئیو" فرو ہو گیا۔ میری جان بچی، میرے آدمیوں کی جان بچی:

اکنوں شبِ من شب است و روزم روز است

بھئی، تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہنچا یا نہ پہنچا۔ میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہنچا۔ اگر پہنچتا تو بے شک تمہاری نظر سے گزرتا اور میرن صاحب اس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجھ کو وہ روداد لکھتے جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر، جیسا کہ میرا گمان ہے، خط نہیں پہنچا تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب ان سے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے؟

حُسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں، جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم ان سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو، میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے؟ نہ صاحب یہ کچھ بات نہیں۔ میرے خط کا جواب ان سے لکھوا کر بھجواؤ۔

یہاں کا حال وہ ہے جو دیکھ گئے ہو۔ پانی گرم، ہوا گرم، تپیں مستولی[1]، اناج مہنگا۔ بیچارہ منشی میر احمد حسین کا بھتیجا، میر امداد علی آشوب کا بیٹا، میر محمد شبِ گزشتہ کو گزر گیا۔ آج صبح اس کو دفن کر آئے۔ جوان، صالح، پرہیز گار، مومنین کا پیش نماز تھا۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلَیہِ راجعون۔

"مجتہد العصر" کا حکم بجا لاؤں گا اور نہ رئیس کو بلکہ مدار المہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کے جواب کو قلم انداز کر جائے گا اور مدار المہام امر واقعی لکھ کر بھیجے گا۔ مجتہد العصر کو دُعا کہنا اور یہ خط پڑھوا دینا۔

میرن صاحب کو دعا کہنا اور کہنا کہ بھلا صاحب تم نے ہمارے خط کا جواب کیوں نہیں لکھا؟ ہم بھی تمہاری طرز کا اتباع کریں گے۔

حکیم میر اشرف علی کو دعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم میں ان میں راہ و رسم تعزیت و تہنیت ہو تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی

(بقیہ صفحہ ۲۵۸) کے لیے۔ آگے مطلب واضح ہو جاتا ہے یعنی میر اشرف علی کے چچا نے کسی بھانجی کی وفات کا ذکر سنا اور لکھ دیا مگر یہ نہ بتایا کہ میر اشرف علی کی پانچ بھانجیوں میں سے کون سی مری۔ [1] غالب و مسلط۔

ان کو معلوم ہو کہ حفیظ یہاں آیا ہوا ہے۔ قبائل تمھارے یہیں ہیں۔ اگر وہاں کچھ رسائی حاصل ہو تو خیر، ورنہ یہاں کیوں نہ چلے آؤ:

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان

کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم خاں کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان سب توشے خانے میں، فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط لکھوں کہاں بیٹھ کر! پانچ چار دن سے فرصت ہے۔ مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی، کہا کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھیں۔

الور کی ناخوشی، راہ کی محنت کشی، تپ کی حرارت، گرمی کی شرارت، یاس کا عالم، کثرت اندوہ و غم، حال کی فکر، مستقبل کا خیال، تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال، جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجا کو اختیار ملے گا، مگر وہ اختیار ایسا ہو گا، جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔

بارے رفع مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے، تپ جاتی رہی ہو، تندرستی حاصل ہو گئی ہو۔ میر صاحب کہتے ہیں:

"تندرستی ہزار نعمت ہے"

ہائے! پیش مصرع قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہنچایا ہے! مجھ کو پسند آیا ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ

تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب کو دعا۔ اہا ہا ہا، میر افضل علی کہاں ہیں؟ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں! ہاں بھائی میرن صاحب بھلا ان کو ہماری دعا کہنا۔

جمعہ ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء غالب

(۴۳)

میری جان!

خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو، اس کی وجہ میں نہیں سمجھا۔ تمھارا خط آئے اور میں جواب نہ لکھوں تو گنہگار۔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ[1] کا دیوان میرے پاس کہاں؟ نواب صاحب نے بہ سبیل ارمغاں مجھے ایک ورق بھی نہیں بھیجا۔

---

[1] والی رام پور۔

یہاں کچھ نسخے بکتے آ گئے تھے، میں نے ایک مول لے کر نواب مصطفیٰ خاں کو جہانگیر آباد بھیجا تھا۔ اب محمد بخش اور پیرجی سے کہہ دوں گا، اگر کسی نے لا دیا تو ایک جلد سرفراز حسین کو بھیج دوں گا۔

توقیع نوکری کا حال مجھ کو مفصل معلوم ہے۔ یہ بھی بادشاہی تنخواہ ہوئی کہ روپیہ دے کر مول لیں اور کہیں کہ ہم نے نذرانہ دیا ہے، بہ شرط نوکری ہو جانے کے برس چھ مہینے تک اپنا دیا ہوا روپیہ مسترد کرنا ہوگا، نوکری مفت ہیں[1]۔

"مقدر" مذکر اور "تقدیر" مؤنث ہے۔ کون کہے گا فلانے کی مقدر اچھی ہے؟ کون کہے گا ڈھکے کا تقدیر بُرا ہے؟ یہ مسئلہ صاف ہے، مذبذب نہیں۔ کوئی بھی مقدر کو مؤنث نہ کہتا ہوگا، تم کو تردد کیوں ہوا؟

"جواں مرد"، "جواں ہمت"، "جواں دولت"، "جواں عمر"، "جواں سال"، "جواں خرد"، "جواں مرگ" یہ الفاظ مقررہ اہل زباں ہیں، کبھی منقلب و معکوس نہیں آتے۔

"اودھ اخبار" میں بادشاہ کے مرنے[2] کی خبر لکھی دیکھی، مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی۔ نرندر سنگھ راجۂ پٹیالہ بے تکلف مر گیا۔ مسجد جامع کی واگزاشت کی خبر مشہور ہے، اگر سچ ہو جائے تو کیا دور ہے؛ شاہ اودھ کی املاک کی بھی واگزاشت کی خبر مشہور ہے۔

لو کہو، اب اور کیا لکھوں؟ سرِ راہ کی منڈیر کے پاس جو تخت بچھا ہے، اس پر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ بس اب یہ لکھنا باقی ہے کہ مجتہد العصر کو دعا اور میر افضل علی صاحب کو دعائیں۔

غالبؔ

صبح پنجشنبہ ۲۷۔ جمادی الاول (۱۲۷۹ھ)

مطابق ۲۰۔ نومبر سال حال (۱۸۶۲ء)

—— (۴۴) ——

جویائے حال دہلی والور سلام لو!

مسجد جامع واگزاشت ہو گئی[3]۔ چیلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ عشرۂ مبشرہ دس آدمی ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش[4]، مولوی صدرالدین[5]، تفضل حسین خاں، تین یہ سات اور۔

---

[1] کارکنان قلعۂ معلیٰ نے آخری دور میں یہ دستور ٹھہرا لیا تھا کہ نذرانے کے نام سے رقمیں لے کر نوکریاں دیتے اور جب تک نذرانے کی رقم پوری نہ ہو جاتی، نوکری مفت میں دینی پڑتی تھی۔ جن لوگوں کی تنخواہیں کئی کئی مہینوں کی چڑھ جاتیں، انھیں مجموعی واجب الادا رقم کا ایک حصہ دے کر پوری رقم کی رسید لے لی جاتی تھی۔ [2] ابوظفر بہادر شاہ ثانی۔ [3] یعنی دہلی کی جامع مسجد، جس پر انگریزوں نے غدر کے بعد قبضہ کر لیا تھا۔ پہلے یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ اسے ڈھا دیا جائے۔ پھر اسے فوجی قبضہ میں لے لیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں ایک انتظامی کونسل بنا کر مسجد واگزار کی گئی۔ [4] میرزا الٰہی بخش شاہی خاندان میں سے تھا۔ غدر میں انگریزوں کا معاون رہا۔ بہادر شاہ کو جنرل بخت خاں کے ساتھ جانے سے اسی نے روکا تھا۔ [5] مفتی صدرالدین خاں آزردہ جو غدر سے پہلے صدر الصدور تھے۔ آخری دور کے عظیم المرتبت عالم اور خوش ذوق شاعر تھے۔

۷- نومبر ۱۴- جمادی الاوّل سال حال (۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نِری انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

راجا پٹیالہ مر گیا۔ مہندر سنگھ، اس کے خلف پر خطاب فرزندی اور القاب بحال و برقرار رہا۔ بالفعل دیوان نہال چند کام کر رہا ہے۔ ظاہرا جو رنگ اس ریاست کا ہونے والا ہے، وہ نواب گورنر جنرل کے آنے پر کھلے گا اور وہ فروری مہینے میں یہاں آئیں گے۔

الور کی ریاست کا حال بدستور ہے۔ گورنر صاحب ہی انھیں اختیارات دیں گے۔ یعنی پٹیالہ اور الور کے راج کا انتظام اسی وقت پر ہوگا۔ بالفعل اپسے[1] صاحب ایجنٹ، الور اور دِلّی ہوتے ہوئے میرٹھ گئے ہیں۔ راجا صاحب تجارہ[2] تک ان کی مشایعت کو گئے۔ یہاں اپسے صاحب سے، کوئی صاحب سنگھ ٹھیکہ دار الور کی سڑک کا ہے، اس نے کچھ کہا تھا، جواب دیا کہ الور کے مقدمات میں پنچوں کو اختیار ہے، ہم کچھ حکم نہ دیں گے۔ اسفندیار بیگ[3] متوفی کا کوئی متبنّٰی مستدعی پرورش ہوا، اس کو بھی یہی جواب ملا۔ اب بولو، کیا لکھوں؟

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے، خط لکھ کر، بند کر کر آدمی کو دوں گا اور گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے، اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا پھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا، کیا صحبت ہوگی۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب اور ذاکر الحسین میر افضل علی عرف میرن صاحب کو دُعا۔

منگل کا دن ۲۳- جمادی الثانی ۱۶- دسمبر پہر دن چڑھے۔

(۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء) غالب

(۴۵)

برخوردار،

تمھارا خط پہنچا، مگر یہ غضب ہے کہ میں اس کا جواب نہیں لکھ سکتا اور وہ جواب طلب ہے۔ جواب کیا لکھوں؟ قواعد عملداری کے برہم ہو گئے۔ نئے نئے دستور ہیں۔ شہرت ہوئی کہ لارڈ صاحب آتے ہیں۔ فروری کو انبالہ پہنچیں گے۔ اہل دہلی کی ملازمت وہاں ہوگی۔ اب یہ آوازہ بلند ہے کہ فروری میں کلکتہ سے چلیں گے۔ بنارس، الہ آباد، اکبر آباد ہوتے



---

[1] یہ سر ایلیجا اپسے کا پوتا تھا، وہی سر ایلیجا اپسے جس نے وارن ہیسٹنگز کے عہد میں نند کمار کو پھانسی کا حکم دیا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں الور کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں لارڈ لارنس کا سیکرٹری بنا۔ اودے پور، جودھ پور، گوالیار میں بھی رہا۔ آخر کار نیپال میں ریذیڈنٹ بن گیا۔ ۱۹۰۴ء میں فوت ہوا۔ [2] ریاست الور۔ [3] یہ الور میں دیوان بن گیا تھا۔

ہُوے مارچ کو انبالہ پہنچیں گے۔ الور، جے پور، کوٹہ یہ تین راجے آگرہ پہنچ گئے۔ وہاں میر فرش کی طرح بے کار دھرے ہُوے ہیں۔ الور کے راجا گویا یوسف ہیں، ان کے خریدار دوڑتے پھرتے ہیں۔ کوئی شکرم، کوئی کرانچی ڈھونڈ رہا ہے، کوئی پیادہ چل نکلا۔ کسی نے مانگے کا ٹٹو بہم پہنچایا۔ یہ سب قصے یک طرف، اب سنتا ہوں کہ راجپتان کے ایجنٹ نے سب رئیسوں کو لکھا ہے کہ لارڈ صاحب تمھیں بلاتے ہیں۔ جس کا جی چاہے آؤ، جس کا جی چاہے نہ آؤ۔ اس تحریر کو دیکھ کر، جو وعدہ گاہ پر جا پہنچے، وہ پشیمان ہیں۔ جو راہ میں ہیں وہ وہیں ٹھٹک رہے ہیں۔ نہ آگے بڑھتے ہیں، نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ جو اپنے مقام سے نہ ہلے تھے، وہ اچھے رہے۔

یہاں دو تین مہاوٹیں برس گئی ہیں۔ گیہوں، چنا اچھا ہوگا۔ ربیع کی امید پڑی:

افق ہا پُر از ابر بہمن مہی
سفالینہ جام من از مے تہی

سیدھے ہاتھ پر ایک زخم، بائیں بازو پر ایک گھاؤ، سیدھی ران پر ایک پھوڑا، یہ حال میرا ہے۔ باقی خیر و عافیت۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو دُعا پہنچے۔

سنہ ۱۸۶۳ء — غالب

(۴۶)

نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ "کلیاتِ فارسی" کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہُوا۔ میاں، اس میں اغلاط بہت ہیں۔ مبارک ہو تمھیں اور میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور بھائی، خدا کرے، مجھ کو بھی۔ صاحب ایجنٹ بہادر راجپتان کا حکم الور کے ایجنٹ کو آیا کہ تم پہلی ستمبر کو راج کے کاغذ، جو تمھارے پاس ہیں اور راج کا اسباب جو تمھارے تحت میں ہے وہ سب راجا صاحب کو دو اور تم الگ ہو جاؤ۔ ستمبر کی بیسویں کو ہم الور جائیں گے، راجا صاحب کو مسند پر بٹھائیں گے خلعتِ شاہی انھیں پہنائیں گے:

"ستمبر" ستم بُرد و آورد داد

شنبہ ۲۲۔ اگست سنہ ۱۸۶۳ء — غالب

(۴۷)

آئیے جناب میر مہدی صاحب دہلوی، بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے؟ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں؟ میرن صاحب خوش ہیں؟:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہُوئے

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں، ایک اعتبارِ محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا

وجود ہے۔ یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا، ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے ۱۲

میخواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدن حبیب را و نہ دیدن رقیب را

"لف و نشر" مرتب ہے۔ میخواہم از خدا، دیدن حبیب را نمی خواہم از خدا، نہ دیدن رقیب را۔
خوار و زار و خستہ و سوگوار۔ معنی تو اس کے موجود ہیں، مگر بول چال ٹکسال سے باہر ہے۔ ایک جملے کا جملہ مقدر چھوڑ دیا ہے اور اس بھونڈی طرح سے کہ جس کو المعنی فی بطن الشاعر کہتے ہیں۔ یہ شعر اساتذہ مسلم الثبوت میں سے کسی کا نہیں ہے۔ کوئی صاحب ہوں گے کہ انھوں نے لوگوں کے حیران کرنے کے واسطے یہ شعر کہہ دیا اور کسی استاد کا نام لے دیا کہ یہ اُن کا ہے۔

تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے۔ جو جس کے کانوں کو لگے، جس کو جس کا دل قبول کرے، اس طرح کہے۔ رتھ میرے نزدیک مذکر ہے، یعنی رتھ آیا، لیکن جمع میں کیا کروں گا؟ ناچار مونث بولنا پڑے گا، یعنی "رتھیں آئیں"۔ خبر مونث ہے بہ اتفاق، مگر کاغذ اخبار، اس کو خود سمجھ لو کہ تمھارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا۔ یعنی اخبار آیا۔ پیر ہوئی یا ہُوا؟ یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ دوشنبہ ہُوا، پیر کا دن ہُوا۔ نری پیر ہوئی یا پیر ہُوا ہم کیوں بولیں گے؟ "بلبل" میرے نزدیک مونث ہے جمع اس کی بُلبلیں۔ طوطی بولتا ہے، بُلبل بولتی ہے[۱]
بھائی، اس امر میں مفتی و مجتہد بن نہیں سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں۔ جو چاہے مانے، جو نہ چاہے نہ مانے ۱۲

سہ شنبہ ۸۔ دسمبر ۱۸۶۳ء
نجات کا طالب، غالب

(۴۸)

برخوردار کامگار، میر مہدی دہلوی، اردو بازار کے مودی، صاحب لوائے ولائے مرتضوی پر علم عباس ابن علیؓ کا سایہ۔ راجا صاحب[۱] کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔ الحمد للہ علیٰ کل حال۔ دیکھیے، اب معاودت کب کرتے ہیں۔ موافق اپنے وعدے کے ہم کو کبوں کر طلب کرتے ہیں۔ کلکتہ جاتے وقت فرما گئے ہیں کہ میں آکر اسداللہ کو بلاؤں گا۔ البتہ اگر وہ بلائیں گے تو میں کیوں کر نہ جاؤں گا۔ ظاہر ہمارے تمھارے واسطے زمانہ انتہائے مصیبت اور وقت پیش آمد دولت[۲] ہے۔ اب مجھ کو میرن صاحب کی خوشامد کرنی پڑے گی۔ وہ مقرب بنیں گے، اگر میری قسمت لڑے گی تم کامیابی کا سامان کر رکھنا۔ میرن صاحب کو مجھ پر مہربان کر رکھنا۔ بھائی، یہ جو میرن یا امیرن صاحب ہیں، حضور کے بڑے مصاحب ہیں۔ جس گروہ میں سے جس کو چاہیں حضور سے ملوا دیں۔ فرقہ شعرا میں سے جس کو جو کچھ چاہیں دلوا دیں۔ ان کو اور مجتہد العصر کو میری دعا کہنا۔

نجات کا طالب، غالب

---

[۱] راجہ شیو دھیان سنگھ (جنھیں شیو دان سنگھ بھی لکھتے ہیں) والی الور۔ [۲] مطلب یہ کہ مصیبتوں کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور دولت ملنے والی ہے میرزا کی خوش فہمی ملاحظہ ہو کہ ذرا سا سہارا ملتے ہی توقعات کی ایک دنیا قائم کر لیتے ہیں۔



—(۴۹)—

میری جان،

وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروّج تھی، اس میں خُر بہ خائے مضموم، "نورِ قاہر" کو کہتے ہیں اور چونکہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے، اس واسطے آفتاب کو "خر" لکھا اور "شید" کا لفظ بڑھا دیا۔ "شید" بہ شین مکسور و یائے معروف بروزنِ "عید" "روشنی" کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ اس "نورِ قاہرِ ایزدی" کی روشنی ہے۔ "خر" اور "خورشید" یہ دونوں اسم "آفتاب" کے ٹھہرے۔ جب عرب و عجم مل گئے تو اکابر عرب نے کہ وہ منبع علوم ہوئے، واسطے رفع التباس کے "خُر" میں واؤ معدولہ بڑھا کر "خور" لکھنا شروع کیا۔ ہر آئینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا اور منظور کیا اور فی الحقیقت یہ قاعدہ بہت مستحسن ہے۔ فقیر "خر" جہاں بے اضافۂ لفظ "شید" لکھتا ہے، موافق قانون عظمائے عرب بہ واؤ معدولہ لکھتا ہے، یعنی "خور" اور جہاں بہ اضافۂ لفظ "شید" لکھتا ہے وہاں بہ پیروی بزرگانِ پارس سربسر لفظ "خور" کو بے واؤ لکھتا ہے، یعنی "خرشید"۔ خُر کا قافیہ "دُر" اور "بُر" کے ساتھ جائز اور روا ہے۔ خود میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا۔ وہاں میں بے واؤ کیوں لکھوں؟ رہا "خورشید" چاہو بے واؤ لکھو، چاہو مع الواؤ لکھو۔ میں بے واؤ لکھتا ہوں مگر مع الواؤ کو غلط نہیں جانتا اور "خر" کو کبھی بے واؤ نہ لکھوں گا، قافیہ ہو یا نہ ہو۔ یعنی نظم میں، وسط شعر میں آپڑے یا نثر کی عبارت میں واقع ہو، "خور" لکھوں گا۔ یہ بات بھی تم کو معلوم رہے کہ جس طرح "خُر" ترجمہ "قاہر" کا ہے اسی طرح "جم" ترجمہ "قادر" کا ہے کہ بہ اضافہ لفظ "شید" اسم شہنشاہِ وقت قرار پایا ہے۔

"مجتہد العصر" میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ سچ کہیے، تمھیں وہاں کوئی "مجتہد العصر" نہ کہتا ہوگا۔ نہ کہو، تم کو کیا؟ میں نے تم نے مان لیا، اب کوئی کہے یا نہ کہے۔ میاں بدرالدین سے ایک مُہر کھدوا دوں گا۔

"جناب مجتہد العصر سرفراز حسین"

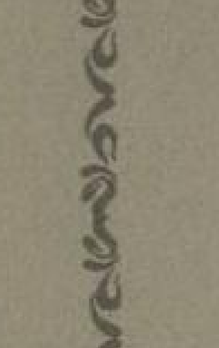
بس، تم یہ مُہر خطوں پر، محضروں پر، تمسکوں پر، کرنی شروع کرنا۔ سب کے سب تم کو مجتہد العصر کہنے لگیں گے۔

حکیم میر اشرف علی کو اور ان کے فرزند کو دعا پہنچے۔

میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن، اب وہ خس کا پردہ کھول ڈالا۔ صافیاں جھجر پر لپیٹتا ہوں۔ دم بہ دم بھگوتا ہوں۔ وہ لُو کہاں جو پردے سے لپٹ کر صافی کو لگے آکر اور پانی کو ٹھنڈا کرے؟ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو، اب کہاں؟ برف پندرہ دن کی اور باقی ہے، آیندہ خدا رازق ہے۔

—(۵۰)—

قرۃ العینین میر مہدی و میر سرفراز حسین، مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو، ہمیں خط نہیں لکھتا؛



ہم بھی منہ میں زباں رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ ماجرا[1] کیا ہے

ماجرا یہ ہے کہ تمھارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا، میں جس کا جواب لکھتا۔ میرن صاحب سے تمھاری خیر و عافیت پوچھنی اور کہہ دینا کہ میری دعا لکھ بھیجنا، بس، اب اتنا ہی دم باقی ہے۔ کل میرن صاحب آئے، پوچھا کہ اور سے کوئی خط آیا؟ فرمایا: اس ہفتے میں کوئی خط میں نے نہیں پایا، کیا کہوں کہ کیا حال ہے؟ پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

اب اس زمزمے کا بھی محل نہ رہا، یعنی سعی بے حاصل کی لذت خاک میں مل گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

شنبہ ۱۸ر شعبان ۱۲۸۱ھ — مرگ ناگاہ کا طالب، غالب
۱۷۔ جنوری ۱۸۶۵ء

مجتہد العصر میر سرفراز حسین



(۱)

نورچشم، راحت جان، میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا، جو بُوے پیرہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ میاں، یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتوان ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، یعنی بہرحال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھُنا کہتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ، اللہ، اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟ سنو غالب، رونا پیٹنا کیا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔ کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے، کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤں گا۔ میں نے ان کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے، اگر بھول نہ جائیں گے، پہنچائیں گے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ صاحب اتن نہیں ہے، نہ ہو، خلام اشرف نہیں ہے، نہ ہو، اگر منظور کیجیے تو میں صوفی ہوں، ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ بموجب مصرع:

---

[1] دیوان غالب میں "ماجرا" کی جگہ "مدعا" ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

تم سے کب انکار کرتا ہوں۔ اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو، تو خوش، اگر غلام اشرف مانو، تو راضی۔ رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ، دن کو مجھ سے جی بہلاؤ۔ قصہ مختصر آؤ اور جلدی آؤ۔

سیّد، الور کا جو حال لکھتے ہو، وہ سچ ہے۔ راجپوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں، مگر مہاراجا مسلمانوں کا دم بھرتے ہیں۔ کچھ دن جاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر وہاں آتے ہیں[۱]۔ کیا مجمع برہم ہوا ہے! مجھ کو کیسا غم ہوا ہے! تم اس جرگے سے جدا ہو، تم کو کیا اندیشہ ہے؟ میر قربان علی صاحب جیسا لکھیں، ویسا کرو۔ میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے، مجھ کو دعا بھی نہ لکھی۔ بھائی، میری دعا پہنچے۔ میر نصیرالدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے۔ اب میں نہیں جانتا یہاں ہیں یا وہاں۔ ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے، دعا سلام کی حاجت کیا؟ دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے، بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ کس کا خط ہے؟

—(۲)—



میری جان کے چین، مجتہد العصر میر سرفراز حسین!

تم کو اور تمھارے بھائی کو اور تمھارے دوست کو دعا اور پھر یہ بیان کہ غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعد "غدر" دربار اور خلعت اور ملاقات سکرتروں کی، یہ سب موقوف۔ اب جو لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، تو انھوں نے خود مجھے بلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم اپنی طرف سے از راہِ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ جاؤ گے تو پاؤ گے۔ میں انبالہ نہ جا سکا۔ بالفعل نواب گورنر کے خلعت پر قناعت کی۔ اس خلعت کو بشرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا۔

ہملٹن صاحب الور میں آ گئے۔ راجا صاحب دربار روز کرتے ہیں۔ اہل اغراض کے عرائض جو حضور میں گزرتے ہیں، وہ حضور پنچوں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ خریطہ یعنی حکم اختیار پانے کا ابھی نہیں آیا۔ یقین ہے کہ لارڈ صاحب بعد اختتام سفر جب شملہ پہنچیں گے، تو خریطہ جاری ہو گا۔ آج جمعہ ساتویں شوال کی اور ستائیسویں مارچ کی ہے۔ چار گھڑی دن چڑھا ہے۔ میں یہ خط لکھ کر بھیجتا ہوں۔ تم بھی پڑھو اور میر مہدی کو بھی پڑھا دو۔ اب شاید تھوڑے دنوں تک میں خط نہ لکھ سکوں۔ تفصیل اس کی یہ کہ جب رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی۔ پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر ایک کفِ دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔ انبالہ نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی۔ دو ہفتے سے انگریزی علاج ہوتا ہے۔ کالا ڈاکٹر روز آتا ہے۔ آج اس نے ارادہ اس مردار گوشت کے کاٹنے کا کیا ہے۔ اب وہ آتا ہو گا۔ جلد جلد یہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں، تا کہ پھر ہاتھ کے پرزے اڑا دوں۔

۷۔ شوال (۱۲۷۹ھ) مطابق ۲۷۔ مارچ (۱۸۶۳ء) نجات کا طالب، غالب

---

[۱] مطلب یہ کہ راجا شیو دھیان سنگھ مسلمانوں کو بہت چاہتے تھے۔ مہاراجا کے ہم قوم راجپوت مسلمانوں کو نکلنے پر تلے بیٹھے تھے۔ آخر ایک ہنگامہ برپا کیا اور سب کو نکال دیا۔

میر افضل علی عرف میرن صاحب

(۱)

سعادت و اقبال نشان، میر افضل علی صاحب المعروف بہ میرن صاحب!

خدا تم کو سلامت رکھے اور پھر تمھاری صورت مجھ کو دکھا دے۔ تمھارا خط پہنچا، آنکھوں سے لگایا، آنکھوں میں نور آیا، دل پر رکھا، مزا پایا۔ کل تک اس نام کو سُن کر خفا ہوتے تھے اور آپ ہی آپ گُھلے جاتے تھے۔ اب بن بن کر باتیں بناتے ہو اور ہم کو کڑیاں سناتے ہو۔ کاش کہ تم یہاں آجاؤ، تب اس تحریر کا مزا پاؤ۔ میر مہدی صاحب، وہ تحریر تمھاری بہ نسبت میرے دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چنانچہ اب جو تمھاری ان کی ملاقات ہوگی تو تم کو معلوم ہوگا۔

بھائی، تمھارے سالے بہت غرور کے پتلے ہیں۔ دو ایک بار میں نے ان کو بلایا، اُنھوں نے کرم نہ فرمایا۔ تم سچ کہتے ہو، یہ لوگ اور ہی آب و گل کے ہیں۔ تمھاری اور ان کی کبھی نہ بنے گی اور گھری نہ چھنے گی۔ وہیں بیٹھے رہو، دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ یہ رنج و عذاب کا زمانہ جلد گزرتا ہے۔

میر سرفراز حسین کو میری دُعا کہنا اور کہنا، بھائی، وہ زمانہ آیا ہے کہ سیکڑوں عزیز راہیِ مُلکِ عدم ہوئے۔ سیکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوگئے کہ ان کے مرگ و زیست کی خبر نہیں۔ دو چار جو باقی رہے ہیں، خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔ میر نصیر الدین کو پہلے بندگی، پھر دُعا۔

دو شنبہ ۹۔ نومبر ۱۸۵۸ء بین الظہر والعصر (بحوالہ میر مہدی[۱] طال عمرہٗ)

نجات کا طالب غالب

(۲)

برخوردار کامگار میر افضل علی عرف میرن صاحب طال اللہ عمرہٗ

بعد دُعا کے واضح رائے سعادت انتمائے ہو، آپ کا خط پہنچا۔ اگرچہ میں نے صرف پڑھا، میر مہدی کے جلانے کو لکھتا ہوں کہ میں نے آنکھوں سے لگایا۔ ہاں صاحب، تم نے جو لکھا ہے کہ قبلہ و کعبہ کہنے سے وہ صاحب بہت خوش ہوتے ہیں، کیوں نہ خوش ہوں؟ خوشی کی بات ہے۔ تمھارے سر کی قسم، میں گویا دیکھ رہا ہوں اور میری نظر میں پھر رہا ہے۔ وہ میر سرفراز حسین کا شرما کر آنکھیں نیچی کرنا اور مسکرانا۔ خدا کبھی مجھ کو بھی وہ صورت دکھائے۔ میر نصیر الدین یہاں آگئے ہیں۔ تم مجتہد العصر اور حکیم محمد اشرف علی کو میری دعا کہنا اور میر مہدی پوچھیں تو کہنا کہ تم کو کچھ نہیں لکھا۔ کل میں نے خبر منگوائی تھی، سو لڑکی کو ابھی تپ آئے جاتی ہے۔ یقین ہے کہ تم نے وہاں پہنچ کر مولوی مظہر علی کو خط لکھا ہوگا۔ ہاں تم کو ضرور ہے، ان سے نامہ و پیام کی رسم رکھنی۔ والدعا

چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء

غالب

---

[۱] گویا یہ خط دستی بھیجا گیا تھا۔

(۳)

میری جان،

تمھارا رقعہ پہنچا۔ نہ کھلا کہ میر سرفراز حسین جے پور کیوں جاتے ہیں؟ بہر حال میر مہدی کو دعا کہنا اور میر سرفراز حسین سے یہ پوچھنا کہ تم جے پور چلے، میں نے تم کو خدا کو سونپا، تم مجھے کس کو سونپ چلے؟

۲۔ جولائی ۱۸۶۴ء — جواب کا طالب، غالب

خواجہ غلام غوث خاں بے خبر



خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے اجداد کا وطن خطۂ جنت نظیر کشمیر تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کا سلسلۂ نسب سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ، فرمانروائے کشمیر سے ملتا تھا۔ جب مغل کشمیر کے فرمانروا بنے تو خواجہ صاحب کے اجداد کو علم و فضل اور عالی نسبی کی بنا پر عہدۂ قضا ملا اور کئی پشتوں تک اس خاندان میں یہ اعزاز قائم رہا۔ مغلوں کے زوال پر کشمیر کا امن و سکون درہم برہم ہوا تو نہ محض وجہ معاش ہی کا معاملہ خطرے میں پڑ گیا، بلکہ اطمینان سے گھر بیٹھے رہنا بھی غیر ممکن ہو گیا۔ اس زمانے میں بے خبر کے دادا خواجہ خیر الدین اپنے مختلف اقربا کے ساتھ کشمیر سے نکل کر پہلے لہاسا (تبت) پہنچے۔ پھر نیپال میں مقیم ہو گئے۔ بے خبر کے مختلف سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جب گلاب سنگھ کشمیر پر مسلط ہوا تو اس کے عہد میں عہدۂ قضا تخفیف میں آیا۔ اس کے بعد خواجہ خیر الدین وطن سے نکلے۔ یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ گلاب سنگھ ۱۸۴۶ء میں کشمیر پر قابض ہوا۔ اس سے چھبیس ستائیس برس پیشتر سکھ کشمیر لے چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ترک وطن کا واقعہ اس سے بھی پہلے کا ہے۔

بہر حال نیپال ہی میں خواجہ خیر الدین کشمیری کے صاحبزادے خواجہ حضور اللہ کی شادی ایک قریبی رشتہ دار خواجہ فرید الدین کی دختر سے ہوئی اور وہیں ۱۲۳۱ھ (۱۸۲۴ء) میں خواجہ غلام غوث خاں پیدا ہوئے۔

خواجہ خیر الدین آبائی عہدے کے چھنتے ہی تجارت شروع کر چکے تھے۔ غالباً کاروبار ہی کے سلسلے میں یہ خاندان نیپال سے نکل کر بنارس پہنچا۔ خواجہ غلام غوث نے بنارس ہی میں تعلیم اور ابتدائی نشو و نما پائی۔

ان کے ماموں سید محمد خاں نے انگریزی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بعد میں وہ ترقی کرتے کرتے صوبہ غرب و شمال (آگرہ جس میں آگے چل کر اودھ شامل ہوا) میں لفٹنٹ گورنر کے میر منشی بن گئے اور "خان بہادر" کا خطاب حاصل کیا چنانچہ خواجہ غلام غوث بھی ۱۸۴۱ء میں جب ان کی عمر سولہ برس کی تھی، اپنے ماموں کے ماتحت ملازم ہو گئے اور اسی تعلق کی وجہ سے انھیں آگرہ میں اقامت اختیار کرنی پڑی، جو اس زمانے میں لفٹنٹ گورنر کا صدر مقام تھا۔ لارڈ ایلن برا کے عہد میں گوالیار پر چڑھائی ہوئی (۱۸۴۳ء) تو خواجہ صاحب کو عارضی طور پر گورنر جنرل کے منشی خانے سے منسلک کر دیا گیا۔ مہم کے خاتمے پر خلعت کا اعزاز ملا۔



حبیب خاں بہادر خواجہ سید محمد خاں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کے حسنِ کارکردگی کے صلے میں نیز اعلیٰ صلاحیت کی بنا پر خواجہ غلام غوث خاں کو میر منشی بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۸۸۵ء تک فائز رہے اور خود بہ اصرار درخواست کر کے پنشن لی۔ انگریز چاہتے تھے کہ وہ ملازمت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ۱۸۴۵ء میں خواجہ صاحب کی شادی گوپاموؤ کے مفتی انعام اللہ خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ پنشن کے بعد آپ الہ آباد میں مقیم ہو گئے اور وہیں ۱۸ ار شوال المکرم ۱۳۲۲ھ (مطابق ۲۶۔ دسمبر ۱۹۰۴ء) کو رات کے پونے دس بجے فوت ہوئے۔ مندرجہ ذیل تاریخ آپ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے:

آں خواجۂ کہ بود بہ نام او غلام غوث — خوش روے و خوش لباس و خوش اندام و خوش سرشت
روشن شد از سواد بیاضِ صفات او — توقیع وقعتے کہ بہ نامش قضا نوشت
در قیل و قال ہم نفسِ شاعرانِ فرس — در وجد و حال ہم اثر خواجگانِ چشت
گوئی بہ رنگ و بوے گل و چوں نسیم صبح — سوے بہشت رفتہ و ایں کشت را بہشت
رضوانش دیدہ گفت کہ ایں نو رسیدہ کیست؟
گفتند حوریانِ جناں "خواجۂ بہشت"

بے حد خوش اخلاق اور وضعدار بزرگ تھے۔ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ مرحوم کا بیان ہے کہ میں جن زمانے میں الہ آباد میں تھا، روزانہ ملنے کے لیے آتے۔ باوجود کبرسن توانا، تندرست، خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے۔ ۱۸۷۰ء میں خضاب چھوڑا۔ اتوار کے دن احباب کا مجمع آٹھ نو بجے سے شروع ہوتا۔ سب لوگ خواجہ صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے۔ دن بھر لطائف اور شعر و سخن کا سلسلہ جاری رہتا۔

میرزا محمد عسکری نے ادبی نکات غالب میں ان کی روزانہ نشست کا حال یوں بیان کیا ہے:

"خواجہ صاحب نماز عصر سے فراغت کر کے باہر تشریف لاتے تھے۔ میں نے ایسی پابندی وقت اور پابندی وضع کسی دوسرے ہندوستانی میں نہیں دیکھی۔ صحن میں چھڑکاؤ ہو کر کرسیاں، مونڈھے دو رویہ بچھا دیے جاتے تھے۔ صدر میں ایک اونچی کرسی، سامنے ایک چھوٹی سی میز جس پر خاصدان رکھا جاتا تھا، اِدھر اُدھر دو بڑے گل دان۔ جناب مرحوم پابندی وقت کے ساتھ ہاتھ میں تسبیح لیے محل سرا سے برآمد ہوتے اور اسی صدر کی کرسی پر متمکن ہو جاتے۔ دونوں طرف کرسیوں اور مونڈھوں پر لوگ اپنے اپنے مرتبے؛ نیز بہ اعتبار اس درجۂ ارتباط اور دوستی کے جو خواجہ صاحب کے ساتھ ان کو حاصل ہوتا، اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو شخص ایک مرتبہ کرسی پر بیٹھا ہو، وہ دوسرے دن مونڈھے پر یا برعکس اس کے مونڈھے پر بیٹھنے والا کرسی نشینی کی جرأت کرے۔"

غرض خواجہ صاحب مشرقی تہذیب کا جامع نمونہ تھے۔ ان کے فارسی نظم و نثر کا مجموعہ "خونابۂ جگر" کے نام سے طبع ہوا۔ اردو نظم و نثر کا مجموعہ "فغانِ بے خبر" کے نام سے چھپا۔ وفات کے بعد بقیہ کلام نظم و نثر کا مجموعہ "لعل و گوہر"

کے نام سے شائع ہُوا۔ اُردو خطوط نے " انشائے بے خبر" کا نام پایا۔ " عود ہندی" کی ترتیب خواجہ صاحب ہی کی نگرانی میں ہُوئی تھی۔ بے خبر میرزا غالبؔ کے اُن چند دوستوں میں سے تھے، جن پر مرحوم کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اعتماد رہا۔

خواجہ صاحب کے احباب کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی نے " انشائے بے خبر" کے مقدمے میں ستر سے زیادہ اکابر کی فہرست دی ہے، جو خواجہ صاحب کے گہرے دوست تھے۔ ان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور انگریز بھی شامل تھے۔

مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے ساتھ بھی بھائیوں کے سے تعلقات تھے۔ زمانۂ قیامِ آگرہ میں ایک مرتبہ خواجہ صاحب بیمار ہو گئے۔ مہرؔ کو اطلاع نہ ملی اور عیادت کے لیے نہ آسکے۔ تندرستی کے بعد بیماری کی کیفیت معلوم ہُوئی تو مندرجہ ذیل قطعہ معذرت میں بھیجا:

منشی غلام غوث ہیں مشہور بے خبر — ہم سا بھی بے خبر مگر اے مہرؔ کم ہُوا
ان کا علیل ہونے کا فصلِ وبائی ہیں — مطلق نہ ہم کو علم، خدا کی قسم ہُوا
اب جو سنا تو رنج ہُوا، پر یہ شکر ہے — اس سے سوا خوشی ہُوئی جتنا کہ غم ہُوا
ہاتف نے ایک مصرع تاریخ پڑھ دیا
اچھی طرح سے ہیں، یہ خدا کا کرم ہُوا

(۱)

پیر و مرشد،

یہ خط ہے یا کرامت؛ صفائے ضمیر و کشفِ حجب[۱] کی علامت ہے۔ مدعا ضروری التحریر اور اندیشۂ نشانِ مسکن دامن گیر۔ اگر یہ خط کل نہ آجاتا تو آج خط کیوں کر لکھا جاتا؛ سبحان اللہ جس دن یہاں مجھ کو وہ مطلب خطیر پیش آیا ہے، اسی دن آپ نے وہاں لکھنے کو قلم اٹھایا ہے۔ آپ کو عارف کامل کیونکر نہ لکھوں اور کیا کہوں ولی اگر نہ کہوں؛ مدعا بیان کرتا ہوں، مگر یہ گمان کرتا ہُوں کہ یہ خط پہنچنے نہ پائے گا کہ رازِ سربستہ آپ پر کُھل جائے گا۔ یعنی یک شنبہ ۲۸۔ نومبر کو دو خط اور دو پارسل، ایک میں " دستنبو" کا ایک مجلد اور ایک میں تین معاً[۲] بسبیل ڈاک روانہ کر چکا ہُوں۔ خطوں کا چوتھے پانچویں دن، پارسلوں کا چھٹے ساتویں دن پہنچنا خیال کرتا ہُوں۔ پارسلوں کے عنوان پر خطوں کی معیت رقم کی ہے اور خطوں کے سرنامہ پر پارسلوں کے ارسال کی اطلاع دی ہے۔ تین کتاب والے پارسل اور ایک خط پر جناب سکرتر بہادر کا نام نامی ہے اور ایک کتاب والے پارسل اور ایک خط پر جناب چیف سکرتر بہادر دوم کا اسم سامی ہے۔ آج پانچواں دن ہے۔ خط اگر دونوں پہنچ گئے ہوں تو کیا عجب ہے، بلکہ سچ تو یُوں ہے کہ اگر نہ پہنچے ہوں تو بڑا غضب ہے۔ اگلے عرائض کے نہ پہنچنے میں کچھ شک نہیں۔ جواب امر آخری دفتر میں اس کا پتا آج تک نہیں۔ اب کارپردازانِ ڈاک ڈاکو نہ بن جائیں اور میرے ان دونوں خطوں اور پارسلوں کو

---

[۱] پردوں کا کُھلنا۔ [۲] یعنی اکٹھے۔

بہ احتیاط پہنچائیں۔ صرفِ عنایت[1] کی گنجائش تو آپ جب پائیں کہ وہ خط اور پارسل پہنچ جائیں۔ ابھی تو آپ سے مجھ کو ان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا سوال ہے، کس واسطے کہ جب تک آپ مجھ کو اطلاع نہ دیں گے، ان کے نہ پہنچنے کی بھی خبر مجھ تک پہنچنی محال ہے۔ بہ ہر حال یہ نیاز نامہ جس دن پہنچے اس کے دوسرے دن جواب لکھیے، جیسا میں نے جلد لکھا، ایسا ہی آپ بھی شتاب لکھیے۔ آپ کے عنایت نامے میں کوئی امر ایسا نہ تھا کہ جس کا جواب لکھا جائے یا اس باب میں کچھ اور عرض کیا جائے۔ لوہارو کی ڈاک کا خط آئے گا، لوہارو کو بھیج دیا جائے گا۔ جناب منشی نواب جان صاحب اور جناب منشی اظہار حسین صاحب میں اور آپ میں اگر ربط بے تکلف ہو تو ان دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہنچانے میں نہ توقف ہو[2]۔

تم سلامت رہو قیامت تک

۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۲)

قبلہ!

اس نامۂ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشتِ خشک سے کرے، یعنی خط اور پارسل[3] کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس کی خبر پاکر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دوسرا پارسل اور خط ایک ساتھ بھیجا گیا ہے اور ہر گونہ توقع کا خیال اسی پارسل پر ہے، کس واسطے کہ اس خط میں حاکم اعظم کے نام کی عرضی ملفوف ہے۔ 

جانتا ہوں کہ محکمہ ایک، ڈاک ایک، دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے، مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا، جب تک کہ حضرت اس سر رشتے سے معلوم کر کے نہ لکھیں گے۔ اب آپ جانیے اور یہ دل سودا زدہ۔ میں اس کی سفارش کرنے والا اور اس کے مدعا کا گزارش کرنے والا کون؛ ہاں اتنی بات ہے کہ آپ لکھ سکتے ہیں بلکہ یہ بھی آپ مجھ پر حالی کر سکتے ہیں کہ نذر ولایت کی، ولایت کو روانہ ہوئی یا نہیں؛ میری جگر کاوی کی قدر دانی ہوئی یا نہیں؛ پیشگاہ سے موافق دستور کے خط کا امیدوار ہوں یا نہیں؛ اپنے حسنِ طبع کا شکر گزار ہوں یا نہیں؛ اس خط کا جواب جتنا جلد عنایت کیجیے گا، مجھ کو جلا لیجیے گا۔ لوہارو کا خط ایک معتمد کے ہاتھ بھیج دیا گیا۔

(۳)

قبلہ حاجات،

عطوفت نامہ کے آنے سے آپ کا بھی شکر گزار ہوا اور اپنے بخت اور قسمت کو بھی آفرین کہی اور ڈاک کے کارپردازوں کا احسان مانا۔ بارے دونوں پارسل اور دونوں لفافے پہنچ گئے:

تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

---

[1] عنایت کرنا، صرف کا ص مفتوح ہے۔ [2] دیکھیے اس تحریر میں خاصا تکلف ہے۔ [3] اس سے مقصود دستنبوے کا پارسل ہے جسے مرزا انجاح مقاصد مہمہ کی کلید سمجھتے تھے۔

یہ کتاب جو مرسل الیہ کے مطالعہ میں ہے، پھر بہ نسبت اس دوسری کتاب کے قسمت کی اچھی ہے، یعنی خود ملاحظہ فرما رہے ہیں اور اگر کہیں کچھ پُوچھنا ہوگا تو یقین ہے کہ آپ سے پُوچھیں گے۔ دوسری کتاب دیکھیے مجھ کو کیا دکھائے؟ جن کو اس کے دیکھنے کا حکم ہُوا ہے، وہ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں، لیکن بہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ نادر ہے، مگر بیگانہ و ناآشنا ہے۔ خدا کرے وہ جو اس کے سر پہ مامور ہیں ان اوراق کو بمشورت آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پُوچھ لیا کریں۔ کیوں کر لکھوں؟ نہیں لکھ سکتا۔ تم سب کچھ جانتے ہو، جہاں گنجایش پاؤ گے، جیسا مناسب جانو گے، جو کچھ کر سکو گے، وہ کرو گے۔ لفافۂ رد کا خط بہ کمالِ احتیاط روانہ ہوگیا۔ خاطرِ اقدس جمع رہے۔ جواب طلب، زیادہ حدِ ادب۔

دسمبر ۱۸۵۸ء

(۴)

جناب عالی

آج دوشنبہ ۳۔ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، پینے کو کچھ میسر نہیں[1]، ناچار روٹی کھائی ہے:

اُفق ہا پُر از ابرِ بہمن مہی
سفالینہ جامِ من از مے تہی

غمزدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا۔ سرنامے کو دیکھ کر اس راہ سے کہ دستخطِ خاص کا لکھا ہُوا ہے، بہت خوش ہُوا۔ خط کو پڑھ کر اس رو سے کہ حصولِ مدعا کے ذکر پر حاوی نہ تھا، افسردگی حاصل ہوئی:

ما خانہ رمیدگانِ ظلمیم
پیغام خوش از دیارِ ما نیست

اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا۔

پہلے تو یہ سُنیے کہ آپ کے دوست کو آپ کا خط پہنچ گیا، مگر وہ دو بار مجھ کو لکھ چکا ہے کہ میں جواب اس کا نشانِ مرقومۂ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں۔ جواب الجواب کا منتظر ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ کمالِ یاس مقتضی استغنا ہے، پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامیدِ مرگ جیتا ہوں، اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں کہ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے، ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے؟ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہے الہام سمجھیے، چاہے اوہام سمجھیے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند و طالب مرد
ور بپرسند در کدامیں سال — مُرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"

---

[1] یعنی شراب نہیں۔

اب بارہ سو پچھتر ہیں اور "غالب مرد" بارہ سو ستہتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو، پہنچ لے، ورنہ پھر ہم کہاں۔

۳۔ جنوری ۱۸۵۹ء

(۵)

قبلہ،

کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے؟ پنسن قدیم اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند۔ پنسن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے، سو ان کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب، نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب سُنیے اُدھر کی۔ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر، عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں[1]۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں اگر گنہ گار ہوں۔ گنہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں، مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے، تقلم چیف سکرتر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں: ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے، نہ اس کے قبول کی اطلاع، نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکرتر بہادر لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالیشان چیف سکرتر ہوئے؟ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرتر کا کام کس کو دے گئے؟ آپ کا حال کوئی نہیں کہتا کہ آپ کہاں ہیں؟ ہاں از روئے قیاس جانتا ہوں کہ آپ اسی منصب اور اسی دفتر میں شاد و شادماں ہیں۔ جو اب لفٹنٹی کے سکرتر ہوئے ہوں گے، اُن سے علاقہ رہتا ہوگا۔ میور صاحب بہادر سے کاہے کو ملنا ہوتا ہوگا؟ لفٹنٹ گورنری اور صدر بورڈ یہ دونوں محکمے الہ آباد آگئے یا آئیں گے، بہرحال آپ اب کیوں آگرہ کو جائینگے؟

نواب گورنر جنرل بہادر کی روانگی کی خبر میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۰۔ جنوری کو گئے، کوئی کہتا ہے فروری میں کوچ فرمائیں گے۔ میں تو ادھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، ہر طرح اپنی قسمت کو رو بیٹھا۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ حقیقت واقعی پر کماحقہ اطلاع حاصل ہو، تاکہ تسلی خاطر اور تسکین دل ہو۔ اگر ان مطالب کا جواب، نہ مجمل بلکہ مفصل، نہ بدیر بلکہ جلد، مرحمت کیجیے گا تو گویا مجھ کو مول لے لیجیے گا۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں؟

۳۰۔ جنوری ۱۸۵۹ء

---

[1] اس عطیہ شاہی سے مراد ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے صلہ مدح ہے، جس کی غالب نے خود تصریح کی ہے کہ ایک قصیدہ لارڈ ایلن برا کی وساطت سے بھجوایا تھا۔ وزیر اعظم برطانیہ نے لکھا کہ جو حکم جاری ہوگا، حکومتِ ہند کے ذریعہ سے جاری ہوگا۔ جنوری ۱۸۵۶ء میں یہ اطلاع میرزا کو پہنچی۔ دو تین مہینے خوش خوش امید میں گزارے۔ پھر "غدر" شروع ہو گیا۔ (دیکھیے مکتوب نمبر ۶)

(۶)

قبلہ حاجات،

قطعے میں جو حضرت نے الہام درج کیا ہے، وہ تو ایک لطیفہ بسبیل دعا ہے، مگر ہاں یہ کشف یقینی ہے اور مخدوم کی روشن دلی اور دُور بینی ہے کہ جو سوالات میں نے ۳۰۔جنوری کو کیے، ان کے جواب تم نے ۲۷۔جنوری کو لکھ کر بھیج دیے۔ کیوں نہ کہوں روشن ضمیر ہو؟ اگرچہ جوان ہو مگر میرے پیر ہو۔ خلاصہ تقریر یہ کہ ۳۰۔جنوری کو آخر روز میں نے ڈاک میں خط بھجوایا اور ۳۱ کو ڈاک کا ہرکارہ پہر دن چڑھے تمھارا خط لایا۔ سوالات میں ایک سوال کا جواب باقی رہا۔ یعنی جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر کی جگہ چیف سکرتر گورنمنٹ کلکتہ کون ہُوا؟ یہ دل میں پیچ و تاب باقی رہا۔

کتاب کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، واقعی یہ درست اور بجا ہے۔ جو کچھ واقع ہُوا، اُسکو مفید مطلب فرض کروں، لیکن اگر اجازت پاؤں تو اسی باب میں عرض کروں گا کہ پیش گاہ گورنمنٹ میں بتوسط چیف سکرتر بہادر سابق اور لفٹنٹ گورنر بہادر حال، دو مجلد پیش کیے ہیں۔ ایک نذر گورنمنٹ اور دوسری کے واسطے یہ سوال کہ میری عزّت بڑھائی جائے اور یہ مجلد حضور شاہنشاہی میں بھجوائی جائے۔ اچھا، نذر گورنمنٹ میں تو مولوی اظہار تحسین صاحب کا وہ اظہار ہے، نذر سلطانی کے ارسال و عدم ارسال میں کیا دار و مدار ہے؟ دو نسخے جوان دونوں صاحبوں کے پیش کش مقرر ہوئے ان میں سے ایک صدر بورڈ کے حاکم اور لفٹنٹ گورنر ہوئے، ردّ و قبول، نفرین و آفرین کچھ بھی نہیں۔ قیاساً جو چاہوں سو کروں، یقین کچھ بھی نہیں۔

۱۷۔دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہُوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ ایلن برا، سائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنسن کی تجویز ضرور ہے، جو حکم صادر ہوگا۔ سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۷۔دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمہ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے نوید تحسین نہیں، تو ولایت کو نذر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے قطع نظر نذر کے ولایت جانے کا یقین کیوں کر حاصل ہو، جہاں یہ تفرقہ اور بے التفاتی اور یہ دشواری اور یہ مشکل ہو؟ جی میں آتا ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر اور حاکم صدر بورڈ کو ایک عریضہ جُدا جُدا لکھوں، پھر یہ سوچتا ہُوں کہ انگریزی لکھواؤں، اور فارسی لکھوں اور دونوں صورتوں میں کیا لکھوں؟ کل کا بھیجا ہُوا خط اور یہ آج کا خط یقین ہے کہ دونوں معاً ایک وقت میں پہنچیں۔ وہ تو جواب طلب نہیں، اس کا جواب لکھیے اور بہت شتاب لکھیے۔

۳۱۔جنوری ۱۸۶۰ء

(۷)

حضور،

خدا کا شکر، پھر آپ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ نے خط لکھا اور میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش حکم نشتر کا رکھتی ہے۔ اب رگِ قلم کی خونابہ فشانی دیکھو۔ گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں سے جو تین بقیۃ السیف تھے، ان کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا، یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سر زمین مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادتِ قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں، دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایامِ "غدر" میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام کا لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنّہ محض ہے، امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تا کہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت موقوف، پنسن مسدود، وجہ نامعلوم۔ لا موجود الا اللہ و لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں۔ اس سال (۱۸۵۵ء میں) میرے شاگرد ہوئے۔ ناظمؔ ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھلا ہوا، ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رام پور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی[1] آیا۔ یہاں آپ کا خط محررۂ ۸۔ مارچ پایا۔ جواب بھیجا جاتا ہے۔

مارچ ۱۸۶۰ء

(۸)

در نومیدی بسے امید است
پایانِ شبِ سیہ سپید است

قبلہ،

آج آپ کی خوشی اور خوشنودی کے واسطے اپنی روداد لکھتا ہوں۔

---

[1] دہلی۔

توطیہ: ۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا "میں بھی چلوں"، فرمایا کہ "نہیں"۔ جب لشکر میرٹھ سے دلّی میں آیا، موافق اپنے دستور کے، روز ورود لشکر، مخیم[۱] میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا، اُن کے خیمہ میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہِ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ میں گدائے مبرم، اس حکم پر ممنوع نہ ہُوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسبِ معمول قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس ہو کر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔

واقعہ: اواخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دِلّی آئے۔ اہالی شہر، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرود حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا۔ دربار ہُوا۔ ہر ایک کامگار ہُوا۔ شنبہ ۸۔ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ بلایا گیا۔ مہربان پا کر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی، وہ بھی حاصل ہُوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنائتیں دیکھیں، جو میرے تصوّر میں بھی نہ تھیں۔

جملہ معترضہ: میر منشی لفٹنٹ گورنر سے سابقۂ تعارف نہ تھا، وہ بطریقِ حسن طلب میرے خواہاں ہُوئے تو میں گیا۔ جب حکام بمجرد استدعا مجھ سے بے تکلّف ملے، تو میں قیاس کرسکتا ہُوں کہ میر منشی کی حسن طلب بایمائے حکام ہوگی، وللہ حمن الطاف خفیہ۔

بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہُوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خان بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمھارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیّرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آ کر تمھارے علاقے کے سب کاغذ، انگریزی و فارسی، دیکھے اور با اجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہُوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ یا پندرہ دن بعد ادھر کو روانہ ہُوئے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ:

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

سہ شنبہ ۳۔ مارچ کو بارہ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا، خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا: "حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب کا حکم سن لیا، نہال ہو گیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہوں گا۔"

---

[۱] خیمہ گاہ

کارِ دنیا کسے تمام نکرد
ہرچہ گیرید مختصر گیرید

مارچ ۱۸۶۳ء

—— (۹) ——

جنابِ عالی!

ایک شعر اُستاد کا مدت سے تحویلِ حافظہ چلا آتا ہے:

ظالم! یہ میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے از راہِ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی:

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

تم اخوان الصفا میں سے ہو۔ تمھاری آزردگی اوروں کی مہربانی سے خوشتر ہے۔

ہاں حضرت، کیسے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی؟ وہ مجموعۂ اُردو چھپا یا چُھپا ہی رہے گا؟ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسرحد تقاضا پہنچا دیا ہے۔

میرا حال سُنیے۔ لارڈ کے ننگ صاحب نے بعد فتح دہلی میرا قصیدہ مجھ کو واپس بھیج دیا۔ صاحب سکرتر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایامِ غدر میں بادشاہِ باغی کے مصاحب رہے، اب گورنمنٹ کو تم سے راہ و رسم آمیزش منظور نہیں۔ ناچار چپ ہو رہا۔ بے حیا ہوں، لارڈ ایلگن صاحب بہادر کے وقت میں پھر موافقِ معمول قصیدہ شملہ کے مقامات پر بھیج دیا۔ خلافِ تصور بحسب دستورِ قدیم چیف سکرتر بہادر کا خط آگیا۔ وہی افشانی کاغذ، وہی القاب، وہی تحسینِ کلام، وہی اظہارِ خوشنودی۔ اب جو یہ امیرِ کبیر وائسرائے قلمرو ہند ہوئے،[1] میں خدمتِ دیرینہ بجا لایا۔ ۱۳۔ فروری ۱۸۶۴ء حال کو قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا۔ آج تک کہ ۷۔ مارچ کی ہے، جواب نہیں پایا۔ باوجود سوابق معرفت رسمِ قدیم کا عمل میں نہ آنا خاطر آشوب کیوں نہ ہو؟:

بیدل نیم ہنوز بہ بلینم چہ میشود

۷۔ مارچ ۱۸۶۴ء

---

[1] غالباً اس سے مراد لارڈ لارنس ہے۔

(۱۰)

قبلہ

میرا ایک شعر ہے:

خود پیشِ خود کفیل گرفتاری من است
ہردم بہ پرسشِ دل مایوس مے رسد

یہ معاملہ میرا اور آپ کا ہے۔ خارج سے مسموع ہُوا کہ میں نے جو اغلاط "برہان قاطع" کے نکال کر ایک نسخہ موسوم بہ "قاطع برہان" لکھا ہے اور ایک مجلد اس کا آپ کو بھی بھیج دیا ہے، آپ اس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ باور نہیں آیا، لیکن عجب آیا۔ ایک مولوی نجف علی ہیں، باوجود فضیلت علم عربی، فارسی میں ان کا نظیر نہیں۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال نے اہل دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے، مسمی بہ "محرق قاطع برہان"۔ انھوں نے اس کی توہین اور مسودہ کی تفضیح میں دو جزو کا ایک نسخہ مختصر لکھا ہے اور ایک طالب علم مسمی بہ عبدالکریم نے سعادت علی مؤلف "محرق قاطع" سے سوالات کیے ہیں اور ایک محضر اس نے لکھوا ے علمائے شہر مرتب کیا ہے[1]۔ ایک میرے دوست نے بصرف زر اس کو چھپوایا ہے۔ ایک نسخہ اس کا آج اسی خط کے ساتھ بسبیل پارسل ارسال کیا ہے۔

اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے، پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہُوا کرتا ہے۔ امرا سے لے کر اہل حرفہ تک قطب جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمان و ہنود دونوں فرقوں کی شہر میں دکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور شہاب الدین خاں اور میرے دونوں لڑکے سب قطب گئے ہُوئے ہیں۔ اب دیوان خانہ میں ایک میں ہُوں اور ایک داروغہ اور ایک بیمار خدمتگار۔ بھائی صاحب وہاں سے آئیں گے تو مقرر آپ کو خط لکھیں گے۔ بڑے پہاڑ سے اُترے، چھوٹے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ عدم تحریر کی وجہ یہ ہے۔

۱۸۶۴ء

(۱۱)

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہُوا تھا

پیر و مرشد،

خفا نہیں ہُوا کرتے۔ یُوں سنا، مجھے باور نہ آیا، یہاں تک تو میں موردِ عتاب نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا استعجاب پر ہے۔ محلِ استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ "قاطع برہان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیاء کا یہ حال ہے، وائے بر حال ہم اشقیا کے۔ یہ حکایت ہے شکایت

---

[1] یہ سوالات غالب نے خود مرتب کیے تھے۔

نہیں۔ میں دنیاداری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں، لیکن فقیر آزاد ہوں، نہ شیّاد، نہ کیّاد۔ ستّر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں، ستّر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خاص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولا دیکھے، ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ، لیکن وہ مرحوم حسنِ صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوسرا دوست خیر خواہِ خلق، حسن و جمال، چشمِ بددور، کمال مہر و وفا صدق و صفا، نورٌ علیٰ نور۔ میں آدمی نہیں، آدم شناس ہوں:

نگہم نقب ہمے زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم

غایت مہر و محبت، جس کے ملکہ کا تم کو مالک سمجھا ہوں، وہ بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پہلے دو آدمیوں کو اپنا ماتم دار سمجھا ہوا تھا۔ ایک کو تو میں رو لیا، اب اللہ آمین ایک دوست رہ گیا۔ دعائیں مانگتا ہوں کہ خدایا اس کا داغ نہ مجھے دکھائیو۔ اس کے سامنے مروں۔ میاں، میں تمھارا عاشق صادق ہوں۔ بھائی ابھی قطب سے نہیں آئے۔ "دافع ہذیان" کے دو مجلد اور بھیج دوں گا۔

سنہ ۱۸۶۴ء

(۱۲)

پیر و مرشد،

کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں، مولوی عبدالغفور ان کا نام اور نسّاخ ان کا تخلّص ہے۔ میری ان کی ملاقات نہیں۔ انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ "دفترِ بے مثال" مجھ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثرِ اردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں اور یہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح، یا چھپے کا بالضم؛ چھپ چکا ہو تو حقِ تصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمّت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے۔ والسّلام ۱۲

سنہ ۱۸۶۴ء

(۱۳)

قبلہ،

آپ کا پہلا خط آیا اور میں اس کا جواب لکھنا بھول گیا۔ کل دوسرا خط آیا مگر شام کو اسی وقت پڑھ لیا۔ آدمی کے حوالے کیا۔ اس نے آج صبح دم مجھ کو دیا۔ میں جواب لکھ رہا ہوں۔ بعد اختتامِ تحریر معنون کر کے ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ والیِ رام پور کو خدا سلامت رکھے۔ اپریل، مئی ان دونوں مہینوں کا روپیہ موافق دستورِ قدیم آیا۔ جون ماہ آئندہ کا روپیہ خدا چاہے تو آ جائے۔ جمعہ ۷۔ جولائی ہے۔ معمول یہ ہے کہ دسویں بارھویں کو رئیس کا خط مع ہنڈوی آیا کرتا ہے۔ میں نے قصیدۂ تہنیت جلوس بھیجا۔[۵۱]

---

۵۱ تجلّی کرز موسیٰ ربود ہوش بہ طور
بہ شکلِ کلب علی خاں دگر نمود ظہور
(باقی بر صفحہ ۲۸۱)

اس کا جواب آگیا۔ اب میں نظم ونثر کا مسودہ نہیں رکھتا۔ دل اس فن سے نفور ہے۔ دو ایک دوستوں کے پاس اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰)

خجستہ سرورِ سلطان شکوہ را نازم — کہ رشک بر کلہش دارد افسر فغفور
ہوائے لطف وے از جان خور برد سوزش — نگاہِ قہر وے از روے مہ رباید نور
دم نگارش وصفِ کلام شبیر نبشش — چو خیلِ مور دود بر ورق حروفِ سطور
فضاے رزمگہش شاہراہ قہر و غضب — بساط بزمگہش کارگاہ سور و سرور
بخوان شرعِ نبیں ہم نوالۂ شبلی — بہ بزم عشقِ نبیں ہم پیالۂ منصور
زروے رابطۂ حسن، ماہتاب جمال — بحسبِ ضابطۂ جاہ، آفتاب ظہور
بحکمِ مرتبہ، او حاکم و فلک محکوم — ز راہِ قاعدہ، شرع آمراست و او مامور
چو آبِ سیل روانے کہ الیند بہ مغاک — بود ہمیشہ بہ فنجانِ وے شراب طہور
زہے وزیر وخہے شہریارِ دانا دل — تو شاہِ کشورِ حسن و خرد ترا دستور
بناے منظرِ جاہِ ترا زحل معمار — ثوابتِ کرۂ چرخ ہشتمیں، مزدور
ثنا گرِ تو سکندر بہ بارجاے جلال — قفا خورِ تو ارسطو بدرسگاہِ شعور
براے بزم نشاط تو شمع چوں ریزند — ق — ز بیہ گاو بکا آورند و نے کافور
ز فیضِ نسبت خُلق تو عنبرِ سارا — بجاے موم بر آید ز خانۂ زنبور
بدیں خرام و بدیں قامت و بدیں رفتار — ق — ز بہر فاتحہ آئی اگر لیسوے قبور
جہانِ جانی و جانِ جہاں عجب نبود — کہ از ورود تو ہر مردہ رقصد اندر گور
بہ پیشگاہِ تو زانو ہمے زند انصاف — ق — کہ اے بہ رحم و کرم در جہانیاں مشہور
در انتقام کشی شیوۂ کرم مگزار — بر آر کامِ دلِ بد سگال از ساطور
توئی بہ فضل فزایندۂ عروج علوم — توئی بہ علم کشایندۂ عقودِ صدور
صریرِ خامۂ من بیں کہ مے رباید دل — چنانکہ از لبِ داوٗدؑ استماعِ زبور
سوادِ صفحہ من بیں و تابشِ معنی — عیاں چو شمع فروزندہ در شبِ دیجور
امیرِ زندہ دل، آں والیِ ولایتِ نظم[1] — بہ گنج خانۂ گنجہ نظامیش گنجور
غروبِ مہر و طلوعِ مہ دو ہفتہ بود — رسیدن تو بدیں اوج بعد آں مغفور[2]
چوں او بزیرِ زمین رفت، آں ولایت یافت — تو باش والیِ روے زمیں، قرون و دہور

---

[1] ایک نسخہ ناظم ولایت نظم [2] یوسف علی خاں والد کلب علی خاں

نقل ہے۔ ان کو اس وقت کہلا بھیجا ہے۔ اگر آج آگیا، کل اور اگر کل آیا، پرسوں بھیج دوں گا۔ بھائی امین الدین خاں کے اصرار سے خسرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے۔ علاؤالدین خاں نے اس کی نقل ان کو بھیج دی ہے۔ میں دیوان پر نہیں چڑھاتا۔ مسودہ بھیجتا ہوں[1]۔ تقدیم و تاخیر ہندسوں کے مطابق ملحوظ رہے۔ گرمی کی شدت سے حواس بجا نہیں، معہذا امراضِ جسمانی و

بقیہ:

برانجمن نہ رسیدم ز ناتوانائی — ولے بہ عرضِ ثنا و دعانیم معذور
بخاکِ پائے تو، گر دستگاہ داشتمے — نبودمے بغمِ دوریِ درِ تو صبور
من آں کسم کہ زافراطِ ورزشِ اخلاص — بغیبت است مرا دعویِ دوامِ حضور
توئی رحیم دل و من سقیم، دوری بہ — مباد رنجہ شوی از نظارۂ رنجور
کفے بدست تہی تر ز کیسۂ دلاک — ولے بہ سینہ بسے تنگ تر ز دیدۂ مور
کمی ز ما و کرم از شما بلا تشبیہ — ز کردگار بود رحمت و ز بندہ قصور
نظر بہ خستگی و پیری و تہیدستی — قبول کردنِ تسلیمِ من خوش است زدور
شعارِ غالبِ آزادہ جز دعا نبود — کہ باد سعی دعا گوے در دعا مشکور
بدہر تا بود آئین کہ در نوا آرند — رباب و بربط و قانون و نے بمحفلِ سور
بہ بزمِ عیشِ تو ناہید باد زمزمہ سنج — نسیم عطر فروشش از شمیمِ طرۂ حور

محب ز لطف تو بالندہ چوں نوا از ساز
عدو ز بیم تو نالندہ چوں خم از طنبور



[1] غزل:

ہم انا اللہ خواں درختے را بہ گفتار آورد — ہم انا الحق گوے مردے را سرِ دار آورد
اے کہ پنداری کہ ناچار است گردوں در روش — نیست ناچار آنکہ گردوں را بہ رفتار آورد
نکتۂ داریم و با یاراں نمے گوئیم فاش — طالبِ دیدار باید تابِ دیدار آورد
آں کند قطعِ بیاباں، ایں شگافد مغزِ کوہ — عشق ہریک را بطرزِ خاص در کار آورد
جذبِ شوقش بیں کہ در ہنگامِ برگشتن زِ دیر — در قفاے خویشتن بت را بہ رفتار آورد
دانہ ہا چوں ریزد از تسبیح، تارے بیش نیست — ایں مشعبد دہر گاہ از سبحہ زنار آورد
آہِ ما را بیں کہ نارد از دلِ سختش خبر — باد را نازم کہ ابر از سوے کہسار آورد
نزدِ ما حیف است گو نزدِ زلیخا میل باش — جذبۂ کز چاہ یوسفؑ را بہ بازار آورد
ہر انارے را کہ افشاریم از وے خوں چکد — ہر نہالے را کہ بنشانیم دل بار آورد
نیست چوں در منطقش جز ذکرِ شاہد حرف و صوت — شاہدے باید کہ غالب را بہ گفتار آورد



آلامِ روحانی۔

۲۰ جولائی ۱۸۶۶ء

(۱۴)

بندۂ گنہگار شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پہ مثلِ بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں:

پاے کہ کشم ہزار نفریں بر خویش
الا بہ زبانِ جادۂ راہِ وطنش

خواجہ صاحب[1] کی رحلت کا اندوہ، بقدرِ قرب و قرابت آپ کو، اور باندازۂ مہر و محبت مجھ کو۔ وہ مغفور میرا قدردان اور مجھ پر مہربان تھا۔ حق تعالیٰ اس کو اعلیٰ علیین میں بسبیلِ دوام قیام دے۔ رام پور ہی میں تھا کہ "اودھ اخبار" میں حضرت کی غزل[2] نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے! ابداع اسی کو کہتے ہیں۔ جدتِ طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ زبانانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے اور دکھنی صاحب "برہانِ قاطع" کے جھگڑے میں بخلاف اور فارسی دانوں کے توفیقِ انصاف عطا کرے۔ لو اب اس کا جواب جلد بھیجو تا یہ طریقہ مسلسل ہو جائے۔

۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء

۱؎ خان بہادر سید محمد خاں۔ ملاحظہ ہو خط ۱۵

۲؎ جس غزل کا حوالہ دیا وہ ذیل میں درج ہے:

چشم کہ باز شد ز خواب؛ فتنہ از و بکار سوست — پردہ ز رخ کہ برکشاد؛ مہر ز شرم لعل روست
رخصت خود بآب رفت عارضِ شرمگیں کہ شستہ است؟ — غرقۂ آبِ حیرت است آئینہ ہا کہ لعل بروست
جامہ کہ کرد زیبِ تن؛ صبح درید پیرہن — بندِ قبا کہ بستہ است؛ نکہتِ گل بہ بندِ اوست
خانہ بدرخ کہ برکشید؛ رنگ بروے گل شکست — ابروے کیست، دستہ تاب؛ گردنِ خلق تیغ جوست
دست کہ در حنا گرفت؛ لالہ تہِ خوں نشستہ است — چشم کہ مستِ سرمہ گشت؟ ناطقہ سرمہ در گلوست
جامِ صبوح کہ زد؛ شیشہ بسجدہ مے ردہ — مے ز لبِ کہ کام یافت جوشِ نشاط در سبوست
چہرہ ز مے کہ برفروخت؛ نشاہ ذوق شد بلند — زلف کہ بہ بوے برفشاند؛ موجِ نسیم مشکبوست
تیغ نگہ کہ آب داد؛ گشتہ فگار سینہ ہا — نوکِ مژہ کہ تیز کرد؛ دامنِ زخم بے رفوست
غنچہ زخندہ لب، بہ لب رنگِ تبسم کہ دید؟ — در گہر آبرو نماند، لعل کہ گرمِ گفتگوست؟
حرفِ نگہ کہ برشکست؛ شیشۂ دل شکستہ شد — قامتِ خود کہ راست کرد؛ نخلِ مراد در نموست

—(۱۵)—

مولانا!

بندگی۔ آج صبح کے وقت شوقِ دیدار میں بے اختیار، نہ ریل، نہ ڈاک، توسنِ ہمت پر سوار چل دیا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤں گا، مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچوں گا۔ اتنا بے خود ہوں کہ جب تک تم جواب نہ دو گے، میں نہ جانوں گا کہ کہاں پہنچا اور کب پہنچا۔

آپ کا پہلا خط رام پور سے دِلّی آیا۔ میں راہ میں تھا۔ پھر دِلّی سے خط رام پور پہنچا۔ میں وہاں بھی نہ تھا۔ خط دِلّی روانہ ہُوا۔ اب کئی دن ہُوئے کہ میں نے ڈاک سے پایا، اس حال میں کہ میں بیمار تھا۔ معہٰذا جاڑے کی شدت، مہاوٹ کا مینا، دُھوپ کا پتا نہیں، پردے چھٹے ہُوئے، نشیمن تاریک۔ آج نیّرِ اعظم کی صورت نظر آئی۔ دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ خط لکھ رہا ہُوں۔ حیران ہوں کہ کیا لکھوں؟ اس خط کے مضامینِ اندوہ فزا نے دل کو مضمحل کر دیا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مغفور تمہارے ماموں ہیں[1]، مگر ان کے اور تمہارے معاملات مہر و ولا جیسے کہ تمہاری تحریر سے اب معلوم ہُوئے، میرے دل نشین نہ تھے۔ ایسے محب کا فراق اور پھر بقیدِ دوام کیونکر جانگزا نہ ہو، حق تعالیٰ ان کو بخشے اور تم کو صبر دے۔

حضرت میں بھی اب چراغِ سحری ہوں رجب ۱۲۸۲ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتّرواں سال شروع ہو گیا۔ طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی۔ بقول نظامی:

یکے مردہ شخصم بمروی رواں

آج میں اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش آ گیا۔ مہینے بھر سے حجامت نہیں بنوائی۔ خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہُوں اور خط بنواتا ہُوں[2]۔

—(۱۶)—

قبلہ

پیری و صد عیب۔ ساتویں دہا کے کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دوری تھا، اب دائمی ہو گیا۔ مہینے بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاء حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر معدوم نہ کہو تو بمنزلۂ مفقود

بقیہ: موُئے کمر کہ تاب دادِ رشتہ جاں زہم گسیخت ٭ امن ناز را کہ ہشت ٭ خاکِ زمین بہ آبرو ست

بر سر زمیں کہ بر نشست ٭ رفتہ ز کفِ عنانِ صبر ٭ سُوئے چمن کہ میرود ٭ بادِ صبا بہ رُفت و رُو ست

بخت کجا ست بے خبر؟ تا برکاب او دوم

بر سرِ رہ نشستہ ام، نیم نگاہم آرزو ست

[1] خان بہادر سید محمد خاں جو غلام غوث خاں کے ماموں تھے۔ [2] یہ خط اوائل ۱۸۶۶ء کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں دوسرے سفر رام پور کا ذکر ہے۔

کھو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں۔ اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں، مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں۔

میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے "بوستانِ خیال" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقا اس کا بصورتِ پارسل بلکہ بہ ہیئت خط بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ ہے سو نقل کر لیجیے[1]۔ میرا مدعا اس دو ورقے کے ارسال سے یہ ہے کہ اگر آپ کے پسند آوے یا اور اشخاص خرید کرنا چاہیں تو چھ روپے قیمت اور محصول بذمّہ خریدار ہے۔

سنہ ۱۸۶۶ء

——(۱۷)——

قبلہ

میں نہیں جانتا کہ ان روزوں میں بقول ہندی اختر شناسوں کے کون سی کھوٹی گرہ آئی ہوئی ہے کہ ہر طرف سے رنج و زحمت کا ہجوم ہے۔ مولوی صاحب سے میری ایک ملاقات ہوئی، جب وہ دلّی آئے تھے اور میر خیراتی کے گھر اترے ہوئے تھے۔ شرفا میں تعارف بنائے محبت و مودت ہے، چہ جائے آنکہ معانقہ اور مکالمہ اور مشاعرہ واقع ہوا ہو۔ روزِ ملاقات سے اس دن تک کہ حضرت دکن کو روانہ ہوں کوئی امر ایسا کہ باعث ناخوشی کا ہو، درمیان نہیں آیا اور میرے اس قول کی، اس راہ سے کہ مولوی صاحب آپ کے ہمنشیں و ہمدم تھے اور مجھ میں اور آپ میں پیوندِ ولائے روحانی متحقق ہے، آپ بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مجھ میں اُن میں رنج پیدا ہوتا تو آپ بہت جلد اصلاح بین الذاتین کی طرف متوجہ ہوتے۔ اب سُنیے حال منشی حبیب اللہ کا، میں نے ان کو دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ تین چار برس ہوئے کہ ناگاہ ایک خط حیدرآباد سے آیا۔ اس میں دو غزلیں۔ خط کا مضمون یہ کہ میں مختار الملک کے دفتر میں نوکر ہوں، آپ کا تلمذ اختیار کرتا ہوں۔ ان دونوں غزلوں کو اصلاح دیجیے۔ اس امر کے وہ بادی نہیں، بریلی اور لکھنؤ اور کلکتہ اور بمبئی اور سورت سے اکثر حضرات نظم و نثر فارسی اور ہندی بھیجتے رہتے ہیں۔ میں خدمت بجا لاتا ہوں اور وہ صاحب میرے حک و اصلاح کو مانتے ہیں۔ کلام کا حسن و قبح میری نظر میں رہتا ہے اور ہر ایک کا پایہ اور دستگاہ، فنِ شعر میں معلوم ہو جاتا ہے۔ عادات و عندیات عدم ملاقاتِ ظاہری کے سبب میں کیا جانوں۔ آمدم برسرِ مدعا۔ منشی حبیب اللہ ذکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھیجتا رہا۔ بعد وارد ہونے مولوی صاحب کے ایک غزل ان کی آئی اور انھوں نے یہ لکھا کہ مولوی غلام امام شہید[2] اکبرآبادی کی غزل پر یہ غزل لکھ کر بھیجتا ہوں۔

---

[1] یعنی "عودِ ہندی" کے لیے جو زیرِ ترتیب تھی۔ [2] مولوی غلام امام شہید نواح لکھنؤ کے تھے۔ مولوی حیدر علی سے علوم متداولہ پڑھے۔ فنِ شعر میں قتیل، مصحفی اور غلام مینا ساحر سے مشورہ لیا۔ حیدرآباد سے محی الدولہ نے ایک ہزار روپے زادِ راہ دے کر بلایا۔ حج کے لیے گئے تو نواب سرسالار جنگ اور راجا گردھاری پرشاد نے کشادہ دلی سے امداد دی۔ نواب صدیق حسن خاں نے اپنے تذکرۂ شعرا میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس خط میں مولوی صاحب سے شہید ہی مراد ہیں۔

میں نے حسبِ معمول غزل کو اصلاح دے کر بھیجا اور یہ لکھا کہ مولانا شہید اکبر آباد کے نہیں لکھنؤ اور الٰہ آباد کے ہیں۔ اس کلمہ سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی۔ اس میں سے توہین کے معنی مستنبط ہوں تو میں ان کا مستہنؔ سہی۔ اب میں نہیں جانتا کہ منشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا۔

(۱۸)

حضرت پیر و مرشد،

اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحبِ فراش ہوں۔ اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں؛ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار ان کے آئے، اصلاح دے دی، منشاء اصلاح جا بجا حاشیے پر لکھ دیا۔ کل جو عنایت نامہ آیا اس میں بھی دیباچہ کا اشارہ اور تفتہ کے خطوط کا حکم مندرج پایا۔ ناچار تحریرِ سابق کا اعادہ کر کے حکم بجا لایا۔

ناظرینِ "قاطع برہان" پر روشن ہوگا کہ "نامراد" اور "بے مراد" کا ذکر مبنی اس پر ہے کہ عبدالواسع ہانسوی "بے مراد" کو صحیح اور "نامراد" کو غلط لکھتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کہ ترکیبیں دونوں صحیح، لیکن "بے مراد" غنی کو کہتے ہیں اور "نامراد" محتاج کو۔ اب آپ کے نزدیک اگر ان دونوں کا محلِ استعمال ایک ہی ہو تو میرا مدعائے اصلی یعنی "نامراد" کی ترکیب کا علی الرغم عبدالواسع کے صحیح ہونا فوت نہیں۔ شعر میرزا صائب:

نامرادی زندگی بر خویش آساں کردن است
ترکِ جمعیت دلِ خود را بساماں کردن است

یہاں "نامرادی" "بے مرادی" کے معنی کیوں کر دے گی؟ اغنیا، خواہ اہلِ توکل، خواہ اہلِ تموّل، متموّلین پر کبھی کام آسان نہیں ہوتا بلکہ مفلسوں سے زیادہ ان پر مشکلیں ہیں۔ رہے اہلِ توکل ان کی صفتیں اور ہیں اور وہ اہل اللہ ہیں، مقربانِ بارگاہِ کبریا ہیں۔ دنیا پر پشت پا مارے ہوئے ہیں۔ کام ان پر کب مشکل تھا کہ انھوں نے اس کو آسان کر دیا؟ "نامراد" صیغہ مفرد ہے مساکین کا۔ اصناف مساکین کی شرح ضرور نہیں۔ سختی کشی، بے نوائی، تہیدستی، گدائی، یہ اوصاف ہیں مساکین کے۔ ان صفات میں سے ایک صفت جس میں پائی جائے وہ مسکین، وہ نامراد۔ البتہ مساکین پر، نہ ایک کام بلکہ سب کام آسان ہیں۔ نہ پاسِ ناموس و عزت، نہ جاہ و تمکنت۔ نہ کسی کے مدعی، نہ مدعا علیہ۔ دن رات میں دو بار روٹی ملی، بہت خوش۔ ایک بار ملی، بہر حال خوش۔ خدا کے واسطے مولانا صاحب کے شعر میں سے نامراد بمعنی کسے کہ ہیچ مراد نداشتہ باشد کیوں کر ثابت ہوتا ہے؟ مساکین کی زندگی، جیسا میں اوپر لکھ آیا ہوں، آسان گزرتی ہے یا اغنیا کی؟ رہا مولوی معنوی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر:

ؔ توہین کرنے والا۔

عاقلاں از بے مرادیہائے خویش

باخبر گشتند از مولائے خویش

میں نے مثنوی کے ایک نسخہ میں عاقلاں کی جگہ عاشقاں دیکھا ہے۔ بہ ہر صورت معنی یہ ہیں کہ عشاق یا عقلا بعد ریاضت شاقہ ماسوائے اللہ سے اعراض کر کے بے مراد اور بے مدعا ہو گئے۔ یہ پایۂ تسلیم و رضا ہے۔ البتہ اس رتبے کے آدمی کو خدا سے لگاؤ پیدا ہو گا ۱۲

باخبر گشتند از مولائے خویش

یہاں بھی "بے مرادی" سے "نامرادی" کے معنی نہیں لیے جاتے، مگر ہاں:

بے مرادی مومناں از نیک و بد

دوسرا مصرع:

در بجلی بے مرادت داشتی

ان دونوں مصرعوں میں "نامراد" اور "بے مراد" کے معنی خلط واقع ہو گیا ہے۔ خیر "بے مراد" اور "نامراد" ایک سہی۔ ہر چند دوسرے مصرع مولوی میں "بے مراد" کے معنی بے حاجت کے درست ہوتے ہیں، مگر:

من کہ رندم شیوۂ من نیست بحث

زیادہ تکرار کیوں کروں، معہذا مصرع اول کی کچھ توجیہہ بھی نہیں کر سکتا۔ "نامراد" کی ترکیب کی صحت علی الرغم عبدالواسع ثابت ہو گئی۔ ثبت المدعا۔ کمال یہ کہ مانند "ناچار" و "بیچارہ" اور "ناانصاف" اور "بے انصاف" کے "نامراد" "بے مراد" کا بھی مورد استعمال مشترک رہا۔ والسلام ۱۲

(۱۹)

بندہ پرور!

اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے تو اس مجموعہ کا چھپ جانا، بالفتح میں نہیں چاہتا، بلکہ چھپ جانا، بالضم، چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر

آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں۔ پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟

حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا، ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں صحیح یوں ہے:

تم کے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں

قبلہ، بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

والسلام بالوف الاحترام ۱۲

سنہ۱۸۶۶ء

(۲۰)

قبلہ،

کل خط آیا، آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے آپ کا ایک فقرہ لکھ کر اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں اور آنکھ سے آنسو نکل آئیں۔ فقرہ: "بڑھاپے میں کیا جانیے کہاں کی حرارت مزاج میں آگئی"۔ فقط

کیوں صاحب بڈھوں میں اپنا نام لکھوایا تو مجھ کو لازم ہے، میں اپنے کو اموات میں گنوں۔ تمھاری عمر میرے نزدیک پچاس سے متجاوز نہ ہوگی، اگر تجاوز کر گیا ہوگا تو دو تین برس سے وہ تجاوز زیادہ نہ ہوگا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور تم ہم عمر ہو۔ وہ کچھ کم پچاس برس، تم کچھ اوپر پچاس۔ ابھی تم دونوں صاحبوں کو ایک سو بیس برس سے ستر برس یا کچھ کم ستر برس باقی ہیں ۱۲

"بنا بر آب رسیدن" لازمی اور "بنا بر آب رسانیدن" متعدی بہ اجماع جمہور اضداد میں سے ہے۔ ہم بمعنی استحکام وہم بمعنی انہدام۔ درصورت استحکام نیو کا گہرا کھودنا ملحوظ ہے اور درصورت انہدام لطمۂ امواج سیلاب مدنظر ہے۔ آپ کے لکھے ہوئے دونوں شعر مفید معنی خرابی ہیں۔ صائب:

بنائے عمر مسیح و خضر بہ آب رسید

یعنی ویران ہوگئی، ڈھے گئی، حال آنکہ وہ یقیناً جاودانی تھی:

ہنوز تشنۂ خون است تیغ مژگانش

باآنکہ تیغ مژہ نے دو زندۂ جاوید کو مارا مگر اب تک تشنۂ خوں ہے۔ تشنہ بمعنی مشتاق اور خون بمعنی قتل اور بنائے عمر بہ آب رسیدن استعارۂ اہلاک:

ہزار میکدہ را محتسب بہ آب رساند

بنائے صومعۂ شیدِ ہم چناں برپاست

بنائے میکدہ غلط، ہزار میکدہ صحیح ہے۔ کلیم کے دیوان میں موجود ہے۔

بمعنی استحکام، نعمت خاں عالی کہتا ہے:

نیست محکم گر رسد بنیاد دنیا تا بہ آب

چوں حباب ایں خانہ بے بنیاد مے سازیم ما[1]

صائب کہتا ہے:

چگونہ شمع تجلّی ز رشک نگدازد

رخ تو خانہ آئینہ را بہ آب رساند

---

[1] عودِ ہندی مطبوعہ میں "مے دانیم ما" تھا، لیکن عالی کی پوری غزل کی ردیف "مے سازیم ما" ہے۔ لہٰذا میں نے تصحیح کر دی۔



برنون موقوف ۱۲

غالب کہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر توغل[1] رہے تو ہزار ہا بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سات شعر امیر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے، وہ مجلسوں میں گانے لگا۔ اکبر آباد لکھنؤ تک مشہور ہوئے۔ وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

از جسم بجاں نقاب تا کے   این گنج دریں خراب تا کے

ایک صاحب آگرہ میں اور ایک صاحب لکھنؤ میں معترض ہوئے کہ "گنج در خرابہ باید نہ در خراب"۔ ہر چند کہا کہ "خرابہ" مزید علیہ، اصل لغت "خراب" عربی الاصل، بہ معنی ویران و ویرانہ ہے، جس کی ہندی اوجڑ۔ معترض مُصر رہا۔ صائب کے دیوان میں سے یہ مطلع نکلا:

بہ فکرِ دل نہ فتادی بہیچ باب دریغ   بہ گنج راہ نہ بُردی دریں خراب دریغ

۱۸۶۶ء

—— (۲۱) ——



قبلہ

آج تیسرا دن ہے کہ میں "بنا بہ آب رسیدن" و "بآب رسانیدن" کی حقیقت باستناد اشعار اساتذہ لکھ کر بسبیل ڈاک بھیج چکا ہوں۔ آج اس وقت بھائی ضیاء الدین خاں صاحب آئے اور اس امرِ خاص میں کلام کے بادی ہوئے۔ میری تقریر سُن کر کہنے لگے کہ "آب در بنا رسیدن" .... و "آب در بنا رسانیدن" کے باب میں متردد ہیں کہ آیا یہ ترکیب جائز ہے یا نہیں؟ اب میں متنبہ ہوا کہ واقعی جو میں نے لکھا وہ سوال دیگر، جواب دیگر تھا۔ ستر برس کا پیر خرف، حواس در معرضِ تلف، اگرچہ سوال کو غلط سمجھا لیکن جواب غلط نہیں لکھا۔ رسیدن بنا بآب ہم بہ معنی استحکام بنا و ہم بہ معنی انہدام بنا، درست۔ فقط

اب "آب در بنا رسیدن" و "رسانیدن" کی کیفیت سُنیے: فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی، پس میں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا۔ جانبِ غلطی میرے نزدیک راجح ہے۔ آپ جب تک کلام اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں، اس کو جائز نہ جانیے گا۔ مگر کلام، سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے، نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔

میرا ایک مطلع ہے:

از جسم بجاں نقاب تا کے
این گنج دریں خراب تا کے

---

[1] انہماک، زیادہ سے زیادہ دیکھتے رہنا۔

ایک گروہ معارض ہوا کہ گنج کو "خرابہ" کہو، نہ "خراب"۔ میں متحیر کہ یارب کس سے کہوں؟ "خرابہ" مزید علیہ "خراب" ہے، مثل "ویران و ویرانہ" و "موج و موجہ"، الحاق ہائے ہوز سے لغت دوسرا نہیں پیدا ہوا۔ بارے صائبؔ کے دیوان میں ایک مطلع نظر آیا:

بفکرِ دل نہ فتادی بہیچ باب دریغ
بگنج راہ نہ بُردی دریں خراب دریغ

یہ مطلع لکھ کر معترض صاحبوں کو بھیج دیا کہ غالبؔ کو دردسر نہ دیجیے، جو پوچھنا ہو صائب سے پوچھ لیجیے۔ عارف علی شاہ خراسانی نے اسی مطلع پر:

از جسم بجاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

تین اعتراض کیے تھے، پہلا نقاب کے ساتھ عارض و رُخ کا ذکر بھی ضرور تھا، وہ نہیں ہے۔ دوسرا گنج تو ویرانے ہی میں ہوتا ہے۔ پھر اس پر تاسف ہی کیا، جو کہتے ہیں "تا کے"، تیسرا "ویرانہ" کو "خرابہ" کہتے ہیں، نہ "خراب" اور ان اعتراضوں کے بعد انھوں نے دخل کیا تھا:

از جسم بجاں حجاب تا کے
گل بر رُخِ آفتاب تا کے[1]

۱۸۶۶ء

—(۲۲)—

قبلہ

دیکھیے، ہم عارف ہیں، اور دو نامہ سے پہلے جواب نامہ لکھتے ہیں۔ دن بھول گیا ہوں، غالب ہے کہ آج تیسرا دن ہوا صبح کو میں نے "آب در بنارسیدن" کی بحث میں خلاصۂ تحقیق لکھ کر ارسال کیا، اسی دن شام کو آپ کا خط آیا، بقیہ جواب اب لکھتا ہوں۔

نقاب اس شعر میں بہ معنی حائل ہے، "حول" کو وجہ و رخ کی خصوصیت نہیں، دو چیزوں کے بیچ میں جو شے آجائے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو چیز ایک چیز کی مانع نظارہ ہے، وہ نقاب ہے اس شیِ نامرئی کا۔ رُخ بمناسبت نقاب مقدر ہے اور یہ تقدیر جائز اور بلیغ ہے۔ حجاب کا یہاں اوپری یعنی بے محل اور ناملائم ہونا بشرط عقلِ سلیم و طبعِ لطیف ظاہر ہے۔ گِل، خاک باآب آمیختہ کو کہتے ہیں۔ وہ رخ آفتاب تک کہاں پہنچے؟ ہاں گرد و غبار میں آفتاب چھپ جاتا ہے۔ اس کا استعمال ازروے مجاز جائز ہے۔

---

[1] اعتراضات کا جواب، اگلے خط میں ملاحظہ فرمائیے۔

"گنج در ویرانہ تا کے" یہ بہت لطیف بات ہے۔ یعنی افسوس کیا جاتا ہے اس گنج کے بیکار ہونے کا۔ گنج سے غرض یہی تو نہیں کہ جنگل میں مدفون رہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ مدفن سے نکلے اور صرف ہو۔ لوگ اس کے وجود سے تمتع پائیں۔

یہاں ایک اور دقیقہ ہے کہ اس شعر میں گنج مشبہ بہ اور روح انسانی مشبہ ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ روح کا تعلق جسم سے جاودانی نہیں۔ پس کیا قباحت ہے اگر ایک غمزدہ و ستم زدہ قطعِ تعلقِ روح کا منتظر اور مشتاق ہو؟ مثلاً ایک میعادی محبوس حسرت مندانہ کہے کہ الٰہی وہ دن کب آئے گا کہ میں قید سے نجات پاؤں؟ کب تک سڑک کاٹوں[1]؟ کب تک رنج اٹھاؤں؟ فاخر مکین ایک شاعر تھا، شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے عہد میں، اُس نے سعدی، نظامی و حزیں کے اشعار کو اصلاحیں دی ہیں۔ جب ایک ہندوستانی بے علم، تنک مایہ، اساتذۂ نامی عجم کے کلام کو اصلاح دے، اگر ایک عالم خراسانی نے ایک ہندی کے مطلع میں تصرف کیا تو کیا قباحت لازم آئی؟ خدا کا شکر کہ مجھ کو ستر برس کی عمر میں پچاس برس کی مشق کے بعد استناد میسّر آیا۔[2]

سنہ ۱۸۶۶ء

—(۲۳)—

جنابِ عالی!

کل میرے شفیق مکرم، منشی نواب جان کلبۂ احزان[3] میں تشریف لائے، آپ کا سلام کہا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صدر الدین صاحب لشکر کے ساتھ گئے ہیں اور آپ یہیں ہیں۔ اس فصل میں کہ ابھی سے رات دن آگ برستی ہے، اچھا ہوا کہ زحمتِ سفر نہ کھینچی۔

اجی حضرت یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں، مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا اُن کی نقل بطریقِ پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔[4] جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔

تم سلامت رہو قیامت تک

—(۲۴)—

پیر و مرشد،

"سہل ممتنع" میں کسرۂ لام توصیفی ہے۔ سہل موصوف اور ممتنع صفت۔ اگرچہ بحسب ضرورت وزن کسرۂ لام

---

[1] مشقت اٹھاؤں، محنت میں مبتلا رہوں۔ [2] ظاہر ہے کہ عبارت طنزیہ ہے۔ [3] غم خانہ [4] بظاہر اس وقت تک دہلی میں خطوط کی فراہمی شروع ہو چکی تھی کہ انھیں چھپوا دیا جائے۔ یہی مجموعہ میرزا کی وفات کے بعد اردوے معلیٰ کے نام سے شائع ہوا۔

مشبع ہو سکتا ہے، لیکن مخلِ فصاحت ہے اور لام موقوف تو خود سراسر قباحت ہے۔ "سہل ممتنع" اُس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع کمالِ حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خود ستائی ہوتی ہے، سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔

ہے سہل ممتنع یہ کلام ادقِ[1] مرا

برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

یہ مصرع حیرت آور ہے۔ کلام ادق سہل ممتنع کے منافی ہے۔ پھر یاد نہ ہونا اور حافظے پر نہ چڑھ جانا ہرگز سہل ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔ "کلام ادق" جس کا حفظ دشوار ہو، شاید کوئی قسم اقسام کلام میں سے ہو۔ ہاں کلام، ادق کلام مغلق کو کہتے ہیں، سو کلام مغلق اور کلام سہل ممتنع ضدیک دیگر ہے۔ مغلق اور ادق سہل ممتنع اور سہل ممتنع مغلق اور ادق کیوں کر ہو سکے گا اور حافظے میں محفوظ رہنا کلام مغلق و ادق کی صفت کیوں کر پڑے گی؟ ہاں مغلق عسیر الفہم ہوگا، پڑھا نہ جائے گا، معنی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ سہل ممتنع کی صفت وہ تھی جو فقیر اُوپر لکھ آیا، اس شعر سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ فقط

"آب در بنا رسیدن" بہ معنی "خراب بنیاد" قیاسی ہے۔ اساتذہ کے کلام میں میں نے نہیں دیکھا۔ اگر آیا ہو تو درست ہے۔ ہاں بآب رسانیدن بنا کہ بظاہر آب در بنا رسیدن کا متعدی منہ ہے، بلغا کے کلام میں آیا ہے، لیکن اضداد میں سے ہے۔ ہم بمعنی ویرانیِ بنا مستعمل اور ہم بمعنی استحکام بنا۔ اگر اس کا لازم ڈھونڈیے تو "رسیدن بنا بہ آب" ہے نہ "رسیدن آب در بنا"، جیسا کہ نعمت خاں عالی کہتا ہے:

نیست محکم گر رسد بنیاد دنیا تا بہ آب

چوں حباب ایں خانہ بے بنیاد مے سازیم ما

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "رسیدن بنا تا بآب" موجب استحکام ہے اور شاعر وجود دلیل استحکام بنا کو نا استوار چاہتا ہے۔

صائب کہتا ہے:

چگونہ شمع تجلی ز رشک نگدازد

رُخ تو خانۂ آئینہ را بآب رساند

حاجی محمد جان قدسی:

بگوش عطائیش رساند ایں خطاب

کہ بنیاد کاں را رساند بآب



[1] مشکل، بدرجہ غایت دقیق۔

یہ دونوں شعر مفید ویرانی ہیں۔ قصہ مختصر "باآب رسیدن بنا خرابی خانہ و باآب رسانیدن" متعدی آں و رسیدن آب دربنا" نامسموع۔

میں ابھی بیمار ہوں اور بیمار کے واسطے انجام کو غسل صحت ہے یا غسل میّت۔ والسلام ۱۲

(۲۵)

قبلہ!

آپ بیشک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا کہ آپ کو اس کی اطلاع دوں۔ خانہ کاہلی خراب، آج لکھوں، کل لکھوں، اب کون لکھے؛ کل صبح لکھوں گا۔ صبح ہوئی غالب اس وقت نہ لکھ، سہ پہر کو لکھیو۔

آج دوشنبہ ۲۳۔ جولائی کے بارہ پر دو بجے ہرکارے نے آپ کا خط دیا، پلنگ پر پڑے پڑے پڑھا اور اسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا مگر بھجوا دیا۔ کل روانہ ہو رہے گا۔ آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکاؔ اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتیؔ کو کبھی اردو خط نہیں لکھا[1]۔ ذکاء کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشأ اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب[2] کو یوں لکھا جاتا ہے:

کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے۔ کچھ بانٹے، کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی[3]۔ مولوی الطاف حسین[4] صاحب کو سلام۔

یہ تحریر اس ہفتے میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں، یہ لائق شمولِ مجموعۂ نثر اردو کہاں ہے؛ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود درج کریں گے۔

کتاب کے باب میں سرمدؔ کی رباعی کا شعر اخیر لکھ دینا کافی ہے:

عالم ہمہ مرآت جمال ازلی ست
می باید دید و دم نمی باید زد

"بوستانِ خیال" کا ترجمہ موسوم بہ "حدائق الانظار" معرضِ طبع میں ہے۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو، تو جتنی مجلد فرمائیے، اُس قدر بھجوا دوں۔ چھ روپے مع محصول ڈاک قیمت ہے۔ اسی مطبع میں جس میں "حدائق الانظار"

۱؎ یہ صحیح نہیں، ذکاؔ کے نام کئی خط موجود ہیں اور ایک خط مصطفیٰ خاں کے نام بھی ہے۔ "فغانِ بے خبر" سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ غلام غوث خاں نے لکھا تھا کہ کالپی، لکھنؤ، بریلی، گورکھ پور اور اکبر آباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں، کاتب لکھ رہا ہے۔ بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں۔ شاید رام پور سے بھی کچھ آجائے۔ آپ شیفتہؔ، ذکاؔ اور سیاحؔ کو لکھیں کہ وہ بھی آپ کے خطوط بھیج دیں۔ ۲؎ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ۔ غالباً کوئی تازہ خط اس مضمون کا بھیجا ہو جس کا حوالہ دیا ہے۔ ۳؎ مطلب یہ کہ مکتوب الیہ کے بچوں کو دعا اور میرے بچوں کی طرف سے بندگی ۴؎ خواجہ الطاف حسین حالیؔ، جو اس زمانے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے مصاحب تھے۔

انطباع ہوا ہے، اخبار بھی چھاپا جاتا ہے۔ اب کے ہفتے کا دو ورقہ بھجوا دیا جائے گا۔ بشرط پسند آپ توقیع خریداری لکھ بھیجیے گا۔

جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارس غرب وشمال کا، باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم ونثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعہ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا، مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع وحصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔ زیادہ حد ادب، نامہ جواب طلب۔

دوشنبہ ۲۳۔ جولائی سنہ ۱۸۶۶ء

انورالدولہ شفق

انورالدولہ سعیدالملک نواب سعدالدین خاں بہادر صولت جنگ متخلص بہ شفقؔ عرف منجھلے صاحب رئیس کدورا، وکالپی (یوپی)



نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل دربار دہلی کے ناہنجار اوضاع سے تنگ آکر دکن چلے گئے تو اپنے بڑے بیٹے کو غازی الدین بہادر فیروز جنگ کا موروثی خطاب دلا کر نیابت کے لیے دہلی میں چھوڑ گئے تھے۔ ۱۷۴۸ء میں نظام الملک فوت ہوئے تو غازی الدین خاں نے دکن کی ریاست لینی چاہی۔ دربار سے فرمان لے کر چلا۔ مرہٹوں سے مدد مانگی اور کئی علاقوں کے وثیقے ان کے نام لکھ دیے۔ اورنگ آباد پہنچ کر چند روز بعد وفات پائی۔

اس کا بیٹا میر شہاب الدین دہلی میں نائب تھا۔ اسے امیر الامرا عمادالملک نواب غازی الدین بہادر کا خطاب ملا اور وہ وزیر اعظم بن گیا۔ یہ عجیب وغریب شخص تھا۔ عربی، فارسی، اُردو اور ترکی کا یگانۂ عالم، خوش ذوق شاعر، چار زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ شجاعت میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ لیکن ذاتی اقتدار کی ہوس میں اس نے سلطنت کو بُری طرح تباہ کیا۔ آخری دور کے امیروں میں سے دو شخص ہیں، جن کی گردن پر مغل سلطنت کا خون ہے، ایک یہی عمادالملک، دوسرا اس کا رفیق وکارندہ آدینہ بیگ جس کے نام پر دینا نگر (ضلع گورداسپور) آباد ہوا۔

عمادالملک نے پہلے احمد شاہ (بن محمد شاہ) کو تخت سے اتارا اور عزیزالدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے بادشاہ بنایا۔ جب اس سے دل پھر گیا تو ایک درویش کی زیارت کا فریب دے کر باہر لے گیا اور قتل کرا دیا، لیکن خود بھی چین نہ پایا۔ پہلے دکن کی طرف چلا گیا، پھر گوالیار کے راجا سندھیا نے جاگیر دے دی جسے باؤنی کہتے تھے۔ حج بھی کیا۔ ۱۸۰۰ء میں بمقام کالپی وفات پائی۔

غلام حسین خاں طباطبائی نے سیر المتاخرین میں عمادالملک کی بے باکی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ یہ پانی پت میں تھا کہ بدخشی فوج نے تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ عمادالملک نے حکم دے دیا کہ بر سرِ کار فوجیوں کی تنخواہ حساب کر کے دے دی جائے۔ یہ حکم ان لوگوں کو بُرا معلوم ہوا، جو بے حساب روپے کھا رہے تھے۔ ایک گروہ نے عمادالملک کی قیام گاہ کے باہر

گھیرا ڈال کر شور مچانا شروع کیا۔ نواب انھیں سمجھانے کے لیے باہر آیا تو شورشیوں نے اسے پکڑ لیا اور کپڑے پھاڑ ڈالے۔ عمادالملک نے کہا کہ جو چاہو کرو، خواہ قتل کر ڈالو، لیکن تنخواہ حساب کے مطابق دوں گا۔ آخر نواب کی ضد پوری ہوئی۔ اس مصیبت سے نجات پاتے ہی اس نے فوج مہیا کی اور بدخشیوں کو تباہ کر ڈالا، جو وقت کے بہترین سپاہی تھے۔

نواب صدیق حسن خاں نے قتیل کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ (قتیل) دہلی ہوتا ہوا کالپی پہنچا اور وہاں عمادالملک کا مصاحب رہا۔ بعد میں لکھنؤ گیا۔ (تذکرۂ شمع انجمن صفحہ ۳۹۰)

عمادالملک کا تخلص نظامؔ تھا۔ "تذکرہ شمع انجمن" میں اس کے شعر موجود ہیں اور ایک مثنوی کلہوڑوں کے آخری عہد میں سندھ کی تباہی پر کہی تھی۔ ایک مثنوی مولانا فخرالدین فخرِ عالم کی کرامتوں کے متعلق لکھی۔

شفقؔ، اس عمادالملک کا پڑوتا تھا۔ نسب نامہ یہ ہے: سعدالدین شفقؔ بن افضل الدولہ احمد بخش خاں بےتابؔ بن ناصرالدولہ بن عمادالملک نظامؔ۔

شفقؔ، پہلے امجد علی قلقؔ کا شاگرد تھا۔ پھر میرزا غالب سے مشورۂ سخن کرتا رہا۔ گلستانِ سخن مرتبہ میرزا صابر (جو تذکرہ صہبائی کے نام سے مشہور ہے) اور سخن شعرا مؤلفہ نساخؔ میں شفقؔ کے صرف اردو شعر درج ہیں، لیکن غالب کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی شعر بھی کہتا تھا۔

تصانیف یہ ہیں: "چشمۂ فیض" (نثر)، دیوان، مثنوی، مولود منظوم موسوم بہ "مخزنِ سعادت"۔

۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں وفات پائی۔ شفقؔ کا چھوٹا بھائی خواجہ نورالدین خاں عرف سانولے صاحب بھی شاعر تھا اور شفیقؔ و فروغؔ تخلص کرتا تھا۔

(۱)

قبلۂ حاجات!

قصیدہ دوبارہ پہنچا۔ چونکہ پیشانی پر دستخط کی جگہ نہ تھی، ناچار اس کو ایک اور دو ورقہ پر لکھوایا اور حضور میں گزرانا اور تمنائے دیرینہ حاصل کی[۱]، یعنی دستخطِ خاص مشتمل اظہارِ خوشنودیِ طبعِ اقدس ہو گئے۔ احترام الدولہ[۲] بہادر میرے ہم زبان اور آپ کے ثناخواں رہے۔ گویا اس امرِ خاص میں وہ شریکِ غالب ہیں۔ ہم بطریقِ کسرۂ اضافی و ہم بطریقِ کسرۂ توصیفی[۳]۔ پروردگار اس بزرگوار[۴] کو سلامت رکھے کہ قدردانِ کمال، بلکہ حق تو یوں ہے کہ خیرِ محض ہے۔

"غیاث اللغات" ایک نام موقر و معزز، جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے[۵]؟

---

[۱] یعنی شفقؔ نے بہادر شاہ کی مدح میں قصیدہ بھیجا تھا جو غالب کی وساطت سے پیش ہوا اور پادشاہ نے اس پر خوشنودی کا شقہ لکھا۔

[۲] حکیم احسن اللہ خاں جو قصیدہ پیش کرنے کے وقت موجود تھے۔ [۳] "شریکِ غالب" کے دو مفہوم ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ میرزا غالب کے شریک رہے۔ یہ شرکت بہ کسرۂ اضافی تھی۔ دوسرا یہ کہ زیرِ بحث کام میں ان سے زیادہ مدد ملی۔ گویا وہ شریکِ غالب تھے۔ یہ شرکت بہ کسرۂ توصیفی ہوئی۔ [۴] حکیم احسن اللہ خاں احترام الدولہ۔

[۵] مُلا غیاث الدین رام پوری صاحبِ "غیاث اللغات"۔

ایک معلم فرمایہ، رام پور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام، "انشاءِ خلیفہ" و "منشآت مادھو رام" کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ[1] راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں؛ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار

اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کس قدر آرزو مند ہوں۔ میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر[2] کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہم شیر بھی تھا۔ یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی[3] کا دودھ پیا تھا۔ وہ باعث ہوا تھا میرے باندا بوندیل کھنڈ آنے کا۔ میں نے سب سامان سفر کر لیا ڈاک میں۔ روپیہ ڈاک کو

---

[1] یعنی غنیمت، قتیل وغیرہ۔ صحیح یہ ہے کہ ماخذ میں متعدد مستند کتابوں کے علاوہ ان کا بھی ذکر ہے لیکن میرزا غالب کے نزدیک انھیں مستند ماخذ میں شمار کرنا ہی فارسی دانی کی تضعیف کے لیے ایک واضح دلیل تھی۔ [2] والی باندہ بوندیل کھنڈ۔ اس خاندان کے جو حالات معلوم ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ چھتر سال بوندیلہ کے خاندان کی ایک لڑکی کسی لڑائی میں محمد خاں بنگش کے ہاتھ قید ہوئی۔ پھر باجی راؤ پیشوا نے قیدیوں کو چھڑایا تو چھتر سال نے اس لڑکی کو اپنے خاندان میں لینے کے متعلق پس و پیش شروع کر دی، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی قید میں رہ چکی تھی اور اسی اثنا میں وہ مسلمان ہو چکی تھی۔ باجی راؤ نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام شمشیر بہادر رکھا گیا۔ چونکہ اس کی والدہ کو مسلمان سمجھا جاتا تھا اس لیے باجی راؤ کی وفات کے بعد مرہٹوں نے اسے پیشوا کے خاندان کا فرد سمجھنے سے انکار کر دیا اور باندہ بوندیل کھنڈ کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ شمشیر بہادر کھلم کھلا مسلمان ہو گیا۔ وہ پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کی طرف سے لڑا تھا۔ زخمی ہوا اور بھرت پور پہنچ کر وفات پائی۔

اس کے بیٹے علی بہادر اول نے مادھو جی سندھیا کی امداد سے بوندیل کھنڈ کے علاقے فتح کیے۔ غلام قادر خاں روہیلے کو گرفتار کرنے میں مدد دی، جس نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالی تھیں اور ماہی مراتب کا اعزاز حاصل کیا۔ دہلی میں مرا اور قطب صاحب میں دفن ہوا۔ اس کے بیٹے ذوالفقار بہادر نے ۱۸۱۲ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے نواب کا خطاب اور باندے کی ریاست حاصل کی۔ ذوالفقار بہادر غالب کی ممانی کی بہن کا بیٹا تھا وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا علی بہادر دوم نواب ہوا۔ غالب نے اسی کے لیے لکھا تھا۔

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

زمانۂ "غدر" میں علی بہادر نے انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں، پھر انگریزوں کے مخالفوں کا زور بہت بڑھ گیا تو علی بہادر بھی مخالفوں کے ساتھ ہو گیا۔ اسی وجہ سے باندے کی ریاست ضبط ہو گئی اور علی بہادر کو تین ہزار ماہوار پنشن دے کر اندور میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے، ذوالفقار بہادر اور امداد بہادر۔ آخر الذکر کا لقب شمشیر بہادر تھا اور تخلص دلیر۔ وہ جلال لکھنوی کا شاگرد تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس کا دیوان شائع ہوا تھا۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ علی بہادر نے ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔ [3] والدۂ میرزا غالب۔

دے دیا۔ قصد یہ تھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا۔ وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں باندے جاکر، ہفتہ بھر رہ کر، کالپی ہوتا ہُوا، آپ کے قدم دیکھتا ہُوا، بسبیل ڈاک دلّی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا[1] بیمار ہو گئے اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا اور پھر مرزا اورنگ خاں[2]، میرا بھائی مرگیا:

اے لبسا آرزو کہ خاک شدہ

واللہ وہ سفر اگرچہ بھائی کی استدعا سے تھا مگر میں نتیجہ اس شکل کا آپ کے دیدار کو سمجھا ہُوا تھا۔ ہرزہ سرائی کا جُرم معاف کیجیے گا۔ میرا جی آپ کے ساتھ باتیں کرنے کو چاہا، اس واسطے جو دل میں تھا وہ اس عبارت سے زبان پر آیا۔" ۱۸۵۳ء[3]

—— (۲) ——

کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں ؟ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم۔

سُن غالبؔ! سُن ہم تُجھ سے کہتے ہیں، بہت مصاحب نہ بن، ایاز حدِ خود بشناس۔ مانا کہ تُو نے کئی برس کے بعد رات کو نوبت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے، مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے ؟ پہلے القاب لکھ، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ، پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکریہ ادا کر کہ جو میں تصوّر کر رہا تھا، وہ ہُوا یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا، اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا۔ معلوم ہُوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ ان شاء اللہ رفع ہو جائے گی۔ موسم اچھا آگیا ہے:

گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز ہوا

محمل مہرِ جہاں تاب بہ میزاں آمد

اگر صرف تبرید و تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا، ورنہ بحسب رائے طبیب تنقیہ کرائیے۔ مجھ کو بھی آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہو گا۔

شب کو ناگاہ ایک نئی زمین خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی۔ غزل تمام کی۔ اسی وقت سے یہ خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں اور میرے قبلہ جناب میر امجد علی صاحب کو سنادیں اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں اور ان کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے۔

غزل

اے ذوقِ نواسنجی، بازم بہ خروش آور | غوغائے شبیخونے، بر بُنگہِ ہوش آور
گر خود نہ جہد از سر، از دیدہ فرو بارم | دل خون کن و آں خوں را در سینہ بہ جوش آور

---

[1] بہادر شاہ ثانی۔ [2] یا اوزبک خاں [3] "خطوط غالبؔ" میں اسے ۱۸۵۶ء کا بتایا گیا، لیکن یہ بداہتہً غلط ہے۔ اس میں بہادر شاہ ثانی کی بیماری کا ذکر ہے۔ وہ جولائی ۱۸۵۳ء میں سخت بیمار ہوئے تھے، یہاں تک کہ جانبری کی امید نہیں رہی تھی۔ یہ خط یقیناً ۱۸۵۳ء کا ہے۔ "نادراتِ غالبؔ" میں منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام ایک خط سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (ص ۴۵)

ہاں ہمدمِ فرزانہ ، دانی رہِ ویرانہ ؟ — شمعے کہ نخواہد شد از باد خموشش آور
شورابۂ ایں وادی تلخ است ، اگر راوی — از شہر بسوے من ، سرچشمۂ نوشش آور
دانم کہ زرے داری ، ہر جا گزرے داری — مے گر نہ دہد سلطان، از بادہ فروشش آور
گر مغ بہ کدو ریزد ، برکف نہ و راہی شو — ور شہ بہ سبو بخشد، بردار و بدوشش آور
ریحاں دمد از مینا ، رامش چکد از قلقل — آن در رہِ چشم افگن، ویں از پئے گوشش آور
گاہے بہ سبک دستی ، زاں بادہ ز خویشم بر — گاہے بہ سیہ مستی، از نغمہ بہ ہوشش آور

غالب کہ بقایش باد ، ہم پاے تو گر ناید
بارے غزلے، فردے ، زاں موینہ پوشش آور

دو شنبہ ۲۱- محرم ۱۲۷۲ھ (۲- اکتوبر ۱۸۵۵ء)

—(۳)—

للہ الحمد کہ پیر و مرشد کا مزاج اقدس بہ خیر و عافیت ہے ۔ پہلے نوازش نامہ کا جواب، باآنکہ وہ مشتمل ایک سوال پر تھا، ہنوز لکھنے نہیں پایا کہ کل اور ایک مکرمت نامہ آیا ۔ بندہ عرض کر چکا ہے کہ مسہل میں ہوں ۔ چنانچہ کل تیسرا مسہل ہو گیا ۔ اس سبب سے توقیع کا پاسخ نگار نہ ہو سکا اور لکھتا بھی تو یہی لکھتا ، جو آپ نے لکھا ہے ۔

" ارنی " کی رے کی حرکت و سکون کے باب میں قول فیصل یہی ہے ، جو حضرت نے لکھا ہے ۔ اگر تقطیع شعر مساعدت کر جائے اور " ارنی " بروزن " چمنی " گنجائش پائے تو نعم الاتفاق ، ورنہ قاعدۂ تصرف مقتضی جواز[1] ہے ۔ مرزا عبدالقادر بیدل :

چو رسی بطور ہمت اَرِنی مگو و بگریز
کہ نیرزد ایں تمنا بجواب " لن ترانی "

اسد اللہ بیگ غالب :

رفت آنکہ ما ز حُسن مدارا طلب[2] کنیم
سررشتہ در کفِ اَرِنی گوے طور بود

زوائد سے فارغ ہو کر عرض کرتا ہوں کہ ہاے کیا غزل لکھی ۔ قبلہ آپ فارسی کیوں نہیں کہا کرتے ؟ کیا پاکیزہ زبان ہے اور کیا طرز بیان ؟ کیا میں سخن ناشناس اور ناانصاف ہوں کہ ایسے کلام کے حک و اصلاح پر جرأت کروں ؟ :

چہ حاجت ست بمشاطہ روے زیبا را

---

[1] یعنی رے کو ساکن باندھا جا سکتا ہے ۔ [2] کلیات فارسی کے پہلے ایڈیشن (۱۸۶۳) اور بعد کے ایڈیشنوں میں " طلب " کی جگہ " طمع " ہے ۔

ہاں ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں:

اے مطربِ جادو فن، بازم رہ ہوشم زن

دو میم آپڑے ہیں، ایک میم محض بیکار ہے۔ "دیگر" کی جگہ آپ "بازم" لکھ گئے ہیں:

اے مطربِ جادو فن، دیگر رہ ہوشم زن

اب دیکھیے اور صاحبوں کی غزلیں کب آتی ہیں۔ اتنی عنایت فرمائیے گا کہ ہر صاحب کے تخلص کے ساتھ ان کا اسم مبارک اور کچھ حال رقم کیجیے گا۔ زیادہ حدِّ آداب

پنجشنبہ، ششم صفر ۱۲۷۲ھ و ہژدہم اکتوبر ۱۸۵۵ء

(۴)

پیر و مرشد،

حضور کا توقیع خاص اور آپ کا نوازش نامہ، یہ دونوں حرزِ بازو ایک دن اور ایک وقت پہنچے۔ توقیع کا جواب دو چار دن میں لکھوں گا۔ ناسازیِ مزاج مبارک موجبِ تشویش و ملال ہوئی۔ اگرچہ حضرت کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مرض باقی نہیں، مگر ضعف باقی ہے، لیکن تسکینِ خاطر منحصر اس میں ہے کہ آپ بعد اس تحریر کے ملاحظہ فرمانے کے، اپنے مزاج کا حال پھر لکھیں۔ سینتیس روپے کی ہنڈوی پہنچی۔ اس کا بھی حال سابق کی ہنڈوی کا سا ہے، یعنی ساہوکار کہتا ہے کہ ابھی ہم کو کالپی کے ساہوکار کی اجازت نہیں آئی، جو ہم روپیہ دیں۔ اگر سرکار کے کارپرداز وہاں کے ساہوکار سے کہہ کر اجازت لکھوا بھیجیں تو مناسب ہے۔

صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد میری مِلک میں سے، میرے پاس تھی، وہ میں اپنی طرف سے بہ سبیلِ ارمغان آپ کو بھیجتا ہوں۔ نذر قبول ہو۔ اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں کہ ڈاک میں دے آوے۔ بارہ پر دو بجے کتاب کا پارسل بطریق بیرنگ روانہ کروں گا۔

پیشگاہِ وزارت[1] میں میری بندگی پہنچے۔ عرضداشت بعد اس کے پہنچے گی۔ جناب میر صاحب قبلہ میر امجد علی صاحب کو سلام نیاز اور جناب منشی نادر حسین کو سلام۔

(۵)

پیر و مرشد،

اگر میں نے "امید گاہ" بکافِ عربی از راہِ شکوہ لکھا، تو کیا گناہ کیا؟ نہ خط کا جواب، نہ قصیدے کی رسید:

دریں خستگی پوزش از من مجوے
بود بندۂ خستہ گستاخ گوے

---

[1] غالباً انور الدولہ کے والد مراد ہیں اور انھیں کو ابتدا میں "حضور" کہا ہے۔

اور یہ جو آپ فرماتے ہیں کہ ان موانع کے سبب سے میں قصیدہ کی تحسین نہیں لکھ سکا، بندہ بے ادب نہیں، تحسین طلب نہیں۔ ایسے مجمع میں محشور ہوں کہ سوائے احترام الدولہ[۱] کے کوئی سخن دان نہیں۔ میں جو اپنا کلام آپ کے پاس بھیجتا ہوں، گویا آپ اپنے پر احسان کرتا ہوں:

وائے بر جانِ سخن گر بہ سخنداں نہ رسد

افسوس کہ میرا حال اور یہ لیل و نہار، آپ کی نظر میں نہیں، ورنہ آپ جانیں کہ اس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل اور اس مرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔

نواب صاحب! اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں زور۔ سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے، بے تامل اور بے فکر جو خیال میں آجائے وہ لکھ لوں۔ ورنہ فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بقول مرزا عبدالقادر بیدل:

جہد ہا در خورِ توانائی ست
ضعف یکسر فراغ مے خواہد

مُہر کا حال معلوم ہوا۔ پہلے آپ لکھ بھیجیے کہ کیا کھودا جائے گا؟ مہدی حسین خاں؟ مہدی حسن خاں بہادر؟ لکھ رہا ہوں، صرف یاد پر لکھ رہا ہوں ورنہ خط لڑکوں نے کھو دیا ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ نگینہ وہاں سے بھیجنے کو آپ نے لکھا، سو مکرر خواہاں ہوں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نگینہ بھیجیے گا یا یہاں سے خریدا جائے گا؟ اور نقش نگیں کیا ہوگا؟ تاکہ شمار حروف کا مجھ کو معلوم رہے۔ اب جب آپ مجھ کو لکھیں گے، تب میں اس کا جواب لکھوں گا۔ حافظ صاحب کا پہنچنا تقریباً معلوم ہوا، یعنی ان کی طرف سے آپ نے مجھ کو سلام لکھا ہے۔ سو میں بھی ان کی خدمت میں بندگی اور جناب منشی نادر حسین کی جناب میں سلام عرض کرتا ہوں۔ زیادہ حد ادب۔

(۶)

پیر و مرشد،

یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔

خلاصہ عرض یہ ہے کہ آج شہر میں بدرالدین علی خاں کا نظیر نہیں۔ بس مُہر اور کون کھود سکے گا؟ ناچار میں نے آپ کا نوازش نامہ، جو میرے نام تھا، وہ ان کے پاس بھجوا دیا۔ اُنھوں نے رقعہ میرے نام آج بھیجا۔ سو وہ رقعہ حضرت کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نہیں سمجھا کہ قسم دوم کھراج کی کیا ہے؟ آپ پڑھ لیں اور سمجھ لیں اور نگین بہ احتیاط ارسال فرماویں۔ پھر روپے کے بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے، جب میں عرض کروں، تب بھیجیے گا۔

تعجب ہے کہ جناب میر امجد علی صاحب قلق کا اس خط میں سلام نہ تھا۔ متوقع ہوں کہ چھاپے کے قصیدے ان کو سُنا دیے جائیں اور میری بندگی کہی جائے۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو میرا سلام بہ ہزار اشتیاق پہنچے۔

مرقومہ یکشنبہ، ۲۹۔ جون ۱۸۵۶ء

۱؎ حکیم احسن اللہ خاں۔

(۷)

قبلہ و کعبہ،

وہ عنایت نامہ، جس میں حضرت نے مزاج کی شکایت لکھی تھی، پڑھ کر بے چین ہو گیا ہوں اور عرض کر چکا ہوں کہ مزاج کا حال مفصل لکھیے۔ چونکہ آپ نے کچھ نہیں لکھا تو اور زیادہ مشوش ہوں۔ نسخۂ رفعِ تشویش یعنی شفقت نامہ جلد بھیجیے۔

جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ حضرت میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ متوقع ہوں کہ دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچے اور آپ ان کی خیر و عافیت لکھیں۔

کبوتروں کا نسخہ جیسا کہ میرے پاس آیا، بجنسہٖ ارسال کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ میرن صاحب نے انتقال کیا۔ یہ چھوٹے بھائی تھے مجتہد العصر[1] لکھنؤ کے۔ نام ان کا سید حسین اور خطاب سید العلماء۔ نقش نگیں "میر حسین ابن علی"[2]۔ میں نے ان کی رحلت کی ایک تاریخ پائی۔ اس میں پانچ بڑھتے تھے یعنی ۱۲۷۸ ہوتے تھے۔ تخرجہ نئی روش کا میرے خیال میں آیا۔ میں جانتا ہوں اچھا ہے، دیکھوں آپ پسند فرماتے ہیں یا نہیں:

"حسین ابن علی" آبروے علم و عمل　　　　کہ "سید العلما" نقش خاتمش بودے
نہ ماندو ماندے اگر زندہ پنج سال دگر　　　　"غم حسین علی" سالِ ماتمش بودے

زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشت جواب طلب۔

دوشنبہ بہ حساب تقویم یازدہم و از روے رویت دہم ربیع الاول ۱۲۷۳ھ

(۱۰۔ نومبر ۱۸۵۶ء)

(۸)

حضرت پیر و مرشد،

اگر آج میرے سب دوست عزیز یہاں فراہم ہوتے اور ہم اور وہ باہم ہوتے تو میں کہتا کہ آؤ اور رسمِ تہنیت بجا لاؤ۔ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ انور الدولہ کا خط لایا:

ایں کہ مے بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

منہ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا۔ الٰہی حیاتِ جاودانی نہیں مانگتا، پہلے انور الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں، پھر اس کے بعد مروں۔ روپیہ کا نقصان اگرچہ جانکاہ اور جانگزا ہے،

---

[1] سید محمد جو سید میرن کے بڑے بھائی تھے۔ پیدائش ۱۷۔ صفر ۱۱۹۷ھ / ۲۲۔ جنوری ۱۷۸۳ء، وفات ۲۲۔ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ / ۲۳۔ اگست ۱۸۶۷ء۔

[2] پیدائش ۱۴۔ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ / ۱۷۔ اکتوبر ۱۷۹۶ء، وفات ۱۸۔ صفر ۱۲۷۳ھ / ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۵۶ء بن سید دلدار علی

پر بموجب "تلف المال خلف العمر" عمر فزا ہے۔ جو روپیہ ہاتھ سے گیا اس کو عمر کی قیمت جانیے اور اثبات ذات اور بقائے عرض و ناموس کو غنیمت جانیے۔ اللہ تعالیٰ حضرت وزیر اعظم[1] کو سلامت رکھے اور اس خاندان کے نام و نشان اور عزّ و شان کو برقرار تا قیامت رکھے۔ میں نے گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد، نثر میں بعبارت فارسی ناآمیختہ بعربی، لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب آگرہ کو مفید الخلائق میں چھپنے کو گئی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔ بعد چھپ جانے کے وہ نسخہ حضرت کی نظر سے گزرانوں گا اور اس کو ہم سخنی اور ہم زبانی جانوں گا۔

جناب میر امجد علی صاحب کا جو آپ کے خط میں ذکر نہیں آیا ہے تو اس خیر خواہ احباب کا دل گھبرایا ہے۔ اب جو خط لکھیے تو ان کی خیر و عافیت بہر نمط لکھیے۔ ان کو بندگی اور جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو سلام پہنچے۔

اکتوبر ۱۸۵۸ء

(۹)

پیر و مرشد

ایک نوازش نامہ آیا اور "دستنبو" کے پہنچنے کا مژدہ پایا۔ اس کا جواب یہی کہ کارپردازان ڈاک کا احسان مانا اور اپنی محنت کو رائگاں نہ جانا۔ چند روز کے بعد ایک عنایت نامہ اور پہنچا، گویا ساغر التفات کا دوسرا دور پہنچا۔ اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اس ستارۂ دُم دار[2] کا لکھوں۔ چنانچہ جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ چونکہ بہ سبب فقدان اسباب، یعنی عدم رصد و کتاب، کچھ نہیں کہا جاتا، ناچار مرزا صائبؔ کا مصرع زبان پر آجاتا ہے:

ازیں ستارہ دنبالہ دارمے ترسم

یہ مطلع ہے اور پہلا مصرع یہ ہے:

زخال گوشۂ ابروے یار می ترسم

کیا آپ مجھ کو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے اور خاص عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں مانتے: "پیش ملا طبیب و پیش طبیب ملا، پیش ہیچ ہر دو، پیش ہر دو ہیچ"۔ آرایش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوّف، کچھ نجوم لگا رکھا ہے، ورنہ سوائے موزونی طبع کے اور یہاں کیا رکھا ہے؟ بہرحال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس برج میں یہ نظر آئے، اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ ذوذنابہ[2] کا ممر[3] اور طریقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کے جال ڈالتے ہیں،

---

[1] غالباً یہ غدر کے نقصان کی طرف اشارہ ہے اور وزیر اعظم سے مراد شفق کے والد ہیں۔ [2] جھاڑو کی مانند ستارہ۔ اگر طلوع کے وقت اس کی شعاعیں مشرق کی طرف ہوں تو "ذوذنابہ" کہلاتا ہے۔

[3] گزرگاہ، راستہ۔

تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ ان دنوں میں آفتاب اوّل میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورتِ عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی۔ اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ وہاں شاید اب نظر آیا ہے، جو آپ نے اس کا حال پُوچھا ہے[1]۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہرِ الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قران النحسین[2]، پھر کسوف[3]، پھر خسوف[4]، پھر یہ صورت پُر کدورت۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا!

یہاں پہلی نومبر کو، بدھ کے دن[5]، حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہُوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزند ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہُوں، چنانچہ لبشمول "دستنبو" نظر سے گزرا ہوگا:

تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

اللہ! اللہ! اللہ![6]

جمعہ پنجم نومبر ۱۸۵۸ء

—(۱۰)—

پیر و مرشد،

کیا حکم ہوتا ہے؟ احمق بن کر چُپ ہو رہوں یا جو از رُوے کشف یقینی مجھ پر حالی ہُوا ہے وہ کہوں؟ اوّل رجب میں نوازش نامہ آپ نے کب بھیجا؟ آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا یہ جو اب بھیجا۔ اگر روانہ ہُوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا[7]۔ بہرحال محبت کی گرمی ہنگامہ ہے، یہ جملہ محض آرائشِ عنوان نامہ ہے:

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

پنسن داروں کا اجرا، پنسن اور اہل شہر کی آبادی مسکن، یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ منجملہ ضروریات ریاست ہے، یہاں قہرِ الٰہی ہے کہ منشاء تباہی ہے۔ خاص میرے پنسن کے

---

۱ اس سے ظاہر ہے کہ دُم دار ستارہ نکلا تھا۔ جس کے متعلق انور الدولہ نے غالب سے اس لیے استفسار کیا کہ شہرت کے مطابق انھیں نجوم میں بھی درک حاصل تھا۔ ۲ دو منحوس ستاروں کا ملنا۔ ۳ سورج گرہن ۴ چاند گرہن ۵ یکم نومبر (۱۸۵۸) کو بدھ نہیں پیر کا دن تھا۔ اس حساب کے مطابق جمعہ کو ۵۔ نومبر ہو گی۔ بظاہر میرزا سے دن کے سلسلے میں سہو ہُوا۔ ۶ اس خط میں نام کی جگہ لکھا ہے، چہ گویم کہ نامہ از کیست؟ خود مے داند کہ نامہ نگار کیست؟ ۷ عبارت کو مقفیٰ بنانے کے اہتمام میں ذرا پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اب جو خط بھیجا، مل گیا، اگر پہلے بھیجا ہوتا تو وہ کیوں نہ پہنچتا؟

باب میں گورنمنٹ سے رپورٹ طلب ہوئی ہے۔ ابنائے روزگار حیران ہیں کہ یہ بھی ایک بات عجب ہوئی ہے۔ رپورٹ کی روانگی کی دیر ہے، چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے۔ دلّی علاقہ لفٹنٹ گورنر سے انقطاع پا گئی اور احاطۂ پنجاب کے تحت حکومت آگئی[۱]۔ رپورٹ یہاں سے لاہور اور لاہور سے کلکتہ جائے گی اور اسی طرح پھیر کھا کر نوید حکم منظوری آئے گی۔

فعل لازم کو جب متعدی کیا چاہیے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنا لینا چاہیے۔ "گشتن" مصدر اصلی "گردد" مضارع "گردیدن" مصدر مضارعی، "گرداندن" و "گردانیدن" مصدر متعدی۔ موافق اس قاعدے کے "کردن" کا متعدی "کناندن" و "کنانیدن" نہ کہ "کراندن"۔ "کراندن" تو کرانے کی فارسی ہے، جیسے چلنے کی فارسی "چلیدن" ہے اور یہ شوخی طبع و ظرافت ہے، نہ اس میں صحت ہے نہ لطافت ہے۔ "کراندن" غلط اور "کنانیدن" صحیح۔ "گشتن" کو "گشتاندن" اور "رستن" کو "رستاندن" نہ کہیں گے، بلکہ "گردیدن" و "روئیدن" بنا کر "گرداندن" و "روباندن" لکھیں گے۔ بلغا کے کلام میں کردن کا متعدی شاید کہیں نہ آیا ہو، اگر آیا ہوگا تو کنانیدن آیا ہوگا۔ "کراندن" ٹکسال باہر ہے۔

تذکیر و تانیث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ "دہی": بعض کہتے ہیں "دہی اچھا"، بعض کہتے ہیں "دہی اچھی"۔ "قلم" کوئی کہتا ہے: "قلم ٹوٹ گیا"، کوئی کہتا ہے: "قلم ٹوٹ گئی"۔ فقیر "دہی" کو مذکر بولتا ہے اور "قلم" کو بھی مذکر جانتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

شنگرف بھی مذبذب ہے۔ کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے۔ میں تو شنگرف کو مونث کہوں گا۔ خلاصہ یہ کہ اس ہیچمداں کے نزدیک "کردن" کا متعدی "کنانیدن" ہے اور "شنگرف" مؤنث۔

خداوند، آئین بندہ پروری بھول نہ جاؤ۔ گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجتے رہو۔ کیا میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے اس عرصے میں دو خط بھیجے اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا؟ ہاں یہ عرض کرتا ہوں، آج صبح کو آپ کا خط آیا، اُدھر پڑھا اور اِدھر جواب لکھا۔ سچ یوں ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہو جاتے ہیں، بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا بادی[۲] اور بانی میں ہوتا ہوں، یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں۔ آپ بھی اب جب کبھی بفرضِ محال خط بھیجیے تو بیرنگ بھیجیے۔ زیادہ حدِ ادب۔

نگاشتۂ چہارشنبہ، سوم شعبان (۱۲۷۵ھ)

و نہم مارچ سال حال (۱۸۵۹ء)

(۱۱)

پیر و مرشد، بارہ بجے تھے، میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کُرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ نقصان میرا ہوتا۔ سرے سے سنیے: آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا۔ اس کی رسید آئی۔ کئی کٹے ہوئے شعر الٹے آئے۔ اُن کی

۱۔ پہلے دہلی کا تعلق صوبہ غرب و شمال سے تھا ۱۸۵۷ء کے بعد اسے پنجاب میں شامل کر دیا گیا ۲۔ ابتدا کرنے والا۔

قباحت پوچھی گئی، قباحت بتائی گئی، الفاظِ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دیے گئے۔ لو صاحب، یہ اشعار بھی قصیدہ میں لکھ لو۔ اس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا کاغذ اُن کو دیا۔ جواب میں جو کچھ اُنھوں نے زبانی فرمایا، آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا:

پُر ہُوں میں شکوے سے یُوں راگ سے جیسے باجا[1]
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہُوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح متصوّر نہیں۔ جواب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے؟ باسی کڑھی میں اُبال کیا آئے؟ بندگی، بیچارگی۔

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہُوا: پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لُٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[2] کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھُوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لُٹ گئی۔ مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی، اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں: ایک بڑا لڑکا[3] اور ایک میرا داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

برسات یہاں بھی اچھی ہُوئی ہے، لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں۔ زمیندار خوش، کھیتیاں تیار ہیں۔ خریف کا بڑا پار ہے۔ ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں مینہ درکار ہے۔ کتاب کا پارسل پرسوں ارسال کیا جائے گا۔

اہاہا، جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی۔ مغل علی[4] خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں؟ حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب نہ جا سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین[5] کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی، لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ، جو عقب "کوتوالی چبوترہ" ہے۔ وہ، اور خواجہ قاسم کی حویلی، جس میں مغل علی خاں جو رہتے تھے وہ، اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب

---

۱ بعض نسخوں میں ہے: پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
دیوان میں بھی پہلا مصرع اسی طرح ہے ۲ انگریزوں کے لشکری جنھیں خاکی غالباً اس بنا پر کہا گیا کہ ان کی وردی خاکی رنگ کی تھی ۳ باقر علی خاں ابن عارف، جو غالبؔ کے گھر میں پرورش پا رہا تھا۔ ۴ غالبؔ کا دوست جو شاہی دربار میں مختاری کے درجے پر پہنچ گیا تھا۔
۵ فرزند شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں جو بہادر شاہ ظفرؔ کے پیر تھے۔

کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پاکر ضبط ہوگئی اور نیلام ہوکر روپیہ سرکار میں داخل ہوگیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں وہ، ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں۔ شاید بہاول پور بھی جائیں گے۔

(۱۸۶۰ء)

—(۱۲)—

پیرو مرشد معاف کیجیے گا
میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال

یہاں کبھی کسی نے اس دریا کی کوئی حکایت ایسی نہیں کی کہ جس سے استبعاد اور استعجاب پایا جائے، پرسش کے بعد بھی کوئی بات نہیں سنی۔ سُنیے تو سہی، موسم کیا ہے؟ گرمی، جاڑا، برسات، تین فصلیں اکٹھی ہو گئی ہیں علاوہ اگر ایک بحر رواں کی حقیقت متغیر ہو جائے تو محل استعجاب کیوں ہو؟ اور یہ بات کہ دلّی میں تغیر نہ ہو اور پورب میں ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جمنا بہ انفراد[1] بہ رہی ہے اور وہاں کہیں "کین"، کہیں کوئی اور ندی اور کہیں گنگا باہم مل گئی ہیں۔ مجمع البحار ہے۔

حضرت نے خوب وکالت کی! مولانا تفلق سے تقصیر میری معاف نہ کروائی۔ کہہ دو گے کہ گناہ معاف ہوگیا۔ میں بغیر سارٹیفکیٹ کے کب مانوں گا؟

یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں۔ گرمی میں میرا حال بعینہٖ وہی ہوتا ہے، جیسے زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا۔ خصوصاً اس تموز میں کہ غم وہم کا ہجوم ہے۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

یوم الخمیس ۲۹۔ ذی الحجہ (۱۲۷۶ھ) — مرگ کا طالب، غالبؔ
(۱۹۔ جولائی ۱۸۶۰ء)

—(۱۳)—

پیرو مرشد،

شب رفتہ کو مینہ برسا۔ ہوا میں فرط برودت سے گزند پیدا ہوگیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابر تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے پر نظر نہیں آتا ہے۔ میں عالمِ تصوّر میں آپ کو مسند عزّ وجاہ پر جانشین اور منشی نادر حسین خاں صاحب کو آپ کا جلیس مشاہدہ کر کے آپ کی جناب میں کورنش بجا لاتا ہوں اور منشی صاحب

---

[1] یعنی اکیلی

کو سلام کرتا ہوں۔ کافر نعمت ہو جاؤں اگر یہ مدارج بجا نہ لاؤں۔ حضرت نے اور منشی صاحب نے میری خاطر سے کیا زحمت اٹھائی ہے۔ بھائی صاحب[1] بہت خوشنود ہوئے۔ منت پذیری میں میرے شریک غالب ہیں۔ فی الحال بہ توسط میرے سلام نیاز عرض کرتے ہیں۔ اغلب ہے کہ نامہ جداگانہ بھی ارسال کریں۔

حضرت، آپ غالبؔ کی شرارتیں دیکھتے ہیں؟ سب کچھ کیے جاتا ہے اور اس اصل کا کہ جس پر یہ مراتب متفرع ہوں، ذکر نہیں کرتا۔ فقیر کو تو یہ طرز پسند نہ آئی۔ مطلب اصلی کو مقدر چھوڑ جانا کیا شیوہ ہے؟ یُوں لکھنا تھا کہ آپ کا عنایت نامہ، اس کے ساتھ نسب نامہ خاندان مجد و علا کا پارسل پہنچا۔ میں ممنون ہوا۔ نواب ضیاء الدین خاں بہادر ممنون و شاکر ہوئے۔ جناب عالی میں تو غالب ہرزہ سرا کا معتقد نہ رہا۔ آپ نے اُس کو مصاحب بنا رکھا ہے۔ اس سے اُس کا دماغ چل گیا ہے۔ قبلہ و کعبہ جناب مولانا قلقؔ کی خدمت میں حضرت شفقؔ نے جو غالبؔ کی شفاعت کی تھی، وہ مقبول نہ ہوئی۔ اب جناب ہاشمی کو اپنا ہم زبان اور مددگار بنا کر بھڑکتے ہیں، آپ کی بات اس باب میں کبھی نہ مانوں گا، جب تک سیّد صاحب کا خوشنودی نامہ نہ بھجوائیے گا۔ اس سارٹیفکٹ کے حصول میں رشوت دینے کو بھی موجود ہوں۔ والسلام۔

پیرو مرشد!

کورنش، مزاج اقدس؟

"الحمدُ لِلّٰہ"، تو اچھا ہے!

حضرت! دعا کرتا ہوں۔

پرسوں آپ کا خط مع سارٹیفکٹ کے پہنچا۔ آپ کو مبدء فیاض سے "اشرف الوکلاء" خطاب ملا، محنتانہ مجتبانہ[2]۔ ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیئے۔ ڈاک کا ہرکارہ، جو بلّی ماروں[3] کے خطوط پہنچاتا ہے، ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا، حرف شناس، کوئی فلاں ناتھ، ڈھمک داس[4] ہے۔ میں بالاخانہ میں رہتا ہوں۔ حویلی میں آکر اُس نے داروغہ کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو، آپ کو جیسا کہ دلّی کے بادشاہ نے "نوابی" کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے، سرنامہ غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشاں" لکھا تھا، اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشاں" کو "کپتان" پڑھا۔

---

[1] ضیاء الدین احمد خاں نیّرؔ، بظاہر انھوں نے میرزا صاحب کی وساطت سے درخواست کی تھی کہ اپنے خاندان کا شجرہ بھیج دیجیے۔ یہ سب کچھ میرزا نے خود آگے چل کر واضح کر دیا ہے۔ [2] یعنی آپ نے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں جو محنت اٹھائی، اس کا محبتانہ معاوضہ خطاب کی صورت میں ادا کر دیا [3] دہلی کا وہ محلہ جس میں میرزا رہتے تھے۔ [4] ڈھمک: فلاں کی ہندی، مطلب یہ ہے کہ نام معلوم نہ تھا۔ بنیا ہونے کی بنا پر "فلاں ناتھ"، "ڈھمک داس" لکھ دیا۔

بھائی ضیاء الدین خاں صاحب شملہ گئے ہوئے ہیں، شاید ماہ حال یعنی جولائی یا اوّل ماہ آیندہ یعنی اگست میں یہاں آجائیں۔ آپ کو نوید تخفیف تصدیع دیتا ہوں۔ آپ نواب صاحب سے کتاب کیوں مانگیں اور زحمت کیوں اٹھائیں؟[1] جس قدر کہ علم ان کو اس خاندان مجدت نشان کے حال پر حاصل ہوگیا ہے، کافی ہے۔ مولانا قلق کے نام کی عرضی ان کو پہنچا دیجیے گا[2] اور جناب نادر حسین خاں صاحب کو میرا سلام فرما دیجیے گا۔

(جولائی ۱۸۶۰ء)

(۱۵)

خداوند نعمت،

شرف افزا نامہ پہنچا۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا مکتوب ان کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ جناب شاہ صاحب سالک مجذوب یا مجذوب سالک ہیں۔ اگر جواب بھجوا دیں گے تو جناب میں ارسال کر دیا جائے گا۔ قصیدے کو بارہا دیکھا اور غور کی۔ جس طرح پر ہے، اس میں گنجایش اصلاح کی نہ پائی۔ یعنی لفظ کی جگہ لفظ مرادف بالمعنی لانا صرف اپنی دستگاہ کا اظہار ہے، ورنہ کوئی لفظ بے محل اور بے موقع نہیں۔ کوئی ترکیب فارسی ٹکسال سے باہر نہیں، مگر ہاں طرز گفتار کا بدلنا، اس کے واسطے چاہیے، دوسرا قصیدہ اس زمین میں ایک اور لکھنا اور وہ تکلف[3] بار دوش ہے، بلکہ شاید حضرت کو یہ منظور بھی نہ ہو۔ پس شرم کم خدمتی سے دل ریش اور فرطِ خجلت سے سر درپیش ہو کر قصیدہ اس لفافے میں بھیجتا ہوں۔ خدا کرے مورد عتاب نہ ہوں۔

حضرت، انہدام مساکن و مساجد کا حال کیا گزارش کروں؟ بانی شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا، جو اب والیان ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ۔ قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض وہ شاہ جہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا۔ سرنگیں کھود دی گئیں، بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیے گئے۔[4]

غلّے کی گرانی، آفت آسمانی، امراض دموی، بلائے جانی۔ انواع و اقسام کے ارام و شور شایع، چارہ ناسودمند، سعی ضائع۔ میں نہیں جانتا کہ ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوجِ باغی میرٹھ سے دلّی آئی تھی یا خود قہر الٰہی کا پے بہ پے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت سابق دلّی ممتاز ہے، ورنہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے۔ انّا للّٰہِ و انّا الیہِ راجعون۔

جناب میر امجد علی صاحب کو بندگی۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو سلام۔

مرقومہ سحرگاہ آدینہ ۲۴ - ماہ اگست ۱۸۶۰ء نجات کا طالب، غالب



---

[1] شفق نے بظاہر لکھا ہوگا کہ شجرۂ خاندانی کے متعلق جو کچھ معلوم تھا لکھ دیا۔ آپ کہیں تو اپنے والد نواب صاحب سے خاندانی شجرے کی کتاب مانگ لوں۔ میرزا نے لکھا کہ جس قدر حالات معلوم ہو گئے، کافی ہیں۔ مزید کی ضرورت نہیں۔ [2] بظاہر قلق کے نام کا خط بھی شفق کے خط کے ساتھ بھیجا گیا۔ [3] نامرغوب تکلف۔ [4] یہ پیراگراف منشی مہیش پرشاد نے اصل خط دیکھ کر اضافہ کیا۔ قلعے کی اندر بھی کئی عمارتیں ڈھائی گئیں، مگر وہ ان عمارتوں سے زیادہ نہ تھیں جو قلعے سے باہر منہدم ہوئیں۔ مثلاً قلعے اور شاہی مسجد کے درمیان کئی محلّے ڈھا دیے گئے اور اس طرح متعدد تاریخی عمارتیں ناپید ہو گئیں۔

—(۱۶۰)—

پیر و مرشد،

میں آپ کا بندۂ فرمانبردار اور آپ کا حکم بطیب خاطر بجالانے والا ہُوں، مگر سمجھ تو لوں کیا لکھوں؟ وُہ مکتوب کہاں بھیجوں؟ آپ کے پاس بھیج دوں یا انھیں منشی صاحب کے پاس بھیج دوں؟ اور وسیم الدین اور ظہیر الدین کو منشی، میر، شیخ، خواجہ، کیا کر کے لکھوں؟

وہ حاکم کی رائے کے شمول کا قیدی اور اس زمانے میں دریائے شور کو بھیجا جاتا ہے، جس زمانے میں سیکڑوں جزیرہ نشین رہائی پا کر اپنے اپنے گھر آ گئے۔ با ایں ہمہ منشی کو کیا اختیار ہے کہ وُہ چھوڑ دے؟ آیا امیر الدین نے، جس محکمے کا وہ منشی ہے، اس محکمے میں یہ مقدمہ بہ طریق مرافعہ پیش کیا ہے، جو منشی کو کار پردازی و کارسازی کی گنجایش ہو؟ یہ آپ کی تحریر سے معلوم نہیں ہُوا کہ اپیل ہو گیا ہے اور مقدمہ دائر ہے بلکہ یہ بھی طرزِ تحریر سے معلوم نہیں ہوتا کہ اب سعی منحصر اس میں ہے کہ قیدی دریائے شور کو نہ جاوے اور یہیں محبوس رہے کہ جزیرہ کو بھی نہ جاوے اور یہاں کی قید سے بھی رہائی پائے؟ خواہش کیا ہے اور کارپرداز سے کس طرح کی اعانت چاہتے ہیں؟ پہلے تو یہ سوچتا ہُوں کہ کیا لکھوں؟ اس کو کہاں بھیجوں؟

طریق یہ ہے کہ میاں امیر الدین وہ نگارش لے کر منشی صاحب کے پاس جائیں اور بذریعہ اس خط کے روشناس ہوں۔ میں کیا جانوں کہ امیر الدین کا مسکن کہاں ہے؟ منشی صاحب کو خط بھیج دوں، ان کے نزدیک احمق بنوں کہ کس امر موہوم مجہول میں مجھ کو لکھا ہے۔ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ کر تفحص کریں کہ امیر الدین کون ہے اور کہاں ہے اور کیا چاہتا ہے؟ بہر حال اس خط کے ساتھ ایک اور لفافہ آپ کے نام کا روانہ کرتا ہوں۔ اس میں صرف ایک خط موسومہ منشی صاحب ہے، کھلا ہُوا۔ اس کو پڑھ کر میاں امیر الدین کے پاس بھیج دیجیے گا مگر گوند لگا کر اور اگر یہ منظور نہ ہو تو میری طرف سے منشی صاحب کے نام کے خط کا مسودہ لکھ کر میرے پاس بھیجیے اور لکھ بھیجیے کہ اس مسودہ کو صاف کر کے کہاں بھیجوں؟

صبح یک شنبہ، ۲-جُون ۱۸۶۱ء

—(۱۷)—

قبلہ و کعبہ،

کیا لکھوں؟ امورِ نفسانی میں اضداد کا جمع ہونا محالات عادیہ میں سے ہے۔ کیونکہ ہو سکے کہ ایک وقت خاص میں ایک امر خاص موجب انشراح کا بھی ہو اور باعث انقباض کا بھی ہو۔ یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں پائی کہ اس کو پڑھ کر خوش بھی ہُوا اور غمگین بھی ہُوا۔ سبحان اللہ! اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع اور ہم دردِ[1] پاتا ہوں۔ عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی۔ میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار، یا دشت خفچاق[2] میں سو دو سو ہوں گے، مگر ہاں اقربائے سببی ہیں۔ سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں۔ اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں،

---

[1] یعنی جو درد مجھے ہے وہی آپ کو ہے [2] خفچاق ترکستان کی ایک صحرا نشین قوم کا نام تھا، جو غالباً اب صحرا نشین نہیں رہی۔ وُہ جس علاقے میں رہتی تھی اسے دشت خفچاق کہتے تھے۔ خفچاق کو قبچاق اور قپچاق بھی لکھتے ہیں۔

گرد ہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب

رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ! دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے دو ہاتھ لگائے، بیڑا پار ہے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا؟

شاہ اسرار الحق کو حافظ نظام الدین صاحب کا خط بھجوا دیا۔ ہفتہ بھر کے بعد جواب مانگا۔ جواب دیا کہ اب بھیجتا ہوں۔ دس بارہ دن ہوئے کہ حضرت خود تشریف لائے۔ جواب آپ کے اور حافظ جی کے خط کا مانگا، کہا کہ کل صبح بھیج دوں گا۔ اس واقعے کو آج قریب دو ہفتے کا عرصہ ہوا۔ ناچار اُن کے جواب سے قطع نظر کر کے آپ کو یہ چند سطریں لکھیں:

از خون دل نوشتم نزدیک دوست نامہ

انی رایت دہراً من ہجرک القیامہ

حافظ جی صاحب کو میری بندگی کہیے گا اور یہ خط ان کو پڑھوا دیجیے گا۔ جناب منشی نادر حسین صاحب کو میرا اسلام پہنچے۔ اگرچہ آپ مبتلائے رنج و الم ہو، مگر یہ شرف کیا کم ہے کہ انور الدولہ کے ہم درد ہو۔ مورد ستمہائے روزگار ہونا شرافت ذاتی کی دلیل ہے ساطع اور برہان ہے قاطع۔



ہاں حضرت بہت دن سے جناب میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ ان کے تخلص[۱] نے مجھ کو حیران کر رکھا ہے یعنی قلق میں مبتلا ہوں۔ آپ اُن کا حال لکھیے۔ خواجہ اسماعیل خاں صاحب کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟

حسینیے قبلہ، میں تو آپ سے شاہ انوار الحق کے خط کے جواب کا طالب نہیں ہوں کہ آپ ان کے خط حاصل ہونے کے انتظار میں مجھ کو خط نہ لکھ سکیں۔ مترصد[۲] ہوں کہ اس اپنے خط کا جواب جلد پاؤں۔

صبح سہ شنبہ ۲۲۔ اکتوبر (۱۸۶۱ء[۳])   جواب کا طالب، غالب

(۱۸)

ناوکِ بیداد کا ہدف، پیر خرف، یعنی غالب آداب بجا لاتا ہے۔ نوازش نامے کو دیکھ کر جانا کہ میں نے "کمرے چند" کے شعر پر خط بطلان کھینچ دیا۔ یہ تو کوئی گمان نہ کرے گا کہ میں کمر کو کمر بند نہیں جانتا۔ معہذا وہاں پہلے مصرع میں اگر "کمر" بمعنی "کمر بند" فرض کیجیے تو بھی تو شعر کاٹ ڈالنے کے قابل نہیں۔ قصد کر کے بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کروں گا، خدا جانے قلم خط کیوں کر کھنچ گیا؟ اب حواس بجا نہیں، حافظہ رہا نہیں۔ اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں۔ ستر برس کی عمر ہوئی

---

۱ امیر امجد علی کا تخلص قلق تھا۔ غالب نے اگلے فقرے میں مطلب خود واضح کر دیا ہے۔ ۲ منتظر و امیدوار ۳ بعض اصحاب نے ۱۸۶۱ء کو اس بنا پر غلط قرار دیا کہ اس میں بیماری کا کوئی ذکر نہیں۔ ظاہر ہے کہ میرزا کی تحریر کے مطابق وہ پانچ برس کی (باقی ص ۳۱۱ پر)

کہاں تک خرافت نہ آئے۔ اس شعر کا گنہگار اور حضرت سے شرمسار ہوں، معاف کیجیے گا۔ زیادہ حدِ ادب۔

پنجشنبہ ۱۹۔ ذی الحجہ سال غفر (۱۲۷۸ھ مطابق ۱۹۔ جون ۱۸۶۲ء)

—— (۱۹) ——

پیر و مرشد،

آداب، تتمۂ غلط نامۂ "قاطع برہان" کو بھیجے ہوئے تین اور آپ کی خیر و عافیت مولوی حافظ عزیز الدین کی زبانی سُنے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ کل آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ "قاطع برہان" کے پہنچنے سے اطلاع پائی۔ معتقدان "برہان قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں، ایک تو یہ کہ "قاطع برہان" غلط ہے یعنی ترکیب خلافِ قاعدہ ہے۔ کلام "قطع" کیا جاتا ہے، برہان "قطع" نہیں ہو سکتی ہے۔ لو صاحب "برہانِ قاطع" صحیح اور "قاطعِ برہان" غلط! مگر برہان قاطع کی فاعل ہو سکتی ہے اور قطع کا فعل آپ نہیں قبول کرتی۔ "قاطع برہان" میں جو "برہان" کا لفظ ہے یہ مخففِ "برہانِ قاطع" ہے۔ "برہان قاطع" کے رد کو قطع سمجھ کر "قاطع برہان" نام رکھا تو کیا گناہ ہوا؟

دوسرا ایراد یہ ہے:

با انگلسیانِ ستیز بے جا ہے

انگلس کا نون تلفظ میں نہیں آتا۔ میں پوچھتا ہوں خدا کے واسطے "انگلس" اور "انگریز" کا نون بہ اعلان کہاں ہے؟ اور اگر ہے بھی تو ضرورت شعر کے واسطے۔ لغات عربی میں سکون و حرکت کو بدل ڈالتے ہیں، اگر انگلس کے نون کو غنہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا؟

وہ ورق جو چھاپے کا آپ کے پاس بھیجا ہے اس کو غلط نامہ شاملہ کے بعد لگوا کر جلد بندھوا لیجیے گا۔

حضرت، کیوں اپنے مراسلے اور میرے مکتوب کا حال پوچھا:

ایں ہم کہ جوابے نہ نویسند جواب است

سمجھ لو اور چپ رہو۔ میں نے مانا جس کو تم نے لکھا ہے، وہ کہے گا کہ میں نے مختار سے پوچھا۔ اس نے یوں کہا، پھر میں نے یوں کہا۔ اب یہ بات قرار پائی ہے تو اس تقریر کو حضرت ہی باور کریں گے، فقیر کبھی نہ مانے گا۔

ایک حکایت سنو۔ امجد علی[1] شاہ کی سلطنت کے آغاز میں، ایک صاحب، میرے نیم آشنا یعنی خدا جانے کہاں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰) عمر میں اقربا بسبی کے دام میں اسیر ہوئے یعنی ان کی پنشن نواب احمد بخش سے متعلق ہو گئی اور اکسٹھ برس تک ان کے ستم اٹھائے اکسٹھ میں پانچ جمع کیے جائیں تو چھیاسٹھ بنتے ہیں۔ گویا یہ خط میرزا نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں لکھا۔ لہٰذا یہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) ہی کا ہو سکتا ہے۔ [1] شاہ اودھ جو جون ۱۸۴۲ء میں مسند نشین ہوا اور پانچ سال کی حکومت کے بعد فروری ۱۸۴۷ء میں وفات پائی۔ اس خط میں ایک پیچیدگی ہے جس کی توضیح لازم ہے۔ ابتدا میں امجد علی شاہ کی جگہ غازی الدین حیدر ہونا چاہیے، اس لیے کہ جس صاحب کا ذکر ہے وہ امجد علی شاہ کے عہد سے بیس سال پیشتر آگرہ میں میرزا سے ملا تھا۔ یعنی ۱۸۲۲ء کے آس پاس اور وہ (باقی بر صفحہ ۳۱۲)

رہنے والے، کسی زمانے میں وارد اکبر آباد ہوئے تھے، کبھی کہیں کے تحصیلدار بھی ہو گئے تھے، زبان آور اور چالاک۔ اکبر آباد میں نوکری کی جستجو کی، کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں ایک دو بار آئے تھے۔ پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلّی میں آ رہا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بسبیل ڈاک آیا۔ چونکہ ان دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا۔ میں نے جانا کہ یہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں پہلے مجھ کو یہ مصرع لکھا:

از بخت شکر دارم و از روزگار هم

آپ سے جُدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا۔ وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ میں آیا ہوں، وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے "خاں" اور "بہادر" کا خطاب دیا ہے۔ مصاحبوں میں نام لکھا ہے۔ مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر[1] کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں، وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجیے تو بیشک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط مشعر فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کی بیت اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آنکہ بہ ذوق دعاے او
صد رہ نمازِ صبح قضا کرد روزگار

متردد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آ گئی صرف۔ پھر دو ہفتے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا۔ وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا، بہ آئین شایستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مُہرکن سے میری مُہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجیے۔ چاندی کا نگینہ ہو مربّع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گزرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینے تک اُدھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا، الٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ، بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط۔ بہادری کی مُہر تم سے بہ فریب حاصل کر کے مرشد آباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیے تھے۔

ایک قاعدہ کلیہ دِلّی کا سمجھ لو۔ خالق کی قدرت مقتضی اس کی ہے کہ جو اس شہر پناہ کے اندر پیدا ہوا، مرد یا عورت، خفقان و مراق اس کی خلقت و فطرت میں ہو۔ آٹھ دس برس کے بعد ساون کے آخر میں مینہ برسا، لیکن نہ دریا جاری ہوئے، نہ طوفان

(بقیہ حاشیہ صـ ۳۱۱) امجد علی نہیں غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ البتہ بیس برس بعد امجد علی شاہ کے زمانے میں انھوں نے خط لکھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ ۱۲۳۲ھ تک غالب آگرہ جاتے آتے رہتے تھے۔

[1] امجد علی شاہ کے عہد میں پہلے اشرف الدولہ محمد ابراہیم خاں وزیر تھے، پھر امین الدولہ امداد حسین خاں وزیر ہوئے۔ بیچ میں منور الدولہ احمد علی خاں بھی اس عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ آخر میں مجتہد العصر نے پھر امین الدولہ ہی کو وزارت دلوا دی۔ یہاں غالباً انھیں کی طرف اشارہ ہے۔

آیا۔ ہاں شہر کے باہر ایک دن بجلی گری۔ دو ایک آدمی، کچھ جانور تلف ہو گئے۔ مکان گرے، دس بیس آدمی دب کر مرے۔ دو تین آدمی کوٹھے پر سے گر کر مرے۔ مراقیوں نے غل مچانا شروع کیا۔ اپنے اپنے عزیزانِ بسفر رفتہ کو لکھا۔ جا بجا اخبار نویسوں نے اُن سے سُن کر درج اخبار کیا۔ لو، اب دس بارہ دن سے مینہ کا نام نہیں۔ دھوپ آگ سے زیادہ تر تیز ہے۔ وہی خفقانی صاحب روتے پھرتے ہیں کہ کھیتیاں جلی جاتی ہیں۔ اگر مینہ نہ برسے گا تو پھر کال پڑے گا۔ مکانات کے گرنے کا حال یہ ہے کہ چار پانچ برس ضبط رہے۔ یغمائی[1] لوگ کڑی، تختہ، کواڑ، چوکھٹ بعض مکانات کی چھت کا مسالا، سب لے گئے۔ اب ان غربا کو وہ مکان ملے تو ان میں مرمّت کا مقدور کہاں ؛ فرمائیے مکانات کیونکہ نہ گریں ؟

صبح دوشنبہ ۱۳۔ صفر (۱۲۷۹)

۱۱۔ اگست ۱۸۶۲

—— (۲۰) ——

پیر و مرشد،

آداب، مزاجِ مقدس۔ میرا جو حال آپ نے پُوچھا، اس پرسش کا شکر بجالاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ آپ کا بندۂ بے دام و درم خریدہ اچھی طرح ہے۔ ایک فصد، بائیس منضج، چار مسہل، کہاں تک آدمی کو ضعیف نہ کرے۔ بارے آفتاب عقرب میں آگیا۔ پانی برفاب ہو گیا ہے۔ کابل و کشمیر کا میوہ بکنے لگا ہے۔ یہ ضعف، ضعفِ قسمت تو نہیں کہ ایسے ایسے امور اس کو زائل نہ کرسکیں۔

غزلوں کو پرسوں سے پڑھ رہا ہوں اور وجد کر رہا ہوں۔ خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے، وہ مجھ سے سُن لیجیے اور میرے داد دینے کی داد دیجیے۔ مولانا فلقیؔ نے متقدمین یعنی امیر خسروؔ و سعدیؔ و جامیؔ کی روش کو سرحد کمال پر پہنچا دیا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفقؔ اور مولانا ہاشمیؔ اور مولانا عسکریؔ متاخرین یعنی صائبؔ و کلیمؔ و قدسیؔ کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ اگر تکلّف و تملّق سے کہتا ہوں، تو مجھ کو ایمان نصیب نہ ہو۔ یہ جو آپ اپنے کلام کے حک و اصلاح کے واسطے مجھ سے فرماتے ہیں، یہ آپ میری آبرو بڑھاتے ہیں۔ کوئی بات بے جا ہو، کوئی لفظ ناروا ہو تو میں حکم بجالاؤں۔ زیادہ حدِ ادب۔

—— (۲۱) ——

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خداوندِ نعمت !

آج دوشنبہ ۶۔ رمضان کی اور ۱۵۔ فروری[2] کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں۔ عطوفت نامہ پہنچا۔ اُدھر

---

[1] لٹیرے [2] سنہ ۱۲۸۰ھ اور سنہ ۱۸۶۴ء۔

پڑھا، اِدھر جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا۔ خط کو معنون کر رکھتا ہوں۔ کل شنبہ ۱۶۔ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ سالِ گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحبِ فراش رہا۔ اُٹھنا دشوار تھا، چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت پُرکدورت، یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یُوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی، دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی۔ جاگ اٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں سے تین حصے دن یوں گزرے، پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سر سے روح قالب میں آئی، اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں لیکن ناتوان و سُست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر اُٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قدِ آدم دیوار اُٹھے۔ آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا، میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثلاً میری یہ تحریر، آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ در صورتِ مرگ نیم مُردہ اور در حالتِ حیات نیم زندہ ہُوں:

در کشاکشِ ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من نمے میرم ہم ز ناتوانیہاست

اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم، مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجیے گا تو ان کو خورسندی اور مجھ کو ممنون کیجیے گا۔

دو شنبہ ۲۶ رمضان سنہ ۱۲۸۰ھ - ۱۵۔ فروری سنہ ۱۸۶۴ء

حکیم غلام نجف خاں و ظہیر الدین احمد خاں

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں، احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کے اقربا میں سے تھے۔ حکیم محمود خاں شریف خانی کے والد ماجد سے طبابت کی تعلیم پائی۔ حکیم احسن اللہ خاں کے زیر نگرانی مشق بہم پہنچائی۔ یہ اصل میں شیخوپورہ (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی وجہ سے دہلی میں اقامت پذیر ہوئے۔ غالب ان کے ساتھ گھر کے افراد کا سا برتاؤ کرتے تھے۔

غدر کے وقت یہ دوجانہ میں تھے اور خط و کتابت کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی۔ پھر دہلی آ گئے تو خط و کتابت کی ضرورت نہ رہی۔ اقامتِ دہلی کے زمانے کا صرف ایک خط میرے علم میں آیا ہے (ملاحظہ ہو خط ۱۷) جس میں چاولوں کا ذکر ہے۔ بہر چند خطوط اس زمانے کے ہیں، جب میرزا پہلی اور دوسری دفعہ رام پور گئے تھے۔

حکیم ظہیر الدین احمد خاں، حکیم غلام نجف خاں کے صاحبزادے تھے۔ ان کے نام صرف ایک خط ہے۔ دوسرا خط ان کی طرف سے، ان کے چچا کو لکھا گیا ہے۔

(۱)

میاں، حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لُٹا نہیں، کسی محکمہ میں اب تک بلایا نہیں گیا، معرضِ بازپرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

شیر زماں خاں نے مجھے آگرہ سے خط لکھا۔ اس میں ایک رقعہ تھا شیخ نجم الدین[1] حیدر صاحب کی طرف سے بنام ظہیر الدین[2] کے۔ اب مجھ کو ضرور آپڑا کہ اس کو تمھارے پاس بھیجوں۔ آدمی کوئی ایسا نظر نہ چڑھا، ناچار بطریق ڈاک بھیجتا ہوں۔ اگر پہنچ جائے تو آگرہ کا جواب لکھ کر میرے پاس بھیج دینا۔ میں یہاں سے آگرہ کو روانہ کر دوں گا۔

مرسلہ دوشنبہ چارم جمادی الاوّل سنہ ۱۲۷۴ھ

(مطابق ۲۱۔ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء) جواب طلب، غالب

(۲)

میاں تمھارا خط پہنچا۔ آج میں نے اس کو اپنے خط میں ملفوف کر کے آگرہ کو روانہ کیا۔ تم جو کہتے ہو کہ تم نے کبھی مجھ کو خط نہیں لکھا اور اگر شیخ نجم الدین حیدر کا خط نہ آتا تو اب بھی نہ لکھتے۔ انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے تم نہ لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔ ظہیر الدین کو دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔ تم کو اور ظہیر الدین کو اور اس کی ماں کو اور اس کی بہن کو اور اس کی لڑکی کو تمھاری ماں[3] دعا کہتی ہے اور دعائیں دیتی ہے۔ یہ رقعہ حیدر حسن خاں کے نام کا ہے، ان کو حوالے کر دینا۔

نگاشتہ شنبہ ۲۶۔ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء اسد اللہ

(۳)

سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں طال بقاؤہٗ۔ تمھارا رقعہ پہنچا۔ جو دم ہے، غنیمت ہے۔ اس وقت تک میں مع عیال و اطفال جیتا ہوں، بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہات میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے، مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے، تو کہہ لیں گے، ورنہ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعون۔

نواسی کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی اور حرمت والی تھی۔ تمھاری استانی[4] تم کو اور ظہیر الدین کو اور اس کی ماں کو اور اس کی بہن کو دعا کہتی ہیں اور میں پیار کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں۔

سہ شنبہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء غالب

---

[1] یہ غالباً حکیم غلام نجف خاں کے بھائی یا قریبی رشتہ دار تھے۔ [2] غلام نجف خاں کے فرزند [3] بیگم غالب [4] استانی سے اشارہ بیگم غالب کی طرف ہے، جسے پہلے ماں لکھا تھا۔

—— (۴) ——

بھائی،

ہوش میں آؤ۔ میں نے تم کو کب خط بھیجا اور رقعہ میں کب لکھا کہ شیر زماں خاں کا خط تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں بندگی لکھی تھی اور میں وہ بندگی اس رقعہ میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ بس بات اتنی ہی تھی۔ وہ بندگی لکھی ہوئی گویا لپٹی ہوئی تھی، سو حضرت کو پہنچ گئی ہے۔ خاطر عاطر جمع رہے۔

(١٨٥٨ء)

غالب

—— (۵) ——

میاں

تم کو مبارک ہو کہ حکیم صاحب[١] پر سے وہ سپاہی، جو ان کے اوپر متعین تھا، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو، مگر شہر میں نہ ہو، باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے، مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے ہے۔ صفدر میرے پاس آیا تھا، یہ اس کی زبانی ہے۔ جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہِ احتیاط جا نہیں سکتا۔

میرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اب اس وقت سُنا ہے کہ وہ خاں صاحب کے پاس آئے ہیں۔ یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے، یہاں نہ رہیں گے۔ قدم شریف میں وہ رہتے ہیں۔



آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر[٢] پٹیالہ کو گئے ہیں۔ میں بہ مقتضائے وقت اپنی سکونت کے مکان چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں، اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانے میں مردانہ۔

پنسن کی درخواست کا ابھی کچھ حکم نہیں معلوم ہوا۔ کلکٹر سے کیفیت طلب ہوئی ہے۔ دیکھیے بعد کیفیت کے جانے کے پنسن ملتا ہے یا جواب۔

پنجشنبہ ١٦۔ شعبان ١٢٧۴ھ مطابق یکم اپریل ١٨٥٨ء

—— (٦) ——

بھائی،

میرا دکھ سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالہ جانے میں ایک سبکی اور ذلّت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسّر آجاتی، لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا، شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے، یعنی جس لوہے کا طوق، اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں

١۔ حکیم احسن اللہ خاں ٢۔ اہل و عیال و اعزہ

بھی پڑ گئیں۔[1] خیر اس کا کیا رونا ہے، یہ تو قیدِ جاودانی ہے۔

جناب حکیم صاحب[2] ایک روز از راہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب[3] میں تو کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں، کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔

مصطفیٰ خاں کا حال سُنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے، ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں؟ احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؟ مخنوق[4] ہوا، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔

پنسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بشرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہوگا؟ ہاں دو باتیں ہیں؛ ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے، دوسرے یہ کہ موافق قول عوام "چو لکھے دلدّر نہ ہوگا"[5] تجھ کو میری جان کی قسم، اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہِ قلیل میں کیسا فارغ البال اور خوشحال رہتا؟ یہ بھی خبط ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ خدا جانے پنسن جاری ہوگا یا نہ ہوگا۔ احتمال تعیش و تنعم بشرطِ تجرید[6]، صورت اجرائے پنسن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے۔ بیدلؔ کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے،

نہ شامِ ما را سحر نویدی، نہ صبحِ ما را دمِ سپیدی
چو حاصلِ ماست نا امیدی، غبارِ دنیا بہ فرقِ عقبیٰ

اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا، جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

اس کا سرنامہ یوں ہے،

جانِ جاناں و از جان و جاناں عزیز تر حکیم غلام نجف خاں سلمہ اللہ تعالیٰ

(اپریل ۱۸۵۸ء) از غالبؔ

—— (۷) ——

میاں،

پہلے ظہیر الدین کا حال لکھو، پھر حکیم صاحب کی حقیقت لکھو۔ کہیں اور جائیں گے یا یہاں آئیں گے؟ اگر یہاں آئیں گے تو کب تک آئیں گے؟ پھر تم خط لکھو میاں نظام الدین کو اور اس میں لکھو کہ تم نے غالبؔ کے خط کا جواب نہیں لکھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں حیران ہوں کہ میاں نظام الدین اور میرے خط کا جواب نہ لکھیں! خدا جانے مجھ سے ایسی کیا تقصیر ہوئی ہے۔



---

[1] بیگم کو طوق اور زین العابدین خاں عارفؔ کے بچوں کو ہتھکڑیاں قرار دیا ہے۔ [2] حکیم احسن اللہ خاں [3] "غدر ۱۸۵۷ء" [4] یعنی پھانسی پائی۔ [5] یعنی کھانے پینے کا محتاج نہ ہونا پڑے گا۔ [6] تنہائی۔ پنشن جاری ہو جاتی تو عیش و تنعم سے زندگی گزارنے کا امکان تھا۔

۱۸۵۸ء

نجات کا خدا سے

اور اس رقعے کے جواب کا طالب

غالب

(۸)

بھائی،

تمھارے رقعے کا جواب پہلے تم کو شیر زماں خاں نے دیا ہوگا، پھر ظہیر الدین خاں نے تم سے کہا ہوگا۔ کہو کوئی طرح شہر میں تمھارے آنے کی ٹھہری یا نہیں؟ بُعد تیس کوس اور آدھ کوس کا برابر ہے۔ میری جان، تم ہنوز دوجانہ ہیں ہو۔ مجھ کو تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں رہنا بے اجازت سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؛ شہر میں تم ہوتے تو جرأت کر کے تمھارے پاس چلا آتا۔ شیر زماں خاں صاحب ایک بار آئے تھے۔ کہہ گئے تھے کہ پھر بھی آؤں گا، مگر نہیں آئے۔ خدا جانے ان کے والد کی رہائی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر تم سے ملیں تو میرا اسلام کہنا اور ان کو میرے پاس بھیج دینا اور تم کو ان کے والد کا جو حال زبانی معلوم ہُوا ہو، مجھ کو لکھ بھیجو۔ ظہیر الدین کو دعا۔ والدعا

(جولائی ۱۸۵۸ء) از غالب

(۹)



بھائی،

ہاں غلام فخر الدین خاں[1] کی رہائی، زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔ سُنا ہے لوہارو بھی ان دونوں صاحبوں[2] کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے۔ خدا سب کا بھلا کرے۔ مجھ کو صاحب ڈپٹی کمشنر نے بُلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ "غدر" میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہُوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدۂ ولایت میں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز و ادا سے پنسن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔

میاں، یہ الور میں کیا فساد برپا ہُوا ہے؟ خدا خیر کرے۔ واسطے خدا کے جو تم کو معلوم ہُوا ہو اور جو معلوم ہو جائے، اس سے مجھ کو بھی اطلاع دینا۔

(۱ اگست ۱۸۵۸ء) غالب

(۱۰)

قبلہ،

یہ تو معلوم ہُوا کہ بعد قتل ہونے دس آدمی کے کہ وہ اس میں عزیز بھی تھے، یہ سب وہاں سے نکالے گئے، مگر

۱؎ غالب کے برادر نسبتی میرزا علی بخش خاں کے فرزند اور غالب کی بھتیجی کے شوہر۔ ۲؎ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں۔

صورت نہیں معلوم کہ کیوں کر نکلے؟ پیادہ یا سوار؟ تہی دست یا مالدار؟ مستورات کو تو رتھیں ملی ہوں گی یا ڈولیاں؟ ذکور کا حال کیا ہوا؟ اللہ پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا؟ کہاں رہے اور کہاں رہیں گے؟ سرکار انگریزی کی طرف سے مورد تفقد و ترحم ہیں یا نہیں؟ رنگ کیا نظر آتا ہے؟ جبر کسر[2] کی توقع ہے یا نہیں؟ تفضل حسین خاں کا حال خصوصاً اور ان سوالات کا جواب عموماً لکھو[1]۔

میرزا مغل میرا حقیقی بھانجا کہ وہ منشی خلیل الدین خاں مرحوم کا خویش ہے اس کی بی بی ہے اور شاید ایک یا دو بچے بھی ہیں، اذعانی ہے یہ امر کہ وہ بھی قافلہ کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو اُس کا حال بہ انفراد لکھیے[2]۔

خواجہ جان اور خواجہ امان[3] کی حقیقت بھی بشرطِ اطلاع ضروری فرمائیے اور ہاں صاحب آپ جانتے ہوں گے علی محمد خاں کو، وہ جو میر منشی عزیز اللہ خاں کا خویش ہے، اگر کچھ اُس کا ذکر بھی سُنا ہو تو میں اُس کا خیر طلب ہوں۔

جواب طلب غالبؔ

(ستمبر ۱۸۵۸ء)

(۱۱)

میاں،

میں تم سے رخصت ہو کر اس دن مراد نگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعہ کو میرٹھ پہنچا۔ نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۱۲۔ جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے، خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ کل شام شاہ جہان پور، پرسوں گڑھ مکتیشر رہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا[4]۔ لڑکوں[5] کے ہاتھ کے[6] خط لکھے ہوئے ان کی دادی[7] کو بھجوا دیے ہیں۔ تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی[8] پر جانا اور استانی[9] جی کو پڑھ کر سُنا دینا اور خیر و عافیت



---

[1] یہ الور کے ہنگامے کی تفصیل ہے جس کے متعلق خط ع۹ میں استفسار کیا گیا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امین اللہ خاں عرف امو جان وہاں مختار بن گیا تھا اور اس نے اپنے منجھلے بھائی تفضل حسین خاں کو نائب دیوان اور چھوٹے بھائی انعام اللہ خاں کو فوج کا بخشی مقرر کر دیا تھا۔ امو جان نے راجہ دھیان سنگھ کی والدہ کو بہن بنا لیا تھا۔ ایک اور صاحب اسفند یار بیگ نے راجپوتوں کو اکسایا۔ ایک ٹھاکر نے دالان کے وقت امین اللہ خاں کے مکان پر حملہ کر دیا۔ دیوان کا ایک بیٹا اور خدمتگار مارے گئے (مرزا نے خط ع۱ میں امو جان کے قتل کا ذکر کیا ہے) اور تینوں بھائی قید ہو گئے پھر راجا نے انھیں چھڑا کر دہلی بھجوا دیا۔ جبر کسر سے مراد ہے نقصان کی تلافی۔ [2] مرزا مغل بیگ کا نام جواد علی بیگ تھا یہ غالب کی بہن چھوٹی خانم کا بیٹا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے جن میں سے آغا میرزا بیگ نے بڑا رتبہ پایا اور میر محبوب علی خاں مرحوم نظام دکن کا استاد بن گیا۔ سرور الملک خطاب ملا۔ نواب ذوالقدر جنگ اس کا فرزند تھا۔ آغا میرزا بیگ نے اپنے سوانح حیات خود لکھے جو "کارنامہ سروری" کے نام سے چھپے۔ اب یہ کتاب کمیاب ہے۔ [3] خواجہ جان اور خواجہ امان، خواجہ حاجی کے فرزند تھے جسے میرزا غالب اپنے دادا کا سائیس بتاتے ہیں۔ خواجہ حاجی ہی تھا جسے نواب احمد بخش خاں مرحوم نے غالب کی خاندانی پنشن میں سے دو ہزار روپے سالانہ دلائے تھے۔ [4] یہ پہلے سفر رام پور کی کیفیت ہے۔ [5] باقر علی خاں اور حسین علی خاں فرزندانِ عارف [6] بیگم غالب [7] غالب کے گھر [8] بیگم غالب

کہہ دینا۔ جناب خاں صاحب کو میرا سلام نیاز اور ظہیر الدین احمد کو دعا کہہ دینا۔

ہاں بھائی، میں ازروے مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں۔ اب جو شخص تم سے پوچھا کرے، اس سے پردہ نہ کرنا اور صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے، یعنی سب کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔

مرقومہ چاشتگاہ شنبہ ۲۱۔ جنوری (۱۸۶۰ء)

(۱۲)

برخوردار سعادت و اقبال نشان، حکیم غلام نجف خاں کو میری دعا پہنچے۔ تمھاری تحریر پہنچی۔ تم جدا گانہ خط نہ لکھا کرو۔ خط لکھا اور بیرنگ یا پوسٹ پیڈ جس طرح چاہا، اپنے آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھیج دیا۔ مکان کا پتا ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس، ڈاک منشی میرا آشنا۔ اب تم ایک کام کرو۔ آج یا کل ڈیوڑھی جاؤ اور جتنے خط جمع ہیں وہ لو۔ مان سنگی مضبوط کاغذ کا لفافہ کرو اور بیرنگ لکھ کر کلیان کے ہاتھ ڈاک گھر میں بھجوا دو اور اپنے خط میں جو حال شہر میں نیا ہو، وہ مفصل لکھو۔ جناب حکیم صاحب[۱] کو سلام نیاز اور ظہیر الدین احمد خاں کو دعا کہنا۔

اب میرا حال سنو: تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو درکنار اکو بھی میسّر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں۔ کچّی دیواریں اور کھپریل، سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں، وہ بھی ایسے ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے، مگر بواسطہ کارپردازانِ سرکار۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں؛ میں سمجھا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی، لیکن آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے "کوسی"، سبحان اللہ ایسا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے، صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ[۲]۔ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست ہیں، آدمی بھی توانا، مگر ہاں ایک عنایت[۳] دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا۔ والدعا

جمعہ ۳۔ فروری ۱۸۶۰ء

(۱۳)

میاں،

تم نے بُرا کیا کہ لفافہ کھول کر نہ پڑھ لیا۔ بارے آج سہ شنبہ ۱۴۔ فروری صبح کے وقت یہ لفافہ پہنچا اور اسی وقت پڑھوایا گیا۔ خط لفٹنٹ گورنر بہادر کا نہیں۔ یہ خط نواب گورنر جنرل بہادر کے چیف سکرتر کا ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے:

"از دفتر خارجہ سکرتر اعظم، حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو کہ جواب اس عرضی کا نواب گورنر جنرل بہادر

---

[۱] حکیم احسن اللہ خاں [۲] کمال حسن بیان کی یہ کتنی عمدہ مثال ہے [۳] میرزا کا ملازم۔ اس خط میں بھی رام پور کے حالات ہیں۔

بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔ از کیمپ لودھیانہ ۲۸۔ جنوری ۱۸۶۰ء"

یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹنٹ بہادر آگرہ سے مراد آباد آیا چاہتے ہیں۔ مراد آباد یہاں سے چار کوس ہے۔ نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں۔ دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مراد آباد جائیں گے، میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں، مگر دیکھوں کیا گفتگو درمیان آتی ہے۔ جو واقع ہوگا تمہیں لکھوں گا۔

بر تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری اُستانی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سُناؤ؟ اب ان کو خیال ہوگا کہ اس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم میرا یہ خط ہاتھ میں لے جاؤ اور حرف بحرف پڑھ سناؤ۔

لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا، سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب[1] آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسنہ۔ ایک پیسہ روز دونوں کو دیا گیا آج ۱۴ ہے۔ مہینا دُور ہے۔ دیکھیے کے بار قرض لیں گے۔ یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنی والدہ[2] کو سُنا دینا۔ ہاں بھائی یہ بھی گھر میں پوچھ لینا کہ کدار ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے وفاداری اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

سہ شنبہ ۱۴۔ فروری ۱۸۶۰ء — غالب

(۱۴)

صاحب،

کل آخر روز تمہارا خط آیا۔ میں نے پڑھا، آنکھوں سے لگایا، پھر بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ اُنھوں نے پڑھ لیا ہوگا۔ ما کُتِبَ فیہ معلوم کیا ہوگا۔ تمہارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا جی گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی ناگاہ ظہیر الدین کا آنا یاد آتا ہے۔ کہو اب خیر سے کب آؤ گے؟ کے برس، کے مہینے، کے دن راہ دکھاؤ گے؟ یہاں کا حال جیسا کہ دیکھ گئے ہو، بدستور ہے:

زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے

جاڑا پڑ رہا ہے، توانگر غرور سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے[3]۔ آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا، عرق[4] کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسدادِ دروازۂ آبکاری ہے، ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔

مولوی فضل رسول صاحب حیدر آباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم کو معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔

---

[1] حسین علی خاں [2] بیگم غالب [3] سبحان اللہ کیا بیان ہے [4] شراب۔

زیادہ کیا لکھوں؟

کیوں ظہیر الدین، کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے اپنی بندگی لکھتا؟ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے، تیری بندگی لکھ دی، تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی؟

صبح یک شنبہ ۱۱- جنوری ۱۸۶۳ء غالب

—(۱۵)—

بھائی،

میں تم کو کیا بتاؤں کہ میں کیسا ہوں؟ طاقت یک قلم جاتی رہی ہے۔ پھوڑا بدستور ہے، رِستا ہے، خیر، محلِ اندیشہ نہیں ہے۔ رِس رِس کر مادّہ نکل جائے گا۔ اس سے اور زیادہ خستہ اور افسردہ ہوں، قبض کہ وہ جانی دشمن ہے، ان دنوں میں حد کو پہنچ گیا ہے۔ بہرحال؛

مرگیست بنام زندگانی

حضرت غور کی جگہ ہے، ایک مکان دلکشا، کوچے کی سیر، بازار کا تماشا، دو کمرے، دو کوٹھڑیاں، آتشدان، صحن وسیع، اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے؟ دروازہ وہ تاریک کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے اور پھر ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع، گوہ کے ڈھیر۔ کہیں حلال خوروں کا بچہ ہگ رہا ہے، کہیں بیل بندھا ہوا ہے، کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذاً باللہ! خدا نہ لے جائے ایسے مکان میں۔

تم نے وہ مسودہ کیوں نہیں بھیجا؟ میں خدمت گزاری کو آمادہ ہوں ۱۲

(۱۸۶۴ء) نجات کا طالب، غالب

—(۱۶)—

میاں،

تمہارا گلہ میرے سر و چشم پر، لیکن میرا حال سُن لو اور اپنے وہم و قیاس پر عمل نہ کرو۔ پہلے ظہیر دلپذیر کا خط آیا[1]۔ پڑھتے ہی اس کا جواب لکھ رکھا۔ دوسرے دن ڈاک میں بھجوا دیا۔ مضمون بہ تغیر یہ: تم جو پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو، اس کا سبب یہ کہ مجھ میں تمہارا لہو ملتا ہے اور میں احتراق خون کا پتلا ہوں۔ پھر تمہارا خط آیا، تیسرے دن اس کا جواب بھجوا دیا۔ مضمون یہ کہ تم سے تو میرا پیارا پوتا ظہیر الدین اچھا کہ جاتے وقت مجھ سے مل گیا اور وہاں پہنچتے ہی مجھ کو خط لکھا۔ رسید ڈاک گھر سے ملتی نہیں۔ خط دونوں پیڈ تھے۔ یہاں کے ڈاک گھر میں ممکن نہیں کہ میرے وہ دونوں خط رہ گئے ہوں۔ شیخوپور کی ڈاک کے ہرکاروں نے نہ پہنچایا، میرا کیا قصور؟ البتہ سرنامے پر صرف بستی کا نام اور تمہارا نام تھا۔ محلّے کا نام نہ تھا۔ شاید اس

---

[1] ظہیر الدین ابن حکیم غلام نجف خاں۔

سبب سے خط نہ پہنچا ہو۔ اسی وقت تمہارا خط آیا، میں نے لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھیں۔ اب عنایت اللہ کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں اور پچھوا منگواتا ہوں کہ پتا وہاں سے کیا لکھا جاتا ہے۔

لو صاحب عنایت اللہ آیا اور یہ پُرزہ لایا ہے۔ پتا سر نامے پر لکھتا ہوں، مگر ڈاک کا وقت نہیں رہا۔ کل صبح بھیج دوں گا۔

حکیم ظہیر الدین خاں کو دُعا۔ بیٹا، اب اس وقت مجھ میں دم نہیں، دعا پر قناعت کر۔ تیرے خط کا جواب جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، بھیج چکا ہوں۔ جھوٹے پر لعنت، تُو بھی کہہ، "بیش باد"۔ [1]

نواب مصطفیٰ خاں کل شہر میں آ گئے۔ مع قبائل آئے ہیں۔ ذیقعدہ میں چھوٹے لڑکوں کی ختنہ اور ذی الحجہ میں محمد علی خاں کی شادی کریں گے۔

آج پانچواں دن ہے، شہر میں مُرغ کے انڈے کے برابر اولے پڑے، کہیں کہیں اس سے بڑے بھی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر [2] جدید آئے، دربار کیا۔ میری تعظیم اور مجھ پر عنایت، میری تمنّا سے زیادہ کی۔ آؤ گے تو مفصّل سُن لو گے۔

شنبہ ۴۔ ذی قعدہ (۱۲۸۱ھ، یکم اپریل ۱۸۶۵ء) نجات کا طالب، غالب

(۱۷)

میاں،

چاول بُرے، بڑھتے نہیں، لمبے نہیں، پتلے نہیں۔ اب زیادہ قصّہ نہ کرو، پُرانے اور پتلے چاول آئیں۔ ایک روپے کے خرید کر کے بھیج دو۔ یاد رہے، نئے چاول قابض ہوتے ہیں اور پُرانے چاول قابض نہیں ہوتے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔

شام کو میر مجد الدین صاحب کہتے تھے کہ حکیم غلام نجف کے پاس ایک کاتب ہے۔ دس بارہ جزو کی ایک کتاب نثر کی مجھ کو لکھوانی ہے۔ یہ معلوم کر لو کہ وہ صاحب روپے کے کے جزو لکھیں گے اور روز کس قدر لکھ سکتے ہیں؟ یہ تو اب لکھو اور پھر دوپہر کے بعد ان کو میرے پاس بھیج دو تا کہ میں ان کو کاغذ اور منقول عنہ حوالے کروں۔ ظہیر الدین کو دعا کہو اور اس کا حال لکھو۔ غالب

(۱۸)

برخوردار حکیم غلام نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ بُدھ کا دن، پہر بھر دن چڑھا ہو گا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۲۰۔ جمادی الاوّل (۱۲۸۲ھ) کی اور ۱۱۔ اکتوبر (۱۸۶۵ء) کی ہے۔ دونوں لڑکے، دونوں گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔ اب آئے جاتے ہیں۔ رات بخیر گزرے، بشرطِ حیات کل رام پور پہنچ جائیں گے۔ گھبرایا ہُوا ہُوں، تیسرا دن ہے پائے خانہ پھرے کو۔ لڑکے بخیر و عافیت ہیں۔ اپنی اُستانی سے کہہ دینا۔ میرزا شہاب الدین خاں کو دُعا، نواب ضیاء الدین کو

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا جب حکیم غلام نجف خاں اور حکیم ظہیر الدین اپنے وطن شیخوپور (یو پی) گئے ہُوئے تھے۔
[2] سر ڈانلڈ میکلوڈ جو سر رابرٹ منٹگمری کے بعد ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کا لفٹنٹ گورنر رہا۔ دہلی کا علاقہ ۱۸۵۷ء کے بعد پنجاب میں شامل ہو گیا تھا۔

سلام۔ میرا رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا۔ ضرور، ضرور، ضرور۔ ظہیر الدین دعا سے خفا ہوگا۔ اس کو میری بندگی کہنا۔[1]

غالب

(۱۹)

اقبال نشان، عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ تمھارے خط سے معلوم ہُوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم ہیں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربّے، اچار۔ ہیں خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلّو اچھا ہو گیا۔ سقا، مشعلچی، خاکروب، سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہُوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع، اخلاق، کسی بات میں کمی نہیں۔

ظہیر الدین خان بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی[2] صاحب کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی، وہ غلط ہے، اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ باقی خیر و عافیت۔

صبح شنبہ ۲۱۔ ماہ اکتوبر ۱۸۶۵ء غالب

(۲۰)



صاحب،

تم سچ کہتے ہو۔ بھائی فضل اللہ[3] کی غمخواری اور مددگاری کا کیا کہنا ہے، مگر اور سے مجھ کو لینا نہیں۔ یاد رکھنا کہ وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ بفرض محال اگر ملا تو ڈھائی سو روپیہ، سو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں کا دینا ہے۔ ان کا قرض ادا ہو جائے گا۔ احیاناً اگر خلاف میرے عقیدے کے پانسو روپیہ کا حکم ہُوا اور وہ آ جائیں تو بعد اطلاع ڈھائی سو میاں فضل کو دے کر مجھے لکھنا۔ باقی کے واسطے میں جس طرح لکھوں، اس طرح کرنا۔

لو صاحب شیخ چلّی بنا، خیالی پلاؤ پکا لیا۔ اب روداد سنو۔ نواب صاحب[4] کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ آج منگل کا دن ۴۔ جمادی الثانی (۱۲۸۲ھ) کی اور ۲۴۔ اکتوبر (۱۸۶۵ء) کی ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہوگئی، لیکن اس میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔ دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہوگا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی مدت اس کی ہے۔ بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔ خدا چاہے تو آخر دسمبر تک تم کو آ دیکھتا ہوں۔ ظہیر الدین خاں کو دعا۔

(۲۴۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء)

---

[1] یہ اور اس سے اگلے تین خط دوسرے سفرِ رام پور سے متعلق ہیں [2] ظاہر ہے کہ یہ خطاب ظہیر الدین کو ہے نہ کہ غلام نجف خاں کو، اس لیے کہ بیگم غالب کو دادی لکھا۔ اگر خطاب غلام نجف خاں سے ہوتا تو والدہ یا استانی لکھتے۔ [3] یہ امین اللہ خاں دیوان الور کے بھائی تھے۔ راجا شیو دھیان سنگھ کو اختیارات ملے تھے تو یہ دربار الور میں پہنچ گئے تھے [4] نواب کلب علی خاں والی رام پور جن کے جشن جلوس میں شریک ہونے کے لیے میرزا غالب دوسری مرتبہ رام پور گئے تھے۔

(۲۱)

صاحب،

تمھارے دو خط متواتر آئے۔ ظہیر الدین کا آگرہ جانا، میرا خط اس کا موسومہ تمھارے پاس پہنچنا اور اس کا آگرہ کو روانہ ہونا، ظہیر الدین کی دادی[1] کا بعارضہ سرفہ و سعال[2] رنجور رہنا، کدار ناتھ کا مجھ سے خفا ہونا، مکان کے روکنے کی اجازت کا مانگنا، فضل حسن سے میرے واسطے دریوزۂ تفقّد کرنا، یہ مدارج و مطالب معلوم ہوئے۔ ظہیر الدین کا خط تم نے کیوں کھولا؟ وہ مغلوب الغضب ہے، تم پر خفا ہوگا۔ اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماد اللحم کا ہے، وہ کھنچوا دو اور ذرا خبر لیتے رہو۔ کدار ناتھ لڑکا ہے، وہ مجھ سے کیا خفا ہوگا؟ روپیہ جو خزانہ میں جمع ہوگا۔ آخر وہی لائے گا۔ خفا میں ہوں کہ روپیہ دام دام پایا اور میرا تمسک نہ دیا[3] اور چھتیس روپے آٹھ آنے کا نہ بانٹا۔ مکان کے روکنے کو اور کس طرح لکھوں؟ شہاب الدین خاں کو لکھا، شمشاد علی بیگ کو لکھا، اب تم کو لکھتا ہوں۔ ستمبر کے پانچ روپے آٹھ آنے دے آیا ہوں۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر یہ سولہ روپے آٹھ آنے آ کر دوں گا، بلکہ اگر موقع بنے گا تو یہ سہ ماہہ یہاں سے بطریق ہنڈوی بھیج دوں گا۔

اسماعیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور یہ کہو ڈیوڑھی کی سیڑھی بنوا دیں اور حویلی کے پاے خانے کی صورت درست کروا دیں۔ ہاے قسمت! اس قسمت پر لعنت کہ میاں فضل حسن میرے مربّی و محسن نہیں اور پھر واے محرومی کہ مطلب بر آری نہ ہو۔ لونڈوں کا احسان زہرِ قاتل ہے۔ فضل اللہ خاں میرا بھائی ہے۔ اس کا احسان مجھ کو گوارا، سو بار اس سے کہا اور ہزار بار کہوں گا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ اس سے زنہار نہ کہیے گا، نہ لکھیے گا، اگر کچھ کہو، تو فضل سے کہو تفضل سے کہو والا، لا۔

نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو، یا کل آ جائیں گے۔ جشن جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

یکشنبہ ۱۲۔ نومبر ۱۸۶۵ء، صبح کا وقت

نجات کا طالب، غالب

(۲۲)

میاں،

آج صبح کو تم آئے تھے۔ میں اس ٹکٹ کے قصے میں ایسا الجھا کہ تم سے کہنا بھول گیا۔ اب میر عنایت حسین صاحب تمھارے پاس پہنچتے ہیں۔ جس امر میں یہ تم سے کوشش چاہیں، تم کو میری جان کی قسم، بہ دل متوجہ ہو کر اس کام کو انجام دو۔ امر سہل ہے، کچھ بات نہیں ہے، مگر درصورت سعی، خدا کے ہاں سے تم کو بڑا اجر ملے گا اور میں تمھارا ممنون ہوں گا۔[4]

(۱۸۶۶ء)

نجات کا طالب غالب

---

[1] اشارہ بیگم غالب کی طرف [2] کھانسی [3] مطلب یہ کہ کدار ناتھ کا جتنا روپیہ میرزا کے ذمّے تھا، وہ اس نے وصول کر لیا، لیکن قرضے کا تمسک واپس نہ کیا۔ [4] یہ خط منشی مہیش پرشاد کے مجموعہ "خطوط غالب" سے ماخوذ ہے۔

(۲۳)

حکیم غلام نجف خاں،

اگر تم نے مجھے بنایا ہے، یعنی استاد اور باپ کہتے ہو، یہ امر از روئے تمسخر ہے تو خیر اور اگر از روئے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو۔ بھائی انصاف کرو، اس نے اگر حکیم احسن اللہ خاں سے رجوع کی، وہ تمھارے بھائی بھی ہیں، .... اور تم کو ان سے استفادہ بھی ہے۔ اگر گھبرا کر حکیم محمود خاں کے پاس گیا، تو ان کے باپ سے تم کو نسبت تلمذ کی ہے۔ ابتدا میں ان سے پڑھے ہو۔ پس یہ غریب سوائے تمھارے اگر گیا تو تمھارے ہی علاقہ میں گیا، وہ بھی گھبرا کر اور خفقان سے[1] ... آکر۔ اب جو حاضر ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس پر بہ نسبت سابق کے زیادہ توجہ فرماؤ اور بہ دل اس کا معالجہ کرو۔

(۱۸۶۶ء) التفات کا طالب، غالب

حکیم ظہیر الدین احمد خاں



(۱)

اقبال نشان، حکیم ظہیر الدین احمد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ کہو میاں، تمھارا مزاج کیسا ہے؟ اور تمھارے بھائی مرزا تفضل حسین کیسے ہیں؟ اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خبر پوچھنا اور اپنے والد ماجد[1] کو میری دعا کہنا اور کہنا تمھارا خط میرے خط کے جواب میں تھا، اس صورت میں اور کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔

سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کے مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپئے پہنچا دیے یا نہیں[2]؟ کدار ناتھ ڈیوڑھی پر آکر جعفر بیگ، وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں؟ اچھا میرا بیٹا، یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو، دیر نہ کیجیو[3]۔

پنجشنبہ ۲۔ نومبر ۱۸۶۵ء خط کے جواب کا طالب، غالب

(۲)

جناب فیض مآب چچا صاحب، قبلہ و کعبۂ دو جہاں کے حضور میں کورنش و تسلیم پہنچاتا ہوں اور ہزار زبان سے اس توپ کے مرحمت فرمانے کا شکر بجا لاتا ہوں۔ سبحان اللہ کیا توپ، جس کی آواز سے رعد کا دم بند اور رنجک کے رشک سے بجلی کو رنج، گو لا اس کا خدا کا قہر، دھراں اس کا دریائے عشق کی لہر۔ استغفر اللہ کیا باتیں کرتا ہوں، جھوٹ سے دفتر بھرتا ہوں۔

---

[1] حکیم غلام نجف خاں [2] یہ اس رقم کی طرف اشارہ ہے جو بیگم غالب کو لوہارو سے ملتی تھی [3] یہ خط رام پور سے لکھا گیا جب غالب دوسری مرتبہ کلب علی خاں کی مسند نشینی میں شریک ہونے کے لیے گئے تھے۔

کیسی زنجک، کیسا دھواں، کیسا گراب۔ یہ وہ توپ ہے کہ بغیر ان عوارض کے صرف اس کی آواز سے رستم کا زہرہ آب ہو جائے۔ اب بارود ہو تو زنجک اڑے، آگ دہکائیں تو دھواں ہو، گولہ چھرا کچھ اس میں بھریں تو ظاہر میں کہیں نشاں ہو۔ صرف اس کی آواز پر مدار ہے۔ نئی ترکیب اور نیا کاروبار ہے۔ ایک آواز اور اس میں یہ اعجاز کہ دوست کو فتح کی شلک کی صدا سنائے، دشمن سننے تو ہیبت سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے۔ آواز کا صدمہ اگرچہ صدائے صور سے دونا ہے، مگر ہمیں یہی کہتے بن آتا ہے کہ صور کا نمونہ ہے۔ کیا خدا کی قدرت ہے، دیکھو تو کیسی ندرت ہے۔ توپ کا گولہ توپ ہی میں رہ جائے اور جو قلعہ روبرو آئے، وہ ڈھے جائے۔ دانا آدمی اسے زنجیری گولہ کہتا ہے کہ توپ میں سے نکل کر پھر وہیں اُلجھ رہتا ہے۔ اچھے میرے چچا جان، یہ توپ کس نے بنائی اور تمہارے ہاتھ کہاں سے آئی؟ جو دیکھتا ہے حیران ہوتا ہے، اب شہر میں جا بجا اسی کا بیان ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ تم کو ہمارے سر پر سلامت رکھے اور ہمیشہ بدولت و اقبال و عز و کرامت رکھے۔[1]

نواب حسین میرزا اور متعلقین

میر محمد امین موسوی حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد میں سے تھا۔ ہندوستان آ کر اس نے بڑا عروج حاصل کیا۔ سعادت خاں برہان الملک خطاب ملا اور اودھ کا حاکم مقرر ہوا۔ اس کے نرینہ اولاد نہ تھی، صرف لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک کو اس نے اپنے بھانجے میرزا مقیم سے بیاہ دیا تھا۔ اسے بعد میں صفدر جنگ خطاب ملا۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ، سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر وغیرہ اس کے اخلاف اور جانشین تھے۔

میر محمد امین کا ایک ہم جد بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی لکھنؤ میں مقیم تھا۔ اس شاخ میں سے ایک کا نام غیاث الدین محمد تھا، جس کا فرزند اکبر حسام الدین حیدر تھا۔ حسام الدین حیدر کی والدہ فوت ہو گئی تو غیاث الدین محمد نے ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں وزیر شاہ عالم ثانی کی بیٹی سے شادی کر لی۔ نواب سید محمد زندا اسی کے بطن سے تھے۔

حسام الدین حیدر کو سوتیلی والدہ کا سلوک پسند نہ آیا اور وہ لکھنؤ سے نکل کر دہلی چلے آئے۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ اُنھوں نے سات گاؤں کی جاگیر کے علاوہ دربار میں عہدہ دے دیا۔ لکھنؤ سے بھی خاصی رقم ماہوار مل جاتی تھی۔ نقد روپیہ بھی خاصی مقدار میں ساتھ لائے تھے۔ دہلی میں جائداد خرید لی۔ شاہانِ اودھ کی دہلی والی جایداد کا انتظام انھیں کے حوالے ہو گیا۔ مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ خطاب ملا۔ بَلّی ماراں میں ان کی حویلی تھی۔ شاعر بھی تھے۔ اردو میں نامی تخلص کرتے تھے۔ دیوان ریختہ مرتب کر لیا تھا۔ اس کا دیباچہ مرزا غالب نے لکھا تھا، جو "پنج آہنگ" کے "آہنگ چہارم" میں موجود ہے۔ سنا ہے کہ اب یہ دیوان ریختہ مہاراجا محمود آباد کے کتب خانہ میں ہے۔ فارسی دیوان

---

[1] یہ خط میرزا نے ظہیر الدین کی طرف سے نجم الدین حیدر کو لکھا تھا، تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ اسے صرف اس خیال سے مجموعۂ خطوط میں شامل کر لیا کہ تحریر بہر حال میرزا ہی کی ہے۔

بھی تھا۔ لیکن اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ ۱۸۴۶ء میں فوت ہوئے۔

حسام الدین حیدر خاں کی شادی نواب نجف علی خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے دو فرزند تھے اور ایک دختر۔ فرزندوں میں سے بڑے مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں، چھوٹے معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر خاں ذوالفقار جنگ جن کا نام حسین مرزا تھا۔ دختر کا نام قدسیہ سلطان تھا جس کی شادی مرشد آباد کے ایک عالی خاندان امیر محمد نصیر سے ہوئی تھی۔ محمد نصیر زیادہ تر لکھنؤ میں رہتے تھے، لیکن قدسیہ سلطان نے زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گزارا۔ ان کے فرزند یوسف مرزا تھے، جن کے نام غالب کے خطوط ہیں۔ وہ ۱۲۸۲-۸۳ھ (۱۸۶۵-۶۶ء) میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

مظفر الدولہ نے کوئی مشغولیت قبول نہ کی اور اپنی خاندانی جاید اد پر امیرانہ گزر اوقات جاری رکھی۔ ان کی شادی شمس الدولہ بخشی الممالک بخشی محمود خاں کی صاحبزادی عالیہ بیگم سے ہوئی تھی۔

حسین مرزا ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بھائی سے چودہ برس اور بہن سے چار برس چھوٹے تھے۔ ان کی شادی ضمیر الدولہ جلیل الملک افتخار الامرا احمد حسین نظارت خاں بہادر مستقیم جنگ کی صاحبزادی حسینی بیگم سے ہوئی۔ خسر کے انتقال کے بعد شاہی نظارت کا عہدہ حسین میرزا ہی کو ملا۔ جس پر وہ غدر تک فائز رہے۔

جب غدر ہوا تو مظفر الدولہ کو بھائی کے متعلق سخت تشویش پیدا ہوئی۔ ہندوستانی سپاہ تمام معاملات پر قابض ہو چکی تھی۔ حسین مرزا چاہتے بھی تو ملازمت چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتے تھے، بلکہ خود بہادر شاہ بھی مجبور اور بے بس تھے۔ جب انگریزی سپاہ دہلی میں داخل ہوئی تو مظفر الدولہ دوسرے لوگوں کے ساتھ الور چلے گئے، جہاں کا راجا ان کا دوست تھا۔ الور سے وہ پکڑے آئے اور گوڑ گانوں میں انگریز افسروں نے مقدمے یا تحقیق و تفتیش کے بغیر انھیں دوسرے لوگوں کے ساتھ گولی مار کر شہید کر ڈالا۔ شیخ ابراہیم ذوق کے اکلوتے فرزند شیخ اسماعیل بھی غالباً انھیں مظلوم کشتوں میں شامل تھے۔

حسین میرزا متعلقین کو لے کر پہلے صفدر جنگ کے مقبرے میں چلے گئے اور کس حالت میں؛ اجمیری دروازے سے مقبرے تک چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا، جسے طے کرنے میں دس ہزار روپے کی رقم لٹیرے گوجروں کے حوالے کرنی پڑی۔ پھر نواب حاکم علی خاں، حسین مرزا کو مع متعلقین چپ چاپ نکال کر اپنے گاؤں برست لے گئے، جو پانی پت کے قریب ہے۔ وہ دربار کے ناظر رہ چکے تھے اور انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جگہ جگہ ان کی تلاش ہوتی رہی۔ جب انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ برست میں ہیں، تو گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ لیکن اس سے پیشتر حسین مرزا پانی پت پہنچ گئے۔ انصاریوں نے جانوں پر کھیل کر انھیں بچایا۔ پھر حسین مرزا بھیس بدل کر لکھنؤ پہنچے اور وہاں روپوش رہے۔ جب اعلان عفوِ عام ہوا تو دہلی واپس آئے، لیکن جاید اد ضبط ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں ان کے لکھنوی عزیزوں کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر نے کمال اہتمام سے حق دوستی ادا کیا اور جتنی مدد وہ دے سکتے تھے، دیتے رہے۔ سنا ہے کہ حسین مرزا کچھ مدت کے لیے بیکانیر میں تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔

سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد دہلی آئے تو حسین مرزا ان سے بھی ملے۔ سالار جنگ نے پہلے نہ ملنے پر بڑے افسوس کا اظہار کیا اور یہ تاکید کی کہ حیدر آباد آ جائیں۔ وہاں جانا چاہتے تھے۔ اس اثنا میں جنون کے آثار نمودار ہوئے۔ جن ہولناک

مصائب سے وہ گزر چکے تھے، ان کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا چنانچہ باقی ساری زندگی بہ حالت جنون گزری۔ ۶۔ رمضان ۱۳۰۶ھ (۶۔ مئی ۱۸۸۹ء) کو فوت ہوئے۔ میر مہدی مجروح نے تاریخ وفات لکھی:

حسین میرزا چوں مُرد در ششِ رمضان — ازاں کہ بود ز نسلِ امیر خیبر گیر
پئے شمارۂ سال وفات رضواں گفت — "بیا بہ کاخِ جناں اے امیر ابنِ امیر"

ان کے بڑے فرزند سجاد میرزا تھے اور چھوٹے اکبر میرزا۔ دونوں کی اولاد موجود ہے۔ اکبر میرزا نے خاندان کے پورے حالات لکھ دیے تھے۔ اس قیمتی کتاب کا مسودہ ان کے فرزند ارجمند احسن میرزا کے پاس ہے۔ انھیں سے مجھے خاندانی حالات تفصیلاً معلوم ہوئے اور اکبر میرزا کی لکھی ہوئی کتاب بھی سرسری طور پر میں نے دیکھی۔ سجاد میرزا نے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی۔

میرزا غالب سے پورے خاندان کے گہرے تعلقات تھے۔ خصوصاً حسین میرزا سے تو حقیقی بھائیوں کی سی محبت تھی۔ سجاد میرزا، اکبر میرزا اور یوسف میرزا کو غالب اپنے عزیز ترین اقربا میں سمجھتے تھے۔ دو آدمی تھے جن کے پاس میرزا کا پورا کلام جمع ہوتا تھا، ایک ضیاء الدین احمد خاں نیر، دوسرے ذوالفقار الدین حیدر حسین میرزا، جنھیں بعض اوقات عہدے کی بنا پر میرزا غالب "ناظر جی" لکھتے ہیں۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے صاحبزادے آغا ابراہیم کی شادی اسی خاندان میں ہوئی تھی۔

(۱)

جناب نواب صاحب،

شکوہ کرنا سہل ہے۔ سبز سیاہی کہیں سے مفت کی ہاتھ آ گئی۔ حضرت نے شکوہ لکھا۔ یوسف میرزا صاحب نے نظم و نثر کے لکھنے کا حکم چڑھایا۔ بھائی تمھارے خط کا جواب آ گے لکھ کر بھیج چکا ہوں۔ اپنی طرف سے سلطان[1] عالم کو ابھی عرضی نہ لکھوں گا اور جب لکھوں گا تو خدا میرے خداوند[2] کو سلامت رکھے، بواسطہ ان کے بھیجوں گا۔ تم کو چاہیے کہ اپنی طرف سے فارسی متعارفہ مروجہ میں لکھ بھیجو۔ یہی تم کو لکھ چکا ہوں اور اب یہی جواب ہے یوسف میرزا کو۔

پرسوں میرزا آغا جان صاحب آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بھاڑا سنگھ اور کاشی ناتھ آئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ نہ میرے کام کے، نہ تمھارے کام کے۔ کام کریں کیا، گنجایش ہی نہیں اور جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینہ برسا یعنی سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں۔ آبادی[3] کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں۔ کئی ہزار گھر کی لبتی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہو گا۔ گھبراؤ نہیں جلدی کیا ہے؟ آج سردار سنگھ ولد جگت سنگھ میرے پاس آئے تھے، تمھارے مکان کا پتا لکھوا لے گئے ہیں۔ شاید تم کو خط لکھیں۔ میر عنایت حسین گڑھ مکتیشر بن کر اُڑ گئے۔ کئی آدمیوں سے کہا، انھوں نے کہا اب وہ وہاں نظر نہیں آتے۔ میرے

---

[1] واجد علی شاہ پادشاہ اودھ جو ۱۸۵۶ء سے معزول ہو کر کلکتہ میں مقیم تھے۔ [2] مجتہد العصر [3] یعنی دہلی میں ان لوگوں کی آبادی جو غدر میں گھر بار چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے۔

پاس ہر ہفتے کے آنے والے، اب مہینے بھر سے نہیں آئے۔ میر مرتضیٰ حسین کا خط ان کے نام کا میرے پاس دھرا ہے، جب وُہ آئیں گے، اُن کو دے دُوں گا۔ جگت سنگھ کا لکھنؤ سے روانہ ہونے کا قصد سردار سنگھ سے کہہ دیا۔ اب کے تمھارے خط میں مظفر میرزا کی طرف سے کچھ نہیں۔ اس سے مستنبط ہُوا کہ وہ اور جگت سنگھ، جیسا کہ تم نے لکھا تھا، لکھنؤ سے کول اور مراد آباد کو گئے۔ میر امداد کا ذکر میں نے میرزا آغا جان صاحب سے کر دیا ہے کہ اچھا ہے، اگر وہ حسین میرزا صاحب اور حسینی صاحب کی طرف سے مختار ہو جائیں۔ کل جمعہ تھا، یقین ہے کہ صاحب کمشنر سے ملے ہوں گے، عرضی دی ہو گی۔ اس کا حال مجھ کو لکھو۔

یہ ہو لیا، اب میرا دُکھ سُنو۔ بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا۔ دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے خیالی ذنگ حرامی کا دھبّا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو "گوری شنکر" یا "گوری دیال"، یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا۔ اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالبؔ نے یہ سکّہ کہہ کر گزرانا:

به زر زد سکّه کشور ستانی
سراج الدین بهادر شاهِ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ گزرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہُوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پُوچھیے۔ اس وقت تو چپکا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہُوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھی کہ یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکّہ کہا۔ ہمارے نزدیک پنشن کے پانے کا مستحق نہیں ہے۔ غرض اس مقصود سے یہ ہے کہ میں یہاں موجود ہُوں اور عملے سے راہ و رسم ہے۔ یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ تاریخ روبکاری کیا ہے اور یہ صدر کو بھیجی گئی ہے یا نہیں؛ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کمشنر جدید سے ملوں گا۔ اسی سے، اگر دے گا، تو نقل لوں گا۔ جواب ازراہِ احتیاط اس کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں۔ مگر غور . . . . . اور ایک جانب سے مقدمہ کیا۔[1] بھائی میں تو علی علی کر رہا ہوں، جیوں تو اور مروں تو۔ کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے چلا جاؤں۔ یہ دو روپے[2] روز بھی اس غاصب ملعون کی گور میں جائیں، جس نے مجھے دس ہزار روپے سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنت و العذاب۔

یوسف میرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی، یہاں میر احمد حسین والد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکّہ سُنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکّے کا گزرانا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء[3] میں ہُوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع رکھتے ہیں۔ اگر وہاں اس کا پتا پاؤ گے اور وُہ پرچہ

---

[1] جہاں نقطے لگائے ہیں وہ عبارت پڑھی نہیں گئی۔ [2] میرزا کو باسٹھ روپے آٹھ آنے پنشن ملتی تھی۔ اسے دو روپے روز سے تعبیر کیا۔ [3] صحیح تاریخ جلوس اکتوبر ۱۸۳۷ء ہے۔

اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبر آباد، فرخ آباد، مارہرہ، میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا ہے۔ کالپی کو لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء ۱۸۳۸ء تین مہینوں کے بارہ پارچہ اخبار دیکھے جائیں۔

محررہ شنبہ ۱۸۔ جون ۱۸۵۹ء

(۲)

یا حسین ابن حیدر، روحی فداک

یہاں تک لکھ چکا ہوں کہ محمد قلی خاں کے نام کا خط کلو سے بو بیگم صاحبہ نے لے لیا۔ محمد قلی خاں علی جی[۱] گئے ہوئے تھے۔ کل رضا شاہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بیگم صاحب نے وہ خط میر رستم علی کو دیا اور وہ اس خط کو لے کر درگاہ گئے۔ آفرین صد آفرین میر رستم علی کو، دوست کے کام کے واسطے اتنی دور پیادہ جانا۔ آج دوپہر کو میر صاحب میرے پاس آئے اور وہی خط کھلا ہوا لائے اور کہا کہ میں تو ندراے کو حرف بہ حرف یہ خط پڑھا لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ کاشی ناتھ کو کیوں نہ دکھایا؟ اُنہوں نے کہا کہ تم دیکھ کر، پڑھ کر اپنے آدمی کے ہاتھ کاشی کے پاس بھیج دینا۔ میں نے سوچا کہ کاشی ناتھ دیکھے گا اور اُلٹا پھیر دے گا۔ نہ آدمی سے کچھ کہے گا، نہ میرے پاس آئے گا۔ میں نے میر صاحب سے کہا آپ ہی کاشی ناتھ کو دکھا کر اور اس سے بات چیت کر کے مجھ کو لا دیجیے گا۔ وہ اس خط کو بموجب میرے کہنے کے لے گئے۔ کل پرسوں وہ آئیں گے، تب فکر کی جائے گی۔ مگر بھائی! پیچ یہ پڑا ہے کہ محمد قلی خاں رضا شاہ کے ساتھ پاٹودی جاتے ہیں۔ محرم وہاں کریں گے۔ لاڈو بیگم والدۂ اکبر علی خاں نے ان کو بلایا ہے تو اب یہ مقدمہ ان کی معاودت کے بعد ہو گا۔ کاغذ میرے پاس دھرے رہیں گے۔

صاحب! محمد قلی خاں نے غلط لکھا ہے۔ نہ حسن علی خاں مقید، نہ حامد علی خاں، نہ حکیم احسن اللہ خاں حکم آخران تینوں صاحبوں کے واسطے نہیں ہوا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات پر ان کو قبضہ مل گیا۔ زنانے مکان میں، جو غضب حمام ہے، ایک انگریز اُترا ہوا ہے۔ پینتیس روپے مہینا ان کو کرایہ دیتا ہے اور وہ دونوں آدمی[۲] ابھی یونہی اُلجھے ہوئے ہیں۔ احسن اللہ خاں اپنے مکان میں جا رہے۔ دیوان خانے کو محل سرا بنایا، خود جہاں اصطبل تھا، وہاں بیٹھتے ہیں۔ دیبی رام، سالگ رام کو ان کے مکانات مل گئے۔ ایسا بھی سُنا ہے کہ ان کے دفینے بچ گئے۔ اب وہ حامد علی خاں کو قطب الدین سوداگر کی حویلی سے اُٹھا کر اپنے مکان میں لے گئے ہیں۔ سردار میرزا کا حال مجھے اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ رضا شاہ کبھی کبھی ان کی بندگی مجھ کو کہہ دیتے ہیں۔ آج یا کل رضا شاہ آ گئے تو میں بیگانہ وار نکاح و متعہ کا حال ان سے پوچھ لوں گا۔

پنجشنبہ ۲۶ ذی الحجہ (۱۲۷۶ھ) ۲۸۔ جولائی (۱۸۵۹ء)



۱؎ درگاہ شاہ مرداں، دہلی ۲؎ حسن علی خاں اور حامد علی خاں۔

(۳)

بھائی،

تمھارے خطوں کا اور یوسف میرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں۔ محمد قلی خاں صاحب ہمہ تن مصروف ہیں۔ دِوالی کی تعطیل ہو چکی ہے۔ نو ندرائے کی بی بی مر گئی ہے، وہ غمزدہ ہو رہا ہے، مگر خیر، کام کرے گا۔ کاشی ناتھ بے پروا آدمی ہے۔ تم ایک خط تاکیدی اس کو بھی لکھ بھیجو۔ اکثر وہ کہا کرتا ہے کہ حسین مرزا صاحب جب لکھتے ہیں، مرزا نوشہ صاحب ہی کو لکھتے ہیں۔ یہ امر اس پر ظاہر نہ ہو کہ میں نے تمھیں یوں لکھا ہے۔ مطلب اپنا اس کو لکھو۔

میں کیا کروں؟ اگر کہوں کہ میری جان بھی تمھارے کام آئے تو میں حاضر ہوں، یہ کہنا تکلف محض ہے۔ کون جان دیتا ہے اور کون کسی سے جان مانگتا ہے؟ مگر جو فکر مجھ کو تمھاری ہے اور جو میری دسترس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اوائل ماہ آئندہ یعنی نومبر میں نیرؔ[1] والا مقدمہ درست ہو جائے گا۔

ان سطور کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ ابھی چنی لال تمھارا قرضخواہ آیا تھا، تمھارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ جھوٹ سچ کہہ کر اس کو اس بات پر لایا ہوں کہ سو دو سو روپے تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح تقریر اس کو سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین میرزا تمھارے کھیت ہیں۔ پانی دو تو کچھ اناج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمھارے مکان کا پتا لکھوا کر لے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے رامجی داس سے صلاح کر کے جو بات ٹھہرے گی، آپ سے آ کر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ بھیج دے تو تو کیا کہنا ہے اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھنا کہ اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے۔ بس زیادہ کیا لکھوں۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ سردار مرزا صاحب[2] تشریف لائے۔ میں نے خط ان کو نہیں دکھایا، مگر عند الاستفسار کہا گیا کہ خط حسین میرزا صاحب کو لکھتا ہوں۔ انھوں نے کہا میرا سلام لکھنا کہ یہاں سب خیر و عافیت سے ہیں اور سب کو دعا سلام کہتے ہیں۔ یوسف میرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ اس وقت سردار میرزا سے دریافت ہو گیا کہ عباس میرزا کے نام کا تمھارا رقعہ ان کو پہنچ گیا۔

شنبہ ۲۹۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء

---

۱ ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ۔ مقدمے سے مراد غالباً وہ مقدمہ ہے جو نیرؔ نے اپنے بڑے بھائی نواب لوہارو کے خلاف دائر کیا تھا۔ ۲ ان سے مراد غالباً سردار میرزا ابن نواب حیدر حسن خاں ہیں جو اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت اودھ کے نواسے یعنی امراؤ بیگم کے بیٹے تھے۔ وہ حسین میرزا کے ہم زلف تھے۔ گویا ان کی شادی بھی ضمیر الدولہ جلیل الملک افتخار الامرا احمد حسین نظارت خاں بہادر مستقیم جنگ کی ایک صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ عباس میرزا، یوسف میرزا اور وزیر میرزا ان کے بیٹے تھے۔ جو یوسف میرزا، حسین میرزا کے بھانجے تھے وہ اور صاحب تھے۔

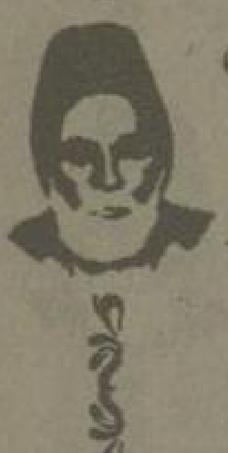
(۴)

جناب عالی!

کل آپ کا خط لکھا ہُوا سہ شنبہ یکم نومبر کو پہنچا۔ لطف یہ کہ کل وہی سہ شنبہ کا دن ۸۔ نومبر کی تھی۔ آج بدھ کا دن، ۹۔ نومبر کی صبح کے وقت میں تم کو خط لکھنے بیٹھا تھا کہ برخوردار یوسف میرزا کا خط لکھا ہُوا، ۲۔ نومبر کا پہنچا۔ اب میں دو نوں خطوں کا جواب باہم لکھتا ہوں۔ دونوں صاحب باہم پڑھ لیں ۱۲

مرزا آغا جانی صاحب اچھی طرح ہیں۔ ان کو تپ آگئی تھی۔ اب تپ مفارقت کر گئی ہے، مگر ضعف باقی ہے۔ آج چوتھا دن ہے کہ میرے پاس آئے تھے۔ کاشی ناتھ سراسر پہلو تہی کرتا ہے، نوندرائے یک سر ہزار سودا۔ محمد قلی خاں اکثر علی جی رہتے ہیں۔ کبھی یہاں آجاتے ہیں، تب نوندرائے کو تاکید کرتے ہیں۔ آجکل یہاں پنجاب احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹ کے باب میں کونسل ہُوئی۔ پرسوں ۷۔ نومبر کو جاری ہو گئی۔ سانگ رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس، ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہُوا ہے۔ غلے اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا اژدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں، پرسوں سے حکم ہو گیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایے کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی آرہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ تم انصاف کرو کہ ہمشیر کی درخواست کیوں کر گزرے؟ جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستان ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور ان کو یہاں رہنا ہوگا۔ کیوں کر اس ویرانے میں تنہا رہیں گی؟ سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبر اختیار کر کر رہیں، کھائیں گی کہاں سے؟ بہر حال یہ سب خیالاتِ خام اور جملے ناتمام ہیں۔ نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حکام بے پروا، مختار عدیم الفرصت، میں پا شکستہ۔ محمد قلی خاں کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ وقت پر موقوف ہے، گھبراؤ نہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ، دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب حامد علی خاں[1] کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض میں کرایے کے مکانات میں مع متوسلہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں۔ میرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ اُنھوں نے زمین پکڑی ہے۔ سلطان جی میں رہتے ہیں۔ عذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبراً اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں[2]

۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء



---

[1] غالب کے عزیز دوست اعتماد الدولہ میر فضل علی کے بھانجے اور داماد۔ یہ اصل میں قصبہ برست کے رہنے والے تھے جو پانی پت کے پاس ہے۔ میر فضل علی لکھنؤ جا کر ترقی کرتے کرتے نصیر الدین حیدر کے زمانے میں نائب السلطنت بن گئے۔ [2] یعنی دیکھیے یہ حکم واپس ہو جائے یا وہ تعمیل حکم پر مجبور ہو جائیں۔

(۵)

نواب صاحب،

آج تیسرا روز ہے کہ حال تم کو لکھ چکا ہوں۔ محمد قلی خاں آئے۔ ہم میں ان میں باہم گفتگو ہوئی۔ نواب گورنر کی آمد میں کچہریاں بند، حکام میرٹھ کو چلے جاتے ہیں۔ ۱۹ یا ۲۰۔ دسمبر کو میرٹھ مخیم خیام ہوگا، دربار وہیں ہوگا۔ رہا دلی کا آنا، مشتبہ نیہ ہے۔ کوئی کہتا ہے نہ آئیں گے، کوئی کہتا ہے جریدہ بسبیل ڈاک آئیں گے۔ کوئی کہتا ہے مع لشکر آئیں گے پانچ دن یہاں رہیں گے۔ آج ۱۵۔ دسمبر کی ہے۔ جو کچھ واقع ہوگا، وہ تم کو لکھوں گا۔ نقل حکم کی درخواست اور اس مقدمہ کی فکر بعد اس ہنگامہ کے عمل میں آئے گی، خاطر عاطر جمع رہے۔

تمہارا دوست[1] بھی حسب الحکم کمشنر ہانسی حصار کل یا پرسوں میرٹھ کو جائے گا اور ادھر سے امین الدین خاں بھی وہاں آئے گا۔ میر او ربار اور خلعت دریا بُرد ہوگیا۔ نہ پنسن کی توقع، نہ دربار اور خلعت کی صورت۔ نہ سزا، نہ انعام، نہ رسم معمولی قدیم۔

یوسف میرزا کو دعا پہنچے۔ پرسوں کلو جوتا لے آیا۔ کل دونوں طرف سے کھلا ہوا لے کر گیا، ڈاک کے کار پردازوں نے اُلٹا پھیر دیا اور کہا کہ پولندہ بنا لاؤ۔ پولندہ بنا کر لے گیا۔ کہا بارہ پر دو بجے لے لیا جائے گا۔ بیٹھا رہا۔ رات کے نو بجے اس کے سامنے روانہ ہوا۔ رسید لے کر اپنے گھر آیا۔ خدا کرے تم کو پہنچ جائے اور پسند آئے۔

قصیدے کے باب میں میں مایوس مطلق ہوں۔ مگر جو کچھ واقع ہو بطریق خبر لکھ بھیجنا[2]۔ مثنوی "باد مخالف[3]" کی رسید تمہاری تحریر سے معلوم ہوگئی۔ فیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ الٹوا ہیں ہے اہل فوج ڈھانا چاہتے ہیں۔ اہل قلم بچاتے ہیں[4]۔ پایان کار دیکھیے کیا ہو۔

جمعہ ۱۶۔ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۶)

نواب صاحب،

پرسوں صبح تمہارا خط پہنچا۔ پہر دن چڑھے لارڈ صاحب کا لشکر آیا۔ کابلی دروازے کی فصیل کے قریب، بھولو شاہ

---

[1] اشارہ بہ ظاہر ضیاء الدین احمد خاں نیّر کی طرف ہے، اس لیے کہ اگلی سطر میں امین الدین احمد خاں والی لوہارو کا ذکر ہے۔ [2] اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی مدح میں لکھ کر بھیجا گیا تھا۔ وہ اگرچہ معزول ہو کر کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ لیکن غالب کبھی کبھی لکھنؤ کے مجتہد العصر کی وساطت سے ان کی مدح میں قصیدہ بھیج دیتے تھے۔ [3] غالب کی فارسی مثنوی جو کلکتہ میں ادبی ہنگامہ برپا ہونے کے سلسلے میں بہ طور معذرت لکھی گئی تھی۔ ضمناً اس میں بعض اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ نیز فارسی زبان کے باب میں اپنا مسلک واضح کیا تھا۔

[4] یعنی عسکری اور کشوری لوگ۔ غدر کے بعد شہر کا انتظام کچھ مدت فوجیوں کے ہاتھ میں رہا۔ پھر کشوریوں یعنی محکمہ نظم و نسق کے ہاتھ آیا۔ اوپر کے فقرے میں جن مقامات کا نام آیا ہے، وہ دہلی کے مختلف محلے تھے۔

کی قبر کے سامنے، خیمۂ خاصہ برپا ہوا اور باقی لشکر تیس ہزاری باغ تک اترا ہے۔

پنجشنبہ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۹ء

آپ غالب کی مصیبتوں کی داستان سُنیے۔ پرسوں تمھارا خط پڑھ کر لشکر کو گیا۔ میر منشی سے مِلا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا اسلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا، خبر کروائی، حکم ہُوا کہ "غدر" کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے، اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیامِ نومیدی جاوید ہے۔ نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنسن۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

بقیہ خبرِ لشکر یہ ہے کہ راجا بھرت پور برات لے کر پٹیالے گیا تھا اور اس سبب سے آگرہ میں لارڈ صاحب سے نہیں مِلا تھا۔ ایک ہفتے سے معاودت کر کے یہاں آیا ہُوا تھا۔ آج اُس کی ملازمت ہے۔

شنبہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء گیارہ بجے ہوں گے۔ میں خط لکھ رہا ہُوں، توپیں چل رہی ہیں۔ شاید راجا صاحب کی ملاقات اسی وقت ہُوئی۔ کل یک شنبہ ہے۔ پرسوں دوشنبہ یا سہ شنبہ کو لارڈ صاحب کا کوچ ہے۔ کہتے ہیں کہ پشاور تک جائیں گے۔

کل صبح کو محمد قلی خاں آئے۔ ایک عرضی انگریزی ان کے ہاتھ میں۔ کہنے لگے یہ عرضی طالب علی فیل بان نے مجھ کو پہنچ دی ہے اور کہا ہے کہ اس کے گزراننے کا موقع نہیں۔ میں اس وقت سوار ہُوا چاہتا تھا۔ تمھاری باس سُن کر گیا، اپنا داغِ حسرت جیسا اوپر لکھ آیا ہوں لے کر آیا۔

ابراہیم علی خاں اور ہیں مستسقی ہو کر مر گئے۔ خدا اُن کو بخشے اور مجھ کو بھی یہ دن نصیب کرے۔ کمشنر صاحب کا نائب یہاں کوئی نہیں اور نہ کسی انگریزی خواں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اتنا مسموع ہُوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہُوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں[1] نے لوٹا ہے۔ البتہ اُس کا معاوضہ بحساب دو یک سرکار سے ہو گا۔ یعنی ہزار روپیہ کے مانگنے والے کو سو روپیہ ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے، وہ ہدر اور بحل ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہو گا۔ شاید یہ دہی کمشنر ہوں۔

مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو؟ وہ تو مدّت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کو نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہُوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بِکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟ تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیسا نوندرا، کیسی نقل حکم، کیسا مرافعہ۔ جو احکام کہ دلّی میں صادر ہُوئے ہیں، وہ احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے، نہ پنسن رکھتے تھے۔ رام پور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ جب تم لکھتے ہو کہ اللہ تم وہاں جاؤ تو مجھ کو ہنسی آتی ہے۔ میں یقین کرتا ہُوں کہ ہلال ماہ رجب المرجب رام پور

---

[1] یعنی ان سپاہیوں نے جنھیں انگریز باغی کہتے تھے۔

میں دیکھوں۔

جو تدبیر وثیقے[1] کے باب میں تم نے کی ہے، وہ بہت مناسب ہے، بشرطِ پیش ہونے کے اور ولایت پہنچنے کے۔ سجاد میرزا اور اکبر میرزا[2] اپنی پیرانہ سری میں اس پر قابض ہو رہیں گے۔ اِن شاء اللہ العلی العظیم۔

یوسف میرزا خاں کو دعا پہنچے۔ حال قصیدہ و مخمس کا معلوم ہُوا۔ قبلہ و کعبہ وہ کر رہے ہیں جو آبا و اولاد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے۔ ان کو منظور ہے کہ دعا کا عطیہ جُدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جُدا پاؤں:

کار سازِ ما بفکرِ کارِ ما

لیکن میری جان، انصاف تو کر ان صلوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بے ہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک ہے؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آیندہ[3] کے، اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطرہ۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے، نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت گھی منگاؤں، نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سراسر سرور۔

یا رب ایں آرزوے من چہ خوش است

تو بدیں آرزو مرا برساں

روز شنبہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء[4]

بندۂ علی ابن ابی طالب، آرزو مندِ مرگ، غالب

نواب یُوسف میرزا

(۱)

"کوئی ہے؟ ذرا یوسف میرزا کو بلائیو!

---

[1] وثیقہ کا مطلب سمجھ لیجیے، شاہان و بیگمات اودھ کا ایک دستور یہ تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو بڑی بڑی رقمیں بہ طور قرض دے دیتے تھے اور ان کے سود کی رقم اپنے مختلف عزیزوں، متوسلوں اور ملازموں کے نام لکھ دیتے تھے۔ یہ رقمیں کمپنی کے خزانے سے ان لوگوں کو ملتی رہتی تھیں۔ اصطلاح میں اسے "وثیقہ" کہتے تھے۔ حسین میرزا اور ان کے بھائی مظفر الدولہ کو بھی لکھنؤ سے غالباً پانچ پانچ سو روپے ماہوار بہ طور وثیقہ ملتے تھے، جو غدر میں ضبط ہو گئے۔ حسین میرزا نے اس کی بحالی کی کوئی تدبیر اختیار کی، جس کی تفصیل میرزا نے نہیں بتائی۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حسین میرزا اس کے لیے ولایت میں چارہ جوئی کے خواہاں تھے۔ [2] حسین میرزا کے فرزند [3] یہ خط رجب ۱۲۷۶ھ میں لکھا گیا۔ میرزا غالب کا خیال تھا وہ ۱۲۷۷ھ میں مر جائیں گے۔ ایک قطعہ تاریخ وفات بھی انھوں نے کہا تھا، جو دوسری جگہ نقل ہو چکا ہے [4] ظاہر ہے کہ اس مکتوب کا ابتدائی حصہ ۲۹۔ دسمبر کو اور باقی خط ۳۱۔ دسمبر کو لکھا گیا۔

لو صاحب وہ آئے!

" میاں! میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے، مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سُن لو: تفضل حسین خاں اپنے ماموں مویدالدین خاں کے پاس میرٹھ ہے، شاید دلی آیا ہو، مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والدان کے غلام علی اکبرآباد ہیں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں۔ لڑکے پڑھاتے ہیں، روٹی کھاتے ہیں۔ تم لکھتے ہو کہ بچاس محل واجد علی شاہ کے کلکتہ گئے۔ تمھارے ماموں[1] محمد علی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ شاہ اودھ بنارس آ گئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے۔ اُدھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں، ادھر سے بیگمات کو وہاں بلایا ہو۔ میری جان ہم کو کیا:

عالم پسِ مرگِ ما چہ دریا، چہ سراب

سنہ ۱۸۵۶ء

—— (۲) ——

اے میری جان، اے میری آنکھیں:

ز ہجرانِ طفلے کہ در خاک رفت
چہ نالی؟ کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خالق کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی رُوح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت۔ نانا نانی[2] کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟ ہاں مظفرالدولہ[3] کا غم منجملہ واقعات کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغ مِا تم جیتے جی نہ مٹے گا۔ والد کی خدمت بجا لانے کا ہرگز افسوس نہ چاہیے۔ کچھ ہو سکتا ہو اور نہ کیا ہو تو مستحق ملامت ہوتے۔ کچھ ہو ہی نہ سکے تو کیا کرو۔ اب تو فکر یہ بڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں اور کھائیے کیا؟ مولانا[4] کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہُوا، کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا، بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا[5] ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے، کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا، سو ہو لیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

ناظر جی[6] کو سلام کہنا اور کہنا کہ حال اپنا مفصّل تم کو لکھ چکا ہوں۔ وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حرمت کو بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے؟

---

[1] حسین میرزا۔ [2] حسام الدین حیدر خاں اور اس کی بیگم [3] یوسف میرزا کا بڑا ماموں، حسین میرزا کا برادر کلاں مظفرالدولہ سیف الدین حیدر خاں جو غدر میں مارا گیا۔ [4] مولانا فضل حق خیرآبادی۔
[5] مولوی عبدالحق خیرآبادی۔ [6] حسین میرزا۔

سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں! ہاں صاحب، گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

لو، حضرت میر عنایت حسین صاحب کل آئے۔ میر ارتضیٰ حسین کا خط دے دیا۔ عینک لگا کر خوب پڑھا۔ کہہ گئے ہیں کہ اس کا جواب کل لاؤں گا۔ میں تو صبح کو یہ خط روانہ کرتا ہوں، وہ آج یا کل جب خط لاویں گے، اس کو جدا گانہ لفافہ میں روانہ کر دوں گا۔ مظفر میرزا دیکھیے کب تک آوے اور مجھ سے کیوں کر ملے۔

ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا: حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا حافظ ممّو کون؟ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممّو ممّو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممّو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی، میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے۔

ہاں صاحب، خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا۔ میں نے جانا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا ہے۔ کہتا تھا کہ آغا صاحب کو میری بندگی لکھ بھیجنا۔ میرن صاحب آجکل پانی پت کو جایا چاہتے ہیں، میر کاظم علی ابن قلندر علی الور سے آئے ہوئے سلطان جی میں اترے ہوئے ہیں۔ دن پندرہ ایک ہوئے، محمد قلی خاں میری ملاقات کو آئے تھے۔ علی جی میں رہتے ہیں۔ رضا شاہ پاٹودی گئے ہوئے ہیں۔ میر اشرف علی ابن میر اسد علی مرحوم نے رہائی پائی۔ ابھی املاک کی درخواست نہیں دی۔ ہماری بھابی صاحبہ یعنی زوجہ میر احمد علی خاں مغفور اپنی حویلی میں چین کر رہی ہیں۔ ایک آدھ دن میں جاؤں گا۔ خدا جانے جمعہ کے دن ناظر جی کی درخواست پر کیا گزری۔ اس وقت تک ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ دھیان لگا ہوا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

(جون ۱۸۵۹ء)

(۳)

میری جان، خدا تیرا نگہبان!

میں نے "گرڈ پھنگ"[۱] کو دام میں پھنسایا، پھر قفس میں بند کر کے یہ رقعہ لکھوایا۔ میر ارتضیٰ حسین کو فقط ان کے نام کی جو عبارت ہے وہ پڑھا دینا تاکہ ان کی خاطر جمع ہو جائے۔ مثنوی کبھی اصلاح نہ پائے گی، جب تک سب نہ آئے گی۔ لاکھ باتیں بناؤ، مجھ کو غیرت دلاؤ، غزل جب تک پوری نہ ہو، مثنوی جب تک سب نہ لکھی ہو، کیونکر اصلاح دی جائے؟ اپنے چھوٹے ماموں صاحب[۲] کو میرا سلام بہ اعتبار محبت کے اور بندگی بہ اعتبار سیادت کے اور دعا بہ اعتبار یگانگی اور استادی کے کہنا اور کہنا کہ بھائی اور کیا لکھوں؟ جس حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو وہ اصل کہاں ہے، جس کی نقل لوں؟ ہاں زبان زد خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں، مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اے لو، کئی دن ہوئے کہ جمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندرائے کی

۱۔ گرڈ پھنگ ۲۔ حسین میرزا

مختار کاری پر قناعت کی گئی، جو کچھ ہونا ہے وُہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پُوری دو سو روپے کے پنسن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے مہینا پانے والیوں کو حکم ہُوا کہ چونکہ تمھارے بھائی مجرم تھے تمھارا پنسن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا؟ میں خود موجود ہُوں اور حکام صدر کا روشناس، پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ترپن برس کا پنسن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک اور بہ منظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے، نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔

جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہُوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں، بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی اُمید ہے، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ اِنا لِلہ و اِنا اِلیہ راجعون۔

بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنسن کی تقسیم کا حکم آجائے گا۔ دیکھیے کہ آتا ہے یا نہیں۔ اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں۔ مظفر میرزا کا خط الور سے آگیا۔ بخیر و عافیت پہنچے۔ میر قاسم علی کا قافلہ بھی وہیں ہے۔ میر قاسم علی کی بی بی الور کی تنخواہ میں سے بموجب سہام شرعیہ[1] دو ثلث مظفر میرزا کو اور ایک ثلث اپنے کو تجویز کرتی ہے۔ ظاہراً بموجب تعلیم میر قاسم علی کے ہے۔

محررہ جمعہ ۱۲۔ ذی الحجہ و ۱۵ جولائی سال حال

(۱۲۷۵ھ - ۱۸۵۹ء) غالب

(۴)

میاں،

پرسوں قریب شام میاں آغا جانی صاحب آئے۔ وہ اور ان کے متعلق سب اچھی طرح ہیں۔ جتو بیگ ہانسی گئے۔ کل تمھارا خط آیا۔ بھائی تمھیں خارش کیوں ہوئی؟ حسین میرزا صاحب کیوں بیمار ہُوئے؟ خدایا ان آوارگان دشتِ غُربت کو جمعیت، جب تو چاہے عنایت کر، مگر تصدق مرتضیٰ علی کا تندرست رکھ۔ اللہ اللہ! حسین میرزا کی ڈاڑھی سفید ہوگئی! یہ شدت رنج و غم کی خوبیاں ہیں۔ اس خط کے پہنچتے ہی اپنی اور ان کی خبر و عافیت لکھنا۔ جہاں تم نے اپنے نام کا خط پڑھا، وہاں کا حال یہ ہے:

بہ گفت احوالِ ما برق جہان است — دمے پیدا و دیگر دم نہان است
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

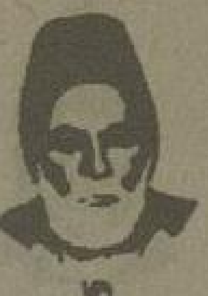
ہمارے خداوند ہیں، قبلہ و کعبہ ہیں، خدا ان کو سلامت رکھے۔ آغا باقر کا امام باڑا اس سے علاوہ کہ خداوند کا

---

[1] شرعی حصّے۔

عزاخانہ ہے، ایک بنائے قدیمِ رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں: ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک[1]۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ جبوب کی دکانیں، بہیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اموجان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثارِ عمارت باقی نہ رہیں گے۔ آج جان نثار خاں کے چھتّے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟

حسین میرزا صاحب کو میرا سلام کہنا۔ یہ رقعہ پڑھا دینا۔ ان کا خط موسومہ محمد قلی خاں آیا۔ کلو کے ہاتھ ان کے گھر بھجوایا۔ ان کا گھر کہاں؟ وہ تو میر احمد علی خاں مرحوم کی بی بی کے ہاں رہتے ہیں۔ وہ نہ تھے۔ جب بھابی صاحبہ کو معلوم ہوا کہ میرے دیور کا آدمی ہے، انھوں نے مدعا دریافت کر کے خط رکھ لیا اور کلو سے کہا کہ بھائی کو سلام کہنا کہ محمد قلی خاں علی جی گئے ہوئے ہیں خط ان کے پاس بھجوا دوں گی۔ کل رضا شاہ آئے تھے، میں نے ان کو کہا تھا کہ تم میر احمد علی خاں کی بی بی کو تاکید کر دینا کہ خط ضرور کا ہے اس کو بہ احتیاط پہنچا دینا۔



صاحب، تمھاری انا کو میں کیا جانوں؟ کس پتے سے ڈھونڈوں؟ دوا سے میں نے پوچھا۔ امیر النساء کو وہ نہ سمجھی، واجد علی کی ماں کر کے پہچانا۔ سو وہ کہتی تھیں کہ واجد علی مع اپنی ماں کے پہاڑ گنج گیا ہے۔

ہمشیرہ کی عرضی کے روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا۔ تم سمجھو اگر وہ عرضی فی الحقیقت کمشنر نے بھیج دی ہے تو بے شک مدعائے سائلہ قبول کر کے بھیجی ہے۔ اگر خود نہ منظور کرتا تو کبھی نہ بھیجتا۔ باقر علی اور حسین علی، اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین احمد خاں کی والدہ کے پاس قطب صاحب گئے ہوئے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی ان کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں اور ایک دعا اور دو آداب ملفوظی۔ دوا اور کلو اور کلیان کی بندگیاں پہنچیں۔ قمر الدین خاں پرسوں آیا تھا، اب آئے گا تو دعا تمھاری اس کو کہہ دوں گا۔

۲۸۔ جولائی ۱۸۵۹ء

غالب

(۵)

حق تعالیٰ تمھیں عمر و دولت و اقبال و عزت دے، خط محررہ دوم محرم میں کوئی مطلب جواب طلب نہ تھا۔ میرزا حیدر صاحب کی رحلت کی خبر تھی اور بس۔ کل بدھ کا دن دونوں مہینوں کی ۱۷ تاریخ[2] تھی۔ صبح کے وقت مرزا آغا جانی صاحب آئے اور انھوں نے فرمایا کہ حسین مرزا کی حرم لکھنؤ سے آئی تھی، بی فتن کے ہاں اتری تھی۔ اب وہ پاٹودی کو اپنے بیٹے کے پاس گئی۔ کہتی تھی کہ نصیب اعدا ناظر جی بہت بیمار ہیں۔ خدا خیر کرے۔ یوسف میرزا میری جان نکل گئی۔ کیا کروں؟ کیوں کر خبر منگاؤں؟ "یا علی" "یا علی" "یا علی" دس بار دل سے کہا ہوگا کہ مداری کا بیٹا دوڑا ہوا آیا اور تین خط لایا، یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا، ڈاک کے

---

[1] یعنی ریلوے لائن [2] یعنی محرم و اگست تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک دن کا فرق تھا لیکن میرزا کا بیان تقویم کے مقابلے میں زیادہ یقینی ہے۔

ہرکارے نے خط لاکر دیے۔ نیاز علی اُوپر لے کر آیا۔ ایک خط عزیز[1] کا اور ایک خط ہرگوپال تفتہ کا اور ایک خط ذوالفقار حیدر[2] مولوی کا۔ میاں، قریب تھا کہ خوشی کے مارے مجھ کو رونا آجائے۔ بارے اُس خط کو میں نے آنکھوں سے لگایا، مچھیاں[3] لیں۔

اب تم تماشا دیکھو۔ ۱۳۔محرم کا خط، ۱۷۔ کو مجھے پہنچا۔ اس میں مندرج کہ جمعے کے دن ۱۹ کو بسبیل ڈاک کلکتے جاؤں گا اور پھر حضرت مجھ سے مطلب کا جواب مانگتے ہیں۔ ہاں جب کلکتے پہنچ لیں گے اور وہاں سے مجھ کو خط بھیجیں گے اور اپنے مسکن کا پتا لکھیں گے، تب جو کچھ مجھ کو لکھنا ہوگا، لکھوں گا۔ آغا صاحب کو سب خط سُنا دیا اور ان کو اسی وقت کاشی ناتھ کے پاس بھیجا تاکہ وہ اس کو گرمائیں اور شرمائیں اور کچھ سجاد میرزا کے واسطے بھجوائیں۔ ضیاءُ الدین خاں دو ہفتہ سے یہاں ہیں۔ اپنے باغ میں اُترے ہوئے ہیں۔ دو بار میرے پاس بھی دو دو گھڑی کے واسطے آئے تھے۔ کچھ ان کو منظور ہے رعایت اخلاص و محبت قدیم[4]۔ خدا چاہے تو کچھ سجاد میرزا کو اور کلکتہ سے ان کے خط کے آنے کے بعد کچھ ناظر جی کو ان سے بھجواؤں۔

میرا وہی حال ہے۔ بھوکا نہیں ہوں، مگر کسی کی خدمت گزاری کی توفیق نہیں ہے، اگر کہوں تو کون باور کرے؟ اور وہ بات خود کہنے کی نہیں، کرنے کی ہے، سو کرنے کا مقدور نہیں۔ تفضّل حسین خاں ابن غلام علی خاں میرٹھ میں اپنے ماموں کے پاس ہے۔ شہر میں آیا تھا۔ میرے پاس بھی آیا تھا۔ تمہارا سلام کہہ دیا۔ پرسوں پھر وہ میرٹھ گیا۔ بھائی فضلو عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں، کوئی سُنتا نہیں۔ تم کو سلام کہتے ہیں۔ آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہوگیا۔ فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو، وہ نہ آئے اور باقی ہندو، مسلمان، عورت، مرد، سوار، پیادہ، جو چاہے چلا آئے، چلا جائے۔ بغیر آبادی کے ٹکٹ کے، رات کو رہنے نہ پائے۔ وہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ مگر یٹ کر ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی، دلّی والوں نے لکھنؤ کا خاکہ اُڑا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ لاکھوں مکان ڈھا دیے اور صاف میدان کر دیا۔ میں جانتا ہوں ایسا نہ ہوگا۔ بات اتنی ہی ہے جو تم نے لکھی ہے۔ بہرحال اب جو کچھ ہو لکھو اور ناظر جی کے روانہ ہو جانے کی خبر اور سجاد اور اکبر اور اس کی ماں کی خیریت اور اپنے باپ کا حال لکھو۔

پنجشنبہ ۱۸۔ محرم الحرام ۱۲۷۶ھ (۱۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

—(۶)—

میری جان شکوہ کرنا سیکھو۔ یہ باب میں نے ابھی تم کو پڑھایا نہیں۔ کوئی خط تمہارا نہیں آیا کہ میں نے اسی دن یا دوسرے دن جواب نہ لکھا ہو، بلکہ میں ایسا جانتا ہوں کہ یہ جو تم نے مجھ کو شکایت نامہ بھیجا ہے، اس کے بعد ایک خط میرا

---

۱ یوسف علی خاں عزیز ۲ حسین میرزا ۳ دیکھیے اسلوب بیان کتنا پاکیزہ اور بے تکلف ہے۔ پھر الفاظ ایسے انتخاب کیے کہ جذبات کے طبعی مدّ و جزر یا تغیّر و تبدل کی پوری تصویر سامنے آجائے۔ ۴ نواب ضیاءُ الدین احمد نے اس دور میں حسین میرزا کی امداد میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔

بھی تم کو پہنچا ہوگا۔ یہ خط کل آیا، آج میں اس کا جواب لکھتا ہوں۔

سنو صاحب، تم جانتے ہو کہ میں چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص شال، رومال، دوشالہ ایک بار پیشگاہ حضرت سلطانِ عالم[1] سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعہ سے ملا ہے؛ یعنی جناب قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر مدظلہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ میں بغیر ان کے توسط کے مدح گستری کروں۔ چنانچہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا کہ میرا دستور ہے، کاغذ بنوا کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا اور میں تم کو بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنؤ کو بھیج دیا ہے۔ اُسی خط میں یہ بھی تم کو لکھا ہے کہ حضرت زبدۃ العلماء سید نقی صاحب[2] اگر کلکتہ پہنچ گئے ہوں تو مجھ کو اطلاع دو۔ داروغگی املاک کے باب میں جو مناسب اور معقول اور واقعی ہے، وہ میں بے پردہ عالیشان مظفر حسین خاں کے خط میں لکھتا ہوں۔ یہ ورق پڑھ کر ان کی خدمت میں گزران دو اور جو وہ ارشاد کریں مجھ کو لکھو۔ تمہارے اس خط کے مطالب مندرجہ کا جواب ہو چکا۔ اس سے زیادہ میرے پاس کوئی بات اس وقت لکھنے کو نہیں ہے۔ مگر یہ کہ ایک خط تمہارے ماموں صاحب کے نام کا بھیج چکا ہوں۔ اگر وہ پہنچے گا اور خدا کرے پہنچے تو اس سے تم کو ایک حال معلوم ہوگا۔

شنبہ ۵۔ نومبر ۱۸۵۹ء
غالب



(۷)

یوسف میرزا،

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؛ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔ غمِ مرگ میں قلعہ نامبارک[3] سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں؛ مظفر الدولہ میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا، حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؛ غمِ فراق حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

---

۱ واجد علی شاہ ۲ سید علی نقی بن سید حسین بن غفران مآب سید دلدار علی نصیر آبادی۔ واجد علی شاہ کو سید علی نقی سے کمال عقیدت و ارادت تھی۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں انتقال ہوا۔ ۳ لال قلعے کو مبارک کہتے تھے۔ اس کے حوادث کی وجہ سے غالب کو پے در پے رنج پہنچے تو شدتِ غم میں اسے "نامبارک" کہہ دیا۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مرگیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج، جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہو گی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیاء اور امراء کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلّو، کلیان، ایاز، یہ باہر، مداری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے، گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم[1] سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر سدّ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعف قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں، گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق[2]، جو بقدر طاقت، بنائے رکھتا تھا، اب میسّر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ بےگناہ ہوں، نہ گناہ گار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دیا، وہ پہلی دسمبر کو مجھے دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے:

ز سال نو دگر آبے بروے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی تمام سرگزشت کے لکھنے کا کیا ہے۔ اس کی نقل تم کو بھیجوں گا۔

میرے آقا زادہ روشن گہر، جناب مفتی میر عباس صاحب کو دکھانا[3]۔ اس بجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اسلوب ہے۔

جہاں پناہ[4] کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا، میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں کہ جس کا ذکر بطریق اختصار اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو عرضِ دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔

بہرحال یہ تو کہو قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ پرسوں تمھارے ماموں کا خط آیا، اس میں قصیدے کا پہنچنا لکھتے ہیں کل تمھارا خط آیا اس میں قصیدے کے پہنچنے کا ذکر نہیں۔ اس تفرقے کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں؟ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا؟ اور کیا حکم ہوا؟ یہ امور جلد لکھو اور ہاں یہ بھی لکھو کہ املاک واقع شہر دہلی کے باب میں کیا حکم ہوا؟

---

[1] رام پور سے [2] شراب۔ [3] ان کے حالات آگے بیان ہوئے ہیں [4] واجد علی شاہ۔

میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ کل میں نے فردِ فہرست دیہات و باغات و املاک مع حاصل ہر یک باغ و دہ و ملک، ناظر جی کو بھیج دی ہے۔ اس خط سے ایک دن پہلے وہ فرد پہنچے گی۔ یہ فرد کلکٹری کے دفتر سے لی ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ شہر کی عمارت جو ترک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھے نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہے۔ کرایہ دار کا نام نہیں۔ مجھ کو یہاں کی املاک کا علاقہ حسین میرزا کے واسطے مطلوب ہے، میں تو پنسن کے باب میں حکم اخیر سُن لوں، پھر رام پور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاوّل سے ذی الحجہ تک آٹھ مہینے اور پھر محرم سے ۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس کے دو، چار، حد دس گیارہ مہینے غرض کہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت، ذلّت و عزّت جو مقسوم میں ہے اُدہ پہنچ جائے اور پھر علی علیٰ کہتا ہوا ملک عدم آباد کو چلا جاؤں۔ جسم رام پور میں اور روح عالمِ نُور میں "یا علی" "یا علی" "یا علی"۔

میاں ہم تمھیں ایک اور خبر لکھتے ہیں۔ برہما کا پتر دو دن بیمار پڑا رہا، تیسرے دن مرگیا۔ ہے ہے کیا نیک بخت، غریب لڑکا تھا۔ باپ اُس کا شیوجی رام اس کے غم میں مُردہ سے بدتر ہے۔ یہ دو مصاحب میرے یُوں گئے: ایک مُردہ، ایک دِل افسردہ، کون ہے جس کو تمھارا اسلام کہوں؟ یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا اور فرد ان سے لے کر پڑھ لینا اور جس طرح ان کی رائے میں آئے اس پر حصول مطلب کی بناء اٹھانا اور ان سب مدارج کا جواب شتاب لکھنا۔

ضیاءُ الدین خاں رہتک چلے گئے اور وہ کام نہ کر گئے۔ دیکھیے آکر کیا کہتے ہیں[1] یارات کو آگئے ہوں یا شام تک آجائیں۔ کیا کروں کہ کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں، بہ مرتضیٰ علی پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہ اودھ سے ہاتھ آئے، حصّہ برادرانہ کروں۔ نصف حسین میرزا اور تم اور سجاد نصف میں۔ مفلسوں کا مدارِ حیات خیالات پر ہے، مگر انھیں خیالات سے ان کا حسنِ طبیعت معلوم ہو جاتا ہے۔ والسّلام خیر ختام۔

دو شنبہ دوم جمادی الاوّل ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء، وقت صبح



(۸)

میاں،

کل صبح کو تمھارے نام کا خط روانہ کیا، شام کو تمھارا ایک خط اور آیا۔ حضرت زبدۃ العلماء[2] کا اب تک وہاں نہ پہنچنا تعجب کی بات ہے۔ حق تعالیٰ ان کو، جہاں رہیں حفظ و امان میں رکھے۔ جب چاہیں وہاں پہنچیں۔ میرا مقصود تو اتنا ہی ہے کہ قصیدہ گزرے اور کچھ ہمارے تمھارے ہاتھ آئے۔ لیکن کل کے خط کی پشت پر جو سطریں ناظر جی کے ہاتھ کی لکھی ہُوئی تھیں، ان کے دیکھنے سے آس ٹوٹ گئی، کچھ ہاتھ آتا نظر نہیں آتا۔

املاک واقع شہر دہلی کے سوال کا جواب اب کی بار قلم انداز ہُوا، مکرر کہا جائے گا تو بے تُنک یہ جواب آئے گا کہ ہم نے تو تم کو عوض ان مکانات کے یہ مکانات دیے، معاوضہ ہوگیا۔ بھائی، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہُوئی اور

---

[1] یعنی خط ۵ میں ان سے کچھ روپے سجاد میرزا اور حسین میرزا کو بھجوانے کا جو خیال تھا، وہ اس وقت پُورا نہ ہُوا۔ [2] سید علی نقی زبدۃ العلماء

وہ سوا لاکھ روپیہ، جو علاوہ زرِ مقررہ ملا ہے، وہ دلّی کی املاک کا خوں بہا ہے۔ پرسوں ناظر جی کے نام کے سرنامے میں فردِ فہرست مجموعِ املاک بھیج چکا ہوں۔ خیر یہ وار بھی خالی گیا۔ مولانا غالب علیہ الرحمۃ خوب فرماتے ہیں:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

تمھارے ماموں صاحب کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے، وہ کس زبان سے ادا کروں؟ ہے ہے حسین میرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے؟ بہت بڑا آسرا تھا اور سرکار کی خدمت نہ سہی، عہدہ نہ سہی، علاقہ نہ سہی، سو ڈیڑھ سو روپیہ درماہہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔ دلّی کے آدمی، خصوصاً امرائے شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سایے سے بھاگتے ہیں۔ مرشد آباد بھی ایک سرکار تھی، حیدر آباد بہت بڑا گھر ہے۔ مگر بے ذریعہ و واسطہ کیوں کر جائے اور جائے تو کس سے ملے؟ کیا کہے؟ ناچار وہیں رہو۔ کسی طرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جائے اور میں کہاں کی صلاح بتاؤں؟ وہ صاحب[1] رہتک گئے ہیں۔ کل یقین ہے کہ آ گئے ہوں گے، مجھے ابھی خبر نہیں آئی۔ اگر مشیّتِ الٰہی میں ہے تو دسمبر مہینے میں کچھ ظہور میں آ جائے گا۔ نواب گورنر جنرل بہادر، یقین ہے کہ آج آگرہ میں رونق افروز ہوں گے۔ الور، جے پور، دھول پور، گوالیار، ٹونک، جاورہ چھ رئیسوں کی وہاں ملازمت کی خبر ہے۔ خیر ہم کو کیا؟ لیث الدولہ حسین علی خاں بہادر کی خدمت میں میرا اسلام نیاز اور شکرِ یاد آوری۔

مرقومہ صبح سہ شنبہ ۲۹۔ نومبر، ۳ جمادی الاوّل بحسابِ جنتری
(۱۸۵۹ء۔ ۱۲۷۶ھ)

(۹)

میاں،

تمھارا خط رام پور پہنچا اور رام پور سے دلّی آیا۔ میں ۲۳۔ شعبان کو رام پور سے چلا اور ۳۰۔ شعبان کو دلّی پہنچا۔ اسی دن چاند ہُوا۔ یک شنبہ رمضان کی پہلی، آج دو شنبہ ۹۔ رمضان کی ہے۔ سولواں دن مجھے یہاں آئے ہُوئے ہے۔ میں نے حسین میرزا کو رام پور سے لکھا تھا کہ یوسف میرزا کو میرے آنے تک الور نہ جانے دینا۔ ان کی زبانی معلوم ہُوا ہے کہ وہ میرا خط ان کو تمھاری روانگی کے بعد پہنچا۔ جو مجھ کو اپنے ماموں کے مقدمہ میں لکھتے ہو کیا مجھ کو ان کے حال سے غافل اور ان کی فکر سے فارغ جانتے ہو؟ کچھ بنا ڈال آیا ہوں، اگر خدا چاہے تو کوئی صورت نکل آئے۔ اب تم کہو کہ کب تک آؤ گے؟ صرف تمھارے دیکھنے کو نہیں کہتا، شاید تمھارے آنے پر کچھ کام بھی کیا جائے۔ مظفر میرزا کا اور ہمشیرہ صاحبہ[2] کا آنا تو کچھ ضرور نہیں۔ شاید آگے بڑھ کر کچھ حاجت پڑے۔ بہ ہر حال جو ہو گا وہ سمجھ لیا جائے گا، تم چلے آؤ۔ ہمشیرہ عزیزہ کو میری دعا کہہ دینا۔ مظفر میرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی تمھارا خط رام پور پہنچا، اُدھر کے چلنے کی فکر میں جواب

---

[1] ضیاء الدین احمد خاں [2] بظاہر بیگم حسین میرزا۔

نہ لکھ سکا۔

بخشی صاحبوں کا حال یہ ہے کہ آغا سلطان پنجاب کو گئے۔ جگراؤں میں منشی رجب[۱] علی کے مہمان ہیں۔ صفدر سلطان اور یُوسف سلطان وہاں ہیں۔ نواب مہدی علی خاں بقدر قلیل بلکہ اقل کچھ ان کی خبر لیتے ہیں۔ میر جلال الدین خوش نویس اور وہ دونوں بھائی باہم رہتے ہیں۔ میں وہیں[۲] تھا کہ صفدر سلطان دلّی کو آئے تھے۔ اب جو میں یہاں آیا تو سُنا کہ وہ میرٹھ گئے۔ خدا جانے رام پور جائیں یا کسی اور طرف کا قصد کریں۔ تباہی ہے، قہرالٰہی ہے۔ مجھ کو لڑکوں نے بہت تنگ کیا، ورنہ چند روز اور رام پور میں رہتا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

مرقومہ دوشنبہ ۹۔ رمضان و ۲۔ اپریل
(سنہ ۱۲۷۶ھ و سنہ ۱۸۶۰ء)

راقم غالب

—— (۱۰) ——



آؤ صاحب، میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج یکشنبہ کا دن ہے، ساتویں تاریخ شوال[۳] کی اور انتیسویں اپریل کی، صبح کو بھائی فضلُو جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتلام الدولہ خطاب دیا ہے، وہ تین پاؤ کھجوریں اور ایک ٹین کا لوٹا اور دو سوت کی رسّیاں لے کر، بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہو کر الور کو روانہ ہُوئے۔ پہر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ وہ تمہارا خط میرے نام کا اور ایک حکمنامہ محکمۂ لاہور موسومہ میر کاظم علی لایا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ تمہارے ماموں صاحب مع سجاد میرزا تشریف لائے۔ تمہارا خط ان کو دے دیا۔ وہ اس کو پڑھ رہے ہیں اور میں یہ خط تم کو لکھ رہا ہُوں۔

پہلے تو یہ لکھتا ہُوں کہ حکمنامہ میر کاظم علی کو دے دینا اور میری طرف سے تعزیت کرنا کہ خیر بھائی صبر کرو اور چُپ ہو رہو۔ تاریخ کے دو قطعوں میں ایک قطعہ رہا۔ "ماہ رو خوش خرام" کی جگہ "مہ رُخ خوش خرام" بنا دیا ہے۔ قطعہ اچھا ہے، بشرط آنکہ متوفیہ کا شوہر یہ الفاظ اپنی زوجہ کے واسطے گوارا کرے۔ خواجہ جان[۴] جھوٹ بولتا ہے۔ والی رام پور کو اس پنسن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خدا ساز ہے، بہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔ ناظر جی نے تمہارے قول کی تصدیق کی اور کہا کہ ہاں مسودہ عرضی کا میرے پاس آ گیا۔ میں تم کو دکھاؤں گا۔ خیر تم نے جو لکھا ہو گا وہ مناسب ہو گا۔ خدا راس لائے اور کام بن جائے۔

الگزانڈر ہدرلے صاحب میرے دوست کے فرزند ہیں اور نیک بخت اور سعادت مند ہیں۔ میر کاظم علی وغیرہ

---

۱ سیّد رجب علی ارسطو جاہ، جو پہلے پنجاب میں میر منشی تھے۔ غدر کے زمانے میں انگریزوں کے رفیق خاص اور معتمد علیہ کارکن رہے۔ جگراؤں ضلع لدھیانہ میں اقامت تھی۔ ایک مطبع بھی قائم کیا تھا۔ غدر کے بعد ان کا گھر شرفاء دہلی کا مامن بنا رہا۔ مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم جب املاک کی بازیافت کے لیے چارہ جوئی کی غرض سے لاہور آئے تھے تو ارسطو جاہ ہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی دہلی سے نکلے تھے تو پہلے انھیں کے پاس مقیم ہوئے بعد ازاں لاہور پہنچے ۲ رام پور ۳ عام نسخوں میں رمضان چھپا ہوا ہے۔ اسے سہوِ کاتب یا سہوِ مرتب مکاتیب سمجھنا چاہیے۔ ۴ شمس الدین خواجہ جان برادر بدرالدین خواجہ امان۔

کی تنخواہ میں میری سپارش کو دخل نہیں ہے۔ تم میر کاظم علی سے دریافت کرلو۔ ہاں دو مقدموں میں میں نے ان کو دو خط لکھے، مگر انھوں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا اور ان مقدموں میں کوشش بھی نہیں کی۔ اب اس کو سمجھ کر جو کچھ تم لکھو اس کے موافق عمل میں لاؤں۔ ناظر جی صاحب اور سجاد میرزا اپنے گھر گئے۔ وہ تم کو دعا اور سجاد بندگی کہہ گیا ہے۔ اپنے آنے میں جلدی نہ کرو۔ ماں کی رضا جوئی کو سب امور پر مقدم جانو۔ میں ابھی رام پور نہیں جاتا۔ برسات بعد بشرط حیات جاؤں گا، یعنی اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر میں قصد ہے۔ یقین ہے کہ خط دو دن میر کاظم علی کے پہنچنے سے پہلے تمھارے پاس پہنچے۔ ان کے نام کا حکمنامہ بہت احتیاط سے اپنے پاس رہنے دینا۔ خبردار، جاتا نہ رہے۔ جب وہ پہنچیں، تب ان کو حوالہ کرنا۔ صاحب نہ خمس، نہ نذر یہ باتیں غیریت کی ہیں۔ جس طرح اپنے اور بچوں کو دوں گا، مظفر میرزا اور تم کو بھی اسی طرح بھجوا دوں گا۔ ہمشیرہ عزیزہ کو یعنی اپنی والدہ کو میری دعا کہنا۔

مرقومہ یک شنبہ وقت نیم روز ہفتم شوال، ۱۹۔ اپریل
(۱۲۷۶ھ۔ ۱۸۶۰ء)

غالب

(۱۱)

یوسف میرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمھارا خط کل منگل کو پہنچا۔ آج بدھ ۱۷۔ شوال اور ۹۔ مئی کی ہے۔ اس کا جواب بھیجتا ہوں۔ خدا کی قسم تامس ہدر لے صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔ ہاں الکٹ[1] صاحب سے ہے۔ سو ان کے نام کا خط لکھا ہوا تم کو بھیجتا ہوں، پڑھ کر، بند کر کر ان کو دو اور ان سے ملو اور جو کچھ وہ کہیں مجھ کو لکھو۔ احتشام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانے کہ کتاب کس کو کہتے ہیں اور آگرہ کس ہتھیار کا نام اور سکندر شاہ کون سے درخت کا پھل ہے۔ میر اردو کا دیوان میرٹھ کو گیا، سکندر شاہ لے گئے، مصطفیٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آگئی۔ نہ "برہان قاطع" نہ "قاطع برہان"۔ کل جس وقت تمھارا خط آیا، اس وقت منشی میر احمد حسین میرے پاس بیٹھے تھے اور اس وقت سالک مجذوب بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دونوں صاحب تم کو اور بھائی فضلو کو سلام کہتے ہیں اور بھائی فضلو سے یہ کہہ دینا کہ باتفاق رائے منشی میر احمد حسین، اب باغ کی درخواست کی عرضی بے فائدہ، بلکہ مضر ہے۔ تمھارا کاغذ قیمتی ایک روپیہ کا منشی جی کے پاس موجود ہے، وہ اس کو بیچ کر روپیہ تم کو بھجوا دیں گے۔

۱۷۔ شوال (۱۲۷۶ھ) و ۹۔ مئی (۱۸۶۰ء)

(۱۲)

یوسف میرزا،

کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ[2] مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر، یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اُسے

---

[1] الگزانڈر ہدرلے کا ایک تخلص آزاد تھا اور دوسرا الکٹ (مخفف الگزانڈر) تامس اس کا بھائی تھا۔ [2] یوسف میرزا کے باپ کا نام محمد نصیر تھا اور وہ لکھنؤ میں رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ تُو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف میرزا کو۔

تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب، وہ لکھتی ہیں کہ پنسن کا روپیہ مل گیا تھا، وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؛ جو مجرم ہو کر چودہ برس کو مقید ہوا ہو، اس کا پنسن کیوں کر ملے گا اور کس کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟ مصطفیٰ خاں[1] کی رہائی کا حکم ہوا، مگر پنسن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں، لیکن بہت عجیب بات ہے، تمھارے خیال میں جو کچھ آئے گا وہ مجھ کو لکھو[2]۔ دوسرا امر یعنی تبدیلِ مذہب، عیاذاً باللہ! علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہوں گے کہ ان دموں میں اپنا کام نکالو اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے۔ اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔ اس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصہ مختصر تمھاری دادی کا خط جو تمھارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا، وہ میں نے تمھارے ماموں کو بھیج دیا۔ ان کی جاداد کی واگزاشت کا حکم تو ہو گیا ہے، اگر ان کے بڑے بھائی کے یار ان کو چھوڑیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

مظفر میرزا کو دعا پہنچے۔ تمھارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمھارے چچا کا آغاز اچھا ہے، خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمھاری پھوپھی کا اور تمھارا اسرا انجام دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوگا کیا؟ اگر جاداد یں مل بھی گئیں تو قرضدار دام دام لیں گے۔ رازقِ حقیقی پنسن دلوا دے کہ روٹی کا کام چلے۔

جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا۔

مرقومہ شنبہ، ۲۷۔ شوال (۱۲۷۶ھ) و ۱۹۔ مئی سال حال (۱۸۶۰ء) غالب



نواب سجاد میرزا

(۱)

قرۃ العین سجاد ابن حسین سلمہ اللہ تعالیٰ

خوبیٔ دین و دنیا تم کو ارزانی۔ تمھارے خط کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوگئیں، دل کو چین آگیا۔ چشمِ بد دُور، خط اچھا، عبارت اچھی۔ اُردو میں مطلب نویس اچھے ہو۔ حق تعالیٰ تم کو عمر و دولت عطا کرے۔ اپنے والد ماجد کو سلام کہنا۔ اپنے بھائی مظفر میرزا کو دعا کہنا۔ زیادہ، زیادہ۔

مارچ ۱۸۶۵ء روز چہار شنبہ نجات کا طالب، غالب

---

[1] شیفتہ [2] یعنی پنشن کا روپیہ کیوں کر ملا؟

(۲)

زبدۂ آلِ رسولؐ، سجاد میرزا خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دُعا۔ دلنواز نامہ پہنچا۔

حیرانِ اطوارِ خودم ، در ماندۂ کار خودم
ہر لحظہ دارم نیّتے چوں قرعۂ رمّالہا

تمھارے یار باقر[1] میرزا تحصیلداری تحصیلداری پکارتے تھے۔ یہاں معلوم ہُوا کہ تمام قلمرو[2] میں چھ تحصیلداریاں اور چھ تھانہ داریاں ہیں، ساتواں علاقہ کہاں سے پیدا کیا جائے؟ رہی مصاحبت، اُس کو پہلے تسنّن اور پھر علوم رسمیہ سے آگہی، پھر زباں آوری، پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔ باقر علی خاں کو تین شرطیں درکار، پہلی شرط موجود[3]۔ تم کو پہلی شرط ازلاً و ابداً مفقود[4]۔ بعد جشن[5]، وقتِ رخصت ان دونوں[6] لڑکوں کے باب میں، ناظر جی اور مظفر میرزا اور تمھارے باب میں، محمد میرزا ابن سیف الدولہ اور میاں زکی الدین اور میاں عبدالسلام کے باب میں کلام کروں گا؛

تا بگرید خواستۂ کردگار چیست



نواب میر غلام بابا خاں

نواب میر غلام بابا خاں عرف چھوٹے صاحب سورت کے رئیس تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ میر جمال الدین عرف خواجہ دانا ترکستان سے اکبر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ ان کی اولاد میں سے خواجہ ابوالحسن ۱۱۲۶ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے، فیض الحسن اور نور الاعلیٰ۔ یہ اصحاب ذکر و فکر تھے۔ اسی دودمان عالیشان سے میر غلام بابا خاں تھے۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں پیدا ہوئے۔ خان بہادر اور سی آئی ای کا خطاب پایا۔ ۱۲۔شوال ۱۳۱۰ھ (۱۹۔اپریل ۱۸۹۳ء) کو فوت ہوئے۔ کسی صاحب نے تاریخِ وفات کہی، جس کے بعض شعر یہ ہیں؛

سیّد آں آلِ نبیؐ، ترمذی، اولادِ حسین ، نقشبندی سندے بود غلام بابا
الف و پنجاہ و دو صد بود سنہ از ہجری ، روز شعبان شدہ مولود غلام بابا
روح پرید شب دوازدہم در شوال ، رحمۃ اللہ ذوی الجود غلام بابا
عمر مرحوم شدہ شصت کہ بس پیکِ اجل ، گفت برخیز بہ معبود غلام بابا
از سرِ ہفت فلک گفت چہ رضواں تاریخ ، بہ جناں آمد و آسود غلام بابا

---

[1] ابن زین العابدین عارفؔ۔ [2] قلمرو سے مراد رام پور ہے [3] یعنی سُنّی ہیں، لیکن نہ علوم رسمیہ سے آگاہ ہیں، نہ زبان آور، نہ قسمت کے یاور [4] یعنی تم شیعہ ہو۔ [5] اس سے مراد نواب کلب علی خاں کا جشن مسند نشینی ہے جو اواخر ۱۸۶۵ء میں رام پور میں ہُوا تھا۔
[6] باقر علی اور حسین علی فرزندان عارفؔ۔

سنہ ۱۳۰ھ میں ایک ماذنہ بنوایا تھا، جس کی تاریخ یہ تھی:

زروے بانگ بگو بر عمود دینِ نبیؐ — دوبارہ اشہد ان لا الہ الا اللہ ؒ

نواب صاحب بڑے خلیق، حلیم، سلیم، متواضع اور متحمل مزاج بزرگ تھے۔ دو بیٹے یادگار چھوڑے۔

ملیباری نے اپنے عہد کے تمدنی حالات میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں میر غلام باباخاں کا بھی ایک واقعہ مرقوم ہے اور وہ یہ کہ موصوف بمبئی سے سورت آ رہے تھے اور ان کے پاس درجہ اوّل کا ٹکٹ تھا۔ ریل میں سوار ہوئے تو ایک انگریز نے انھیں بہت بُرا بھلا کہا لیکن میر غلام باباخاں نے انگریز کی بدتمیزی پر صبر کیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

غالبؔ کے ساتھ روابط میاں دادخاں سیّاح کی وساطت سے پیدا ہوئے، جو میر غلام بابا کے مصاحب بن گئے تھے۔

(۱)

سبحان اللہ تعالیٰ شانہ ما اعظم برہانہ۔ جناب مستطاب، نواب میر غلام باباخان بہادر سے بتوسط میاں دادخاں صاحب شناسائی بہم پہنچی۔ لیکن واہ! "اوّل ساغر و دردی"، کیا جگرخوں کُن اتفاق ہے۔ پہلا عنایت نامہ جو حضرت کا مجھ کو آیا، اس میں خبرِ مرگ۔ اب میں جو اس کا جواب لکھوں، اور یہ میرا پہلا خط ہوگا۔ لامحالہ مضامین اندوہ انگیز ہوں گے۔ نہ نامۂ شوق، نہ محبت نامہ، صرف تعزیت نامہ۔ صریرِ قلم ماتمیوں کے شیون کا خروش ہے، جو لفظ نکلا وہ سیاہ پوش ہے۔ ہے ہے میر جعفر علی خاں[1] جیسا امیرِ روشن گہرِ نام آور، روشناسِ اعیانِ ہند و انگلینڈ، وسطِ جوانی یعنی ۴۶ برس کی عمر میں یوں مر جائے

نخلِ چمنِ سروری افتاد ز پا ہائے

سچ تو یہ ہے کہ یہ دہر آشوب غم ہے، مجموعِ اہلِ ہند ماتم دار و سوگوار ہوں تو بھی کم ہے۔ اگرچہ میں کیا اور میری دُعا کیا، مگر اس کے سوا کہ مغفرت کی دُعا کروں، کیا کروں؟ قطعہ سالِ رحلت نواب غفران مآب، جب دل خارخارِ غم سے پُرخوں ہُوا، یوں موزوں ہُوا:

گر دید نہاں مہرِ جہانتاب دریغ — شد تیرہ جہاں، بچشمِ احباب دریغ

ایں واقعہ را ز روے زاری غالبؔ — تاریخ رقم کرد کہ "نواب دریغ"

"روے زاری"، یعنی زاء ہوز کے عدد بڑھائے جائیں تو سنہ ۱۲۸۰ھ پیدا ہوتے ہیں، فہذا المطلوب۔ شریکِ بزمِ ماتم، منشی میاں دادخاں صاحب کو سلام۔

یکشنبہ بست و یکم ربیع الاوّل سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق ششم ستمبر سنہ ۱۸۶۳ء

(۲)

بہ جناب نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون الاسلام و دعاے

سلہ نواب میر جعفر علی خاں، نواب میر غلام باباخاں کے خسر تھے، یعنی اُن کی پہلی بیوی رحیم النساء بیگم عرف چھوٹی بیگم کے والد۔

دولت و اقبال کہ ہمیشہ وردِ زبان ہے ۔ گھڑی کے عطیہ کا شکر ہر گھڑی اور ہر ساعت بجالاتا ہوں ۔ پہلے تو آپ دوست اور پھر امیر اور پھر سید ۔ نظر ان تینوں امور پر اس ارمغاں کو میں نے بہت عزیز سمجھا اور اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا ۔ خدائے عالم آرا آپ کو سلامت رکھے اور ہر گھڑی آپ کا ممد و مددگار رہے ۔ ظاہرا، بوقت روانگی کنجی کا رکھنا سہو ہو گیا، خیر یہاں بن جائے گی ۔ والسّلام بالوف الاحترام ۔

سہ شنبہ سوم دسمبر ۱۸۶۴ء — خوشنودیٔ احباب کا طالب، غالب

(۳)

جناب نواب صاحب،

آپ کے اخلاق کا شاکر اور آپ کی یاد آوری کا ممنون اور آپ کے دوامِ دولت کا دعاگو ہوں ۔ اگر بوڑھا اور اپاہج نہ ہوتا، تو ریل کی سواری میں مقرر آپ تک پہنچتا اور آپ کے دیدار سے مسرّت اندوز ہوتا ۔ آپ میرے شفیق اور میرے محسن ہیں ۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت باکرامت رکھے ۔ خط کے دیر دیر لکھنے کا سبب ضعف و نقاہت ہے ۔ اگر میری اوقات شبانہ روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ یہ شخص جیتا کیوں کر ہے ۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑے رہنا اور پھر دمبدم پیشاب کو اٹھنا ۔ ان مجموع مصائب میں سے ایک ادنیٰ مصیبت یہ ہے کہ ۱۲۸۲ھ ہجری شروع ہو گئی ۔ ۱۲۱۲ھ کی ولادت ہے ۔ اب کے رجب کے مہینے سے سترھواں سال شروع ہوگا ۔ سترا بہترا، بہرا، بوڑھا، اپاہج آدمی ہوں ۔ جو عنایت تم میرے حال پر فرماتے ہو، صرف تمھاری خوبی ہے، میں کسی لایق نہیں ۔

چہار شنبہ ۳۱ ۔ مئی ۱۸۶۵ء — نجات کا طالب غالب

(۴)

نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، امیدگاہِ درویشاں، زاد افضالکم ۔

آپ کا بندۂ منت پذیر، غالبِ خونیں صفیر، یوں نواسنج ہوتا ہے کہ عنایت نامہ عزِ ورود لایا اور مژدۂ قبول سے میرا مرتبہ بڑھایا ۔ جو کچھ میرے حق میں ارشاد ہوا، اگر اس کو قدر دانی کہوں تو لازم آتا ہے کہ اپنے کو ایک طرح کے کمال کا مالک جانتا ہوں ۔ البتہ آپ نے ازراہِ حق پسندی سخن کی قدر دانی اور میری قدر افزائی کی ہے ۔ جو اغلاط فارسی دانانِ ہند کے ذہن میں راسخ ہو گئے تھے، ان کو دفع کیا ہے تو کیا بُرائی ہے ۔ بات یہ ہے کہ اوچھی پونجی والے "گمنام" اپنی شہرت کے لیے مجھ سے لڑتے ہیں ۔ واہ واہ، اپنے نامور بنانے کو ناحق احمق بگڑتے ہیں ۔

عطیہ حضرت بتوسط جناب سیف الحق[1] پہنچا اور میں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا ۔ علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ و الثنا، آپ کا دادا اور میرا آقا ۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا ۔ آج سے کا پی

---

[1] میاں داد خاں سیاح جنھیں غالب نے سیف الحق خطاب دیا تھا ۔ یہ سو روپے کے عطیہ کی طرف اشارہ ہے، جو غالب کو بتوسط سیاح "قاطع برہان" کی طبع ثانی کے لیے پہنچا تھا ۔

لکھی جانے لگی اور تصحیح کو میرے پاس آنے لگی۔ چھاپے کے واسطے برسات کا موسم اچھا ہے۔ بس اب اس کے چھپ جانے میں دیر کیا ہے۔

صبح یک شنبہ، ۱۷۔ ستمبر ۱۸۶۵ء — نجات کا طالب، غالب

(۵)

نواب صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان، سلامت۔

فقیر اسد اللہ عرض کرتا ہے کہ آپ کے خط کے آنے نے میری آبرو بڑھائی، حق تعالیٰ تمھیں سلامت رکھے۔ چھتیس "درفش کاویانی"[1] کی رسید پہنچی۔ حسب الارشاد اب اور نہ بھیجوں گا۔ قبلہ غرض شہرت ہے۔ اس قلمرو میں مَیں نے جلدیں تقسیم کی ہیں، اس ملک میں آپ بانٹ دیں۔ اتنی میری عرض قبول ہو کہ بڑودہ، گجرات میں سید احمد حسن مودودی اور میر ابراہیم علی خاں صاحب کو ایک ایک جلد بھجوا دیجیے گا اور چھ جلدیں مولانا سیف الحق کو عطا کیجیے گا کہ وہ اپنے دوستوں کو بھجوا دیں۔

خواجہ بدر الدین خاں[2] میرے بھتیجے نے بوستانِ خیال کو اُردو میں لکھا ہے۔ اس کا ایک اشتہار اور یہاں ایک اخبار نیا جاری ہونے والا ہے، اس کے دو اشتہار اس خط کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ آپ یا آپ کے احباب میں سے کوئی صاحب کتاب کے یا اخبار کے خریدار ہوں، تو اشتہار کے مضمون کے مطابق عمل میں لائیں۔ والسلام مع الاکرام، میاں سیف الحق کو سلام۔



۲۲۔ مارچ ۱۸۶۶ء

(۶)

نواب صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان نواب میر غلام بابا صاحب بہادر، زاد مجدہٗ

عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کا عنایت نامہ اور مولانا سیف الحق کا مہربانی نامہ دونوں لفافے ایک دن پہنچے۔ سیف الحق کے خط سے معلوم ہوا کہ رجب کے مہینے میں شادیاں قرار پائی ہیں۔ مبارک ہو، اور مبارک ہو۔ نظارۂ بزمِ جمشیدی سے محروم رہوں گا، مگر میرا حصہ مجھ کو پہنچ رہے گا، خاطر جمع ہے۔

کیوں حضرت صاحبزادے کا اسم تاریخی پسند آگیا یا نہیں؟ نام تاریخی اور پھر سید بھی اور خان بھی۔ "سید مہابت علی خاں"۔ عجب ہے اگر پسند نہ آئے اور بہت عجب ہے کہ اس امر کی نہ آپ کے خط میں توضیح، نہ میاں داد خاں کے

---

[1] "قاطع برہان" کا نام طبع ثانی میں غالب نے "درفش کاویانی" رکھا تھا۔ [2] خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان ابن خواجہ حاجی، جن کی والدہ غالب کی بہن کی نند تھی، یعنی خواجہ حاجی کی شادی میرزا جیون بیگ سبز پوش کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور انھیں کے بطن سے خواجہ امان اور ان کے بھائی خواجہ جان پیدا ہوئے اور غالب کی بہن چھوٹی بیگم میرزا جیون بیگ کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے بیاہی گئی تھی۔ اس بنا پر خواجہ امان کو میرزا نے بھتیجا لکھا۔

خط میں خبر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی یہی نام رکھیے۔ پسند آنے یا نہ آنے کی تو فقیر کو اطلاع ہو جائے۔

۹۔ ماہ اگست ۱۸۶۶ء جواب کا طالب، غالب

(۷)

ستودہ بہ زبان و نامور بہر دیار، نواب صاحب شفیق کرم گستر، مرتضوی تبار، نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو مسرت بعد مسرت و جشن بعد جشن مبارک و ہمایوں ہو۔ رقعہ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی، بسواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پانو سے اپاہج، کانوں سے بہرہ، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع۔ کیونکر قصدِ سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟[1] گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتے دو ہفتے کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں، آنا میرا سورت تک کسی صورت حیزِ امکان میں نہیں۔

خط لکھتے لکھتے خیال میں آیا کہ سید صاحب کی ولادت کی تاریخ لکھی، سیدانی صاحبہ کی بسم اللہ کی تاریخ بھی لکھا چاہیے۔ مادہ "خجستہ بہار" ذہن میں آیا ہے۔ سات عدد کم پائے "خجستہ بہار" پر ادب کے اعداد بڑھائے۔ شمار میں ۱۲۸۳ نظر آئے۔ دوسرے ورق پر وہ قطعہ مرقوم ہے۔ بوڑھوں کی فکر کی طاقت معلوم ہے، صرف جوشِ محبت سے چار مصرعے موزون ہوئے ہیں:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

۱۴۔ نومبر ۱۸۶۶ء راقم اسد اللہ خاں غالب

سیف الحق صاحب کو سلام۔ ایک میرے دوست مصور خاکسار کا خاکہ اتار کر، دربار کا نقشہ اتارنے کو اکبر آباد گئے ہیں، وہ آجائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔ خط از راہِ احتیاط بیرنگ بھیجا جاتا ہے۔

قطعہ:

خجستہ جشن دبستاں نشینیِ بیگم — بفیضِ ہمت نواب و یُمنِ اقبالش
چو از پئے ادب آموزی است خوش باشد — اگر "خجستہ بہارِ ادب" بود سالش

(۸)

نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، عالیشان، والا دودمان، زاد مجدکم

سلام مسنون الاسلام و دعائے دوام دولت و اقبال کے بعد عرض کیا جاتا ہے کہ ان ایام میمنت فرجام میں جو از روے اخبار بمبئی آپ کی افزایش عز و جاہ کے حالات معلوم ہوئے، متواتر شکر الٰہی بجا لایا اور اس ترقی کو

---

[1] یعنی ریل کی سواری میں تین چار روز تک کیوں کر ڈبے کے اندر بند بیٹھا رہوں؟ غالب کے کمالِ تحریر کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ ضمناً اپنے عہد کے حالات بتا جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ریل اس وقت دہلی سے تین چار روز میں سورت پہنچتی تھی۔

اپنی دُعا کا نتیجہ جان کر اور زیادہ خوش ہُوا۔ خصوصاً عدالت العالیہ میں فتح پانا اور حق حقیقی کا ظہور میں آنا، کیا کہوں (کہ) کیا مسرت و شادمانی کا موجب اور کس طرح نشاط و انبساط کا سبب ہُوا ہے۔ حق تعالیٰ یہ فتح مبارک و ہمایوں کرے[1] قطعہ

فتح سیّد غلام بابا خان　　خود نشانِ دوامِ اقبال است
ہم ازیں رو بود کہ غالبؔ گفت　　کہ "ظفر نامۂ ابد" سال است

بہارِ باغِ جاہ و جلال جاوداں باد!

(مارچ ۱۸۶۷ء)　　اسداللہ خاں غالبؔ

(۹)

نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، عنایت فرمائے مخلصاں، زاد مجدہٗ

شکر یاد آوری و رواں پروری بجا لاتا ہُوں۔ پہلے اس سے آپ کا جو مودت نامہ پہنچا ہے، وہ میرے خط کے جواب میں تھا۔ اس کا جواب نہیں لکھا گیا۔ پرسوں میاں سیف الحق کا خط پہنچا۔ خط کیا تھا خوانِ دعوت تھا۔ میں نے کھانے بھی کھائے، میوے بھی کھائے، ناچ بھی دیکھا، گانا بھی سُنا۔ خدا تم کو سلامت رکھے کہ اس نالائق درویش گوشہ نشین پر اتنی عنایت کرتے ہو۔

صاحب، ریاست و امارت میں ایسے جھگڑے بہت رہتے ہیں۔ بسبب فرطِ محبت اخبار میں تمھاری افزائشِ عزّ و جاہ دیکھ کر خوش ہُوا اور تم کو تہنیت دی۔ "ظفر نامۂ ابد" بہت مبارک لفظ ہے۔ ان شاء اللہ العلی العظیم ہمیشہ مظفر و منصور ہو گے۔

کارت بجہاں جملہ چناں باد کہ خواہی

سہ شنبہ ۳۔ اپریل ۱۸۶۷ء　　نجات کا طالب غالبؔ

(۱۰)

جناب سیّد صاحب قبلہ!

بعد بندگی عرض کرتا ہُوں کہ عنایت نامہ آپ کا پہنچا۔ آپ جو فرماتے ہیں کہ تو اپنی خیریت کبھی کبھی لکھا کر، آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی۔ ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو گیا، بینائی ضعیف ہو گئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے تو میں مطلب کہتا گیا، وہ لکھتے گئے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ کل آپ کا خط آیا، آج ہی ایک دوست میرا آ گیا کہ یہ چند سطریں لکھوا دیں اور یہ آپ کبھی نہ فرمائیں کہ منشی میاں داد خاں سے مجھے قطع محبت ہو گیا ہے۔ منشی صاحب کی محبت اور ان کے توسط سے آپ کی محبت دل و جان میں اس قدر سما گئی ہے، جیسا اہلِ اسلام میں ملکۂ ایمان کا۔ پس ایسی محبت کا موقوف ہونا کبھی ممکن نہیں۔

---

[1] یہ ایک خاندانی مقدمے میں کامیابی کا ذکر ہے، جیسا کہ اگلے خط سے ظاہر ہے۔

امراضِ جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمدگر کی شرح کے بعد ہجوم غم ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں؛ جیسا ابرِ سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے۔ سیف الحق منشی میاں داد خاں کو سلام کہیے گا اور یہ خط پڑھا دیجیے گا۔

روز چہار شنبہ ۶- اپریل ۱۸۶۶ء　　　نجات کا طالب، غالب

نواب ابراہیم علی خاں وفاؔ

ان کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ میرزا محمد عسکری نے انھیں سورت کا رئیس بتایا ہے۔ ممکن ہے نواب میر غلام بابا خاں کا اور ان کا خاندان ایک ہو۔ یہ بڑودہ میں رہتے تھے اور وہاں جاگیر بھی ملی ہوئی تھی۔ میر عالم خاں ان کے حقیقی یا رشتے کے بھائی تھے۔ سید احمد حسن مودودی بھی ان سے وابستہ تھے۔

(۱)

پیر و مرشد جناب سید ابراہیم علی خاں کو بندگی۔ غزل پہنچتی ہے۔ خط از روے احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ قبلہ! آپ کے بھائی میر عالم علی خاں صاحب مجھ پر کیوں خفا ہیں کہ اپنی غزل نہیں بھیجتے؛ یہ امر ان کے خاطر نشاں ہو جائے کہ غالب آپ کے دادا کا غلام اور خدمت بجا لانے کو آمادہ ہے۔

نہم ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ

(۲۱- جولائی ۱۸۶۶ء)　　　نجات کا طالب، غالب

(۲)

ولی نعمت کو غالب کی بندگی،

بسبب ضعف پیری کے خدمت گزاری میں درنگ واقع ہو جائے تو معاف رہوں، کبھی قاصر نہ رہوں گا، ان شاء اللہ العظیم۔ دو غزلوں میں سے ایک غزل بعد اصلاح پہنچتی ہے، دوسری غزل ہفتہ آیندہ میں پہنچ جائے گی۔ ضعفِ اعضا اور دوامِ مرض سے علاوہ اختلالِ حواس کا کیا حال لکھوں۔ دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں۔ دیکھیے اس سہو کو کہ کس کی غزلیں کس کو پہنچیں۔ مزا اس میں ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے اور کہاں کا ہے؛ شاید اس بندۂ خدا کو حضرت کی غزلیں بھیجی ہوں گی۔ خدا کرے وہ بزرگوار میر صاحب کی غزلیں میر صاحب کی طرح میرے پاس بھیج دے تو میر صاحب کی خدمت میں بھیج دوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ان غزلوں کو، جواب آئی ہیں، دیکھوں گا۔ یہ اکہتر برس کی عمر کی خوبی ہے۔ آپ میر صاحب قبلہ کو خط پڑھوا دیجیے گا۔

۳۰- اکتوبر ۱۸۶۶ء　　　لطف و کرم کا طالب، غالب

(۳)

سید صاحب قبلہ نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر کو غالب علی شاہ کا سلام۔ وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے :

بس شوقِ قتل سے ہے الخ

گم ہو گئی۔ پھر لکھ کر بھیجیے اور قصور معاف کیجیے۔ یہ غزل جو اس غزل کے بعد بھیجی ہے، فی الحال بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔

میر صاحب قبلہ سید عالم علی خاں بہادر کی دو غزلیں پہنچیں، مگر وہ یہ لکھتے ہیں کہ میں رجب کے مہینے میں وطن کو جاؤں گا اور وہاں سے تیرے پاس آؤں گا۔ آج بحساب جنتری ۲۷، اور از روے رویت ۲۶ رجب کی ہے۔ غزلیں ان کی موجود، مگر بھیج نہیں سکتا۔ آپ میری بے گناہی کے گواہ رہیں۔

قبلہ! ضعف نے مضمحل کر دیا ہے، حواس بجا نہیں۔ اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہتروان برس شروع ہو گیا ہے۔ غذا باعتبار آرد و برنج مفقود۔ صبح کو پان سات بادام کا شیرہ، بارہ بجے آب گوشت، شام کو چار کباب تلے ہوئے۔ بس آگے خدا کا نام۔

ہاں حضرت، جناب حکیم احمد حسن صاحب کی تحریر سے کچھ حال ناسازی اخوان و احباب کا معلوم ہوا اور وہ علم باعث توزع[1] ضمیر ہے۔ متوقع ہوں کہ اس فساد کے رفع ہونے سے اور اپنی طمانیت خاطر سے فقیر کو آگہی بخشیے اور اس خط کا جواب مع رسید غزل جلد ارسال فرمائیے گا۔

پنجم دسمبر ۱۸۶۶ء۔ رجب کی تاریخ اُدپر لکھ آیا ہوں[2]۔ اسد بے دستگاہ

(۴)

بخدمت قبلہ سید احمد حسن صاحب مودودی تسلیم۔ بجناب میر ابراہیم علی خاں بہادر کورنش مقبول باد۔ تصویر مہر تنویر مجھے پہنچی اور میں نے رسید لکھ بھیجی۔ عجب ہے کہ آپ کو اس کے پہنچنے میں تردد ہے۔ امسال فقیر نے جو اپنی خاکساری کا خاکہ یعنی تصویر، منشی میاں داد خاں کی معرفت نذر کی ہے، یقین ہے وہ بھی پہنچ ہو گی۔ دونوں غزلیں بعد اصلاح کے بھیجتا ہوں۔ اپنی غزل آپ رہنے دیں اور سید صاحب کی غزل ان کے حوالہ کر دیں[3]۔

جمعہ ۱۷۔ اگست ۱۸۶۶ء نجات کا طالب، غالب

(۵)

جناب تقدس انتساب سید صاحب قبلہ، والا مناقب، عالیشان، نواب سید ابراہیم علی خاں بہادر، مدظلہ العالی۔

بعد بندگی معروض ہے، حضرت سید احمد حسن خاں صاحب مدظلہ العالی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر مولود مسعود

---

[1] پریشانی، پراگندگی [2] یعنی جنتری کے رُو سے ۲۷۔ اور رویت کے رُو سے ۲۶۔ رجب ۱۲۸۳ھ [3] یہ خط سید احمد حسن مودودی اور میر ابراہیم علی خاں میں مشترک ہے۔ لیکن چونکہ مودودی صاحب کو محض سلام لکھا ہے، باقی سارے خط میں میر ابراہیم علی خاں سے خطاب ہے۔ اس لیے میں نے اسے میر صاحب کے مجموعے میں رکھا۔

پیدا ہوا۔ ایک عبارت رنگین مرتب کر کے "اکمل الاخبار" میں میں نے چھپوا دی ہے اور ایک رباعی اور ایک قطعہ اپنا اور ایک قطعہ سید صاحب ممدوح کا، جو اُنھوں نے یہاں بھیجا تھا، وہ بھی چھپوا دیا اور تین قطعے تاریخی بہاری لال مشتاق منتظم اور میر فخرالدین مہتمم مطبع نے جو یہاں تاریخیں لکھی تھیں، وہ چھپوا دیں۔ چنانچہ اپنی لکھی ہوئی رباعی اور قطعہ عرض کرتا ہوں:

رباعی

حق داد بہ سید ز پئے انعامش   فرخ پسرے کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش   "ارشاد حسین خاں" کہ باشد نامش

قطعہ

غالبؔ حالِ سنینِ ہجری   معلوم کن از "خجستہ فرزند"
چوں یک صد و بست و چار ماند   این ست شمار عمر دلبند

یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب "خجستہ فرزند" کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ لے لیے جائیں تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں۔ اُن کو میں نے دعائے عمر مولود قرار دیا۔ حق تعالیٰ اس مولود کو تمھارے سامنے عمر طبعی کو پہنچائے۔[۱]

خط کی رسید کا طالب، غالب

حکیم سید احمد حسن مودودی

(۱)

حضرت قبلہ

پہلے التماس یہ ہے کہ آپ صحیح النسب سید، تمام اُمت مرحومہ محمد علیہ السّلام کے قبلہ و کعبہ، جب آپ مجھ کو قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپ کو کیا لکھوں؟ خدا کے واسطے غور کیجیے کہ "قبلۂ قبلہ" اور "کعبۂ کعبہ" یہ کیا ترکیب ہے؟ چونکہ آپ نے مجھے اُستاد گردانا ہے، اس التماس کو بھی از قسم اصلاح تصور کیجیے۔ زنہار قبلۂ قبلہ کبھی نہ لکھیے، یہ سوءِ ادب ہے بہ نسبت قبلہ۔ عیاذاً باللہ!

آپ کا عطوفت نامہ پہنچا۔ میرے پہلے خط کا بہ دیر پہنچنا اور اس کی دیر رسی کا سبب مجھ کو معلوم ہوا۔ اب اس کا خیال رکھوں گا۔ اب آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمّہ باقی نہیں ہے۔ دو یا تین جس خط کا جواب نہیں پہنچا، اس کو یہ سمجھیے کہ وہ خط راہ میں تلف ہوئے اور میرے پاس نہیں پہنچے۔

۱؎ یہ خط اگست ۱۸۶۸ء کے بعد کا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ سید احمد حسن مودودی کے نام کے خط مرقومہ ۱۷ جولائی ۱۸۶۸ء میں یہ ذکر ہے کہ میر ابراہیم علی خاں کے بچہ ہونے والا ہے۔ ۱۷ اگست کے خط میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا یہ واقعہ چند روز بعد کا سمجھنا چاہیے۔ ۱۲۸۵ھ کا آغاز ۲۴ اپریل ۱۸۶۸ء سے ہوا۔

بہارِ گلستانِ احمدِ حسن

یہ سجع کیا بُرا ہے ؟ :

دلِ حیدر و جانِ احمدِ حسن

پر اس سے بھی بہتر ہے ۔ انھیں دونوں میں سے ایک سجع مُہر پر کھدوا لیجیے ۔ غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے ۔

۱۹ ۔ ذی الحجہ (۱۲۷۷ھ ، ۱۸ ۔ جون ۱۸۶۱ء) غالب

—(۲)—

حضرت پیر و مرشد ،

غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے ۔ غزل سہو سے لکھ گیا ہوں ، دونوں غزلیں پہنچتی ہیں ۔ جناب مولوی انصار علی صاحب سے مجھ کو تعارف اسمی ہے ۔ ان کو میرا سلام کہیے اور کہیے کہ حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے ۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہُوا ۔ روبکاریاں ہُوئیں ۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا ۔ نوکری موقوف ، جایداد ضبط ۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جایداد واگزاشت کی ۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں ۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں ۔ کرایے پر معاش کا مدار ہے ۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے ، کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی ، تیس چالیس روپے مہینے کی آمد ، لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت[۱] ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں ، لہٰذا فراغ بال سے نہیں گزرتی ۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے ۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں ۔ خدا سلامت رکھے ، غنیمت ہیں ۔

یک شنبہ ۱۹ ۔ جنوری ۱۸۶۲ء غالب

—(۳)—

سیّد صاحب قبلہ ،

عنایت نامہ مع قصیدہ پہنچا ۔ پس و پیش ایک رافت نامہ پیر و مرشد سیّد ابراہیم علی خاں صاحب بہادر اور ایک عطوفت نامہ قبلہ و کعبہ سیّد عالم علی خاں بہادر کا پہنچا ۔ میں علی کا غلام ہُوں اور اولادِ علی کا خانہ زاد ، لیکن بوڑھا اور ناتوان اور مسلوب الحواس اور بے سروسامان ۔ خدمت بجالانے میں عذر کروں تو گنہ گار ۔ درنگ و توقف کا مضائقہ نہیں ۔ لایکلف اللّٰہ نفساً الّا وُسعہا ۔

خداوند نعمت کیا تم دلّی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہُوئے ہو ، جو حضرت شیخ کا کلام[۲] اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پُوچھتے ہو ؟ " ایں دفتر را گاؤ خورد ، گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد " ۔

---

[۱] یہ لفظ اولاد کے لیے بھی مستعمل اور خویش و اقارب کے لیے بھی ۔ یہاں آخری معنی مراد ہیں ۔ [۲] شیخ کلیم اللّٰہ جہان آبادی جو اپنے زمانے کے مشہور مشائخ میں تھے ۔ دہلی میں قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان ان کا مقبرہ ہے ۔

بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دی۔ کاغذ کا پرزا، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں؟ کیا کروں؟ کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکے گا۔

سید صاحب قبلہ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟ اگر یہی مرضی ہے تو اتحاف و اہدا تکلف محض ہے۔ فقیر بے سوال ہوں، اگر کچھ بھیج دیں گے، رَد نہ کروں گا۔ کم و بیش پر نظر نہ کریں، جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں۔ والسلام

(روز شنبہ یکم ستمبر ۱۸۶۳ء) از اسد اللہ

—(۴)—

پیر و مرشد،

تین برس عوارضِ احتراقِ خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی۔ آپ کے خطوط آئے ہوں گے کوئی عنوان ناکشودہ پڑا رہا ہوگا۔ البتہ حاجی مصطفیٰ خاں کا آنا مجھ کو یاد ہے۔ یقین کرتا ہوں کہ اُنھوں نے ازروئے مشاہدہ میری خستگیِ تن کا حال حضرت کو لکھا ہوگا۔ اب میں اپنی زبان سے یہ کیوں کر کہوں کہ اچھا ہوں، مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بُوڑھا، بہرا، اپاہج، بدحواس، ناتوان، فلک زدہ آدمی ہوں۔ عہد کرتا ہوں کہ جب آپ کا خط آئے گا اس کا جواب لکھوں گا۔ جب غزل آئے گی اس کو دیکھ کر پھر بھیجوں گا، مگر حضرت کے مسکن کا پتا بھول گیا۔ یہ خط تو مصطفیٰ خاں سوداگر کو بھیجے دیتا ہوں، وہ آپ کو بھجوا دیں گے، آیندہ جو عنایت نامہ ڈاک میں آئے، اس میں مسکن و مقام و شہر کا نام لکھا جائے۔

۲۴۔ جولائی ۱۸۶۵ء نجات کا طالب، غالب

—(۵)—

حضرت پیر و مرشد،

ان دنوں میں اگر فقیر کے عرائض نہ پہنچے ہوں یا ارشاد کے جواب ادا نہ ہوئے ہوں تو موجب ملالِ خاطرِ اقدس نہ ہو:

اتفاقِ سفر افتاد بہ پیری غالبؔ
آنچہ از پائے نیامد، ز عصا می آید

رام پور کی سرکار کا فقیر، تکیہ دار، روزینہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعاگوے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رام پور کو روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل ستّہ وہاں پہنچا۔ بعد اختتامِ بزم، عازمِ وطن ہوا۔ ہشتم جنوری کو دلّی پہنچا۔ عرضِ راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مراد آباد میں صاحبِ فراش رہا۔ اب جیسا فرسودہ رواں و ناتواں تھا، ویسا ہوں۔ جواب خطوط مجتمعہ لکھ سکتا ہوں؟

نواب میر جعفر خاںؑ مبرور و مغفور کا خاندان، سبحان اللہ:

این سلسلہ از طلاے ناب است   این خانہ تمام آفتاب است

نواب میر غلام بابا خاں میرے دوست اور میرے محسن ہیں۔ راہ و رسم نامہ و پیام مدت سے باہدگر جاری ہے۔ آپ کا حکم بے تکلف مانوں گا۔ جناب میر ابراہیم علی خاں صاحب اور حضرت میر عالم علی خاں صاحب کی خدمت گزاری کو اپنا فخر و شرف جانوں گا۔ اس وقت بکس کھولا ہے۔ خطوط اطراف و جوانب دیکھ رہا ہوں۔ پہلے حضرت کے خط کا جواب لبطور اختصار لکھا ہے۔ اب جب اس کا جواب آئے گا، تب فقیر حکم بجا لائے گا۔

چار شنبہ ۱۷۔ جنوری ۱۸۶۶ء   اسداللہ

(۶)

پیر و مرشد،

آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہوگئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہات سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں شاہ شرف علی بو قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں توقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا، لکھ دیا کروں گا۔ زیادہ حد ادب۔

۸۔ اپریل ۱۸۶۶ء   راقم اسداللہ خاں غالب

(۷)

پیر و مرشد،

یکم محرم کا خط کل ۱۸۔ محرم کو پہنچا، آج ۱۹۔ کو جواب لکھتا ہوں۔ آپ پر اور میر ابراہیم علی خاں پر میری جان نثار ہے۔ مضیٰ ما مضیٰ۔ اب ایک ایک غزل آپ تینوں صاحب بھیج دیا کیجیے۔ اسی طرح میں فرداً فرداً اصلاح دے کر بھیج دیا کروں گا، مگر میرے قبلہ و کعبہ، واسطے خدا کے شجرۂ منظوم ارسال نہ فرمایئے گا۔ اس کی اصلاح میری حد وسع سے باہر ہے۔ میرا شیوہ نہیں ہے خط بیرنگ بھیجنا، یہ خط عمداً بیرنگ بھیجتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ پیڈ کے تلف ہونے کا احتمال ہے اور بیرنگ کا نہیں۔

شنبہ، دوم جون ۱۸۶۶ء   اسداللہ

(۸)

قبلہ،

ڈاک کے ہرکارے نے کل دو خط ایک بار پہنچائے۔ ایک آپ کا خط مع غزل اور ایک نواب میر ابراہیم علی خاں کا خط مع غزل۔ آج تین باتیں ضروری لکھنی تھیں

ؑ میر غلام بابا خاں کے نام پہلے خط میں ان کا نام میر جعفر علی خاں لکھا ہے۔

اس واسطے یہ خط روانہ کرتا ہوں۔ ایک بات یہ کہ غزل کا کاغذ واپس بھیجتا ہوں۔ نہ اس کو پھاڑ سکوں، نہ پانی میں دھو سکوں۔ شہیدی کی غزل ان قافیوں میں بہ تغیّرِ ردیف ایسی ہے کہ اب ان قافیوں کا باندھنا ہرگز نہ چاہیے۔ آپ اور غزل لکھیے، اس کو ہرگز دیوان میں نہ رکھیے۔

یہ بھی اس ضمن میں لکھنا مناسب ہے کہ میر ابراہیم علی خاں صاحب نے اپنی اصلاحِ غزل کی رسید کل کے خط میں لکھ بھیجی، آپ اپنے خط میں کس راہ سے لکھتے ہیں کہ وہ غزل اصلاحی مانگتے ہیں؟ اسی فصل میں یہ بھی اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کی غزل "سہلا کر سوئے" اور "نہلا کر سوئے" اور تاریخ ہائے بنائے مسجد دیکھ کر اور اصلاح دے کر آج پانچواں دن ہے کہ ڈاک میں بھیج چکا ہوں۔

دوسری یہ بات ہے کہ آپ سیّد صاحب کا حال مفصّل لکھیے۔ ایسا کہ لاکھ کا ملک بڑودہ کی سرکار سے ہمارے محسن کو ملا ہے کہ ان سے دو لاکھ روپیہ نذرانہ مانگا جاتا ہے؟ آگے اس راج میں حسام الدین حسین خاں بڑے معزّز اور مکرم متوسل تھے اور سیر حاصل جاگیریں رکھتے تھے۔ سیّد ابراہیم علی خاں صاحب اسی خاندان میں سے ہیں؛ اور ہاں یہ بھی لکھیے کہ میر عالم علی خاں کون ہیں اور آپ کو ان دونوں صاحبوں سے کیا قرابت ہے؟

تیسری بات یہ ہے کہ جب نوٹ بھیجیے تو اہلِ کلکتہ کی طرح آدھا آدھا دو بار کر کے نہ بھیجیے گا۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے، اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلّی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

۲۵۔ستمبر ۱۸۶۶ء اسداللہ

(۹)

حضرت،

یہ آپ کے جدِّ امجد کا غلام تو مر لیا۔ کثرتِ احکام، تواترِ ورودِ اشعار، پھر یہ ہنجار کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو۔ میر ابراہیم علی خاں صاحب کی غزل، جس کا ایک شعر یہ ہے:

علی علی جو کہا تا سحر تو یوں سمجھے — کہ ذوالفقار سے کٹتی ہے اب ہماری رات

بعدِ اصلاح بھیج چکا ہوں اور آپ اس کا تقاضا کیے جاتے ہیں۔ غزلیں آپ کی برستی ہیں، کہاں تک دیکھوں؟ آپ کی غزلوں کے ساتھ اور غزلیں بھی گم ہو جاتی ہیں۔ بہتّر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی، غذا ایک قلم مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آبِ گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشکہ۔ آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔ جہاں جو کاغذ رہا، وہ وہیں رہا۔

میر عالم علی خاں صاحب کی دو غزلیں آئی ہوئی کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ نوٹ عطیہ سیّد صاحب کا آپ کے خط میں پہنچا، روپیہ وصول ہوا، معاً خرچ ہوا۔ ان کی ایک غزل "ساری رات" "ہماری رات" جس کا ایک شعر اوپر لکھ آیا ہوں۔ بعدِ اصلاح بھیج چکا ہوں اور کوئی غزل ان کی میرے پاس نہیں اور جناب میر عالم علی خاں کی دو غزلیں یاد ہیں کہ آئی ہیں۔ اگر مل جائیں گی تو بعدِ اصلاح بھیجوں گا۔ آپ کی غزلیں شمار سے باہر ہیں۔ بکس میں دیکھوں گا، کتابوں میں ڈھونڈوں گا۔

مدعا یہ کہ آپ اور دونوں سید صاحب اس کا التزام کریں کہ ایک غزل اپنے خط میں بھیجیں۔ جب وہ غزل اور اس خط کا جواب پہنچ جائے، تب دوسری غزل خط میں ملفوف ہو کر بھیجی جائے اور خط ہر صاحب کا جدا ہو۔ آپ یہ میرا خط غور سے پڑھ لیں اور دونوں سید صاحبوں کو پڑھوا دیں۔ از روئے احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔

۱۸۔ اکتوبر ۱۸۶۶ء — اسدِ بیرنگ

(۱۰)

سید صاحب و قبلہ حکیم سید احمد حسن صاحب کو غالب نیم جان کا سلام پہنچے۔ وہ جو آپ نے سنا ہے کہ اب غالب کو مرض سے افاقت ہے، سو محض غلط ہے۔ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ خط نہیں لکھ سکتا۔ ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ جو میں کہتا گیا ہوں، وہ غریب لکھتا گیا ہے۔ آپ سید ہیں اور بزرگ ہیں، میرے حق میں دعا کریں کہ اب تہتر برس سے آگے نہ بڑھوں اور اگر کچھ زندگی اور ہے تو حق تعالیٰ تھوڑی سی صحت عنایت کرے تاکہ دوستوں کی خدمت بجا لاتا رہوں۔

۳۔ جولائی ۱۸۶۷ء — غالب

(۱۱)

جناب سید صاحب و قبلہ سید احمد حسن صاحب کو غالب نیم جان کی بندگی مقبول ہو اور یہ عرض بھی قبول ہو کر جناب معلیٰ القاب نواب ابراہیم علی خاں بہادر کی خدمت میں میری بندگی عرض کریں۔ بارے بصورتِ تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا اسلام پہنچنا معلوم ہوا۔ اگرچہ اس صورت میں چلنا پھرنا، خدمت بجا لانی نہیں ہو سکتی، مگر خیر حضرت کے پیشِ نظر حاضر رہوں گا۔ عنایت کی نظر رہے میرے حال پر۔

یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ نواب صاحب قبلہ کے ہاں اس مہینے میں لڑکا پیدا ہونے والا ہے، مجھ کو تاریخ تولد کا خیال رہے گا جب آپ کی تحریر سے نوید تولد معلوم کر لوں گا، تب قطعہ یا رباعی جو کچھ ہو گی ہو گی، وہ بھیج دوں گا اور یہ جو آپ نے اپنی اور نواب صاحب کی غزلوں کی اصلاح کے واسطے لکھا ہے، مجھے اس حکم کی تعمیل بدل منظور ہے۔ جس مہینے تک میں زندہ ہوں، اس مہینے تک خدمت بجا لاؤں گا۔

۱۷۔ جولائی ۱۸۶۶ء

تفضّل حسین خاں

کیوں صاحب،

یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام، خرید آٹھ دس روپیہ کی، سو وہ بھی میں نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک

رہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں گا۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا، دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بہ دل مطلوب ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ باللہ واللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے، نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو، تو تم کو آفریں۔

غالبؔ

سیّاح



میاں داد خاں نام، سیّاح تخلص، "سیف الحق" لقب، جو غالبؔ نے عطا کیا تھا۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد منشی عبداللہ خاں اورنگ آباد کے ذی مقدرت رئیس تھے۔ سیّاح کی پیدائش کے وقت دولت و اقبال کی فراوانی تھی، لیکن وہ سن شعور کو پہنچے تو گردش روزگار سے سارا نقشہ بگڑ گیا۔ ثروت و فراغت بال کی جگہ نکبت و احتیاج نے لے لی۔ مجبور ہو کر وہ گھر سے نکل پڑے اور بمبئی ہوتے ہوئے سورت پہنچے، جہاں نواب میر غلام بابا خاں نے انھیں مصاحبت میں داخل کر لیا۔ بعد میں بہ قصد سیاحت نکلے تو دہلی، کان پور، لکھنؤ، بنارس، کلکتہ وغیرہ ہوتے ہوئے پھر سورت لوٹے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایران و عرب و مصر کی سیاحت بھی کی تھی۔ اسی وجہ سے غالبؔ نے ان کے لیے سیّاح کا خطاب تجویز کیا تھا۔

"قاطع برہان" کی اشاعت پر ردّ و بحث کا جو ہنگامہ بپا ہوا تھا، اس سلسلے کی ایک کتاب سیّاح سے بھی منسوب ہے یعنی "لطائفِ غیبی"، لیکن اہل علم و ذوق کی رائے یہ ہے کہ یہ کتاب خود غالبؔ کی مؤلفہ تھی، اگرچہ سیّاح کے نام سے چھپی، اس لیے کہ انداز تحریر و نگارش صاف غالبؔ کا ہے۔ سیّاح کا جو انداز "سیرِ سیّاح" میں ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے یا کم از کم یہ ظاہر ہے کہ کتاب کی عبارت میں وسعت تصرفات کے باعث اب اسے بے تکلف غالبؔ کی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سیّاح کو "لطائف" کا جو نسخہ میرزا نے بھیجا تھا اس کے متعلق لکھتے ہیں، "یہ نسخہ میں نے اپنے مطالعہ میں رکھ کر درست کر دیا ہے۔ باقی نسخوں کو بھی اس کے مطابق صحیح کر لو۔"

میرزا محمد عسکری مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں سیّاح کے خلاف قلب سازی کا مقدمہ قائم ہوا، جس میں وہ سزا پا گئے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ستر برس کی عمر پا کر ۱۹۰۷ء میں بہ مقام بمبئی فوت ہوئے۔ منشی نولکشور سے ان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ اور کانپور گئے تھے تو منشی صاحب نے انتہائی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا اور دونوں جگہ ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے تھے۔ "سیرِ سیّاح" انھیں حالات پر مشتمل ہے۔

(۱)

برخوردار کامگار، سعادت نشان، منشی میاں داد خاں سیاح طال عمرہٗ

درویشِ گوشہ نشین، غالبِ حزیں کی دعاے درویشانہ سے کامیاب و بہرہ مند ہوں۔ لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک گونہ[1] ہوگا، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے، جو دیکھے گا وہ داد دے گا اور دلّی کے فساد کے بعد گون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے، جو قلعے کے لاہوری دروازہ سے شہر کے لاہوری دروازہ تک[2] ہے، سراسر بگڑ گئی اور بگڑتی جاتی ہے۔

دیوان کا چھاپا کیسا؛ وہ شخص نا آشنا، موسوم بہ عظیم الدین[3]، جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طورِ انطباعِ دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے۔ تم بھی دعا مانگو۔ زیادہ کیا لکھوں[4]۔

دوشنبہ ۱۱۔ جون ۱۸۶۰ء

غالب

(۲)

برخوردار،

تمھارا خط پہنچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصلِ خزاں!

میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصبِ ناانصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نورِ چشم منشی شیو نرائن کو بھیج دیا۔ یقین کُلی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے، ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔ طریقۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جان کر جہاں جاؤ، وہاں سے خط لکھتے رہو اور اپنے مسکن کا پتا ہم پر ظاہر کرتے رہو۔ ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی، شرمندہ بھی ہیں۔

مرقومہ شنبہ روزِ عید مطابق ۳۰۔ جون ۱۸۶۰ء

راقم اسد اللہ خاں

(۳)

بھائی،

تمھاری جان اور اپنے ایمان کی قسم کہ فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے بیگانۂ محض ہوں۔ اُردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سُنی ہو گی۔ فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا

---

[1] یعنی بگاڑ کے بعد بناؤ کی صورت نکلے گی [2] یعنی چاندنی چوک اور کھاری باؤلی [3] عظیم الدین میرٹھی جسے دیوان چھاپنے کے لیے دیا تھا، پھر اس لیے واپس مانگ لیا تھا کہ منشی شیو نرائن آرام نے کہا تھا، دیوان میں چھاپوں گا [4] اس خط کے انداز سے ظاہر ہے کہ یہ غالب کی طرف سے سیاح کے نام کا پہلا خط نہیں ہو سکتا۔ اور خط بھی لکھے ہوں گے جو تلف ہو گئے۔

ہوں؛ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا، حساب درست نہ پاؤں گا دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادّۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لا دیتے تھے، موزون میں کرتا۔ اگر آپ مادے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آ گئے ہیں کہ وُہ تاریخ ہنسی کے قابل ہو گئی ہے۔ کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی۔ میں نے لکھی۔ چنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

مفتیِ عقل از پئے تاریخِ ایں بنا ایما بسوے من ز رہِ احترام کرد
گفتم بر دے بدیہہ "خوشا خانۂ خدا" شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد
خاشاک رُفت و پاے ادب در شکنجہ ریخت ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو "خوشا خانۂ خدا" مادّہ، پھر اس میں سے "خاشاک" کے عدد دور کرو، نو سو اکیس کا تخرجہ۔ پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ "پاے ادب" یعنی "ب" کو اُڑایا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے؛ مگر ہاں حساب کے قاعدے سے باہر کچھ معنی سگالی کے طور پر میرا ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۴۸ھ میں مرا۔ اس کی تاریخ میں نے لکھی:

ز سالِ واقعۂ میرزا مسیتا بیگ مآت راست شمارِ ائمہ امجاد
صحیفہ ہاے سماوی مبیّن از عشرات حدیقہ ہاے بہشتی مشخّص از آحاد

ائمہ بارہ یعنی "بارہ سو"، پھر کتب سماوی "چار" دہا کے چار یعنی چالیس، بہشت آٹھ، چالیس اور آٹھ اڑتالیس، بارہ سو اڑتالیس۔

دوسری تاریخ بارہ سو ستّر کی:

از بروجِ سپہر جوئی مآت عشرات از کواکبِ سیّار

بروج بارہ، سات دہا کے ستر۔

یہ جو لکھتے ہیں کہ سیّد غلام بابا کسی بحر میں نہیں آتا، کیوں نہیں آتا؟

جب کہ سیّد غلام بابا نے مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات کہ کواکب ہوئے تماشائی

دوسری بحر سنو:

ہزار شکر کہ سیّد غلام بابا نے فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

اس بحر میں سماتا ہوا کوئی مادہ بہم پہنچاؤ، تاریخ کہہ لو۔ وہ دوست جو مادّہ ڈھونڈ دیتے تھے، وہ جنّت کو سدھارے۔ جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں معذور اور مجبور ہوں۔

سہ شنبہ ۱۱۔ محرم۔ ۳۱۔ جولائی سال حال (۱۲۷۷ھ و ۱۸۶۰ء) غالب



(۴)

سعادت و اقبال نشان، منشی میاں داد خاں سے میں بہت شرمندہ ہوں کہ ان کے خطوط کا جواب نہیں لکھا۔ غزلوں کے مسودے گم ہو گئے۔ اس شرمندگی سے پاسخ نگار نہ ہوا۔ اب یہ سطریں جو لکھتا ہوں، اس خط کے جواب میں ہیں، جو بنارس سے آیا ہے۔

بھائی، بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغ دیر"[1] اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے، اس کو دیکھنا۔

اشرف حسین خاں میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد[2] کے زمانے سے بہت پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے۔ تم ان کو میرا سلام کہنا اور میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت لکھی ہے، اسی طرح آیندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں۔

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد

خیر اگر سیر و سیاحت میسر نہیں، نہ سہی، "ذکر العیش نصف العیش" پر قناعت کی۔ میاں داد خاں سیاح کی سرگزشت سیر و سفر ہی سہی۔

غزل تمھاری رہنے دیتا ہوں، اس کے دیکھنے کی ابھی فرصت نہیں ہے۔ جیسا تم نے وعدہ کیا ہے، جب اور غزلیں بھیجو گے، ان کے ساتھ اس کو بھی دیکھ لوں گا، بلکہ احتیاط مقتضی اس کی ہے کہ ان غزلوں کے ساتھ اس کو بھی لکھ بھیجنا۔

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر[3] مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟[4]

---

[1] یہ مثنوی غالب کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے اور بہ اعتبار ترتیب مثنویوں میں تیسری ہے۔ کل ایک سو شعر ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

نفس با صور دمساز است امروز   خموشی محشرِ راز است امروز

[2] یعنی "غدر" [3] جائے قرار، ٹھکانا۔ [4] یہ شعر ذوق کا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جلدی میں لکھتے وقت شاعر کا نام یاد نہ آیا۔ بہت کم اصحاب کو معلوم ہوگا کہ اصل مضمون عرفی کا ہے۔ وہ کہتا ہے:

امید عافیت از مردن است، مے ترسم   کہ مرگ دیگر و آسودگی دگر باشد

(باقی ص ۳۶۷ پر)

اللہ، اللہ، اللہ!

صبح دوشنبہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۶۰ء　　　　نجات کا طالب، غالب

(۵)

منشی صاحب،

تمھارے خط کے پہنچنے کی اطلاع دیتا ہوں اور مطالب مستفسرہ کا جواب لکھتا ہوں اور اپنے دوست روحانی میرزا رجب علی بیگ سرور[1] کو سلام کہتا ہوں، کہہ دیجیے گا، بلکہ یہ رقعہ دکھا دیجیے گا ۱۲

بعض لوگ "آن بان" بولتے ہیں، مگر فقیر کے نزدیک "آن تان" صحیح ہے اور بہی فصیح ہے ۱۲

"پر" بمعنی "لیکن" ملفظ مشہور ہے اور "پہ" اس کا مخفف ہے۔ اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو۔ کوئی اور لکھے یا نہ لکھے، میرے اردو کے دیوان میں سو دو سو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا ۱۲

مجھ کو بنگالے سے آئے بتیس تینتیس برس ہوئے۔ بہت احباب مر گئے، بہت متفرق ہو گئے اب ایسا وہاں کوئی نہیں، جس سے ارسال رسائل کو رسم و راہ ہو ۱۲

صاحب، وہ شعر جس کو تم نے پوچھا، یہ ہے:

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

دو شعر اس غزل کے اور یاد آ گئے ہیں، وہ دوسرے صفحہ پر لکھتا ہوں:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　　کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

دیکھو یہ "پر" کا مخفف "پہ" ہے، بمعنی لیکن ۱۲

بنارس کا کیا کہنا ہے! ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے! انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا اور ادھر کو نہ آتا:

عبادت خانۂ ناقوسیان است　　ہمانا کعبۂ ہندوستان است

جس بحر میں کوئی اسم یا کوئی لفظ نہ آ سکے، اس کی تدبیر فردوسی و خاقانی سے بھی نہ ہوگی۔ میں کیا کروں گا؟ نام تمھارا آ سکتا ہے، لیکن الف دبنا رہتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب[1] سے بھی ضرور پوچھنا۔

سہ شنبہ ۱۲۔ فروری ۱۸۶۱ء　　　　نجات کا طالب، غالب

(بقیہ حاشیہ صٓ ۳۶۶) یعنی موت ایک شے ہے اور آسودگی دوسری شے ہے۔ تاہم ذوق نے جس انداز میں یہ مضمون باندھ دیا ہے وہ ستایش سے بالا ہے۔ [1] رجب علی بیگ سرور مصنف "فسانۂ عجائب" وغیرہ۔

(۶)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو دعا۔ صاحب وہم اور چیز ہے اور احتیاط اور چیز ہے۔ کار پردازانِ ڈاک میرے خطوط کے ٹکٹ کبھی نہ دبائیں گے اور میرے خطوط کبھی نہ تلف ہوں گے۔ آدھ آنے کی جگہ دو دست کا ایک آنہ کیوں کھوؤں؛

"گلشن"، بعض کے نزدیک مؤنث اور بعض کے نزدیک "مذکر" ہے۔ "قلم"، "دہی"، "خلعت" ان کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی مونث، کوئی مذکر بولتا ہے۔ میرے نزدیک "دہی" اور "خلعت" مذکر ہے اور قلم مشترک۔ چاہو مذکر کہو، چاہو مؤنث۔ "گلشن"، البتہ مذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بھائی، جہاں الف دبتا ہے، میرے کلیجے میں ایک تیر لگتا ہے۔ "رکھتا ہے گلشن بھی"۔ یہ الف دبتا ہوا دیکھ کر میں نے رکھتی ہے، بنا دیا۔ مگر "گلشن" مذکر مناسب ہے۔ "پھلکی" یا "پھلکا" تنہا بے معنی محض ہے۔ "ہلکی پھلکی" یا "ہلکا پھلکا"، یوں آئے تو درست، ورنہ لغو۔ اور جو "پھلکا" پتلی چپاتی کو کہتے ہیں، یہ دوسرا لغت ہے۔ "پھلکے" کبھی نہ بولے گا۔ "پانی وانی"، "حُقّہ وُقّہ"، یُوں کہیں گے۔ نرا "وانی" اور نرا "وُقّہ" نہ کہیں گے۔ "ہلکا پھلکا"، "ہلکی پھلکی" کہیں گے سبک چیز کو۔ نرا "پھلکا" یا نری "پُھلکی" نہ کہیں گے۔ تذکیر و تانیث کے باب میں میرزا رجب علی بیگ سے مشورہ لیا کرو اور دبتے ہُوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔[1] ۱۲

غالب

(۷)

بھائی،

ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم میرزا رجب علی بیگ[2] کے شاگرد ہو جاؤ اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ تذکیر و تانیث کو اُن سے پوچھ لیا کرو۔ دکھن بنگالے کے رہنے والوں کو اس امر خاص میں دلی لکھنؤ کے رہنے والوں کا تتبع ضرور ہے ۱۲

ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے۔ عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو اس کو سمجھنا کہ عربی ہے۔ بعد معلوم ہونے اس قاعدے کے یہ سمجھو کہ "غربال" (غین نقطہ دار مکسور اور رائے قرشت اور بائے موحدہ اور الف و لام) یہ لغت فارسی ہے، ہندی اس کی چھلنی اور مرادف اس کی "پرویزن" (یعنی فارسی میں چھلنی کو "غربال" اور "پرویزن" کہتے ہیں)، اور چھلنی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو کوئی نہ جانے۔ رہا عربال عین سعفص اور یائے تحتانی سے، فصیح کیا بلکہ غلط محض و

---

[1] اس خط میں تاریخ درج نہیں، لیکن اس کے آخر میں ہے کہ تذکیر و تانیث کے متعلق سرور سے مشورہ لے لیا کرو۔ سیاح نے سمجھا کہ یہ سرور کی شاگردی کا مشورہ ہے۔ چنانچہ غالب کو لکھ دیا۔ میرزا نے خط ۷ میں اس غلط فہمی کی تردید کی۔ لہٰذا میں نے زیر غور خط کو عدد ۶ رکھا۔ یہ ۱۸۶۱ء کے اوائل کا ہونا چاہیے۔ اس وقت سرور بنارس میں راجا کے پاس ملازم تھے۔ [2] رجب علی بیگ سرور مصنف "فسانۂ عجائب" وغیرہ۔

محض غلط ہے۔ ہاں اگر عربی میں چھلنی کو عریال کہتے ہوں تو فارسی غربال اور عربی عریال، مگر میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ غربال کا عربی میں کچھ اور اسم ہوگا، عریال نہ کہتے ہوں گے۔

اب تم سنو، فنِ لغت میں ایک امر ہے کہ اس کو تصحیف کہتے ہیں یعنی لفظ کی صورت ایک ہو اور نقطوں میں فرق، جیسا کہ سعدیؔ "بوستاں" میں کہتا ہے:

مرا بوسہ گفتا بہ تصحیف دہ   کہ درویش را توشہ از بوسہ بہ

"توشہ" و "بوسہ" و "نوشہ" یہ تین لفظ مُصَحَّف ہمدگر ہیں۔ حال آنکہ معانی میں وہ فرق کہ جیسا زمین و آسمان میں۔ "توشہ"، ترجمہ زاد کا، "بوسہ" ترجمہ قُبلہ کا، "نوشہ" اسم "دولہ" کا۔ صاحبانِ فرہنگ میں "برہانِ قاطع" والا تصحیف میں بہت مبتلا ہے، گزر اور گزر، خرپزہ اور خربزہ۔ کہتا ہے کہ "سدا"، بہ سین سعفص لفظ فارسی ہے، بہ معنی آواز اور "صدا" بہ صاد تعریب ہے۔ جو لغات "تے" میں لکھے ہیں، انھیں لغات کو "طوے" میں لکھتا ہے، حال آنکہ جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے، طوے بھی نہیں ہے۔ مثلاً تشت لغت فارسی الاصل ہے، املا اس کی طوے سے غلط ہے[1]۔ "برہانِ قاطع" والا اس کو "تے" سے بھی لایا ہے اور طوے سے بھی۔ محققین جانتے ہیں کہ "صدا" بمعنی آواز لُغت عربی الاصل ہے، نہ معرب اور "سدا" سین سے ہرگز فارسی میں آواز کو نہیں کہتے، ہاں اُردو کے محاورے میں بہ معنی "ہمیشہ" کے مستعمل ہے۔ قصہ کوتاہ، غربال بہ معنی چھلنی کے لفظ فارسی الاصل، صحیح اور فصیح ہے اور عریال اگر کسی اور فرہنگ میں مثل "قاموس" اور "صراح" وغیرہ کے بہ معنی چھلنی کے نکلے تو اس کو مانو، ورنہ یہ "برہانِ قاطع" والے کے خرافات میں سے ہے۔

۲۷۔ فروری ۱۸۶۱ء   نجات کا طالب، غالب

——(۸)——

صاحب،

کل آپ کا خط آیا۔ میرا دھیان لگا ہوا تھا کہ آیا میاں سیّاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے؟ پہلا خط تمھارا جس کا حوالہ اس خط میں دیتے ہو، میں نے نہیں پایا، ورنہ کیا امکان تھا کہ جواب نہ لکھتا۔ جناب منشی میر امیر علی صاحب سے مجھ سے ملاقات نہیں، لیکن ان کے محامد و مکارم سُنتا ہوں۔ جناب مولوی اظہار حسین صاحب سے البتہ اسی شہر میں دو ملاقاتیں ہوئی ہیں، لیکن میں نے ان کو فقیر دوست اور درویش نواز نہ پایا۔ اغنیا کے واسطے اچھے ہیں۔ ہائے مولوی محمد حسن اور مولوی عبدالکریم! اس عہد میں اگر ان بزرگوں میں سے ایک ہوتا تو میں کیوں اپنی قسمت کو روتا؟ وقت گزر جاتا ہے، بات رہ جاتی ہے۔

ہاں، خان صاحب، آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق[2] کا حال اچھی طرح

---

[1] یعنی اسے طشت لکھنا غلط ہے، "تشت" لکھنا چاہیے [2] مولانا فضل حق خیر آبادی جو آخری دور میں ادب اور معقول کے امام مانے جاتے تھے۔ "غدر" میں بہ الزام اعانت باغیاں انگریزوں نے ان پر مقدمہ چلایا اور حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دی (باقی صفحہ ۳۷۰ پر)

دریافت کرکے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے میں اس کا کیا حال ہے ؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے؟

جمعہ ۴۔ ماہ اکتوبر ۱۸۶۱ء غالب

(۹)

صاحب،

آج تمھارے کئی خطوں کا جواب لکھتا ہوں۔ مولوی کرامت علی صاحب میرے شفیق ہیں۔ جس زمانے میں وہ دلی آئے تھے، میری اُن سے مُلاقاتیں ہُوئی تھیں۔ وہ میرے دوست ہیں، شاگرد نہیں اور ہرگز قصیدہ اُنھوں نے میری مدح میں نہیں لکھا۔ آغا عبدالرزاق شیرازی نے گویا میری خستگی اور تہمت زدگی کا انتقام لیا۔ بہرحال میں تمھارا احسان مند ہوں۔ اگر تم نہ ہوتے تو میری اور رہبر منشی کی صفائی نہ ہوتی۔ ان دنوں ضعفِ دماغ و دورانِ سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ والی رام پور کا بہت سا کلام یوں ہی دھرا ہے۔ دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ تمھاری بھیجی ہُوئی غزلیں سب محفوظ دھری ہیں، خاطر جمع رکھو۔ جب نواب صاحب کی غزلیں دیکھوں گا تو یہ بھی دیکھی جائیں گی۔

جب حال یہ ہو کہ اصلاح نہ دے سکوں تو فکرِ تاریخ کیا کروں ؟ اگر میرا حال درست ہوتا تو جناب مولوی عبدالغفور خاں صاحب نساخ کے دیوان کی تاریخ ضرور لکھتا اور اس خدمت گزاری کو اپنی سعادت سمجھتا۔ آپ جناب مولوی صاحب سے میرا سلام کہیں اور یہ میرا رقعہ ان کو دکھا دیں۔

چہارشنبہ ۲۰۔ نومبر ۱۸۶۱ء نجات کا طالب، غالب

(۱۰)

جنابِ منشی صاحب،

آپ کا خط، جو ہمری لفٹنٹ گورنر آگرہ کے دہ میرا بھیجا ہُوا تھا، پہنچا۔ اس کے بھیجنے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ جب گورنمنٹ اعلیٰ نے مجھ کو خط لکھنا موقوف کیا تو لفٹنٹ گورنروں کے اگلے زمانے کے خطوط سے میرا دل کیا خوش ہوگا۔ ایسے ایسے پچاس ساٹھ خط میرے پاس موجود ہیں۔ مجھ کو تو چھ آنے کے پیسوں کا افسوس ہے، جو تم نے بابت محصول دیے۔

مرقوم ۱۰۔ فروری ۱۸۶۲ء راقم اسداللہ

(۱۱)

آئیے بیٹھیے مولانا سیاح۔ السلام علیکم۔ مزاج مبارک۔ سورت کا پہنچنا بہرصورت مبارک ہو۔ بھائی، میرا دل بہت خوش ہُوا کہ تم اپنے وطن پہنچے، لیکن تم کو چین کہاں ؟ خدا جانے کے ہفتے، کے مہینے ٹھہروگے اور پھر سیاحت کو نکلوگے۔ جی میں کھُپ گئے آؤ اب دکن کی سیر کریں۔ حیدرآباد، اورنگ آباد دونوں شہر اچھے ہیں، ان کو دیکھیں۔

میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں، یہ دونوں بیٹے ہیں، نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے اور قدرت اللہ بیگ

(بقیہ حاشیہ صہ ۳۶۹) اُنھوں نے جزائر انڈیمان میں وفات پائی۔ (۱۲۔ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۹۔ اگست ۱۸۶۱ء) ۵۔ انڈیمان۔

خان ابن عم تھے۔ نواب خدا بخش خان کے اور معین الدین حسین خاں کی بہن منسوب ہے بھائی ضیاء الدین خاں سے۔

یہاں کوئی امر نیا واقع نہیں ہوا، وہی حالات و اطوار ہیں، جو دیکھ گئے ہو۔ مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔ والسلام مع الاکرام۔

صبح شنبہ ۲۔ ذیقعدہ و مئی ۶۲ء[1] غالب

(۱۲)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان،

شکوہ تمھارا میرے سر آنکھوں پر، مگر کوئی خط تمھارا جواب طلب نہ تھا۔ اشعار کی اصلاح سے میں نے ہاتھ اٹھایا۔ کیا کروں؟ ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے وقت پلنگ پر سے اتر بیٹھتا ہوں۔ کھانا کھا کر، ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اتر کر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ نشست چوکی سہی، مگر کئی قدم جانا، پھر آنا کیا ایسا آسان ہے۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی۔ اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا، کہاں تک جیوں گا۔

(اب تم دوسرے صفحہ کو پڑھو)

جناب نواب سید غلام باباخاں صاحب[2] کی خدمت میں سلام کہنا اور ولادت فرزند کی مبارکباد دینا اور یہ قطعۂ تاریخ نذر کرنا:

میر بابا یافت فرزندے کہ ماہ چاردہ   بر فرازِ لوح گردوں گردۂ تمثال اوست

فرخی بینی و یابی بہرہ از ناز و طرب   از سر ناز و طرب "فرزند فرخ فال" اوست (۱۲۲۱)

۱۲۸۰ھ "ناز" کے نون کے "پچاس" اور "طرب" کی طوے کے "نو" "فرخ فال" پر بڑھانے ہوں گے۔

پنجشنبہ ۱۶۔ اگست ۱۸۶۳ء غالب

(۱۳)

صاحب،

یہ سر پیٹنے کی جگہ ہے کہ تمھارا کوئی خط ڈاک میں ضائع نہیں ہوتا اور میرا کوئی خط تم کو نہیں پہنچتا۔ سنو، چھوٹے صاحب کا خط آیا۔ اس میں قطعہ کا شکریہ اور اجزائے کتاب کے بھیجنے کی تاکید کی تھی۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ اس کتاب کا چھاپا یہاں ہی شروع ہوگیا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بعد انطباع ایک مجلد آپ کے واسطے اور ایک منشی میاں داد خاں کے واسطے بسبیل ڈاک پارسل بھیجوں گا۔ اب تم نواب صاحب سے میرا سلام کہو اور یہ اپنے نام کا خط ان کو پڑھا دو اور ایک پتا تم کو دیتا

۱؎ یعنی ۲۔ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ و ۲۔ مئی ۱۸۶۲ء   ۲؎ مراد ہے میر غلام باباخاں۔

ہوں۔ نواب صاحب کا جو خط طلب کتاب کے باب میں آیا تھا، اس میں مندرج تھا کہ اب میں سورت کو جاتا ہوں تم اجزائے کتاب کا پارسل اس پتے سے سورت بھیجنا۔ بھائی میں نے اسی پتے سے خط بھیجا تھا، نہ پہنچے تو میرا کیا گناہ۔ پیڈ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر اس بات پر، یہ خط تم کو بیرنگ بھیجتا ہوں تاکہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے۔ فقط

صبح دوشنبہ ۱۴- ربیع الثانی مطابق ۱۷، ستمبر سال حال[1] غالب

(۱۴)

منشی صاحب،

یہ کیا اتفاق ہے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھتا:

کس زبانِ مرا نمے فہمد
بہ عزیزاں چہ التماس کنم

یاد کرو اصل مقدمہ یہ تھا کہ میں "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپوانا چاہتا ہوں، نواب صاحب مدد دیں، یعنی دو سو جلدیں خرید لیں۔ حضرت صاحب نے ایک گھڑی عنایت فرمائی۔ بھلا یہ میرے کس کام کی؟ چار دن سوچا کیا کہ پھیر دوں، پھر سوچا کہ بُرا مانیں گے۔ آخر کو گھڑی رکھ لی اور خیال کیا کہ کتاب کے انطباع کے بعد سو ڈیڑھ سو جلدیں بھیج دوں گا۔ اسی خط کے ساتھ نواب صاحب کے نام کا خط گھڑی کی رسید کا تم کو پہنچتا ہے اور یہ بھی تم کو معلوم رہے کہ گھڑی کی کنجی نہیں آئی۔ ظاہراً، سہو سے وہیں رہی ہو گی۔

ہاں صاحب، تیس جلدیں "لطائف غیبی" کی دو پارسلوں میں آگے بھیجی ہیں، جس کی قیمت دس روپے مجھ کو پہنچے۔ فی الحال ایک جلد اور اپنی طرف سے بھیجی ہے۔ رسید جلد لکھو۔

۳- دسمبر ۱۸۶۴ء غالب

(۱۵)

سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے۔ مگر تیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل بر بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے، اس میں وہی "لطائف غیبی" جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے، تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو اور وہ نسخہ ان کی نذر کر دو۔

صاحب، میں نے اپنے صرف زر سے "لطائف غیبی" کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ بیس میں نے مول لیں، تیس تم کو دلوا دیں۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لیں، دس مصطفیٰ خاں نے لیں۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔

---

[1] ۱۴- ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۷- ستمبر ۱۸۶۴ء

دیکھو سیف الحق! سعدیؒ کا قول کیا سچا ہے،

اگر دنیا نہ باشد، دردمندم — وگر باشد، بہ مہرش پائے بندم
بلائے زیں جہاں آشوب تر نیست — کہ رنجِ خاطر است، ار ہست ور نیست

جہاں دولت نہیں وہاں مصیبت ہے، جہاں دولت ہے وہاں خصومت ہے۔ میں تو میر غلام بابا خاں کا دوست ہوں، ان کی فتح کی دعا مانگتا ہوں۔ آپ اتنی مہربانی کریں کہ یہ حالات جو واقع ہُوا کریں، وہ مجھ کو لکھا کریں۔

غربیلہ کی ہندی "نخرہ" ہے، فارسی میں غربیلہ بولتے ہیں۔

پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۔ جنوری ۱۸۶۵ء — نجات کا طالب، غالب

(۱۶)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں سلّمکم اللہ تعالیٰ!

فقیر کی طرف سے دعا و سلام قبول کریں۔ چھوٹے صاحب کی تصویر کی رسید میں بھائی محمد حسین خاں سے کہا گیا تھا کہ تم تصویر کے پہنچنے کی اطلاع دے دینا۔ سو اب تمھاری تحریر سے معلوم ہُوا کہ اُنھوں نے اطلاع دی ہے۔ حال تصویر کا یہ کہ میں نے اسے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا، لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہُوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر، دیدار تو میسر ہُوا، گفتار بھی اگر خدا چاہے گا تو سُن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب آئینے کی تصویر[1] کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں، مگر فقیر اس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے، آگے پہنچے اور نیچے کا پتا نہیں۔ مکالمہ ایک طرف مصافحے کی بھی حرکت رہ گئی۔ اس وقت جُداگانہ خط لکھنے کی فرصت نہیں۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام اور اشتیاق کہنا، بلکہ یہ خط ان کو ضرور دینا کہ وہ پڑھ لیں۔ میں سادات کا نیاز مند اور علیؓ کا غلام ہوں:

بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

۱۷۔ ذوالقعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۳۔ اپریل ۱۸۶۵ء — نجات کا طالب، غالب

(۱۷)

صاحب،

مہربانی نامہ کہ گویا الفاظ اس کے سراسر نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی زبانی تھے، پہنچا۔ جواب لکھتا ہوں اور پرسش کا شکر بجا لاتا ہوں۔ ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والی رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینا ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اس روپے کی رسید نہیں لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے، میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو، کبھی

---

[1] فوٹو۔

ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود۔ انگریزی پنسن مسدود۔ یہ بزرگوار[1] وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔ رئیس حال کو خدا بدولت و اقبال ابداً موبداً سلامت رکھے، وجہ مقرری کی ہنڈوی ہر مہینے بجسب دستورِ قدیم بھیجے جاتا ہے۔ فتوح کی رسم دیکھیے جاری رہے یا نہیں۔

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپواؤں؟ پہلے بھی نواب مغفور نے دو سو روپے بھیج دیے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے، وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء حال میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا، مصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ یاد دلاؤں گا، مگر اس مرحوم کا وعدہ سرِ دست دفتر سے نہ تھا، جو از روئے دفتر اس کی تصدیق ہو۔ بہرحال فکر میں ہوں، اگر اسباب نے مساعدت کی فھو المراد، ورنہ:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

منشی صاحب، اس خط کو ضروری جان کر بیرنگ بھیجتا ہوں۔

۳۰- جولائی ۱۸۶۵ء نجات کا طالب غالب

(۱۸)



منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، منشی میاں داد خاں سیّاح، سیف الحق سلمکم اللہ تعالیٰ!

دعا اور سلام اور شکر اور سپاس۔ تمہارا خط مرقومہ ۳۰۔ اگست پرسوں بروز جمعہ ۸۔ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔ کل دسویں ستمبر ماہ حال کو سو روپے مندرجہ اس کے ایک صراف سے وصول ہو گئے۔ چھوٹے صاحب نے بڑی جوانمردی اور بڑی ہمت کی۔ اس صرف میں میرا کام ہوا اور ان کا نام ہوا۔ اللہ اللہ! اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے ان کو دیکھا، نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا، نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت، نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر، فقیر ہوں جب تک جیوں گا دعا دوں گا، تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔ تمہارا بھی احسان مانوں گا۔ اب دو ایک دن میں کاغذ آجائے تو اس کا انطباع شروع ہو جائے۔ تم نواب صاحب کو میرا سلام کہو اور یہ خط دکھا دو اور عرض کرو کہ آج تک کسی بھائی یا دوست کا روپے پیسے کا احسان مند نہیں ہوا تھا۔ اب احسان بھی اٹھایا تو اپنے آقا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرزند کا۔

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملّا، مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی، تم کو بھیجوں گا[2]۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں، جن کو "لطائفِ غیبی" میں رد کر چکے ہو، بہرحال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔ فقط والسلام والاکرام۔

دوشنبہ ۱۱۔ ستمبر ۱۸۶۵ء نجات کا طالب، غالب

---

[1] نواب کلب علی خاں والیِ رام پور [2] "ساطع برہان" جو "قاطع برہان" کے رد میں میرزا رحیم بیگ نے لکھی تھی۔

(۱۹)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں، تم سلامت رہو۔ تمھارے خط کے صفحۂ سادہ پر یہ سطریں رقم کرتا ہوں تاکہ تم اپنے خط کے پہنچنے سے اطلاع پاؤ۔ "نامۂ غالب" صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی، جو میں مول لے کر بھیجوں اور تم سے اس کی قیمت مانگ لوں۔ مَیں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں۔ دو دو روز دیک بانٹ دیں۔ آج یک شنبہ ہے، پارسل روانہ نہ ہوگا۔ جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں، کل تمھیں بھیج دوں گا۔

ہاں صاحب، سو روپے کا نوٹ پہنچا اور روپیہ وصول ہُوا۔ کاپی[۱] آج شروع ہو گئی ہے۔ جس دن نوٹ پہنچا، اس کے دوسرے دن روپیہ مل گیا۔ تیسرے دن میں نے تم کو تمھارے رجسٹری دار خط کا جواب لکھ بھیجا۔ یقین ہے کہ میرا خط پہنچ گیا ہوگا اور تم نے بموجب میری خواہش کے نواب صاحب کو دکھایا ہوگا۔ کل حضرت کا بھی ایک خط آیا ہے، اس کا جواب بھی آج تمھارے خط کے ساتھ ارسال ہوتا ہے۔ بندہ پرور، سچ کہتے ہو، رحیم بیگ کا وطن اصلی سردھنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے اور آٹھ دس برس سے اندھا۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔

یک شنبہ، ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء   راقم، غالب علی شاہ

(۲۰)

صاحب،

میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے اور عزیزان وطن کو دیکھ کر خوش ہُوئے اور مع الخیر والعافیۃ اپنے محسن و مربی کی خدمت میں پھر آ پہنچے۔ نواب صاحب سے میرا بہت سلام کہنا اور کہنا کہ اس خط میں سلام صرف وفور اشتیاق سے لکھا ہے۔ محبت نامہ جداگانہ بھیجوں گا۔

اجی ہاں میاں سیف الحق، رام پور سے آ کر تین سو جلدیں "درفش کاویانی[۲]" کی تیار پائیں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب سے حصّہ برادرانہ، ڈیڑھ سو جلد کا پشتارہ بنوایا، اس پر ٹاٹ لپٹوایا، ڈاک گھر بھجوایا، مسترد آیا۔ سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجنا قبول نہ کیا۔ ٹھیکے والے، پمفلٹ پاکٹ والے، ریل والے، متفق اللفظ اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں۔ تم یہ رقعہ حضرت کو پڑھواؤ اور اس باب میں جو وہ فرمائیں، وہ مجھ کو لکھو۔ مدعا یہ ہے کہ کسی طرح یہ پشتارہ وہاں پہنچ جائے۔ اس خط کا جواب جس قدر جلد لکھو گے، مجھ پر زیادہ احسان کرو گے۔

سہ شنبہ ۲۳ - جنوری ۱۸۶۶ء   نجات کا طالب، غالب،

(۲۱)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر اسد اللہ کا سلام۔ کل سہ شنبہ ۲۰۔ فروری صبح

---

[۱] یعنی "قاطع برہان" کی کاپی [۲] میرزا نے قاطع برہان دوبارہ چھپوائی تھی تو اس کا نام درفش کاویانی رکھا تھا۔

کے وقت چھ پارسل چھتیس "درفش کاویانی" کے، نواب میر غلام بابا خاں کی خدمت میں ارسال کیے۔ کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا، حال معلوم ہُوا۔ خیر، اب اور نہ بھیجوں گا۔

صاحب، یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے؟ میں نہ کتاب فروش، نہ دلّال، یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے بُرا کیا۔ حضرت، سولہ جلدیں "لطائفِ غیبی" کی بھیج کر، اس کے پانچ سات دن کے بعد بیس "نامۂ غالب" کا پارسل ارسال کیا ہے۔ "لطائف" کی رسید تم نے بھیج دی، یقین ہے کہ "نامۂ غالب" کا پارسل بھی پہنچ جائے گا، گھبراؤ نہیں۔ نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام اور اشتیاقِ ملاقات عرض کرنا۔

۲۱- فروری ۱۸۶۶ء   نجات کا طالب، غالب

(۲۲۲)

خان صاحب، سعادت و اقبال نشان، میاں داد خاں سیّاح کو فقیر گوشہ نشین کا سلام پہنچے۔ تمھارا کوئی خط، سوائے اس خط کے، جس کا جواب لکھتا ہُوں، ہرگز نہیں پہنچا۔ بہت دن سے مجھ کو خیال تھا کہ مولانا سیّاح نے مجھ کو یاد نہیں کیا۔ کل ناگاہ تمھارا خط پہنچا، آج اس کا جواب لکھتا ہوں۔

مُہر میں تو کھودنے کا نہیں جو اس قدر عذر چاہتے ہو، کھدوا دینے میں کیا تکلیف اور کیا زحمت؟ میں احباب کا خادم ہوں۔ میر غلام بابا خاں سے میرا سلام کہیے اور وہ نگین مع نقشہ بے تکلف بھیج دیجیے۔ آپ کے حکم کی تعمیل اور اس نگین کی درستی ہو جائے گی۔ خاطر جمع رہے۔ زیادہ کیا لکھوں؟

اجی سیّاح صاحب، ہمارا دھیان تم میں لگا رہتا ہے۔ کبھی کبھی خط لکھتے رہا کرو۔ میں ایسا گمان کرتا ہُوں کہ اگر میر غلام بابا خان صاحب کو مُہر کھدوانی نہ ہوتی اور وہ تم سے نہ کہتے تو تم ہرگز مجھ کو خط نہ لکھتے۔ یہ تمھارا خط گویا میر غلام بابا خاں کے حسب الحکم تھا۔ جی میں آیا تھا کہ انھیں کو اس کا جواب لکھوں اور ان کے نام کا خط بھیجوں، مگر پھر سوچا کہ تم آزردہ ہو جاؤ گے، تمھیں کو خط لکھا، بھائی، یہ طریقہ فراموش کاری کا اچھا نہیں۔ گاہ گاہ خط لکھا کرو۔ والسلام

یکم مارچ ۱۸۶۶ء   نجات کا طالب، غالب

(۲۲۳)

اقبال نشان، سیف الحق کو دعا پہنچے۔ پانچ اشتہار اخبار کی خریداری اور تین اشتہار کتاب کی خریداری کے آپ کے پاس پہنچتے ہیں۔ چھوٹے صاحب کو ملاحظہ کروائیے اور اطراف و جوانب، دُور و نزدیک بھیجیے۔ جو صاحب کتاب و اخبار دونوں کے خریدار ہوں، وہ اس کے خریدنے کی اطلاع کا خط میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع کے نام لکھیں اور وہ خط میرے پاس بھیج دیں۔ جو صاحب فقط اخبار کے خریدار ہوں وہ اس کی اطلاع کا خط لکھیں۔

۲۲- مارچ ۱۸۶۶ء   غالب

—(۲۴)—

مولانا سیف الحق،

اب تو کوئی خط تمھارا نوٹ اور ہنڈوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ بھلا یہ تو فرمایئے کہ یہ ڈھائی روپے کس بابت کے اور کس جنس کی قیمت کے ہیں؟ اگلے پانچ روپے پر میں بے مزہ ہوا تھا، یہ ڈھائی اور طرہ ہوئے۔ بہرحال ان کا حال لکھو کہ کیسے ہیں اور کاہے کے ہیں؟ اس رقعے کا جواب جلد لکھو۔ ٹوپیاں بعد عید بھیجی جائیں گی۔

۲۳-اپریل ۱۸۶۶ء   عنایت کا طالب، غالب

—(۲۵)—

صاحب،

میر اسلام۔ تمھارا خط پہنچا، دونوں غزلیں دیکھیں۔ خوش ہوا۔ فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں اور فن شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی جائے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو، کبھی کوئی غزل تمھاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح نہ ہوئی ہو، خصوصاً روزمرۂ اردو میں۔ دونوں غزلیں لفظاً اور معنًی بے عیب ہیں، کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ آفرین اور صد ہزار آفریں۔

میر غلام بابا صاحب واقعی ایسے ہی ہیں، جیسا تم لکھتے ہو۔ سیاحت میں دس ہزار شخص تمھاری نظر سے گزرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک آدمی کے مداح ہو، تو بیشک وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے۔ لاریب فیہ۔ کیا فرمایش کروں اور کیا تم سے منگاؤں؟ وہاں کونسی چیز ہے کہ یہاں نہیں؟ آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں، انگور سے کم عزیز نہیں، لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت؟ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلی آم بھیجنے محض تکلف ہے۔ روپے کے آم اور چار روپے محصول ڈاک اور پھر سو سے شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہ کرنا۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ، لذیذ اور خوشبو[1]، افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ اسے لو! آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست[2] کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکرے، ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے، دو سو میں تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے۔ اوائل جون ماہ حال میں ایک ہفتہ مینہ برس کر پھر اب وہی آگ برس رہی ہے اور لو چل رہی ہے۔

سہ شنبہ ۱۷-جون ۱۸۶۶ء

—(۲۶)—

بھائی سیف الحق، تمھارا خط پہنچا۔ قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پر ان کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں؟ تم بُرا نہ مانو، کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں، تو

---

[1] یعنی انھیں سونگھا جائے تو ان میں سے عمدہ خوشبو آئے۔ [2] قاضی عبدالجمیل جنون۔



اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے بُرا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو؛

غالبؔ بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں[۱]
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے ؟

صاحب، اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کہاں کھچا کھچا پھروں؟ گوشہ نشین آدمی، عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں؟ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھچی ہوئی ہے، اگر ہاتھ آجائے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا۔

اجی، وہ تو میں نے نواب صاحب کو ہنسی سے ایک بات لکھی تھی، دوستانہ اختلاط تھا۔ بمبئی میں بہرا ہوں، گانا کیا سنوں گا؟ بُوڑھا ہوں، ناچ کیا دیکھوں گا؟ غذا چھ ماشے آٹا، کھانا کیا کھاؤں گا؟ بمبئی، سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں، اگر وہاں آتا اور شریکِ محفل ہوتا تو پی لیتا۔

۵۔ ستمبر ۱۸۶۶ء　　　　نجات کا طالب، غالب

(۲۷)

صاحب،

میں تم سے شرمندہ (ہوں)۔ پہلا خط تمھارا مع قصیدہ پہنچا۔ میں قصیدہ کسی کتاب میں رکھ کر بھول گیا۔ اب دوسرا خط دیکھ کر قصیدہ یاد آیا، ہرچند ڈھونڈا، نہ پایا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس قدر مجھ کو یاد ہے کہ اسی وقت میں نے ان اشعار کو سراسر دیکھ لیا تھا۔ اشعار سب ہموار تھے۔ تم اندیشہ نہ کرو اور قصیدہ نذر گزرانو اور مع الخیر وطن کو جاؤ، لیکن بھائی وطن پہنچ کر ضرور مجھ کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتا لکھنا تاکہ میں اس نشان سے تم کو خط بھیجوں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب کو فقیر کی طرف سے سلام کہنا۔ فقط

صبح سہ شنبہ ۱۸۔ نومبر ۱۸۶۶ء



(۲۸)

منشی صاحب،

وہی جہان، وہی زمین، وہی آسمان، وہی سورت، وہی دلّی، وہی نواب میر غلام بابا خاں، وہی سیف الحق سیّاح، وہی غالبؔ نیم جان۔ انگریزی ڈاک جاری، ہرکاروں کو ریل کی سواری۔ ربیع الاول میں تمھارا خط آیا۔ ربیع الثانی، جمادی الاوّل، جمادی الثانی، رجب، آج شعبان کی ۲۶ ہے۔ صبح کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آٹھ بج گئے ہیں۔ اس وقت تک نہ کوئی تمھارا خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔ واسطے خدا کے میرے اس خط کا جواب جلد لکھو اور اس خط میں ترک نامہ و پیام کا سبب لکھو۔ آج ہی کے دن ایک پارسل چھ ٹوپیوں کا ارسال کرتا ہوں، خدا کرے، پارسل پہنچ جائے۔ اور ٹوپیاں تمھارے پسند آئیں۔ نواب صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہنچانا اور عتاب کی وجہ دریافت کر کے لکھنا۔ خط بیرنگ ہے اور پارسل پیڈ۔

۳۔ جنوری ۱۸۶۷ء　　　　نجات کا طالب، غالب

(۲۹)

منشی صاحب شفیق، بدل مہربان، عزیز تر از جان، سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ پڑھوں

۱؎ دیوان میں پہلا مصرع یوں ہے: غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے

نواب صاحب کا خط اور کل تمھارا خط آیا۔ صاحب! ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے "لطائفِ غیبی" کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں، پھر دو روپے کے ٹکٹ بھیج کر ٹوپیاں منگوائیں۔ میں نے تمھارے بھیجے ہوئے روپوں کی ٹوپیاں خرید کر تم کو بھیج دیں۔ چاہے تم پہنو، چاہے چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔

یہ جو میں نے "سیف الحق"، خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔" لطائفِ غیبی" نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں۔

ایک نئی بات سنو۔ محمد میرزا جان میرے سبطی بھائی کا نواسا ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے مسمّیٰ بہ" اشرف الاخبار"۔ اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمھارا ایک اعتراض قتیلؔ کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے[۱]۔ ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ چھوٹے صاحب کی بھی نظر سے گزر جائے اور اس سرکار میں یہ اخبار خرید کیا جائے اور تم ان کی طرف سے حکم خریداری ابتدائے جنوری ۱۸۶۷ء سے بنام محمد میرزا خان لکھو اور وہ خط اس پتے سے دلّی روانہ کرو جو ان کے اخبار کے آخر میں لکھا ہے۔

حیران ہوں کہ چھوٹے صاحب کے خط کا کیا جواب لکھوں۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ اپنے کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا۔ سیّد تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں۔ میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل، علیل، فقیر، حقیر آدمی ہوں۔ یہ ان کی بزرگی، ان کی خوبی، ان کی مہربانی ہے۔ حق تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور ان مقدمات میں من کل الوجوہ ان کو فتح و ظفر نصیب ہو۔ میرا سلام کہنا اور یہ عبارت پڑھا دینا۔

ہاں صاحب، برادر بجان برابر میرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ بھائی، میرا جی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ پہلے برخوردار شہاب الدین خاں سے صلاح پوچھو، وہ اجازت دے تو فوراً بہل پہل کرتے چلے آؤ۔ فقط

سہ شنبہ، ۷۔ شوال ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۲۔ فروری ۱۸۶۷ء دیدار کا طالب، غالب

(۳۰)

بھائی،

تم جیتے رہو اور مراتبِ علیا کو پہنچو۔ لو ایک ہنسی کی بات سنو۔ تمھارا خط منشی کنہیا لال کے نام کا میرے پاس آیا۔ ہر چند میں نے خیال کیا، اس نام کا کوئی آشنا مجھے یاد نہ آیا۔ یہ نادانی ان کی کہ مجھ سے کہہ نہ دیا کہ میرے نام کا خط آئے تو میرے پاس بھیج دینا۔ بے خبری میں جو خط آیا، میں نہ نام سے واقف، نہ مقام سے واقف، خط نہ پھیر دوں تو کیا کروں؟ خط کے واپس کرنے کے بعد ایک دن آپ[۲] بھائی میرزا محمد حسین خاں[۳] کے ساتھ میرے پاس آئے اور تعارفِ قدیم یاد دلایا۔ دیکھنا میاں کیا خوب بیان ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں غدر سے پہلے دو تین بار تیرے پاس حاضر ہوا ہوں۔ انصاف کرو، دو تین ملاقاتیں اور

---

۱ اس سے ظاہر ہے کہ غالبؔ نے خود ہی اعتراض لکھ کر سیّاحؔ کے نام سے اخبار میں چھپوا دیا تھا۔ اسی طرح "لطائفِ غیبی" خود لکھی اور سیّاحؔ کے نام سے چھاپی ۲ منشی کنہیا لال ۳ میرزا معین الدین حسین خاں کے بھائی۔

دس گیارہ برس کی بات۔ میں نسیان کا پتلا، میرا قصور کیا؟ بہر حال یہ شریف ہیں اور عمدہ روزگار کیے ہوئے ہیں۔

صاحب، میں نے "اودھ اخبار" میں دیکھا کہ چھوٹے صاحب مقدمہ جیتے اور بمبئی کے صاحبوں میں ان کی افزائشِ جاہ و جلال و تعظیم و توقیر کمال ہوئی۔ میں تو تہنیت میں خط لکھوں گا، مگر رشک آتا ہے کہ بحوالہ اودھ اخبار لکھوں اور بحوالہ سیف الحق نہ لکھوں۔ زیادہ، زیادہ۔

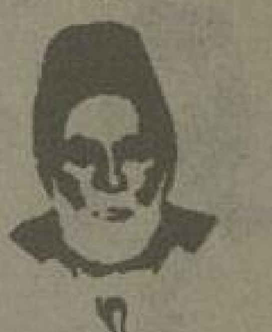
۳۱۔ مارچ ۱۸۶۶ء　　　　اسد اللہ غالب

(۳۱)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، عزیز تر از جان سیف الحق، میاں داد خاں سیاح کو غالب کی دعا پہنچے۔

پرسوں ایک خط تمہارا، ایک چھوٹے صاحب کا پہنچا۔ تمہارے خط میں پچاس پچاس روپے کے دو نوٹ پہنچے، سو روپے وصول ہو گئے۔ آج تم کو اطلاع اور نواب صاحب کا شکریہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔

بھائی تم نے اخبار اطراف و جوانب میں میرا حال دیکھا ہو گا۔ میں اب محض نکما ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں۔ از آں جملہ تین صاحبوں کے نام لکھتا ہوں، میر ابراہیم علی خاں صاحب، میر عالم علی خاں صاحب، نواب عباس خان، رئیس حال رامپور کے حقیقی ماموں۔ غرضکہ انھیں اوراق میں تمہارے کاغذ بھی دھرے ہوئے ہیں۔ جس دن ذرا افاقہ پاؤں گا، تو ان سب کاغذ کو دیکھوں گا۔



۲۳۔ اپریل ۱۸۶۶ء

(۳۲)

بھائی،

تمہارا خط پہنچا، آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ میری طرف سے جو اعتذار چھپا ہے، وہ تمہاری نظر سے گزرا ہے یا نہیں؟ نہ گزرا ہو، تو "اکمل الاخبار" ماہ شوال کے چاروں ہفتے کے دو ورقے دیکھ لو، ایک ہفتے میں نکل آئے گا ۱۲

واقعی اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں۔ اس ہفتے کے "اکمل الاخبار" میں دیکھ لو۔ جو تم سے کلام کرے اسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔

۲۹۔ اپریل ۱۸۶۶ء　　　　نجات کا طالب، غالب

(۳۳)

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق، منشی میاں داد خاں سیاح کو غالب ناتواں نیم جان کی دعا پہنچے۔ بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا، اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو صاحب، میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں؟ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی میں سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کو دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں، صبح کو دو آدمی ہاتھوں

پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔

تمھاری غزلیں، میر ابراہیم علی خاں بہادر کی غزلیں، میر عالم علی خاں بہادر کی غزلیں، حکیم میر احمد حسن صاحب کی غزلیں اور کیا کہوں کس کس کی غزلیں، یہ سب ایک جگہ دھری ہیں۔ اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گرمی خیر سے گزر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا۔

تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصوّر صاحب میرے دوست، میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے، آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینے پر نقشہ اتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو، وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم، یہ پانچواں مہینا ہے، آج تک نہیں آئے۔

آغا غلام حسین خاں صاحب کا قطعہ پہنچا۔ اس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے، اب اصلاح دے کون؟ میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بارے ایک میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ کیسواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا۔ اس کو موقع و محل بتادیا۔ جو میں کہتا گیا، اسی طرح وہ بناتا گیا۔ وہ قطعے کا کاغذ بعد اصلاح کے "اکمل المطابع" میں بھیج دیا۔ ہفتۂ آیندہ میں تم بھی دیکھ لوگے۔

۱۱۔ جون ۱۸۶۶ء   مرگ ناگاہ کا طالب، غالب

(۳۴)

نورچشم، اقبال نشان، سیف الحق، میاں داد خاں سیاح کو غالب نیم جان کی دعا پہنچے۔ واقعی تمھارے دو خط آئے ہیں۔ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ہاتھ میں رعشہ، آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔

بھائی، میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار والے میرا کیا حال جانیں؟ ہاں "اکمل الاخبار" اور "اشرف الاخبار" والے کہ یہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں، سو ان کے اخبار میں میں نے اپنا مفصّل حال چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا، دن رات پڑا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے تلے دھری رہتی ہے۔ تشت، چوکی پلنگ کے پاس لگا رہتا ہے۔ سو تشت چوکی پر تیسرے چوتھے دن اتفاق جانے کا ہوتا ہے اور حاجتی کی حاجت بسبب سرعت بول کے گھنٹہ بھر میں پانچ چھ بار ہوتی ہے۔

تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا، شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے، وہ کھینچتا ہے۔ مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں، پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹے کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر

جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں ۔ اب تم از راہِ مہربانی میر ابراہیم علی خان بہادر اور حکیم سید احمد حسن صاحب کو اور حبیب بمبئی سے واپس آجائیں ، نواب غلام بابا خاں کو یہ خط پڑھوا دینا ۔ تمھارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور مرجانا معلوم ہو کر بڑا غم ہوا ۔ بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے ۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی ۔ تم ابھی جوان ہو ، حق تعالیٰ تمھیں صبر اور نعم البدل دے ، والسلام

۲۵۔ اگست ۱۸۶۷ء — غالب

(۳۵)

صاحب ،

تمھارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی ۔ ٹوپیاں اگرچہ تمھارے سر پر ٹھیک نہ آئیں ، لیکن ضائع نہ گئیں ، میرے شفیق اور تمھارے مربّی کے صرف میں آئیں ۔ تم کو اور ٹوپیاں بھیجوں گا ۔

مصوّر سے سخت عاجز ہوں ۔ وعدہ ہی وعدہ ہے ، وفا کا نام نہیں ۔

کلیات میر تقی کا انتخاب تمھارے خط کے پہنچنے سے دو دن پہلے میر فخر الدین نے ارسال کر دیا ۔ ٹکٹ ان کے حوالے کر دیے ۔

حضرت ، بہتان لگانے کی تُو کس سے سیکھے ہو ؟ میرے پاس کوئی غزل تمھاری نہیں ہے ۔ نواب صاحب کو سلام کہنا کہ ٹوپیوں کو میرا ارمغان سمجھنا ۔ سیف الحق کی نذر تصوّر نہ کرنا ۔

۲۵۔ جنوری ۱۸۶۸ء — نجات کا طالب ، غالب

میر حبیب اللہ ذکاؔ

حبیب اللہ نام ، ذکاؔ تخلص ، نیلور (مدراس) کے باشندے تھے ۔ وہیں ۱۲۴۴ھ (۲۹-۱۸۲۸ء) میں پیدا ہوئے ۔ باپ کا نام حافظ محمد میراں اور دادا کا نام حافظ محمد علی تھا ۔

آپ کے اجداد بیجاپور سے نقل مکان کر کے نیلور میں مقیم ہوئے تھے ۔ علم و فضل اس خاندان کا امتیازی نشان تھا ۔ منشی حبیب اللہ پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی منشی رحمت اللہ رسا سے حاصل کی ، جو راجہ کٹ گری کے دیوان تھے ۔ پھر مدراس جا کر عربی و فارسی کی متداولہ کتابیں پڑھیں ۔ تعلیم نے طبعی جوہروں کو چمکا دیا ۔ شعر و ادب کی محفلوں میں بڑا نام پیدا کر لیا ۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر اور ادیب تھے ۔ انشائے فارسی میں خاص مہارت حاصل کر لی اور مدراس کے حلقوں میں بے مثل منشی سمجھے جاتے تھے ۔

اس زمانے میں مدراس کے دو سید فارسی شاعری کے اُستاد مانے جاتے تھے ؛ ایک سید محمد مہدی ثاقبؔ ، دوسرے سید محمد مرتضیٰ بینشؔ ۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے ۔ ان کے جدِّ اعلیٰ مشہد سے ہندوستان آئے ۔

اور گلبرگہ میں مقیم ہوئے۔ ان کے ایک پوتے خواجہ محمد گیسو دراز کے خالو تھے۔ پھر اس خاندان کا ایک فرد ارکاٹ میں متوطن ہوا۔ اس کی اولاد میں سے ایک صاحب سید ابراہیم نام مدراس چلے گئے۔ ثاقب اور بینش انھیں سید ابراہیم کے پوتے تھے۔ ذکا ابتدا میں انھیں سے اصلاح لیتے رہے۔

کچھ مدت اس حالت میں گزری تو ذکا کو غالب سے غائبانہ عقیدت پیدا ہو گئی۔ واقف حال اصحاب کا بیان ہے کہ عقیدت دیوانگی کی حد تک جا پہنچی تھی اور ذکا ہر وقت اس کوشش میں رہنے لگے کہ غالب سے ملیں۔ ثاقب وقتاً فوقتاً حیدرآباد آتے تھے اور یہاں ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوتے تھے۔ ذکا کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ پہلے حیدرآباد پہنچنا چاہیے اور وہاں پہنچ کر غالب سے ملنے کی سبیل نکالنی چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنے اقربا کو خبر کیے بغیر گھر سے نکلے اور پیدل سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے حیدرآباد پہنچ گئے۔

حیدرآباد میں ایک صاحب مولوی عبدالوہاب تھے، جو نواب مختارالملک سر سالار جنگ اول مرحوم و مغفور کی ڈیوڑھی میں میز خانہ کے مہتمم تھے، ان سے ذکا کی جان پہچان تھی۔ ذکا انھیں کے ہاں مقیم ہو گئے اور انھیں کی سفارش پر نواب مختارالملک نے ذکا کو صدر محاسبی کے دفتر میں میر منشی کی خدمت عطا کر دی تھی۔ پھر نواب صاحب نے اپنی جاگیر میں ایک اچھی ملازمت دے دی۔ بالآخر، علاقہ دیوانی میں دوم تعلقداری (جو ہمارے ہاں ای، اے، سی کے برابر ہے) پر مامور ہو گئے۔

حیدرآباد پہنچنے کے بعد غالب کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا اور میرزا کے خطوں سے ظاہر ہے کہ وہ ذکا کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ شعرا کے ایک قلمی تذکرہ سے معلوم ہوا کہ غالب کی شاگردی کے بعد ذکا نے اپنا پہلا کلام ضائع کر دیا تھا۔ پھر جب تک جیتے رہے غالب کے انداز میں شعر کہتے رہے:

"مضامین شعری را کماینبغی مے فہمید و بہ جمیع نکات و لطائف بہ بادی النظر پے مے برد۔ بالجملہ نکتہ سنج و نغز گفتارے بود کہ مثلش کمتر مرئی..... الخ

ہجو و مزاح میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کی ہجویں اور مزاحیہ نظمیں موجود ہیں۔

سنہ ۱۲۷۲ھ (سنہ ۱۸۵۵-۵۶ء) میں حیدرآباد آئے، تو اٹھائیس برس کی عمر تھی۔ انیس برس ملازم رہنے کے بعد سنہ ۱۲۹۱ھ (سنہ ۱۸۷۴ء) میں فالج سے وفات پائی۔ صرف سینتالیس برس کی عمر تھی۔ چنچل گوڑہ میں دفن ہوئے۔ آپ نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی کے لطن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی، دوسری کے لطن سے صرف ایک بیٹا ہوا۔ بڑے بیٹے کا نام محمد میراں تھا۔ غالب کے خطوں میں اس کا ذکر ہے۔ یہ بھی فارسی کے شاعر تھے اور سہا تخلص کرتے تھے۔ صدر محاسبی سرکار عالی میں انھیں منتظم کا عہدہ حاصل تھا۔ ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔

۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں محمد میراں نے ذکا کا متفرق فارسی اور اردو کلام نظم و نثر "خاشں خماشں" کے نام سے چھاپ دیا تھا۔ اب یہ بالکل کمیاب ہے۔ میرے پاس اس کا ایک ناقص نسخہ ہے جس کا کاغذ اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ ورق گردانی کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔

دوسرے صاحبزادے محمد اسد اللہ صاحب بھی صدر محاسبی میں منتظم تھے۔ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ (اکتوبر ۱۹۲۴ء) میں بعارضہ طاعون فوت ہوئے۔

(۱)

صبح سہ شنبہ ۱۳ صفر سال غفر (۱۲۸۰ھ) صاحب، میں تم کو اخوان الصفا میں گنتا ہوں۔ اپنا نور نظر و لخت جگر جانتا ہوں۔ دیکھو تم پر مجھ کو کیا اعتماد ہے کہ خود ضبط راز نہیں کر سکتا اور تم سے رازداری اور امانت میں استواری چاہتا ہوں ۱۲ قصیدہ و غزل میں صلہ و تحسین بہ اقتضائے بخت و قسمت ہے، نہ بہ اندازۂ ارزش کلام ۱۲۔ ممدوح سخن فہم ہوتا تو مجھ کو متوسط کے تساہل کا وہم ہوتا۔ اغنیا کو نہ مذاق شعر سے نسبت، نہ مطالعۂ اشعار کی فرصت۔ متوسط نے بقدر (ہمت!) سلسلہ جنبانی کی، لیکن مرجع نے نہ قدردانی کی۔ ۱۲

مولوی غلام غوث خاں بیخبر میر منشی لفٹنٹ گورنر مخلص خاص الاخلاص ہیں، ہرگز ان کو مدعی سے تلمذ نہیں۔ البتہ اس کو خوشگوار جانتے ہیں اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ میرا مقابلہ کریں اور "قاطع برہان" کا جواب لکھیں:

باطل است آنچہ مدعی گوید

مدعی اپنے زعم میں مجھ کو اپنا ہم فن جان کر حسد کرتا ہے۔ میں امیر علی شیر[1] جیسا محتسب اور مولوی جامی[2] جیسا مفتی کہاں سے لاؤں جو نیاز کرے اور کاذب کو سزا دے؛ شکر ہے خدا کا کہ تم سخنور اور سخندان ہو اور یقین ہے کہ قلمرو ہند میں اور بھی ایسے آدمی ہوں گے کہ میرے اور مدعی کے رتبے کو ممیز ہو سکیں گے:

عید است بادہ شد فلک و ساغر آفتاب

خالصاً للہ، فلک ظرف اور آفتاب مظروف ہے، یہ شخص ظرف کو مظروف اور مظروف کو ظرف ٹھہراتا ہے۔ اس کو کون مسلّم رکھے گا؟ اس سے بڑھ کر ایک اور خدشہ ہے، یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ شرط ہے۔ آفتاب و ساغر میں تدویر وجہ شبہ ہے، شراب اور فلک میں وجہ شبہ کہاں؟ ۱۲

میں اپنے کو ایسا نہیں جانتا کہ تمہارے کلام کو اصلاح دوں۔ قدردانی کیوں کر کہوں، قدر افزائی کرتے ہو۔

---

[1] نظام الدین علی شیر نوائی سلطان حسین میرزا فرمانروائے چغتائیہ ہرات کا ہم مکتب تھا۔ جب سلطان حسین میرزا تخت پر بیٹھا تو نوائی مصاحبی میں لے لیا۔ اس کی سرپرستی میں ہرات علم و ہنر کا مرکز خاص بن گیا۔ خود ترکی اور فارسی کا خوش ذوق شاعر تھا۔ دونوں زبانوں میں دیوان موجود ہیں۔ مجالس النفائس کے نام سے شعرا کا تذکرہ بھی لکھا تھا جو چھپ گیا ہے۔ مولانا جامی سے بڑی عقیدت تھی۔

[2] مولانا عبدالرحمٰن جامی جن کا درجہ بلند علم و شعر و تصوف میں کسی شرح کا محتاج نہیں۔

دوستانہ، نہ استادانہ، جوخیال میں آئے گا کہا جائے گا۔ اگر آپ نے اس روش کا یعنی استصلاح کا التزام کیا ہے تو جب تک کاغذ اشعار میرے پاس سے واپس نہ جایا کرے، ما کُتِبَ فیہ شہرت نہ پایا کرے۔ مجموعہ کلام سابق بھیج دو گے، میں بکمال طیب خاطر اس کو دیکھ کر بھیج دوں گا۔ استجازت کیا ضرور ؟ ۱۲

۱۳۔ صفر ۱۲۸۰ھ مطابق ۳۰۔ جولائی ۱۸۶۳ء)　　　　نجات کا طالب، غالب

(۲)

حضرت مولوی صاحب،

میں برس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اُٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود۔ پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے ہڈیاں نمودار۔ پھوڑے ایسے جیسے انگارے سُلگتے ہیں۔ اعضاء پر دس جگہ پھاٹے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوزِ غم ہائے نہانی علاوہ۔ صنعت سہل ممتنع میں، میں نے نواب مختار الملک[۱] کو قصیدہ[۲] بھیجا، کچھ قدر دانی نہ فرمائی۔ ردِ فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی[۳] جو سابق میں لکھی تھی، وہ ممی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید، شاگردِ قتیل وہاں کوس "انا ولا غیری" بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر برس کی عمر میری ہوئی۔ سوائے شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ "احسنت" و "مرحبا" کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر، ستایش کا حق ستایش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا، نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے! ممی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا، مگر یہ کہ خدا سمجھے ۱۲۔

کل سے پلنگ پر لیٹا لیٹا غزل کو دیکھ رہا ہوں اور لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھتا ہوں:

دیدیم گل و لالہ چہار رنگ بر آورد

فقیر کے نزدیک دیدیم زائد ہے، اگر یوں ہو تو بہتر ہے:

ہر یک ز گل و لالہ[۴] الخ

باشد شفقے کاں بلب لعل تو ماند　　گر چرخ بکام دل ما رنگ بر آورد

"باشد" مخل معنی ہے۔ اگر اس کی جگہ "آرد" ہو تو بہتر، مگر "آرد" صیغہ مستقبل کا اور "آورد" ماضی کا اور فاعل دونوں فعلوں کا چرخ۔ ہر چند اساتذہ نے یوں بھی لکھا ہے، مگر فارسی گویان ہند نہ مانیں گے۔ پس اس شعر کو یوں لکھنا چاہیے:

حاشا کہ شفق مثل لب لعل تو باشد　　کے چرخ بکام دلِ ما رنگ بر آورد

۱؎ نواب مختار الملک میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اوّل، جو دولت آصفیہ حیدر آباد کے مشہور وزیر اعظم تھے۔ ۱۸۸۳ء میں فوت ہوئے۔

۲؎ ملاحظہ ہو فارسی کلیات نظم غالب صفحہ ۳۴۶۔ اسی قصیدے کا ایک شعر یہ ہے:

کس نیست متاع را خریدار　　با آنکہ بہا گراں نگویم ؟

۳؎ کلیات نظم غالب کی چھٹی مثنوی (کلیات صفحہ ۱۰۲) ۴؎ پورا شعر یہ ہے: (باقی صفحہ ۳۸۶ پر)



مصرع :

خون شد دل غم دیدہ[1] الخ

یہ شعر ہموار ہے، نہ صاد کے قابل، نہ اصلاح کا محتاج۔ چوتھا اور پانچواں یہ دو شعر واہ کیا کہنا ہے[2] :

اے اہل ورع[3] الخ یہ بھی ہموار ہے۔ نہ صاد چاہتا ہے نہ اصلاح :

گوئی کہ زباں در دہنم برگِ حنا بود   تا بوسہ زدم آں کفِ پا رنگ بر آورد

مرزی صاحب، یہ بات تو کچھ نہیں۔ زبان چاٹنے کا آلہ ہے، نہ چومنے کا۔ زبان برگِ حنا بن گئی تو بوسے سے کفِ پا کیوں حنائی ہو جائے ؟ :

گوئی دہنم لب ز رگِ برگِ حنا داشت   تا بوسہ زدم آں کفِ پا رنگ بر آورد[4]

مقطع اور اس کے اوپر کا شعر دونوں اچھے۔ اب آپ اس خط کی رسید لکھیے اور اس میں غلام امام شہید کا حال مفصل لکھیے کہ ان کی وہاں کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے چار سو روپے مہینا سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔

روز چہار شنبہ ۱۰۔ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۰ھ[5] مطابق ۲۶۔ اگست سنہ ۱۸۶۳ء

(۳)

مولانا،

ایک تفقد نامہ پہلے بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں یہاں سے خط جواب طلب لکھا گیا تھا۔ پھر ایک اور مہربانی نامہ آیا۔ اس میں میں نے اپنے خط کا جواب نہ پایا۔ ناچار اس خط کے جواب کی نگارش اپنے خط جواب طلب کے پاسخ آنے پر موقوف اور ہمت آزادانہ، نہ فطرت کیا دانہ اس تحریر کے پانے پر مصروف رکھی گئی۔ بارے وہ کل نظر افروز ہوا اور طبیعت اس کے مشاہدے سے طرب اندوز ہوئی۔ اب درنگ و دیری کی تقصیر معاف کیجیے اور اپنی دونوں نگارشوں کا جواب لیجیے۔

(بقیہ ص ۳۸۵)   ہر یک ز گل و لالہ چہار رنگ بر آورد   رخسار تو زیں ہر دو جدا رنگ بر آورد

۱؎   خون شد دل غم دیدہ واز دیدہ فرو ریخت   دیدی کہ جفایت چہ بلا رنگ بر آورد

۲؎ چوتھا اور پانچواں شعر یہ ہیں :

تا بند کشائیم ہر انگشت حنائی است   از عکس تنت بسکہ حنا رنگ بر آورد

خوں کرد جگر حسرت اظہار تمنا   لب بستن من ہم چو حنا رنگ بر آورد

۳؎   اے اہل ورع چوں نتواں داشت عزیزش   مے سرخ تر از خون شما رنگ بر آورد

۴؎ ذکا نے اپنا کلام مرتب کرتے وقت یہ شعر، مقطع نیز دو اور شعر حذف کر دیے تھے۔ ۵؎ مطبوعہ نسخوں میں سنہ ۱۲۶۹ھ چھپا ہوا ہے، جو غلط ہے۔ صحیح سنہ ۱۲۸۰ھ ہے۔

صاحب، تاریخ الطباع کلیات خوب لکھی ہے[۱]۔ مگر ہزار حیف کہ بعد از انطباع پہنچی۔ کتاب کی رونق افزا نہ ہوئی۔ بندہ پرور، تم چراغِ دودمانِ مہر و وفا اور منجملہ اخوان الصفا ہو۔ مجھ سے تمھیں محبت روحانی ہے۔ گویا یہ جملہ تمھاری زبانی ہے۔ دوست کی بھلائی کے طالب ہو۔ اس شیوے میں شریک غالب ہو۔ ایک خواہش میری قبول ہو، تاکہ مجھ کو راحت حصول ہو۔ مبادی کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔ واقعہ حال دل نشین کرتا ہوں۔

جناب مولوی موید الدین خاں صاحب کے بزرگواروں میں اور فقیر کے بزرگوں میں باہم خلّت و صفوت مرعی تھی کہ وہ مقتضی اس کی ہوئی کہ ہم میں اور ان میں برادرانہ ارتباط و اختلاط باہم ہے اور ہمیشہ یونہی بلکہ روز افزوں رہے گا۔ خط میں خط ملفوف کرنا جانب حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں ان کے نام کا خط تمھارے خط میں ملفوف کر کے بھیجتا۔ ناچار اب آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا رکھا ہے، اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعۂ عنایت سے اس مجلّد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اس کے گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کر کے مجھ کو مطلع فرمائیں۔

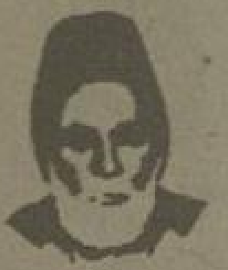
جمعہ ۱۰۔ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۵۔ ستمبر ۱۸۶۳ء غالب

(۴)

بندہ پرور،

آج تمھارا عنایت نامہ آیا اور آج ہی میں نے اس کا جواب ڈاک میں اور اس خط کے ساتھ پارسل کلیات کا بھی ارسال کیا۔ دسویں بارھویں دن خط اور مہینے بیس دن میں پارسل پہنچے گا۔ خط کا جواب ضروری الارسال نہیں، لیکن پارسل کی رسید ضرور لکھیے گا۔ آپ کے خط کی عبارت تو میں سمجھا، لیکن مدعا مجھ پر نہ کھلا۔ میں نے پارسل کب آپ کے پاس بھیجا اور کب آپ کو لکھا کہ آپ یہ پارسل موید الدین خاں کو دے دیجیے گا؟ پارسل کا لفافہ مولوی صاحب کے نام کا اور آپ کو اس کے ارسال کی اطلاع اور آپ سے یہ خواہش کہ موید الدین خاں صاحب سے ملیے اور میرا خط جو آپ کے نام کا ہے انھیں دکھائیے اور ان سے پارسل کا حال دریافت فرمائیے۔ آپ ولایتی بھی نہیں جو میں یہ تصور کروں کہ اردو عبارت سے استنباط مطلب اچھی طرح نہ کر سکے۔ بہ ہر حال اب مدعا سمجھ لیجیے اور مولوی صاحب سے ملنے کا ارادہ فرمائیے اور پارسل کا حال معلوم کر کے لکھیے۔

۵۔ جمادی الاوّل ۱۲۸۰ھ و نوزدہم اکتوبر ۱۸۶۳ء روز ورود نامہ نامی — داد کا طالب، غالب



---

[۱] اس سے مراد غالباً یہ قطعہ ہے:

غالب کہ نفی مطلق اگر معنی کم است	گویم کہ ہمسرش بہ سخن کمتر آمدہ
دیوانِ او ز مطبع منشی نولکشور	طومار سعیِ کارگزاران بر آمدہ
تاریخ انطباع نویسد ذکا ہمے	جان سخن بہ قالب طبع اندر آمدہ
صدہائے ہا ز رشک بر آمد ز منکراں	یک حرف ہا چہ شد ہمہ نا ئد گر آمدہ

(۵)

صاحب،

پہلے مطلع میں لطف نہیں، ہاں مضمون لطیف ہے، وہ فرد میں خوب آگیا ہے۔ مطلع ثانی بسبب تعقیدات کے مہمل رہ گیا۔ "ورنہ" کا قافیہ اور شعر میں اور طرح سے بندھ گیا ہے۔ تیسرا شعر الفاظ بدلنے سے بہت اچھا ہوگیا۔ جو شعر بے تصرف بدستور رہا، اس کا ذکر کچھ ضرور نہیں۔

ساقی ابھی چھنی[۱] الخ

چھنی لفظ غریب ہے، نہ اہل دہلی کے زبان زد، نہ گوشش زد۔ غربال کو چھلنی کہتے ہیں جس کی فارسی پرویزن ہے اور جس کپڑے میں سائلات[۲] کو چھانیں، فارسی اس کی "لاے پالا" اور اردو "صافی" ہے بہ یاے معروف۔ "برابر نہ ہُوا تھا" الخ تقرر وقت مرگ کا انکار حشو بلکہ مہمل ہے، مگر ہاں تقرر کا وقت ازل کو قرار دیا جائے۔ مقطع میری پسند نہیں ہے، میرے سر کی قسم اس کو نہ رکھو، اور مقطع لکھ لو۔ ۱۲

شنبہ ۱۴۔ نومبر ۱۸۶۳ء غالب

(۶)



بندہ پرور،

تمھارے دونوں خط پہنچے۔ غالب گُستہ دم، کو نہ قلم، نہ لکھے تو بہ اور بات ہے۔ دونوں خط آپ کے اور ایک پارسل محمد نجیب خاں کا بہ تقدیم و تاخیر دو سہ روز موصول ہُوئے۔ آپ کا پارسل بعد مشاہدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔ خاں صاحب کے پارسل میں ایک کتاب ارمغان اور اوراق اصلاح بھیجے جائیں گے۔

اہاہاہا! "محرق قاطع" کا تمھارے پاس پہنچنا:

کامے کہ خواستم زخدا شد میسّرم

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا؛ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصّہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے[۳]۔ دو طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے[۴] جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو "محرق" کو دیکھ کر جانوگے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق "دافع ہذیان" و "سوالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی" کو پڑھ کر متنبہ نہ ہُوا اور "محرق" کو ڈھونڈ ڈالا تو معلوم ہُوا کہ بے حیا بھی ہے۔ "دافع ہذیان"، "سوالات"، "لطائف غیبی" تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ بہ تقدیم و تاخیر یک دو روز، نظر انور سے گزریں۔ فی الحال اس

---

[۱] ذکا کا اردو کلام میری نظر سے نہیں گزرا، اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اصل شعر کیا تھا [۲] بہنے والی چیزیں [۳] دافع ہذیان مؤلفہ مولوی نجف علی [۴] سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی۔ میرے نزدیک یہ دونوں رسالے غالب نے خود لکھے تھے۔ ایک عبدالکریم کے نام سے چھپا، دوسرا سیف الحق میاں داد خاں سیّاح کے نام سے۔

پارسل کی رسید لبطور ورود لکھیے۔ جب آپ کا بھیجا ہُوا نسخہ مستر د پہنچے، تو اس کی رسید رقم کی جائے گی۔ چار نسخے پارسل میں ہیں: دو آپ لیجیے اور دو محمد نجیب خاں کو دیجیے۔

دوشنبہ ۲۸۔ نومبر ۱۸۶۴ء　　　　غالب

—— (۷) ——

بندہ پرور،

کل آپ کا نفقد نامہ پہنچا، آج میں پاسخ طراز ہُوا۔ جس کاغذ پر میں یہ نقوش کھینچ رہا ہوں، آپ کے خط کا دوسرا سر ورق ہے، پہچان لیجیے اور معلوم کیجیے کہ آپ کا مجموعہ کلام معجز نظام اور اس کے بعد دو خط پہنچے۔ میں صحیفہ شریفہ کی رسید لکھ چکا ہوں، بلکہ اسی خط میں محمد نجیب خاں کو سلام اور ارمغان کا شکر اور اوراق اشعار اصلاح طلب کی رسید میں نے لکھ دی ہے۔ پارسل کے سرنامہ سے میرا نام مٹا نہیں، پارسل تلف ہُوا نہیں۔ آٹھ دس روز ہُوئے ہوں گے کہ وہ مجلّد اسی پارسل میں کہ اس کو روگرداں کر لیا۔ ہے، لبعد ادائے محصول آپ کا نام لکھ کر روانہ کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ لبعد آپ کے خط کی روانگی کے آپ کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔

ہاں صاحب، خط دیروزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام، مع اس حکم کے کہ میں اس کو مولوی صاحب کے پاس پہنچاؤں، مَیں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحاد معنوی کے اقتضائے سے انھوں نے "دافع ہذیان" لکھ کر فن سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک ان کے شاگرد اور میرے آشنا ہیں۔ ان کو وہ خط بجنسہٖ بھیج دیا۔ یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھیج دیں گے۔ انھیں کے اظہار سے دریافت ہُوا کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالہ میں ہیں۔ نواب ناظم نے ان کو نوکر رکھ لیا ہے۔ ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدردان پایا۔ غالب سوختہ اختر کو ہنر کی داد بھی نہ ملی؛

کسم بجود نہ پذیرفت و دہر بازم برد
چو نامۂ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

یہ شعر میرا ہے۔ ولیعہد خسرو[۱] دہلی میرزا فتح الملک بہادر[۲] مغفور کے قصیدے کا اور دیکھو ایک رباعی میری:

دستم بہ کلید مخزنے می بایست　　　　ور بود تہی بہ دامنے می بایست
یا ہیچ کہم بہ کس نیفتادے کار　　　　یا خود بہ زمانہ چوں منے می بایست

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[۱] بہادر شاہ ثانی [۲] فخر الدین عرف مرزا فخرو، غالب کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۶ء میں فوت ہُوئے۔ منقولہ شعر قصیدہ ۲۷ میں ہے۔

(۸)

اے عتابت بہ عنایت ہم شکل

آپ کا خط حاوی حل شبہات جس دن پہنچا، اس کے دوسرے دن جواب لکھ کر بھیج دیا۔ دو مصرعوں میں دو لفظ بدلے گئے۔ دو شعروں کے باب میں کچھ تقریر درج ہوئی۔ دو تین شعروں میں تمھاری رائے مسلّم رہی۔ باوجود فقدان حافظہ و استیلائے نسیان ایک مصرع کا بدلا ہوا لفظ یاد ہے:

چہ غرۂ غرۂ پیشانی سمندِ عمر

بدل مصرع: چہ غرہ، غرۂ پیشانی تگاورِ عمر

دوسرا تبدل اسی قدر یاد رہ گیا ہے کہ "شبگیر و گراں رکاب"، کچھ اسی طرح کے دو لفظ تھے، بے واؤ عاطفہ کچھ تقدم و تاخر ہو گیا ہے ۱۲

صبح شنبہ ۳۔ ذی الحجہ (سنہ ۱۲۸۲ھ) مطابق یکم مئی سال حال[۱] (سنہ ۱۸۶۶ء) غالب

(۹)

میرے مشفق، میرے شفیق، مجھ سے ہیچ پوچ کے ماننے والے، مجھ سے برے کو اچھا جاننے والے، میرے محب، میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد[۱] ہے، رعشہ و ضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔

پہلا خط تمھارا پہنچا، اس سے تمھارا مریض ہونا معلوم ہوا۔ متواتر دوسرا خط مع غزل آیا۔ غزل کو دیکھا۔ سب شعر اچھے اور لطیف۔ حافظے کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ ایک لفظ میں کوئی شعر بدلا گیا تھا۔ غرضکہ وہ غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو۔

کل ایک خط رجسٹری دار آیا، گویا ستارہ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے! بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نویدِ رفع مرض و حصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بے جا سے لبریز۔

صاحب، میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو، وہیں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلّی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے، جو مجھ تک نہ پہنچے۔ وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صابر[۲] کا تذکرہ مانگتے ہیں، اس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔

---

[۱] تحفہ جو سفر سے لایا جائے [۲] میرزا قادر بخش صابر معز الدین جہاندار بادشاہ دلّی کی اولاد میں سے تھے۔ "گلستان سخن" کے نام سے شعرا کا تذکرہ لکھا تھا جو بہت کمیاب ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تذکرہ خود صہبائی نے لکھا تھا اور صابر کے نام سے شائع ہوا۔

بس اب مجھے اتنا لکھنا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلد لکھو۔

صبح جمعہ ۲۵۔ ذی حجہ ۱۲۸۲ھ، ۱۲۔ مئی ۱۸۶۶ء — جواب کا طالب، غالب

(۱۰)

دوست روحانی، برادر ایمانی، مولوی حبیب اللہ خاں میر منشی کو فقیر غالب کا سلام۔ تم نے یوسف علی خاں کو کہاں سے ڈھونڈ نکالا اور ان کا تخلص اور ان کا خطاب کس سے معلوم کیا؟ بغیر نشان محلہ کے ان کو خط کیوں کر بھیجا اور وہ خط ان کو کیوں کر پہنچا؟ :

حیرت اندر حیرت است اے یار من

پہلے یہ تو کہو کہ "درفش کاویانی" اور وہ قطعہ جس کی پہلی بیت یہ ہے تم کو پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر پہنچا تو مجھ کو رسید کیوں نہ لکھی؟

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ در خصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است

اگر یہ پارسل پہنچ گیا ہے تو رسید لکھو اور دیباچہ ثانی جدید کی داد دو اور اگر نہیں پہنچا تو مجھ کو اطلاع ہو کہ ایک نسخہ اور بھیجوں۔

زیستن دشوار۔ اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہترواں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔

اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر، چار پایہ بن کر اٹھتا ہوں، تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعد اراقت بول بے تکلف نیند آجاتی ہے۔ ایک سو باسٹھ روپے، آٹھ آنے کی آمد، تین سو کا خرچ، ہر مہینے میں ایک سو چالیس کا گھاٹا۔ کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں؟ مردن ناگوار بدیہی ہے، مرنا کیوں کر گوارا ہوگا؟

بھائی یہ خط از راہ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔ — جواب خط کا طالب، غالب

سہ شنبہ از روے جنتری ۲۶، اور از روے رویت

۲۵۔ رجب ۱۲۸۳ھ اور ۴۔ دسمبر ۱۸۶۶ء

(۱۱)

جانان بلکہ جان، مولوی منشی حبیب اللہ خاں کو غالب خستہ دل کا سلام اور نور دیدہ و سرور سینہ منشی محمد میراں[1] کو

---

[1] محمد میراں فرزند میر حبیب اللہ ذکا۔

دعا اور مجھ کو فرزندِ ارجمند کی نوید۔ جو نگارش صاحبزادے کی طرف سے تھی، رسم الخط بعینہٖ تمھاری تھی۔ اب تم یہ بتاؤ کہ رقعہ اس کی طرف سے تم نے لکھا ہے یا خود اس نے تحریر کیا ہے؟ لڑکا تمھارا تمھارے ساتھ حیدرآباد نہیں آیا، ظاہراً اب تم نے وطن سے بلایا ہے۔ مفصل لکھو کہ نخلِ مراد کا ثمر یہی ہے یا اس کے کوئی بھائی بہن اور بھی ہے؟ یہ اکیلا آیا ہے یا قبائل کو بھی اس کے ساتھ تم نے بلایا ہے؟ ہاں صاحب، محمد میراں یہ اسم مقتضی اس کا ہے کہ آپ قوم کے سیّد ہوں۔ منشا، افراطِ پرسش و فورِ محبت ہے، نہ فضولی۔

یوسف علی خاں شریف و عالی خاندان ہیں۔ بادشاہ دہلی کی سرکار سے تیس روپے مہینا پاتے تھے۔ جہاں سلطنت گئی وہاں تنخواہ بھی گئی۔ شاعر ہیں، ریختہ کہتے ہیں۔ ہوس پیشہ ہیں، مضطر ہیں۔ ہر مدعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں۔ علم اسی قدر ہے کہ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا باپ میرا دوست تھا۔ میں ان کو بجائے فرزند سمجھتا ہوں۔ بقدر اپنی دستگاہ کے کچھ مہینا مقرر کر دیا ہے، مگر بہ سبب کثرتِ عیال وہ ان کو مکتفی نہیں، تم ان کی درخواست کے جواب سے قطع نظر نہ کرو گے تو کیا کرو گے؟

صاحب، میں بعین عنایتِ الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتہ سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا "موید برہان" ہے۔ اس رسالے میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تُو نے دکنی[1] پر کیے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ بس بھائی، میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں "درفش کاویانی" علاوہ اوراق مذکور بھیج دیے۔ اسی زمانے میں تین چار ورق، خوب یاد ہے کہ "درفش" کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں۔ یا تو مجھے غلط یاد ہے یا تم نے "درفش" کو کھول کر دیکھا نہیں۔ وہ اوراق مع "درفش" زینت طاقِ نسیاں ہیں۔ وہ ورق اس لفافے میں اپنے نزدیک مکرر بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور صاحبزادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظمِ فارسی یہی ہے اور بس۔

ہاں صاحب، اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام کا دیکھا، "مکاں تنگ است" "جہاں تنگ است" مدحِ مختار الملک میں، متضمن استدعائے مسکنِ وسیع۔ پھر مہینے بعد اسی "اودھ اخبار" میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا، مگر تیس روپے مہینا بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا گیا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وضیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔ آپ سے اس روداد کی تفصیل اور جواب اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں، بسبیل استعجال۔

دوشنبہ ۱۶۔ شعبان ۱۲۸۳ھ (مطابق ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۷ء)

---

[1] یعنی صاحب "برہان قاطع"۔

(۱۲)

بھائی، میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے۔ ظاہرا، معاملۂ عالم ارواح ہے۔ اسبابِ ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔ تمھارے خط کا جواب مع اوراق مسودہ روانہ ہو چکا ہے، وقت پر پہنچے گا۔ "ستر ا بہتر ا" اردو میں ترجمۂ پیرِ خرف" ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے، پس میں "اخرف" ہوا، گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں، رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے، وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب، سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، رُوسیاہ ہوں، یہ شعر تقی کا میرے حسب حال ہے،

مشہور ہیں عالم میں، مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آج اس وقت کچھ افاقت تھی۔ ایک اور خط ضروری لکھنا تھا۔ بکس کھولا تو پہلے تمھارا خط نظر پڑا۔ مکرر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ بعض مطالب کے جواب لکھے نہیں گئے۔

ناچار اب کتابت جداگانہ میں لکھتا ہوں تا کہ خلعت کا حال اور میرے حالات تم کو معلوم ہو جائیں کہ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم[۱] کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ[۲] کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں[۳] کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ[۴] کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصراللہ بیگ خاں بہادر میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا، اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا، صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا، ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی، وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا،

---

[۱] شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی جو ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوا، اور ۱۸۰۶ء میں مرا۔ غالب نے کئی جگہ لکھا ہے کہ اس کا دادا عالم شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا اور لاہور میں معین الملک کے پاس ملازم ہوا۔ معین الملک نے محرم ۱۱۶۷ھ / نومبر ۱۷۵۳ء میں یعنی شاہ عالم سے چھ سال پہلے وفات پائی۔ لہٰذا میرزا کا دادا احمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا نہ کہ شاہ عالم کے عہد میں۔ البتہ دہلی میں ملازمت شاہ عالم ہی کے عہد میں ہوئی۔ [۲] آصف الدولہ ابن شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ [۳] نظام علی خاں ابن نظام الملک آصف جاہ اول جو عام طور پر نظام الملک ثانی مشہور ہے [۴] والیِ الور

جو باپ مرگیا۔ آٹھ برس کا تھا، جو چچا مرگیا۔ سنہ ۱۸۳۰ء[۱] میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔ زاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا، مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر، بجرم مصاحبت بہادر شاہ، دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری برأت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس کے بعد پنڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا۔ غرضکہ یہ خلعت ریاست کا ہے، عوض خدمت نہیں، انعامی نہیں، معوج الذہن نہیں ہوں، غلط فہم نہیں ہوں، بدگمان نہیں ہوں۔ جو جس کو سمجھ لیا اس میں فرق نہیں آتا، دوست سے راز نہیں چھپاتا۔ کسی صاحب نے حیدر آباد سے گمنام خط ڈاک میں بھیجا۔ بند بُری طرح کیا تھا، کھولنے میں سطر کٹ گئی۔ بارے مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بھیجنے والے کی غرض یہ تھی کہ مجھ کو تم سے رنج و ملال ہو، قدرت خدا کی میری محبت اور بڑھ گئی اور میں نے جانا کہ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ وہ خط بجنسہٖ تمہارے پاس اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ زنہار دستخط پہچان کر کاتب سے جھگڑا نہ کرنا۔ مدعا اس خط کے بھیجنے سے یہ ہے کہ تمہاری ترقی منصب اور افزونی مشاہرہ اس خط سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔

صبح جمعہ دہم شوال سنہ ۱۲۸۳ھ، ۱۵۔ فروری سنہ ۱۸۶۷ء

(۱۳)

جانِ غالب،

تم نے بہت دن سے مجھ کو یاد نہیں کیا۔ ایک خط میرا ضروری جواب طلب گیا ہوا ہے اور آمد و رفت ڈاک کی مدت گزر گئی۔ اس کا جواب تو سو کام چھوڑ کر لکھنا تھا۔ "موید برہان" میرے پاس بھی آ گئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں، وہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔ شرط مودت، بالشرط آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب لکھو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو درج کر دو۔ میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا الیہ راجعون۔ میاں محمد میراں کو دعا۔

۴۔ مارچ سنہ ۱۸۶۷ء[۲] جواب کا طالب، غالب

(۱۴)

بندہ پرور،

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ تمہاری اور صاحبزادے کی خیر و عافیت معلوم ہونے سے دل خوش ہوا۔ جو آپ کی عبارت سے سمجھ گیا ہوں، اس کا جواب لیجیے اور جو نہیں سمجھا وہ مطابق میری التماس کے مجھے سمجھا دیجیے۔ عماد، عمائد شعرائے قدیم میں سے ہے۔ اس کی پانسات بیت کی ایک غزل ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

پائے سر تا نشود راہ تو رفتن نتواں ٭ جز بہ جاروب مژہ کوئے تو رُفتن نتواں

---

[۱] صحیح یہ ہے کہ میرزا سنہ ۱۸۲۷ء میں کلکتہ گئے اور سنہ ۱۸۲۹ء میں واپس آئے۔
[۲] معلوم ہوتا ہے یہ خط ۴۔ مارچ کا ہے، مطبوعہ نسخوں میں اسے ۱۴۔ مارچ کا بتایا گیا، جو میرے اندازے کے مطابق صحیح نہیں۔

پہلے مصرع میں رے مفتوح اور دوسرے مصرع میں مضموم۔ باقی اشعار میں گفتن و سفتن وغیرہ قافیے ہیں۔ اُستاد دو مصرعوں میں حرکت ماقبل روی مختلف لایا۔ اگر میں نے پچاس شعر کے قصیدے میں ایک شعر ایسا لکھا تو کیا غضب ہُوا؟ آیا معترض صاحب اُستاد مثل و نظیر کو نہیں جانتے اور نہیں مانتے؟ یہ دستور میرا نکالا ہُوا نہیں، قدیم سے ہے۔

بندہ نواز میں نے لکھا کہ "موید برہان" میرے پاس آگئی ہے اور میں اس کے اعتراضات کے جواب بہ نشان صفحہ و سطر ایک تختہ کاغذ پر لکھ رہا ہوں۔ بعد اتمام نگارش تمہارے پاس اس مراد سے بھیجوں گا کہ تم از راہ عنایت "موید" کا جواب لکھو۔ میری نگارش جو پسند آئے اس کو بھی جا بجا درج کردو۔ تم نے اس درخواست کا جواب ہاں، نا، کچھ نہ لکھا[۱]۔ اب عنایت فرما کر ان تینوں باتوں کا جواب لکھیے۔ میاں محمد میراں کو دعا۔

۱۸۔ مارچ ۱۸۶۷ء

(۱۵)

منشی صاحب، الطاف نشان، سعادت و اقبال توامان، منشی حبیب اللہ خاں کو غالب سوختہ اختر کی دعا پہنچے۔ تمہارا خط پہنچا، پڑھ کر دل خوش ہُوا۔ تم میری بات پوچھتے ہو، لیکن میں کیا لکھوں؟ انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے تو اُس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، موتیٰ کی روح کو اس کی بُو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔ بھائی[۲] اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے، بالکل میرا یہی حال ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دوم شوال ۱۲۸۴ھ (مطابق ۲۷۔ جنوری ۱۸۶۸ء)

اپنی مرگ کا طالب، غالب

چودھری عبدالغفور سرورؔ

سرور مارہرہ ضلع ایٹہ کے رئیس اور قوم کے کمبوہ تھے۔ میرزا عسکری نے لکھا ہے کہ ان کے اجداد بہ عہد شہاب الدین محمد غوری مارہرہ میں مقیم ہو گئے تھے اور انھیں لوگوں نے حضرت صاحب عالم مارہروی کے بزرگوں کو مارہرہ میں بلا کر عزت سے رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ سرورؔ فارسی بہت اچھی جانتے تھے اور صرف فارسی میں شعر کہتے تھے۔ جب "انشائے بہارستان" لکھی تو غالب سے تاریخ کی فرمائش کی، جس کا ذکر میرزا کے خط میں بھی آیا ہے۔ لکھتے ہیں: وعدہ نہیں کرتا، بے وعدہ پہنچے گا تو زیادہ لطف آئے گا۔

---

۱ ملاحظہ ہو خط ۱۳۔ اگر اسے ۱۴۔ مارچ کا مانا جائے، جیسا کہ مطبوعہ نسخوں میں ہے تو چار روز میں نفی یا اثبات کے جواب کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ خط ۱۳، ۴۔ مارچ کا ہوگا نہ کہ ۱۴۔ مارچ کا۔ ۲ اس خط سے ایک حال اور بیس روز بعد انتقال ہُوا۔

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے   وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

سرورؔ نے میرزا کے اردو خطوط جمع کر لیے تھے اور خود ان پر ایک مقدمہ لکھا تھا، جس میں فرماتے ہیں:

"جب کلام بلاغت نظام رشکِ صائب، فخرِ طالب، جناب اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ کا دیکھا، دل کو بھایا، یکتا پایا۔ ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا۔ ہر کتابت کا جواب آیا۔ سبحان اللہ! وہ زبان کہاں پاؤں کہ ان کے خُلق کا بیان لب پر لاؤں..... کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاح شعر و عبارت میں دریغ و ننگ نہ فرمایا۔ جو نامہ کہ بہ نام میرے بہ عبارت اُردو تحریر کیا، مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا تر ہے..... پس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی مزا اٹھانا خلافِ انصاف جانا، دل مائل تمام بہ شہرت عام ہوا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ اس اثنا میں ممتاز علی خاں صاحب میرٹھی مارہرہ آئے۔ انھوں نے انطباع خطوط کا بیڑا اٹھایا، میں نے خطوط مرتب کر دیے:

"چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر بہت غالب ہے، لہٰذا نام اس انشا کا "مہر غالب" (بہ کسر میم) مناسب ہے۔ سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا۔ طبیعت اور بڑھی، تحریر تاریخ کو دست قلم بڑھایا:

انشا مملو بہ صد مطالب لکھی   یعنی پئے دوستانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو "مہر غالب" سے سرورؔ   تاریخ بھی اس کی "مہر غالب" لکھی

گویا یہ مجموعہ ۱۲۷۰ھ میں مرتب ہوا، لیکن اس کے چھپنے میں دیر ہوتی رہی، اس لیے کہ اور خطوط جمع کرنے کا خیال ہو گیا تھا اور خواجہ غلام غوث خاں بیخبرؔ اس کام کے مہتمم بن گئے تھے۔ آخر یہ مجموعہ بنام "عود ہندی" غالبؔ کی وفات سے صرف چار ماہ پیشتر چھپا، جس کا ابتدائی حصہ سرورؔ کے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ سنا ہے کہ سرورؔ کا انتقال بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ ان خطوط کی ترتیب میں زیادہ تر قرائن و قیاسات سے کام لینا پڑا۔ ضروری نہیں تمام قیاسات درست ہوں۔

(۱)

میرے کرم فرما، میرے شفیق:

شرط اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب
اے تو غائب ز نظر مہرِ تو ایمانِ من است

آپ کے اس خط کا جواب بعد لکھنے اس شعر کے منحصر التماس پر ہے کہ میری طرف سے تحریر جواب خط میں کبھی تقصیر نہ ہوگی، لیکن اغلب و اکثر ابتدا بہ تحریر نہ ہوگی۔ یہ خط ناچار از روئے اضطرار واپس بھیجتا ہوں۔ واسطے خدا کے میرے پیر و مرشد[1]

---

[1] صاحب عالم مارہروی۔

کے ارشادات کو ایک اور کاغذ پر اپنے ہاتھ سے نقل کرکے بھیج دیجیے تاکہ مجھ بدنصیب کو معلوم ہو کہ حضرت نے کیا لکھا ہے۔ جناب چودھری غلام رسول صاحب[1] کی خدمت میں سلام نیاز۔ استاد شیخ عطا حسین[2] صاحب کی جناب میں سلام۔

(۱۸۵۹ء)

——(۲)——

جناب چودھری صاحب کی یاد آوری اور مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں۔ آپ کا خط مع قصیدہ و مثنوی پہنچا۔ مثنوی کو جداگانہ بہ طریق پمفلٹ بھیجتا ہوں اور یہ خط جداگانہ ارسال کرتا ہوں۔ لفافہ اس کا بھی آپ کے نام کا ہے۔ آپ کے جواب کا ماجرا اور صبح کو ادھر کا قصد اور پھر اپنے چچا صاحب کے کہنے سے نظر تابستان پر اس عزم کا ملتوی رکھنا معلوم ہوا۔ آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی کہ جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان پر آ جاتے تو ممکن تھا، مگر رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرور رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو، تو نہ ہو، اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دلّی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے، نہ قانون، نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا ہی کرے۔ بہر حال:

اے وائے ز محرومی دیدار دگر ہیچ

ان شاء اللہ العظیم دو تین مہینے میں یہاں بھی صورت امن و امان کی ہو جائے گی، مگر میری آرزو باستیفا اس صورت میں بھی بر نہ آئے گی۔ میں یہ تاکے ہوئے ہوں کہ میری اور تمھاری ملاقات اس طرح سے ہو کہ ہم تم ہوں اور حضرت صاحب عالم صاحب ہوں اور باہم حرف و حکایت کریں۔ اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے تو میں مارہرہ کو آتا ہوں۔ حضرت پیر و مرشد کا اشتیاق اور اسی جلسے میں تمھارے دیدار کا شوق ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو آرام سے بیٹھا رہنے دے گا۔

صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہو گئی ہے۔ اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے، تب یہ تراوش خونابہ ظہور میں آئی ہو گی۔ مزا یہ ہے کہ عنوان بیان سے حق بجانب انھیں کے معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اصل کاغذ میری نظر میں نہیں اور حقیقت حال مجھ پر مجہول ہے، اس واسطے انجام و آغاز، اندازہ و انداز کچھ نہیں سمجھا۔ حک و اصلاح کو آپ بہ نظر امعان ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے بحسب دستور ہر جگہ منشا اصلاح لکھ دیا ہے۔ شیخ صاحب سے میرا سلام کہیے گا اور کہیے گا کہ کیا کروں، دور ہوں، معذور ہوں۔ مدد نہیں کر سکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا۔ خدا تمھارا نگہبان رہے۔ والسلام

(۱۸۵۹ء)

---

[1] سرور کے چچا [2] مارہرہ کے ایک خوش مزاج اور بذلہ سنج استاد جن کی مثنوی "شکایت سعایت" پر میرزا غالب نے اصلاح دی تھی۔ اس مثنوی میں بعض لوگوں کی غیبتوں اور سازشوں کا ذکر تھا۔ عطا حسین کی وفات ۲۰ ذی حجہ ۱۲۹۶ / ۲۲ نومبر ۱۸۷۹ کو ہوئی۔

(۳)

بندہ پرور،

آپ کا تفقد نامہ محررہ ۱۵۔ نومبر آج پنجشنبہ کے دن ۱۸۔ نومبر کو یہاں پہنچا۔ مارہرہ کا خط دلّی چوتھے دن آیا ہے، دلّی کا خط مارہرہ دیر میں کیوں پہنچتا ہے؟ لو تمھاری خوشی، اب کے بیرنگ بھیجتا ہوں[1]، مگر مجھ کو اطلاع دیجیے گا کہ کس دن پہنچا؟

۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی۔ جو سُنا گیا وہ بھی ضمیمۂ سرگزشت کرتا گیا۔ مگر بطریق لزوم مالایلزم، اس کا التزام کیا ہے کہ بہ زبان فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے، اس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسمائے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔ چنانچہ ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مگر یہ نذر ہے جناب قبلہ و کعبہ حضرت صاحب عالم کی اور چونکہ وہ آپ کے بزرگ ہیں، جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی نذر کروں اور سیر میں ان کو مشترک رکھوں۔ نذر ان کی ہے اور فیض یابی آپ کے مطالعہ سے ہے۔

ہیہات یہ کاتب اساتذہ کے کلام کو کیا بگاڑ دیتے ہیں، گویا مسخ کر دیتے ہیں۔ اُن سے بعید نہیں، لیکن تم سے اور حضرت صاحب سے بعید ہے کہ سہو کاتب کا نہ سمجھ لیا،

من آں دریاے آشوبم کہ از تاثیر خاصیّت

دو کافوں کا علی التواتر آنا دوسری بات ہے، "دریاے آشوب" کیا ٹکسال باہر لفظ ہے۔ استعارہ بالکنایہ صحیح، مگر یہ محل نہیں ہے۔ یہاں تو دریا چاہیے بے شائبہ استعارہ و کنایہ۔ عیاذاً باللہ اعرفی اگر ایک بڑا قدح بھنگ کا یا ایک بوتل شراب کی پیے ہوئے ہوتا تو بھی یوں نہ لکھتا۔ اس غریب کا مصرع یوں ہے؛

من آں دریا پُر آشوبم کہ از تاثیر خاصیّت

"دریا" موصوف "پُر آشوب" صفت۔ دوسرے مصرع کا کاف صفت کی تفسیر۔

اب روے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ امیدوار ہوں کہ میرے ہم عمر مرشد، میرے ہم فن مخدوم میری تقصیر معاف کریں گے۔ اگرچہ تریسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں، عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں۔ باوجود حدت بصر، بسبب نقص فہم کے دستخطی عبارت مجھ سے پڑھی نہیں جاتی۔ آگے جو دو بار میں نے جواب لکھا ہے، صرف قرائن ملحوظ رکھے ہیں ورنہ عبارت بالستیفا مجھ سے نہیں پڑھی گئی۔ آخر چودھری صاحب تو آپ کے معتقدوں میں بمنزلہ عزیزوں کے ہیں۔ جو آپ فرمایا کریں، وہ انھیں الفاظ کو لکھ دیا کریں۔ اب سب عبارت کا جواب جب لکھوں گا کہ کتاب کی رسید اور اس مطلب کا اعادہ تحریر بہ دستخط چودھری صاحب میرے پاس آجائے گا۔

۱۸۔ نومبر ۱۸۵۸ء

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے، سرور نے خود کہا تھا کہ خط بیرنگ بھیجا کیجیے۔

(۴)

جناب چودھری صاحب،

آپ کا عنایت نامہ اس وقت پہنچا اور یہ وقت صبح کا ہے۔ دن بدھ کا، ربیع الثانی کی چوبیسویں (۱۲۷۵ھ) اور دسمبر کی پہلی (۱۸۵۸ء) کتاب کے پارسل کی رسید معلوم ہوئی۔ حکیم عبدالرحیم خاں کوئی نامی اور نامور نہیں ہیں۔ یہاں کے خاصی زادوں میں سے ایک شخص ہیں۔ طبابت کرنے لگے ہیں۔ میرے بھی آشنا ہیں، صرف سلام علیک، زیادہ ربط نہیں ہے۔ سوان کا حال مجھ کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ آگے حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ جو لکھیں وہ بقلم چودھری صاحب لکھا جائے۔ حضرت نے نہ مانا اور پھر عبارت بدستخط خاص لکھی۔ واللہ باللہ نہ مجھ سے نہ اور کسی سے پڑھی گئی۔ ناچار ان کا خط پھر آپ کو بھیجتا ہوں۔ حضرت سے کچھ نہ فرمائیے گا، مگر اس عبارت کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے مجھ کو بھجوائیے گا۔ ضرور اور جلد۔ شفیق مکرم جناب چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یکم دسمبر ۱۸۵۸ء

(۵)



چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی، ورنہ میں سزاوار ستایش نہیں ہوں۔ ایک سپاہی زادۂ ہیچ مداں اور دل افسردہ و رواں فرسودہ۔ ہاں، ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پرداز میں میرا قول اکثر خلافِ جمہور پائیے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔

پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں، کیا یہ سب ایزدی سروش[1] ہیں اور ان کا کلام وحی ہے؟ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے، مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ فرماتے ہیں، وہ صحیح ہے۔

اسی چھاپے میں آپ جس کا حوالہ دیتے ہیں:

منکہ باشم عقل کل[2] الخ

اس شعر کی شرح کو ملاحظہ کیجیے۔ عبارت وہ تعقید سے لبریز کہ مقصود شارح کا سمجھا بھی نہیں جاتا اور جب غور و تامل کے بعد سمجھ لیجیے تو وہ معنی ہرگز لائق اس کے نہیں ہیں کہ فکر سلیم اس کو قبول کرے۔ پھر:

---

۱ خدائی فرشتے۔

۲ عرفی کا شعر ہے:

منکہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب   مرغ اوصاف تو از اوجِ بیاں انداختہ

"احسان تو لبشگافتہ"[1] الخ

اِس مصرع کی توجیہ کتنی بے مزہ اور بے نفع ہے؟ عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اس سے پوچھوں کہ بھائی تُو نے اس شعر کے کیا معنی رکھے ہیں؟ قصّہ کوتاہ:

دیواں گری محبّت تو　　کامروز مسلّم ست مارا
بیگانہ ز تاج کرد تارک　　آوارہ ز کفش کرد پارا

جیسا کہ دوسرے شعر کے مفہوم کو شارح کہتا ہے کہ "دیوانگی" میں یہ حالت بعید نہیں۔ ایسا ہی اگر کوئی کہے منصب "دیوانی" سے یہ بات بعید ہے، تو پھر شارح کیا جواب دے گا؟ ہاں یہ کہے گا کہ غلبۂ محبّت میں پاسِ وضع نہ رہا اور دیوان جی صاحب کچہری سے ننگے سر اور ننگے پاؤں نکل بھاگے۔ ہم نے مانا، مگر ہم یہ پُوچھتے ہیں کہ "دیوانگی" کیوں نہ لکھیں کہ دوسرے شعر کے معنی بے تکلّف منطبق ہو جائیں اور توجیہات درمیان نہ آئیں؟ فقیر کے نزدیک "دیوانگی محبّت" تو صحیح اور بے تکلف ہے اور "دیوانگی و محبّت"، تو غلط محض اور "دیوانگری محبّت"، تو تکلّف محض۔ دیوانگی اور محبّت دو صفتیں کیوں جمع کریں؟[2] غور کیجیے، عطف واؤ یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص پہلے سے دیوانہ تھا اور پھر اسی حالت میں اس کو محبّت پیدا ہوئی۔ دیوانگی میں تاج و کفش بے جا تھے، محبّت پیدا ہونے کے بعد یہ حالت طاری ہُوئی۔ کیا بے مزہ توجیہ ہے۔ ہاں "دیوانگی محبّت" یعنی وُہ جنون جو فرطِ محبّت میں بہم پہنچا، اس نے اس احوال کو پہنچایا۔ فقیر "دیوانگی محبّت"، کہے گا اور "دیوانگی و محبّت"، کہنے کو منع کرے گا اور "دیوانگری محبّت"، کہنے کو نہ مانع آئے گا، نہ تسلیم کرے گا۔ زیادہ اس سے کیا عرض کروں؟ یادآوری اور مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں اور بس۔

اب یہاں سے رُوئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم صاحب کی طرف ہے۔ اپنے مخدوم و مطاع حضرت صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں اور حیران ہُوں کہ اور کیا کہوں؟ یہ مدعا چودھری صاحب کی تحریر سے معلوم ہو گیا تھا، اس کا جواب لکھا گیا۔ حضرت کے دستخط خاص کی لکھی ہوئی عبارت سے جو سمجھتا ہُوں اس کا جواب لکھتا ہوں اور جو مجھ سے نہیں پڑھا گیا، وہ تعویذ بازو کر رکھتا ہُوں۔ اگر بفرضِ محال کبھی ملاقات ہو گی تو آپ سے دریافت کر کے پاسخ گزار ہوں گا۔

ہاں حضرت سچ ہے　میر ابن حسن[3] خاں میرے دوست ہیں اور میرزا عباس[4] میرا بھانجا۔ فتنہ و فساد[5] کے زمانے میں بلگرام میں رہا، اب وہ فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے۔ آپ کی اور بھائی منشی نبی بخش صاحب کی ملاقات سے میرا

---

[1] عرفی کا مصرع:

احسان تو لبشگافتہ ہر قطرۂ یم را

[2] مطلب یہ ہے کہ عرفی نے "دیوان گری محبت"، نہیں بلکہ "دیوانگی محبت"، لکھا تھا [3] "عود ہندی" مرتبہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کے مطابق میر ابن حسن خاں بن میر نثار حسین خاں بلگرامی [4] میرزا عباس بیگ بن میرزا اکبر بیگ۔ [5] انھوں نے (باقی صفحہ ۴۰۱ پر)

دل بہت خوش ہوا۔ یاد رہے سخن فہمی اس بزرگوار کا حق ہے۔ اب آگرہ میں بے کار اور پنسن کے امیدوار ہیں ؛

مصرع :

تا ہر چہ گفتے از تو مکرر شنود ے

"شدے" کی رعایت سے کہ وہ بیاے مجہول ہے بہ معنی "میشد" اکثر صاحب گفتی کو بیاے مجہول پڑھتے ہیں تاکہ میگفت کے معنی پیدا ہوں۔ اس صورت میں خطاب سے بطرف غیب کے رجوع کرتے ہیں اور "گفتی" بیاے معروف سے صیغۂ واحد حاضر ہے، ازمنہ میں سے اشعار زمانۂ ماضی رکھتا ہے اور "شدن" "شود" یہ سب استقبال کے ہیں اور معروف گفتی ماضی ہے۔ پس اگر "گفتی" بیاے معروف کہیے تو اوپر کے مصرع میں بُدے کہنا ہوگا، بُودے کا مخفف۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہاں "بُدے" کہیے تو یہاں "گفتی" بیاے معروف بے تکلف درست اور بیاے مجہول غلط ہے اور اگر وہاں "شدے" کہیے تو یہاں "گفتے" بیاے مجہول کہیے۔ غیبت اور خطاب کا تفرقہ مٹا دیجیے۔ گفتے بیاے مجہول میں خطاب حاضر مقرر رہتا ہے اور تو کا لفظ جو قریب ہے وہ اس معنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ نظائر اس کے فارسی میں بہت ہیں۔ رباعی کے باب کی پرسش ہرگز نہ رہے، نہیں کہی۔ زیادہ حد ادب۔

۱۸۵۹ء

—— (۶) ——

بندہ پرور،

مہربانی نامہ آیا، آنکھوں سے لگایا۔ فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے۔ پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ اشعار قتیل[1] و واقف[2] و شعراے ہندوستان کہ یہ اشعار سواے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۰) انگریزی پڑھ لی تھی۔ انگریزوں سے تعلقات اچھے تھے۔ سر ہنری لارنس نے انھیں صوبہ غرب و شمال میں اچھا عہدہ دے دیا تھا۔ غدر میں خدمات کی بنا پر بڑا گاؤں کی جاگیر ملی اور چھ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی۔ عاشور بیگ عباس بیگ کے بھائی تھے جو اپنے بیٹے احمد بیگ کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے ہاتھ سے مارے گئے، جیسا کہ خود میرزا غالب نے یوسف میرزا کے نام ایک خط میں لکھا ہے (دیکھیے خط ۷) ۵ یعنی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ۔

۱ قتیل، احداد کا وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور) قتیل کے والد پہلے باغپت پھر دہلی چلے گئے، قتیل کی پیدائش فرید آباد کی ہے جو دہلی کا ایک محلہ تھا۔ اصل نام دیوالی سنگھ تھا، میرزا محمد باقر شہید طہرانی (متوفی ۱۱۷۸/۱۷۶۵) سے پڑھا۔ اسلام قبول کر لیا۔ محمد حسن نام رکھا۔ ترکی اور عربی کے بھی ماہر تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے ہاں معزز منصب دار تھے ۲۳۔ ربیع الاول ۱۲۳۳/۳۱۔ جنوری ۱۸۱۸ کو لکھنؤ میں وفات پائی ۲ قاضی نور العین واقف بٹالوی بن قاضی امانت اللہ۔ حاکم لاہوری کے ساتھ حج کا قصد بھی کیا تھا، لیکن سورت پہنچ کر عوارض جسمانی کے باعث جہاز کا سفر نہ کر سکے اور سورت میں حاکم کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ کیمیا کا بھی شوق تھا۔ یہ ۱۱۷۶/۱۷۶۳ کا واقعہ ہے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے سید غلام علی آزاد کی کتاب "خزانہ عامرہ"۔ واقف بہاول پور کے (باقی صفحہ ۴۰۲ پر)

کیسے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی، نہ معنی نازک۔ ہاں الفاظ فرسودہ و عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں، وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے، تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔

"منکہ باشم"[۱] اس کی جو شرح چھاپے میں لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیجیے اور معنی میرے خاطر نشان کیجیے تو میں سلام کر دوں۔

پہلے نظر یہاں لڑنی چاہیے کہ "از اوجِ بیان انداختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے؟ اگر "عقل کل" کو "انداختہ" کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کدامیہ ٹھہراؤ گے تو بے شبہ "انداختہ" کے فاعل دو ٹھہریں گے، ایک "ناوک انداز ادب" اور ایک "مرغِ اوصاف تو"، ایک فعل اور دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے؟

اب فقیر سے اس کے معنی سنیے: "من" انداختہ کا مفعول، "را" مقدر، "منکہ" کا کاف توصیفی، ناوک انداز ادب، "ادب آموز" یعنی استاد، "مرغِ اوصاف تو" فاعل (یعنی) مجھ کو کہ عقل کل کا استاد ہوں، تیرے مرغ اوصاف نے اوج بیان سے گرا دیا۔ عقل کل تک، کہ وہ علویوں[۲] میں اعلیٰ ہے، اس کا ناوک پہنچ سکتا تھا، مگر مرغ اوصاف اس مقام پر ہے کہ جہاں اس ناوک انداز کو ناوک پہنچانے کی گنجائش نہیں۔ اوج بیان سے گرنا عاجز آنا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوج بیان سے گر گیا۔ اچھا مبالغہ ہے مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا خوب مضمون ہے اظہار عجز کا، باوجود دعوائے قدرت:

ایثار تو بر دوختہ چشم و دہن آز

اس کے تو معنی وہی ہیں جو چھاپے میں لکھے ہیں۔ مصرع ثانی کی شرح میں گمراہ ہو گیا:

احسان تو بشگافتہ ہر قطرۂ یم را

یعنی "احسان تو ہر قطرہ دریا بشگافت تا ہم لقید حساب نیاید"، یہ ہیچمداں اس بنی کے معنی نہیں سمجھا۔ سیدھی بات ہے مگر خیال میں جب آئے گی کہ اساتذہ کے مسلمات معلوم ہوں۔ کمال ایثار و عطا میں مروارید و یاقوت و بحر و معدن کی کم بختی آتی ہے۔ لعل و دُر کا معدوم ہو جانا اور بحر و کان کا خالی رہ جانا نئی نئی طرح سے باندھا ہے، چنانچہ میں نے کسی زمانے میں اسی زمین میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۱) دربار سے بھی وابستہ رہے۔ گیارھویں صدی کے اواخر یا بارھویں کے اوائل میں وفات پائی۔

[۱] عرفی کا شعر پہلے بھی نقل ہو چکا ہے۔ یہاں چونکہ اس کی شرح لکھی ہے، اس لیے دوبارہ نقل کیا جاتا ہے:

منکہ باشم عقلِ کل را ناوک انداز ادب

مرغِ اوصافِ تو از اوجِ بیاں انداختہ

[۲] بضم عین تیز بکسر عین و سکون لام، عالمِ بالا کی ہستیاں مثلاً فرشتے وغیرہ۔

قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والیِ ٹونک[1] کو بھیجا تھا، اس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں:

ناموس نگہ داشتی از جود بہ گیتی — جز پردگیانِ حرمِ معدن و یم را
وقت است کہ این قوم بہر کوچہ و بازار — پرسند ز ہم منشاء رسوائیِ ہم را

"پردگیان حرم معدن و یم" یعنی لعل و گوہر جو کثرت ایثار سے کوچہ و بازار میں خاک آلودہ پڑے ہوئے ہیں، وہ باہمہ گر دردمندانہ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ اس شخص نے سب کی حرمتیں رکھ لیں اور سب کی آبروئیں بچائیں۔ ہم کو اس قدر بے حرمت اور ذلیل کیوں رکھا ہے؟

قطرۂ دریا کا حساب کے واسطے چیرنا، بے حساب ہے۔ مقولہ عرفی کا یہ ہے کہ جتنے موتی دریا میں ہاتھ آئے وہ بخش دیے اور بخشش کا ذوق باقی رہا۔ چونکہ قطرہ میں بالقوہ استعداد موتی ہو جانے کی ہے، تو اس احتمال سے ہر قطرۂ دریا کو چیر ڈالا کہ اگر موتی ہاتھ آویں تو وہ سائلوں کو دیے جاویں۔ پہلے مصرع میں حرص کا سیر کر دینا موافق مسلماتِ شعر، ممتنع اور اس کا وقوع بین آنا اغراق۔ دوسرے مصرع میں بہ احتمالِ استعدادِ بالقوہ قطرے کو چیر ڈالنا اور پھر اس طرح کہ ہر قطرے کو، بہ اغراق سے گزر کر تبلیغ و غلو ہے۔

یہاں سے خطاب حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ مخدوم مکرم و مطاع معظم، قبلۂ دیدہ و دل کہ جو میرے اور اپنے ملنے کو از قسم فرض محال نہیں مانتے ہیں، خدا کرے ایسا ہی ہو، جیسا وہ جانتے ہیں۔ تقصیر معاف ہو اگر دنیا میں ظہور امر، بحسب مساعدتِ اسباب ہے، تو اس تمنا کا حصول مانند اعادۂ شباب[2] ہے۔ کوئی وجہ نہیں پاتا آپ کے یہاں تشریف لانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی میرے وہاں آنے کی۔ اگرچہ حیز امکان سے باہر نہیں، مگر وقوع میں تامل ہے۔ اب جو بھائی نبی بخش صاحب کو خط لکھوں گا تو آپ کا سلام ضرور لکھ دوں گا۔ آپ نے احباب البعاض کی خیر و عافیت عموماً لکھی، بالتخصیص حضرت شاہ عالم صاحب کا سلام نہ لکھا، کیا وہ وہاں نہیں ہیں؟ اور اگر اور کہیں ہیں تو ان کا حال مجھ کو لکھیے اور اگر وہاں ہیں تو میرا سلام ان کو کہیے۔

رباعی کے باب میں بیان مختصر یہ ہے کہ اس کا ایک وزن معین ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا سوائے عجم کے۔ یہ بحر ہزج میں سے نکالا ہے۔ "مفعول مفاعلن فعولن" ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور، اس وزن پر فعلن بڑھا دیا ہے۔ "مفعول مفاعلن فعولن فعلن" زحافات اس میں بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس ہیں اور وہ سب جائز اور روا ہیں اور اس بحر کا نام "بحر رباعی" ہے۔ رباعی سچ ہے کہ سوائے اس بحر کے اور بحر میں نہیں کہی جاتی اور یہ جو مطلع اور حسن مطلع کو رباعی کہتے ہیں، اس راہ سے ہے کہ مصرعے چار ہیں، کہو ورنہ رباعی نہیں ہے، نظم ہے۔ قدما کو بیشتر اس کا التزام تھا کہ ہر مصرع میں قافیہ رکھتے تھے۔ خاقانی بر عایت صنعت ذوقافیتین کہتا ہے:

---

[1] نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خاں بن امیر الدولہ محمد امیر خاں والیِ ٹونک ۱۸۳۴ء میں مسند نشین ہوئے اور ۱۸ جون ۱۸۶۴ء کو وفات پائی۔

[2] یعنی محال ہے، جیسے جوانی واپس نہیں آسکتی۔

من بودم و آں نگار روحانی روے — افگندہ دراں دو زلف چوگانی گوے
خلقے بدر ایستادہ خاقانی جوے — من در حرمِ وصال "سبحانی" گوے

میں پانچ سات برس سے بہرا ہو گیا ہوں۔ ایک رباعی چار قافیہ کی اس مضمون خاص کی میں نے لکھی ہے، بہ رعایت صنعت ذوقافیتین:

وارم دل شاد و دیدۂ بینا ے — وز کری گوشم نہ بود پروا ے
خوب است کہ نشنوم زبہر خود را ے — گلبانگ "انا ربکم الاعلا ے"

فقیر اس باب میں متعصب ہے، اور اس وزن کی دوبیتی[1] تین قافیہ والی کو رباعی نہ کہے گا۔

نثر عاری، نہ قافیہ، نہ وزن۔ نثر مسجع، قافیہ موجود، وزن مفقود، مگر اس میں ترجیع کی رعایت ضرور ہے یعنی فقرتین کے الفاظ مماثل اور ملائم ہمد گر ہوں اور یہ بات نہ ہوگی اور صرف قافیہ ہوگا تو اس کو مقفّٰی کہیں گے، نہ مسجع۔

نثر مرجز وہ ہے کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو۔ جب آپ لالہ قتیل کے گھڑے ہوئے فقرے دیکھ چکے ہیں تو مجھ کو فقرہ تراشی کی تکلیف کیوں دیتے ہیں؛ زمانۂ گزشتہ میں بھائی ضیاالدین خاں صاحب نیّر تخلص ایک مختصر سا دیوان حضرت نظامی کا مجھ کو دکھلانے لائے تھے۔ اس میں نثر مرجز تھی۔ میں اس دن نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و شیفتہ کو خط لکھا چاہتا تھا۔ اسی وضع پر خط لکھا اور وہ خط پنج آہنگ میں ہے۔ مگر میں نے اس طرز میں بہ مقتضاے شوخی طبع یہ بات کی ہے کہ ایک جگہ جو فقرے مقفّٰی ہو گئے ہیں اور وہ لفظ مجھ کو پسند آئے ہیں۔ میں نے اُن کو یوں ہی رہنے دیا ہے۔ اس کو دستور میں تصوّر نہ کیجیے گا۔ وہ رقعہ یہ ہے:

ہاں، خواجۂ بے پروا، من بندہ کہ غمناکم وز غصہ جگر چاکم، خواہم سخنے گفتن۔ آں روز کہ مے رفتند، آں نامہ فرستادند، کز دیدن آں خوں شد، دل تا جگر از اندوہ۔ گفتم چکنم غالب، چوں کار دگرگوں شد۔ می بایدم اینک رفت تا عذر سخن خواہم، چوں گرد و غبارے بود، رفتن نتوانستم۔ آں روز لبشام آمد، لا بلکہ سیہ تر شد۔ سرماندہ بہ بالین بر، چوں غم زدگان خفتم۔ ہے ہے چہ تواند خفت، آں خستہ کہ غمخوارش، بر زخم نمک ریزد، وز دیدۂ بیدارش، شوراب رواں باشد۔ چوں از افق شرقی، خورشید درخشندہ، ناگاہ سرے برزد، آتش بجہاں درزد، مرغ سحری پرزد۔ رفتم بجگر کاوی، واں راز نہانی را، از دل بہ زباں دادم، در صورت تنہائی، بے پردہ چو ہمرازاں۔ نے آمد و ہمدم شد[2]، چندانکہ دم اندر نے از مہر دمیدم من، چوں من بنوا آمد، زاں نالہ کہ برلب بود، از باطن نے سرزد۔ آں دم کہ نفس با نے، زینگونہ کشاکش کرد، یک کاغذ نوشتنہ، بود است بدستم در۔ چوں نالہ نمودے داشت، زاں شعلہ کہ دودے داشت، بر صفحہ نشانہا ماند۔ گفتم مگر ایں صفحہ، غمنامۂ رازستے، فہرست نیازستے۔ باید کہ فرو پیچم، وانگہ بہ نشانمندی، زی خواجہ رواں سازم۔ کوتاہ کنم گفتن، آں نامہ کہ من گفتم۔ حجاب دردالا، بردند و رواں کردند۔ ہرچند در اندیشہ پیداست کہ خوش باشد، باخواجگی استغنا، با اینہمہ خوش نبود، پوزش نہ پذیرفتن۔ امروز سحرگاہاں، روشن گہر آں نیّر، کش روح رواں دانم، بل خوشتر ازاں دانم، دیوان نظامی را، آور دلبسوے من، زینگونہ نواہا بود، در پردۂ گفتارش، کز ذوق بہنجارش، ایں

---

[1] دوسرا یعنی بجز رباعی کے۔ [2] یہاں نے سے مراد حُقّہ ہے۔

زمزمہ سر کردم۔ والا گہر اکبر خاں، خوانند سلام از من"۔

(۷)

جناب چودھری صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں اور شکر احسان بجالاتا ہوں۔ "حاشا" اور "حاش للہ" کے جواب کو حوالہ ان سطور پر رکھتا ہوں کہ جواب جناب حضرت صاحب کے ارشاد کے جواب میں لکھوں گا۔ آپ کو اتنا لکھنا اور کافی ہے کہ اپنے عم والاقدر جناب چودھری غلام رسول صاحب کو فقیر کا سلام نیاز پہنچائیے اور جناب شیخ عطا حسین صاحب عطاؔ کو بھی سلام کہیے۔

اب خطاب جناب حضرت عالم صاحب کی طرف ہے۔ پیر و مرشد قلم کا کام زبان سے لینا یعنی تحریر کے مطالب کو پڑھنا اور پڑھا دینا آسان ہے اور زبان کا کام قلم سے لینا دشوار ہے، یعنی جو کچھ کہا چاہیے اس کو کیوں کر لکھا چاہیے۔ وہ بات کہاں کہ کچھ میں نے عرض کیا، کچھ آپ نے فرمایا، دو چار باتوں میں جھگڑے نے انجام پایا۔ خیر دولت ہم زبانی کہاں میسر؟

آپ کا حکم بجالانے کو اپنا شرف جانتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ نظامی اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوالی سنگھ متخلص بہ قتیلؔ، جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے، اس کی تصدیق نہ کرے، تب تک اس کا کلام قابل استناد نہ ہو؟ قتیلؔ اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر ساد کشمیری یا کابلی و قندھاری و بکرانی۔ احیاناً کوئی عامہ اہل ایران میں سے ہوگا۔ مانا کہ عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔

تقریر اور ہے، تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط سے اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید سے، یہ سب نثریں کیوں خونِ جگر کھایا کرتے؛ وہ سب اسی طرح کی نثریں جو لالہ دیوالی سنگھ قتیلؔ متوفی نے بتقلید اہلِ ایران لکھی ہیں، نہ رقم فرمایا کرتے؟

یہ شخص مدعی ہے کہ "کدہ" کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس آرزوکدہ اور دیوکدہ اور نشترکدہ اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہل زبان کے کلام میں آیا ہے، وہ نادرست ہے[۱]۔ میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں عرض کروں اس پر حضرت غور فرمائیں، تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے۔

آمدم برسرِ مدعا۔ نثر "مرجّز" اس کو کہتے ہیں کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو، مقابل مقفّی[۲] کے کہ قافیہ ہو اور وزن نہ ہو اور یہاں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وزن میں قیدِ منظور نہیں۔ مثلاً حضرت نظامی علیہ الرحمۃ کی نثر کا وزن یہ ہے؛ مفعول مفاعیلن، مفعول مفاعیلن۔

---

[۱] مولانا شبلی مرحوم نے ایرانی شاعری کے آخری دور کی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اس زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں۔ مثلاً پہلے میکدہ، آتش کدہ وغیرہ مستعمل تھے۔ اب نشتر کدہ، مرہم کدہ وغیرہ ترکیبیں پیدا ہوئیں..... الخ (شعر العجم جلد سوم ص ۲۵)

یہ فغانی سے کلیم ہمدانی کے دور کی کیفیت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قتیلؔ کا دعویٰ وہی تھا جو پیش ہوا تو سراسر بے اصل تھا۔

حضرت ظہوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

رائتیش سروبن گلشن فتح، خنجرش ماہی دریائے ظفر،

یہ نثر مرجز ہے، وزن اس کا " فعلاتن فعلاتن فعلن"۔ کاتبوں نے مقفّٰی کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور وہ تصرف کیا ہے کہ نثر نہ مرجز رہی، نہ مقفّٰی۔ چنانچہ اساتذہ فن: لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا۔ اس آیت سراسر ہدایت اثر کو نثر مرجز کہتے ہیں اور اس کا وزن یہ ہے " فاعلاتن فاعلاتن فاعلن"۔ " ویرزق من حیث لا یحتسب" اس کا وزن " فعولن فعولن فعول"۔ بندہ کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے، " مقفّٰی": قافیہ ہے اور وزن نہیں، " مرجز": وزن ہے اور قافیہ نہیں، " عاری" نہ وزن ہے، نہ قافیہ۔ " مسجّع": وہی نثر مقفّٰی " ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہم دگر ہوں۔ نظم میں یہ صنعت آپڑے تو اس کو " مرصّع " کہتے ہیں اور نثر اس صنعت پر مشتمل ہو تو اس کو " مسجّع" کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کو نہ عبدالرزاق[1] بدل سکتا ہے، نہ صاحبِ قلزم[2] ہفتگانہ، نہ یہ قطرۂ بے سروپا۔

" حاشا" و " حاش للہ" کلام اہل عرب میں اسی طرح ہے، جس طرح آپ فرماتے ہیں، مگر پارسیوں نے ازراہِ تصرف بہ معنی " زنہار" قرار دیا ہے یعنی تاکید۔ اگر منفی پر آئے تو نفی کی تاکید اور مثبت پر آئے تو اثبات کی تاکید۔

میں کسی کلمہ کا استعمال نہیں کرتا، جب تک اہل زبان کے کلام میں نہیں دیکھتا۔ عیشیؔ بے چارہ اس کے لائق نہیں کہ مستند علیہ بنے، مگر یہ لفظ غلط نہیں لکھا اس غریب نے۔

حضرت قبلہ، فارسیوں کے تصرفات اگر دیکھیے تو حیران رہ جایئے۔ مجھ کو اس وقت کہاں یاد ہے اور کتاب کیا نام کوئی ورق بھی لکھا ہوا میرے پاس نہیں۔ حاشا کا کوئی شعر موکد نفی اگر یاد آجائے گا تو آپ کو لکھا جائے گا:

ہرزہ مشتاب و پے جادہ شناساں بردار

اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

یہ مثنوی[3] جس میں یہ مصرع ہے:

" حاش" للہ کہ بد نمی گویم

کلکتہ میں میں نے لکھی تھی۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراض مجھ پر کیے تھے، ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ " ہمہ عالم" غلط ہے، یعنی " ہمہ " کا لفظ " عالم " کے لفظ کے ساتھ ربط نہیں پا سکتا۔ قتیلؔ کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حافظ کہتا ہے:

" ہمہ عالم" گواہ عصمت اوست

سعدی کہتا ہے:

عاشقم " بر ہمہ عالم"، کہ " ہمہ عالم" ازوست

---

[1] عبدالرزاق مولف مقدمات سہ نثر ظہوری اور صاحب قلزم قبول محمد لغت نگار جو غازی الدین حیدر کے نام سے لکھی گئی۔

[2] قطرۂ بے سروپا، صاحب قلزم ہفت گانہ (یعنی ہفت قلزم) کی رعایت سے کہا اور خوب کہا۔ [3] مثنوی باد مخالف

غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی[1] اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے۔ اب ایک نسخہ ہے "ابطال ضرورت" اگرچہ صاحب اس کا ہندی ہے، بلکہ ہندو ہے مگر قابل اچھا ہے۔ دیکھیے اساتذہ کیا کیا تصرفات نمایاں کر گئے ہیں۔

میں نے آج تک اردو میں "انتظاری" بمعنی "انتظار" نہ آپ لکھا ہے، نہ اپنے شاگردوں کو لکھنے دیا۔ اساتذہ مسلم الثبوت کے ہاں فارسی موجود ہے۔ "حاشا" ایسا نہیں کہ ان میں فارسی والوں کو تامل ہو۔ زیادہ حد ادب۔

۱۸۵۹ء

(۸)

جناب چودھری صاحب،

آپ کو بعد ابلاغ سلام آپ کے خط کے پہنچنے سے آگہی دیتا ہوں اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے چچا صاحب کے خط کا جواب اس سے آگے بھیج چکا ہوں۔ میں نہیں آسکا۔

یہاں پنسن کا مقدمہ درپیش ہے۔ کبھی صاحب بہادر کمشنر بہادر کے پاس، کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے۔ خود نہ جاؤں تو خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کس وقت کوئی پرسش آجائے۔ بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم[2] جسم اور مفرح روح تھا، مسدود ہے۔ کیا کھاؤں اور کیوں کر جیوں؟ للہ الحمد کہ گنہگار نہیں ٹھہرا۔ پنسن پاؤں گا، مگر وہ پنسن گورنمنٹ کے پولٹیکل سررشتے سے مقرر کی ہوئی ہے، سو دہلی کا اجنٹی دفتر فرد فرد لٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔ اُس دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزت کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں، کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں۔ یہ بھی نکل جائیں گے،

کارہا آساں شود اما بہ صبر

یہاں سے روئے سخن صاحب عالم صاحب کی طرف ہے۔ جناب رفعت مآب مولائی و مرشدی تسلیم قبول کریں۔ اور اس تحریر سے، جو اب میرے پاس بھیجی ہے، مجھ کو شاداں اور اپنے بخت اور قسمت پر نازاں تصور فرمائیں۔ سب سمجھا اور سب مطالب کا جواب لکھتا ہوں۔ پہلے اپنا ایک شعر کمال گستاخی کو کار فرما کر لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر میں نے کیوں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے:

مرا بغیر ز یک جنس در شمار آورد
فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش

---

[1] کلکتہ میں شاہ اودھ کی طرف سے سفیر تھے، سید علی بلگرامی (شمس العلما) اور سید حسین بلگرامی (عماد الملک) انھیں کے پوتے تھے۔ [2] مقوم۔ قائم رکھنے والا۔

بہ ہر حال حضرت کو یہ معلوم ہے کہ میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما اور متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔ جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو، ان کا حال کیا گزارش کروں۔

ایک ان میں صاحب "برہان قاطع"[1] ہے۔ اب ان دنوں "برہان قاطع" دیکھ رہا ہوں اور اس کے فہم کی غلطیاں دیکھ رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے اس نسخہ کا نام "قاطع برہان" رکھوں گا:

کجا بود منزل کجا تاختم

شعر فردوسی میں "انگبین و شہد" اور شعر استاد میں "حرص و آز" واقعی بادی النظر میں زاید معلوم ہوتا ہے "شیر ناب" بہتر ہے، لیکن "حرص و آز" کو کیا کیجیے گا؟ میں عرض کرتا ہوں کہ وہاں بھی "خشم و آز" ہے، ہرگز "حرص و آز" نہیں ہے۔ حکما اور صوفیہ قوت غضبی اور قوت شہوی کی تعدیل میں مختتیں کرتے ہیں۔ قوت غضبی کی اصلاح سے فضیلت شجاعت اور قوت شہوی کی اصلاح سے فضیلت عفت حاصل ہے۔ اور یہ مسئلہ علم اخلاق میں مبرہن ہے۔ دو بندۂ من حرص و آز بے معنی محض۔ استاد کو بدنام کیا۔ ایک اسم سے دو مسمیٰ تراشے۔ واحد حقیقی کا تثنیہ اس سے علاوہ۔ مرد عارف حکیم نے قوت شہوی کی اصلاح کا ذکر کیا اور قوت غضبی کا مذکور بھی نہ کیا۔ میں نے خود خشم و آز دیکھا ہے اور یہی بجا ہے۔ "شہد" کی جگہ "شیر" اور "حرص" کی جگہ "خشم" درست۔ میری رائے آپ کی رائے کے مطابق، مگر گوگرد سرخ اور پیل سفید میں ساکت ہوں۔ یہ تقریر کہ گوگرد سُرخ کمیاب اور پیل سفید نایاب ہے، میرے دل نشین نہ ہوئی۔ کبریت احمر اور کیمیا اور عنقا ان سب کا ایک حکم ہے۔ نظر اس قاعدے پر لعل سفید بہتر ہے اور کبریت احمر اور پیل سفید بے جوڑ ہے، جیسے امیر خسرو کی انملیاں۔

ایک قاعدہ اور عرض کرتا ہوں "کم" کا لفظ اہل فارسی کے منطق میں کہیں افادۂ معنی سلب کلی بھی کرتا ہے، جیسے "کم آزار" یعنی "بیازار ندہ" نہ یہ کہ "کم آزار ندہ"، "کم ہمتا" یعنی "بے ہمتا" بلکہ "اندک" کا لفظ بھی اس طرح آتا ہے جیسا کہ میرا خداوند نعمت نظامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتا ہے:

پس و پیش چوں آفتابم یکے ست
فروغم فراواں فریب اندکے ست

یعنی فریب بالکل نہیں، نہ یہ کہ کچھ ہے۔ کمیاب اور نایاب ایک چیز ہے۔ نظامی نے "لعل سپید" کہا ہے۔ کسی صاحب طبع نے اس کو غلط سمجھ کر "پیل سپید" بنا دیا ہے۔ "انگبین" و "شہد ناب" شاید مثل غم و اندوہ و مسرت و فرحت ہو یا نہ ہو شیر ناب ہی ہو، بلکہ شیر ناب بہتر ہے، لیکن حرص و آز تو کسی طرح درست نہیں۔ عارف کا دعویٰ ناقص اور لغو رہا جاتا ہے۔ اگر یہ قباحت لازم نہ آتی تو بھی ہم حرص و آز کو مسلم نہ رکھتے، کس واسطے کہ غلام کا شبہ بکمال وضوح غم و اندوہ و عدل و داد کا نظیر

---

[1] محمد حسین تبریزی ثم دکنی متوفی ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء۔

نہیں ہو سکتا۔ ہاں انگبین و شہد کے جواز میں ہم مضائقہ نہ کریں گے، مگر شیر ناب کو اُس سے اچھا سمجھیں گے۔ شہد میوے کی حلاوت کے واسطے اور شیر افزایش لطافت کے واسطے[1]۔ "حاشا" و "حاش للہ" کا جواب آغاز تحریر میں لکھ چکا۔ آپ کی اس نظیر لکھنے سے اس کے جواز پر میرا یقین نہ بڑھا۔ لو کشف الغطاء لما ازددت یقینا۔

نثر مرجز کے باب میں پیر و مرشد کو اتنا تامل کیوں ہے؟ یہ جو نثریں آپ نے لکھی ہیں سوائے اس نثر کے کہ جس کو آگے لکھوں گا، یہ تو سب "مسجع" ہیں۔ یعنی پہلے فقرے کا ہر لفظ وزن میں موافق ہے دوسرے فقرے کے لفظ سے۔ نظم میں یہ صنعت آپڑے تو نظم کو "مرصع" کہیں گے اور نثر میں واقع ہو تو نثر کو "مسجع" کہیں گے۔ جو حضرت کہ اس نثر کو "مرجز" کہتے ہیں، وہ نثر "مسجع" کی مثال ہم کو دیں۔ زنہار زنہار یہ نثر "مرجز" نہیں، "مسجع" ہے، ہاں یہ نثر مرجز ہے۔

"صاحبا مشفقا شفیق ولی، زبدالطافکم الی الابد، بعد تبلیغ بندگی و نیاز، بر ضمیر منیر روشن باد۔"

اگر وہ نثر کہ جس کو میں نے "مسجع" کہا ہے، "مرجز" ہے تو اس کمبخت نثر کا کیا نام ہے؟ نہیں وہ "مسجع" ہے اور یہ "مرجز" ہے۔ میں تو بہت مختصر و مفید لکھ چکا ہوں، آپ نہ مانیں تو کیا کروں؟ وزن نہ ہو قافیہ ہو، وہ "مقفّٰی" وزن ہو قافیہ نہ ہو، وہ "مرجز" ہے۔ الفاظ و فقرتین وزن میں برابر ہوں، وہ "مسجع"۔ اس صنعت کو بیشتر نثر "مقفّٰی" میں صرف کرتے ہیں اور چاہو قافیہ کا التزام نہ کرو۔ بہ ہر رنگ اقسام ثلاثہ نثر یہی ہے۔ حضرت نے نثر مسجع کو مرجز کہا ہے۔ جواب وہی ہے کہ اگر مرجز یہ ہے تو مسجع کس نثر کو کہتے ہیں؟ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم، نہ یارائے کلام۔

قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے؟

بعد اتمام خط کی تحریر کے، خیال آیا کہ شاید کسی بات کا جواب رہ نہ گیا ہو۔ میں نے آپ کے خط کو دیکھا اور ایک بات "دستور تسگرف" کی عبارت میں نظر آئی۔

"مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد، سجع ندارد۔"

اس تعریف کو دیکھیے اور نمونہ نثر کو دیکھیے، وہ موزوں کہاں ہے جو "وزن دارد" اُس پر صادق آئے؟ وزن بمعنی تقطیع شعر مفقود۔ "سجع ندارد"، خدا جانے یہ بزرگ سجع کس کو کہتا ہے؟ سجع ہم وزن ہونا دو لفظوں کا فقرتین میں یا مصرعین میں، سو اس نثر میں موجود ہے۔ موجود کو مفقود اور مفقود کو موجود لکھا ہے اور پھر کلام اس کا مقبول ہے۔!

اللہ اللہ ملا غیاث الدین لکھتا ہے:

"مرجز نثرے باشد کہ کلمات فقرتین اکثر جا ہا ہم وزن باشد، در تقابل یک دیگر، بدون رعایت سجع۔"

---

[1] شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں میرزا غالب کے متعلق لکھا ہے: مضامین شعری را کما ہو حقہ مے فہمد و بہ جمیع نکات و لطائف پے مے برد و ایں فضیلتے است کہ مخصوص بعض اہل سخن است" اس فضیلت کی سیکڑوں مثالوں میں سے ایک مثال یہ بھی ہے کہ ہر لفظ کے استعمال کی حقیقت و حیثیت پر گہری نظر ہے۔

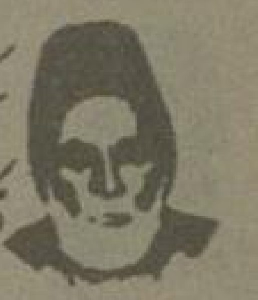
خدا کے واسطے سجع تو اسی کو کہتے ہیں کہ کلمات فقرتین یا مصرعین ہم وزن یک دیگر ہوں، سو اس نثر میں موجود "بدون رعایت سجع" کے کیا معنی؟ مگر یہ دونوں صاحب وزن کو برابر ہونا کلمات کا سمجھتے ہیں اور سجع تقطیع شعر کو کہتے ہیں۔ اس عقیدے کی رکاکت اظہر من الشمس ہے۔ صاحب "دستور شگرف" کا کلام نص اور مولوی غیاث الدین کا کلام حدیث نہیں ہے۔ آپ بھی غور فرمائیے اور انصاف کیجیے۔

فروری ۱۸۵۹ء

(۹)

شفیق مکرم مظہر لطف و کرم، جناب چودھری صاحب کی خدمت میں بعد سلام یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کا مہربانی نامہ آیا، میرا رنج و تشویش مٹایا۔ میری خدمت مقبول ہوئی۔ میر امداد علی شاہ کو میری دعا کہنا۔ ان کا باپ میرا بڑا یار تھا۔ میری طرف سے خاطر جمع کر دیجیے گا۔ اب سبیل اچھی نکل آئی، چودھری صاحب کے ذریعہ سے جو کچھ مجھ کو بھیجنا ہوگا، بھجوا دوں گا۔

جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ محمد باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا، مسمّٰی بہ "دہلی اردو اخبار"۔ بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے[1] کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوقؔ کے دو سکے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوقؔ نے اس مہینے کے بعد سکے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے کہ اگر متبلّ کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس پر علم ہو تو وہاں سے منگوا بھیجیے۔ والسلام مع الاکرام۔



۱۸۵۹ء

(۱۰)

شفیق میرے، عنایت فرما میرے،

تمہاری مہربانی کا شکر بجا لاتا ہوں۔ نہایت سعی یہ تھی کہ آپ کی طرف سے ظہور میں آئی۔ میں نے مہتمم مطبع "جام جہاں نما" کو لکھ بھیجا ہے اور ترک سعی کیا ہے۔ آپ بھی فکر نہ کیجیے۔ اگر کہیں سے آپ کے پاس آ جائے تو مجھ کو بھیج دیجیے۔ میرے پاس آئے گا تو میں تم کو اطلاع دے دوں گا۔

عنایت الٰہی کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا؟ اس کی پرسش زائد۔ میں خدمت گزاری کو حاضر ہوں، وہ جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں۔ میرا سلام اور یہ پیام کہہ دیجیے گا۔

---

[1] آگے سے مراد ہے بعد کے۔

صاحب، تم نے ہمارے پیرو مرشد کو ہم پر خفا کر دیا ہے۔ بھلا وہ خط نہ لکھیں، نہ لکھیں، کبھی تم کو فرمادیں کہ غالب کو میری دعا لکھ بھیجنا۔ بہرحال میرا سلام نیاز عرض کیجیے اور ان کے مزاج مبارک کی خیر و عافیت لکھیے اور یہ لکھیے کہ اگر خدانخواستہ وہ مجھ سے ناخوش ہیں تو ناخوشی کی وجہ کیا ہے؟ اپنے چچا صاحب کی خدمت میں سلام پہنچائیے گا اور مولانا عطا کو سلام شوق کہیے گا۔

سنہ ۱۸۵۹ء

(۱۱)

میرے مشفق کو میرا سلام پہنچے۔ دونوں مخمس بعد اصلاح پہنچتے ہیں، منشأ اصلاح سمجھ لیجیے؛ "سیّد عالی نسب سرور والاحسبی"، یہ افتتاح کلام اور ابتدائے خطاب کے درخور نہ تھا۔ مصرعۂ ثالث اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔ دوسرے بند کی تخمیس دو طرح پر ہے۔ دونوں بے عیب ہیں اور مزید لطف کسی میں نہیں۔ جن مصرعوں کو چاہو رہنے دو۔

"گزشت از افلاک" و "زافلاک گزشت" ایک فارسی رہا اور دوسرا ہندی، حضرت نے دونوں فارسی لکھے تھے۔

ندامت فعل پر مترتب ہُوا کرتی ہے، ترجمہ اس کا پشیمانی۔ حضرت یوسف کو ندامت کیوں ہو؟ مگر خجالت، اس کا ترجمہ ہے شرمندگی۔ آپ غور کیجیے کہ ندامت اور خجالت میں کتنا فرق ہے۔ جہاں آپ نے عرق ریز ندامت لکھا، وہ محل خجالت کا تھا۔ آپ نے ندامت کیوں لکھا؟ بہرحال وہ مصرع تو بدل گیا لیکن اطلاع ضرور تھی۔

"طرح"، بفتح اوّل و سکون ثانی بمعنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسائش دنیا بھی مجاز ہے۔ مرادف طرز و روش بھی ہے، بفتحتین۔ اس کا تفرقہ منظور رہا کرے۔ نسیم تخلص اچھا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نسیم مؤنث ہے، جواب اس کا یہ ہے کہ جرأت اور وحشت اور ایسے بہت تخلص ہیں کہ وہ مونث ہیں۔ با اینہمہ اگر بدلا چاہیے تو اس کا ہم وزن سلام و سلیم اور خیال بھی ہے۔ اس میں سے جو پسند آئے۔

آپ کے عم عالی مقدار اور آپ کے بزرگ آموزگار کو میرا سلام پہنچے۔

یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی طرف ہے۔ پیر و مرشد کی خدمت میں سلام اور مرشد زادوں کی جناب میں دعائے طول عمر و دعائے دولت پہنچا کر یہ عرض کرتا ہوں کہ واقعی حضرت شاہ عالم کا عنایت نامہ آیا تھا اور میں اس کا جواب بھیج چکا ہوں۔ عجب ہے کہ حضرت کی تحریر میں جہاں اُن کے خط کا ذکر تھا، وہاں میرے خط کا مذکور نہ تھا اور ان سطور کی تحریر کے بعد اپنے خط کا پہنچنا گمان نہیں کر سکتا۔ میں اس میں ان کو یہاں کا حال لکھ چکا ہوں۔

"پنج آہنگ" آپ نے لی، دیوان فارسی آپ کے پاس ہے، مگر یُوں سمجھیے کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور اب کہیں سے اس کا اتمام ممکن نہیں۔ خیر جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ "دستنبو" میں نے نذر کی ہے۔ "مہر نیم روز" معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ جو "دستنبو" میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی، اس نظم کے سوا اگر کچھ کہا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے۔ قطعہ:

بہ آدم زن بہ شیطاں طوقِ لعنت　　سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم　　گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

رباعی:

دنیا ہیچ است و شادی و غم ہیچ است　　ہنگامۂ شور و بزمِ ماتم ہیچ است
رو دل بہ یکے دہ کہ دو عالم ہیچ است　　ایں نیز فرو گزار کایں ہم ہیچ است

اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "برہان قاطع" میرے پاس تھی، اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادرہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا، مسودہ کاتب سے صاف کروا لیا ہے۔ اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیج دوں۔ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں، وہ اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس بھیج جائے۔

۱۸۵۹ء

―(۱۲)―

جناب عالی "چھا چھا" ترجمۂ ہندی ہے۔ ایک بار "چھا" کفایت کرتا ہے۔ "انواع انواع" ہماری آپ کی بول چال میں ہے، لیکن تحریر میں درست نہیں۔ "چمن پُر فضا" کو "چمن پر فزا" زائے ہوز سے کیوں لکھا؟ خطاب واحد غائب فقط "شین" ہے نہ "اش"۔ ہاں اگر آخر لفظ مبنی با ئے اضافی حرکت پر ہو، مثل غمزہ و چشمہ و خانہ و دانہ تو اس کو یوں لکھتے ہیں: "چشم اش" "غمزہ اش" "خانہ اش" "دانہ اش" اور باقی اور سب کا حرف آخر شین سے مل جاتا ہے۔ خطاب واحد حاضر، خطاب واحد غائب، خطاب متکلم، ت، ش، م ہے۔ الف کو یہاں کیا دخل؟ اور وہ جو دکھنی بوہرہ یعنی جامع "برہان قاطع" ات، اش، ام لکھتا ہے، غلط کرتا ہے۔ جہاں تم نے بعد اپنے نام کے یہ اشعار لکھے ہیں:

پریشان تر ز زلفِ خویشم داستانے است

وہاں ربط کلام جاتا رہا تھا۔ ایک جملہ فاضل کر دیا ہے۔ یعنی بدیں اشعار زمزمہ سرا است یہ خبر اس کاف توصیفی کی ہے اور آگے جو نثر ہے اُس کا فاعل وہی مصنف ہے۔

پیر و مرشد، صاحب عالم صاحب کی خدمت عالی میں میرا اسلام مسنون عرض کیجیے گا اور یہ عرض کیجیے گا کہ آپ کے منشور عطوفت کا جواب بانفراد آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

―(۱۳)―

میرے شفیق دلی کو میرا اسلام پہنچے۔ کل انشا کا پارسل پہنچا اور آج خط۔ انشا کا نام بہارستان اور آپ کا تخلص سرور اچھا نام ہے۔ قطعہ کا وعدہ نہیں کرتا، کس واسطے کہ اگر بے وعدہ پہنچ جائے گا تو لطف زیادہ دے گا اور نہ پہنچے گا تو محل شکایت نہ ہوگا۔

رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلّم، یہاں کوئی طرح آسایش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے۔ یہ داغ اُن کی پیشانی

سے مٹ نہیں سکتا۔ میں اموات میں ہوں، مُردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے انوریؔ گویا میری زبان سے کہتا ہے۔

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے، اشرفیاں نہیں اور خلعت، ریاست دو دمانی کا سات پارچہ اور زمین رقم جیغہ وسرپیچ و مالائے مروارید، مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں۔ دربار میں بلائے جانے کی توقع نہیں، پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعت شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے، ذوق چاہیے، امنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں، جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں! رعایت فن، اس کے اسباب کہاں؟ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۱۴)

میرے شفیق دلی چودھری عبدالغفور صاحب کو خدا سلامت رکھے۔ دیکھو میرے حواس کا اب یہ عالم ہے کہ تمھارے نام کی جگہ تمھارے چچا صاحب کا نام لکھا تھا۔ اسی طرح سابق کے خط میں سرنامے پر یہ لکھ گیا ہوں گا:

بہار پیشہ سوائے کہ غالبش نامند
گنوں بہ بیں کہ چہ خوں مے چکد ز ہر نفسش

جو خط آپ کے خطوط کے جواب میں آئے، ان کے بھیجنے کی کیا حاجت تھی؟[1] آپ کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دلنشین اور خاطرنشان ہے، جیسا کہ کوئی استاد کہتا ہے:

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

وہ اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا اور نہ آئے گا۔ میں اپنے خدا سے امیدوار ہوں کہ میرا کام بغیر اس کے نکل جائے گا۔ بندہ پرور، میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہُوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لُٹ گئے، جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہُوئے۔ میں خود اس مثنوی کے واسطے خون در جگر ہُوں۔ ہائے کیا چیز تھی۔ پارسل میں خطوط بھیجنے محلِ اندیشہ ہے، خدا نے بچایا۔ چونکہ اب وُہ خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھا، از راہِ احتیاط پارسل میں سے نکال لیے۔

---

[1] اس سے واضح ہے کہ غالب کی فرمایش کے مطابق سرورؔ نے "اردو اخبار" دہلی کے اس نمبر کے لیے جگہ جگہ سعی کی تھی۔ سرورؔ کو اخبار نہ مل سکا اور غالب کو اپنی سعی کا پورا یقین دلانے کے لیے اس نے وہ تمام خطوط بھیج دیے تھے جو طلب اخبار کے جواب میں اسے موصول ہُوئے تھے۔

(۱۵)

جناب عالی،

آپ کا نفقد نامہ مرقومہ یازدہم شعبان (۱۲۷۶ھ) مطابق پنجم مارچ (۱۸۶۰ء) بقید روز دوشنبہ پہنچا۔ پہلے تو ان تاریخوں کے حساب سے تطابق میں مَیں اُلجھا۔ پھر خط کے پہنچنے سے بہت خوش ہُوا۔ ڈاک کیا ہے، خاک ہے۔ خیر ادھر پڑھا ادھر جواب لکھا۔ خدا کرے یہ میرا خط جلد پہنچے، ورنہ یہ آپ کو خیال ہوگا کہ غالب نے ہمارے خط کا جواب نہ لکھا۔

حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہوگئی ہے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخۂ "دستنبو" بسبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت، و قبول صدق ارادت و مودت بسبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا، اس کی رسید آگئی۔ وہی "خان صاحب بسیار مہربان دوستاں" القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بہ توسط کمشنر بہادر مجھ کو آگیا۔ پنسن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔ جب ملے گی حضرت کو اطلاع دی جائے گی۔

پیر و مرشد عالم ہیں اور میں جاہل ہُوں۔ ان کے تسلیم نہ کرنے کو میں نے تسلیم نہ کیا اور پھر تسلیم بجالایا۔ اے حضرت جناب مخدوم مکرم چودھری غلام رسول صاحب کی خدمت میں انھیں الفاظ میں رسم مبارکباد ادا کی گئی تھی، نہ عبارت آرائی، نہ طبع آزمائی، کچھ عجب نہیں کہ وہ خط بھی مئی اور جوُن میں آپ کو پہنچ جائے۔ آپ کا بھی تو مارچ کا خط مجھ کو اب آخر اپریل میں پہنچا ہے۔

جناب شیخ صاحب، کیوں مجھ کو محجوب کرتے ہیں؟ اس باب میں اس سے زیادہ عرض نہیں کرسکتا کہ افادہ مشترک ہے۔ قصیدہ و مثنوی بھیج دیجیے، لطف اُٹھاؤں گا اور جو کچھ میرے خیال میں آئے گا، بے تکلف عرض کردوں گا۔ میرا سلام کہیے اور مثنوی اور قصیدہ ان سے لے کر جلد بھیج دیجیے۔

اپنے عم عالی مقدار کی خدمت میں میرا سلام پہنچائیے اور کہیے کہ حضرت خلاصہ مکتوب سابق یہ ہے: الفاظ یہی تھے، شاید کچھ تغیر بالمرادف[1] ہو، تو ہو۔ "یہ شادی بصد ہزار مسرت آپ کو مبارک ہو اور ان کی اولاد دیکھنی اور اسی طرح ان کی شادی کرنی نصیب ہو۔" فیض علی خاں صاحب کو میرا سلام پہنچے۔ میں بھی آپ کی ملاقات کا مشتاق اور آپ کا مداح رہوں گا خط کا لفافہ اس خط میں ملفوف کرکے بھیجتا ہُوں۔ یہ آج پہنچا اور آج ہی میں نے اس کا جواب لکھا۔ کاتب وہی ہے جو لفافہ ملفوفہ کا مکتوب الیہ ہے۔

(اپریل ۱۸۶۰ء)

---

[1] مراد یہ ہے کہ یا تو یہی الفاظ تھے یا ان کے ہم معنی الفاظ ہوں گے۔

(۱۶)

میرے مشفق، چودھری عبدالغفور صاحب اپنے خط اور قصیدہ بھیجنے کا مجھ کو شکرگزار اور قصیدۂ سابق کی اب تک اصلاح نہ پانے سے شرمسار تصور فرمائیں اور ان دونوں قصیدوں کے باہم پہنچنے کا انتظار کریں۔

نوید وصلِ و بیم مے دہد ستارہ شناس
نکردہ ژرف نگاہی مگر در اختر من

تحقیق کر اب روئے سخن جناب فیض نصاب، جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کے فروزندہ شمع، مستغرق مشاہدہ شاہد ذات، حضرت صاحب، عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے اور یہ شعر افتتاح کلام ہے[1]۔

پہلے کچھ باتیں، کہ بادی النظر میں خارج از مبحث معلوم ہوں گی، لکھی جاتی ہیں۔ میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک[2] صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ[3] صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔

بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینا مقرر کیا، ان کے ولیعہد[4] نے چار سو روپے سال۔ ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے، وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب میں جو والی دکن کی طرف رجوع کروں۔ یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائیگی

---

[1] وہ شعر جو اوپر نقل ہوا ہے یعنی:

نوید وصل و بیم مے دہد ستارہ شناس   نکردہ ژرف نگاہی مگر در اختر من

[2] کولبرک ۱۸۲۶ء سے ۱۸۲۹ء تک ریذیڈنٹ رہا، پھر غالباً رشوت ستانی کی بنا پر الگ ہو گیا۔ [3] اسٹرلنگ ۱۸۱۳ء میں ہندوستان آیا۔ فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ حکومت ہند میں معزز عہدوں پر ممتاز رہا۔ ۱۸۳۰ء میں ۳۵، ۳۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔ کلیات غالب (فارسی) میں اس کی مدح میں ایک قصیدہ اور وفات پر ایک قطعہ موجود ہے [4] شہزادہ فتح الملک بہادر شہزادہ غلام فخر الدین عرف میرزا فخرو، بہادر شاہ کا ولی عہد۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو وفات پائی۔ بیماری کی صورت ایسی تھی کہ بعض حلقوں میں زہر دیے جانے کا شبہ پیدا ہوا۔

اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔[1] اے خداوند بندہ پرور، یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؛ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی، کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے، مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے؛ عبد القادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایان عمر ہے۔ دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رام پور کے، ساٹھ روپے پنسن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امور عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں، دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے، ماہ گزشتہ میں گزر گئے۔[2] مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں؛ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں؛ قصیدہ لکھوں، آپ کے پاس بھیجوں، آپ دکن کو بھیجیں، متوسط کب پیش کرنے کا موقع پائے؛ پیش کیے پر کیا پیش آئے؛ ان مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں کر جیوں گا؛ اِنّا لِلّٰہ و انّا الیہ راجعون۔ لا آلہٰ الا اللّٰہ و لا معبود الا اللّٰہ و لا موجود الا اللّٰہ، کان اللّٰہ و لم یکن معہ شئی و اللّٰہ الآن کما کان۔

(سنہ ۱۸۶۰ء)

—— (۱۷) ——

جناب چودھری صاحب کو سلام پہنچے۔ آپ نے اپنے مزاج کی ناسازی کا کچھ حال نہ لکھا، اگر پیر و مرشد بھی نہ لکھتے تو میں کیوں کر اطلاع پاتا اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصولِ صحت کی دعا کیوں کر مانگتا؛ کل سے وقت خاص میں دعا مانگ رہا ہوں۔ یقین ہے کہ پہلے تم تندرست ہو جاؤ گے، ازاں بعد یہ خط پاؤ گے۔

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہ نیم ماہ" بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہر نیمروز" کی عبارت کو نہیں سمجھے تو "ماہ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے؟ صاحب! "مہر نیمروز" کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستان" ہے اور اس کی دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر، دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام "مہر نیمروز" دوسرے حصے کا اسم "ماہ نیم ماہ"۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا، چھاپا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات کے لکھنے کا کہ امیر تمر تک کا

---

[1] ظاہر ہے کہ مخاطب نے میرزا کے لیے حیدر آباد میں کوشش کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ [2] منشی نبی بخش حقیر کے انتقال کا سال معلوم ہے۔ یعنی ۱۲۷۶ھ۔ غالب نے ان کی تاریخ کہی تھی؛

گفت مدہ طول و بگو "رستخیز"

اس سے ظاہر ہے کہ یہ خط سنہ ۱۸۶۰ء کا ہے۔

نام ونشان مٹ گیا۔ "آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد" جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو، وہ بھیجوں کہاں سے؟

پیر و مرشد کو میری بندگی اور صاحبزادوں کو دعا۔ خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی، شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یُوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں اب وہ دل کہاں سے لاؤں؛ طاقت کہاں سے پاؤں؟ نہ آموں کی طرف رغبت، نہ معدے میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہار مُنہ میں آم نہ کھاتا تھا، کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہُوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہُوئے تو پانچ سات:

دریغا کہ عہد جوانی گزشت
جوانی مگو، زندگانی گزشت

اب اس کے واسطے کیا سفر کروں؟ مگر حضرت کا دیکھنا، اس کے واسطے متحمل رنجِ سفر ہوں تو جاڑے ہیں، نہ برسات ہیں:

اے وائے زمحرومی دیدار دگر ہیچ!

—(۱۸)—

میرے مشفق،

آپ کا خط آیا اور اس کے آنے نے تمھاری رنجش کا وسوسہ میرے دل سے مٹایا۔ ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہُوں اگر اس کو منظور کیجیے تو خطوط کے پہنچنے کا احتمال اُٹھ جائے گا اور رجسٹری کا دردِ سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی۔ آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجیے اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں واضع ہُوا ہوں، بادی بھی ہُوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا۔[ا]

پنسن جاری ہوگیا، تین برس کا چڑھا ہُوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی روپے گیارہ آنے بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے، مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہُوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصّے میں ڈھائی روپیہ مہینا آیا۔ ساڑھے باسٹھ کے ساٹھ رہیں گے۔ کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش و ناخوش گزارا ہو جاتا ہے۔

یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار؛ خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود

[ا] لیکن اس سے پہلے خود سرور کے کہنے پر ایک خط بیرنگ بھیجا تھا۔

ایک قصبہ تھا۔ اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ ؤ دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی برسات بھر مینہ نہیں برسا، اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔ غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں بارہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کنوار کا مہینا، جسے جاڑے کا دوار کہتے ہیں، پانی گرم، دھوپ تیز، لو چلتی ہے، جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔

حضرت رفعت و رجعت جناب صاحب عالم کی خدمت میں دوستانہ سلام اور مریدانہ بندگی بہ انکسار تمام عرض کرتا ہوں۔ حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے؟ میں نے مرشد زادے کے خط میں کب اپنا عزم لکھا؟ کس نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ روز روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں؟ ہاں آپ کی قدمبوسی کی تمنا اور انور الدولہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا۔ تنخواہ کے اجراء کا حال اور مستقبل میں اس کے وصول کی صورت ان سطروں سے جو آغاز مکتوب میں، چودھری عبدالغفور صاحب کی خدمت میں لکھی گئی ہیں مع روداد شہر معلوم کر لیجیے گا۔

لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے۔ میں دنیادار نہیں، فقیر خاکسار ہوں۔ تواضع میری خو ہے۔ انجاح مقاصد خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔ ان شاء اللہ العزیز وہ فقیر سے راضی اور خوشنود رہیں گے۔

جناب مستطاب حضرت محمد امیر صاحب کی خدمت میں بعد سلام و نیاز یہ گزارش ہے کہ میرے پاس حضرت کا سلام و پیام اب کی بار بھی نہیں پہنچا۔ اب ان سطور کو اپنا ذریعہ افتخار سمجھا اور نوید مقدم مبارک سے بہت خوش ہوا۔ یہ خانہ کوچی اور گریز پائی اور بے اطمینانی کا آپ کو مجھ پر جو گمان ہے اور اس کا رنج ہے۔ یہ خلاف واقعہ کس نے آپ سے کہا؟ میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا۔ نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔ تنخواہ جس کو حضرت نے یومیہ لقب دیا ہے، اس کا حال اوپر کی تحریر سے دریافت ہو گا۔ غیر کو اپنا دوست اور معتقد اور مشتاق تصور فرماتے رہیے گا۔ مرشد زادۂ مرتضوی دودمان، سید شاہ عالم کو سلام و دعا۔ ڈپٹی صاحب[1] سے مجھ سے ملاقات کثرت سے نہیں ہے۔ ان کو کثرتِ اشغال سے فرصت نہیں، مجھ کو افراط ضعف سے طاقت نہیں۔ اگر بحسب اتفاق کہیں ملاقات ہو گئی تو آپ کا سلام کہہ دوں گا۔ آپ اپنے اخوان عالی شان کو میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔

"بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما"

(ستمبر ۱۸۶۰ء)



---

[1] مولانا سید مرتضیٰ حسین نے لکھا ہے کہ ان سے مراد ڈپٹی وزیر علی ہیں۔

—(۱۹)—

حضرت چودھری صاحب، عنایت نامۂ سابق:

تھا تو خط، پر نہ تھا جواب طلب
کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

آج دوپہر کو یہ خط پہنچا، آج ہی آخر روز جواب لکھ کر چھوڑتا ہوں۔ کل صبح بشرطِ حیات ڈاک میں بھجوادوں گا۔ "قاطع برہان" کی مجلدات جو بموجب توقیع خریداری میری ملک ہیں، وہ اوّل جولائی میں میرے پاس اور اُن میں سے دو مجلد آخر جولائی میں آپ کے پاس پہنچیں گے۔ ایک آپ رہنے دیں گے اور ایک پیرومرشد کی نذر کریں گے۔ ان شاء اللہ العلی العظیم۔

جذا فیض تعلق معجزہ کلکش نگر
گر رود صد سالہ رہ پیش نظر باشد بہاں

یہ شعر مولانا نورالدین ظہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ممدوح کی خوشنویسی کی تعریف میں ہے۔ مبالغہ سرحد تبلیغ و غلو کو پہنچ گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُس کا لکھا ہُوا قطعہ یا کوئی عبارت سو برس کی راہ پر سے آدمی کو نظر آتی ہے۔ وجہ اس کی یہ کہ حرف بہت روشن، صاف اور جلی ہیں اور چونکہ یہ امر بحسب عادت و عقل ممتنع ہے، اس رو سے اس کو معجزۂ قلم کہا اور چونکہ معجزہ خرق عادت ہے اور خرق عادت ایک امر ہے مسلّمات جمہور میں سے، پس منکر کو گنجایش انکار نہ رہی۔

یہاں یہ خیال آئے گا کہ "فیض تعلق" بے کار رہتا ہے۔ میں کہتا ہُوں کہ وہ حسن الہام ہے، یعنی نگاہ کو ازانجا کہ باصرہ مشتاق حسن ہے، اُس خط سے وہ تعلق بہم پہنچا ہے کہ اگر وہ خط سو برس کی راہ پر ہو تو بھی نگاہ اُس سے متعلق رہتی ہے، جیسے طائر کو اپنا آشیانہ اور مسافر کو اپنا وطن اور عاشق کو معشوق کا خدوخال مسافت بعیدہ سے پیش نظر رہتا ہے۔ چاہو ایک معلول کی دو علت سمجھو: فیض تعلق مذکور اور حسن خط مقدر، چاہو فیض تعلق کو ادعا کہو اور حُسنِ خط جو تقدیر میں ہے اُس کو سبب سمجھو تعلق کا اور موکد جانو ادعا کا۔

شنو دعوے کے واسطے دلیل موضوع ہے، ادعا کو دلیل ضرور نہیں ہے، ہاں ادعا پر تاکید طریقہ بلاغت ہے۔ یہ لطافت معنوی خاص اس بزرگ کے حصے میں آئی ہے۔ میں جانتا ہُوں مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صُورت پکڑی تھی۔ اس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوری تھا۔

اللہ اللہ فرماتا ہے:

مروت کرد شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نمے باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے، یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ۔ پادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا و ملازمین میں سے کچھ لوگ زیر قصر رہتے ہوں۔ اس واسطے پادشاہ دن کو اس منظر بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں۔ رات کو ان کے گھر تاریک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بلند مکان پر چڑھا تو کچھ نظر نہ آئیگا۔

یہ مدح ہُوئی عفت کی اور عفت ایک فضیلت ہے فضائل اربعہ میں سے۔ اب ابہام کو سوچیے۔ ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا ہے، اس واسطے کہ رعایا کے گھروں میں چراغ نہیں۔ اگر کسی کو کسی کپڑے میں پیوند لگانا یا کوئی چمڑے کی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تفحص حال منظور ہو تو وہ گھر اُس ممدوح کے پرتو جمال سے روشن ہو جائے۔ چراغ کی حاجت باقی نہ رہے۔ جو کام جو شخص چاہے وہ کرے۔ مروت کے لفظ کا مزہ وجدانی ہے۔ سوائے اس لفظ کے کوئی لفظ یہاں کام نہیں آتا۔ اگر حفظ ناموس رعایا ہے تو مروّت ہے اور اگر مفلسوں کی کاربراری ہے تو مروّت ہے۔ قالب معنی کی جان ہے ظہوریؔ، ناطقہ کی سرفرازی کا نشان ہے ظہوریؔ۔ زیادہ کیا لکھوں؟

(جون ۱۸۶۲ء)

(۲۰)

جناب چودھری صاحب،

آپ کے تلطف نامہ کے ورود کی مسرت اور پارسل کے نہ پہنچنے کی حیرت، باعث اس کی ہُوئی کہ آپ کو پھر تکلیف دوں اور باآنکہ خط جواب طلب، نہ تھا، جواب لکھوں۔ بندہ پرور میں نے پارسل کی رسید لے لی تھی۔ اب آپ کے خط کو پڑھ کر کارپردازانِ ڈاک کے پاس وہ رسید بھجوائی، انھوں نے کتاب دیکھ کر میرے آدمی سے کہہ دیا کہ سکندرہ راؤ کی رسید یہ موجود ہے۔ اب پارسل کی جواب دہی وہاں والوں کے ذمّہ ہے۔ یہ سُن کر میں نے یہ مناسب جانا کہ وہ رسید آپ کے پاس بھیج دوں۔ آپ سکندرہ راؤ کے ڈاک خانہ میں بھجوا کر ان سے پارسل منگوا لیں اور اب اس رسید کا میری طرف راجع ہونا کسی صورت میں ضرور نہیں۔ والسّلام

(۱۸۶۲ء)

(۲۱)

بندہ پرور،

بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامہ پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہُوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہُوا کہ تمھارے دشمن بعارضہ تپ و لرزہ رنجور ہیں۔ اللہ اللہ ضعف کی یہ شدّت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں! خدا وہ دن دکھائے کہ تمھارا خط تمھارا دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو۔ خط پڑھ کر دونی مسرّت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا، دل سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصد ڈاک کی راہ دیکھتا ہوں گا۔ جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا۔ آپ کے عم عالی مقدار اور بزرگ آموزگار کو میرا سلام مع صنوف اشتیاق و الوف احترام۔

جناب چودھری صاحب، آؤ ہم تم حضرت صاحب عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کف پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام عرض کروں گا، تم معرّفت ہونا کہ غالب یہی ہے۔ اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عزم قدمبوسی کیا، پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا۔ فرماتے ہیں کہ "غالب تو اچھا ہے؟"

عرض کرتا ہوں کہ "الحمد للہ، حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟"

ارشاد ہُوا کہ" مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں":

"جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہُوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے۔ ضعف قویٰ واضمحلال کہتے تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا، ان کی غمخواری اور دردمند نوازی کا دم بھرتا:

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من نمے میرم ہم ز ناتوانیہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ "بوستان خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پہ گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں؛ حضرت سچ تو یُوں ہے کہ غمہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہُوں، ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یُوں ہی رویا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دلنشین ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ ہیہات:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

اے حضرت شاہ عالم صاحب میرا سلام لیجیے۔ کاغذ باقی نہیں رہا۔ اپنے سب بھائیوں کو مع میر وزیر علی صاحب میرا سلام کہہ دیجیے گا۔

سنہ ۱۸۶۴ء

(۲۲)

چودھری صاحب مشفق مکرم کو میرا سلام۔

آپ کا خط کہ سوائے چند سطر کے جو تم نے لکھی تھیں، سراسر حضرت صاحب کا دستخطی تھا، پہنچا۔ سبحان اللہ حضرت کو کس قدر محبت ہے تمھارے ساتھ۔ تمھاری ناسازی مزاج کا کیسا ملال اور تمھارے نہ دیکھنے کا کیسا رنج ہے؛ سچ یُوں ہے کہ تم خوبانِ روزگار میں سے ہو۔ توقیع قبول اہل نظر کا حاصل ہونا آسان نہیں ہے۔ سلامت رہو، خوش رہو، مختصر:

کارت بجہاں جملہ چناں باد کہ خواہی

اب روئے سخن حضرت صاحب کی طرف ہے۔ خدمت خدام مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے۔ تفقد نامہ نامی میں صورت عز و شرف نظر آئی۔ اللہ اللہ! تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی حضرت کی قدر دانی کی کیا بات ہے۔ آپ کا التفات موجب مباہات ہے۔ یہ بات بطریق طنئ لسان زبان پر آئی ہے، ورنہ قدر دانی کیسی، یہ قدر افزائی ہے۔ نظیری علیہ الرحمۃ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجیے اور زمرۂ شعرا میں سے مجھ کو نکال دیجیے۔ شعر یہ ہے:

جوہرِ بینشِ من در تہِ زنگار بماند
آنکہ آئینہ من ساخت، نہ پرداخت دریغ

دعویٰ اور چیز ہے اور کمال اور ہے۔ علم عربی اور شے ہے اور فارسی کی حقیقت حال اور ہے۔ جلا لاسے طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے شیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا۔ عبارت اس وقت یاد نہیں آتی مگر یہ مضمون اس کا کہ ایک دن مولانا عرفی علیہ الرحمۃ اور ابو الفضل میں مباحثہ ہوا۔ شیخ نے عرفی سے کہا کہ "ہم نے تحقیق کو بسر حد افراط پہنچا دیا اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا۔" عرفی نے کہا کہ "اس کو کیا کرو گے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، گھر کے بڈھوں سے اور بڈھیوں سے جو بات سُنی، فارسی میں سُنی"۔ شیخ گفت "ما فارسی از انوری و خاقانی فراگرفتہ ایم، وشما از پیر زناں آموختہ اید۔" عرفی فرمود: "انوری و خاقانی نیز از پیر زناں آموختہ باشند۔" ختم

غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی لغز گوئی میں مشہور ہے، کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے[1] دیکھو عبدالقادر بدایونی کیا لکھتا ہے۔ زہے[2] سپاہی فالیز (؟) آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آ گئے۔ ناصر علی اور بیدل اور غنیمت اُن کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھیے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟

منت اور یکین اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں۔ خیر ہوں، فاضل کہلائیں، کلام میں اُن کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟ فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروی قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ[3] سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ با اینہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، مُنہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی۔ اس شیوہ و روش کو خوب برت گئے۔ فارسی وُہ کیا جانیں؟ قاضی محمد صادق اختر[4] عالم ہوں گے، شاعری سے ان کو کیا علاقہ؟ ایک بات حضرت کو اور معلوم رہے کہ ہندی فارسی دانوں نے کمال کو وہم میں منحصر رکھا ہے۔

کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیل کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیل کا اُن کے نام دیکھا ہے کہ قتیل اُن کو لکھتا ہے: جامہ گزاشتن بمعنی مُردن مسلّم، لیکن بہت احتیاط کیا کرو، موقع دیکھ لیا کرو، جب لکھا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقع کیا؟ "فلاں مُرد" "بہماں جامہ گزاشت۔" پھر وہ کہتا ہے کہ "کدہ" کے ساتھ سوائے پانچ سات لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو۔ پھر فرماتا ہے کہ "ہمہ" کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ، مفرد سے نہ ملاؤ۔

نقل، میں نے "دستنبو" میں لکھا ہے کہ "ہمہ کس داند"۔ ایک شخص نے کہ وہ بھی مولوی کہلاتا ہے، میری غلطیت

---

[1] ایک جگہ لکھتے ہیں،

اگر معترض فیضی کو نہیں مانتا تو آپ معترض کر کیوں مانتے ہیں؟ فیضی کی سند مقبول اور مسموع (قدر بلگرامی کے نام خط ۴۲) [2] یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی [3] شاگرد دبیر محمد علی رائج، مصنف مصطلحات الشعرا، وفات ۱۱۸۰/۱۷۶۶ [4] بن قاضی محمد لعل، ساکن ہوگلی، ملک الشعرا غازی الدین حیدر، مصنف تذکرہ "آفتاب عالم تاب"، صبح صادق، نور الانشا، دیوان فارسی وغیرہ، وفات ۱۸۵۵ء۔

میں کہا کہ "ہمہ کس واند" کیا ترکیب ہے؟ ایک لڑکا میرا شاگرد وہاں موجود تھا، اس نے کہا کہ یہ ترکیب بعینہٖ صائب کی ہے، جیسا کہ وہ کہتا ہے،

ہمہ کس طالبِ آں سرو رواں ست اینجا
آبِ حیواں ز نفس سوختگاں ست اینجا

اُس نے کہا کہ تمہارا اُستاد "حاش للہ" کو ما قبل کلمہ منفی لایا ہے اور یہ جائز نہیں:

حاش للہ کہ بد نمیگویم

میرے شاگرد نے کہا کہ یہ ترکیب انوری کی ہے:

حاش للہ نہ مرا، بلکہ ملک را نبود
با سگِ کوے تو ایں زہرہ و یارا و مجال

مولوی ہدایت علی نمکین کا آج تک میں نے نام نہیں سُنا تھا، چھپے ہوئے رستم ہیں۔ صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا، مگر وارد شاہجہان آباد تھا۔ "انتقام کشیدن" و "انتقام گرفتن" دونوں بول گیا۔ مولوی صاحب لچ فارسی بولتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

"کلیم" بروزن فعیل صیغہ اسم فاعل ہے، مثل کریم ورحیم، بشیر وسمیع وبصیر وکلیم اسماے الٰہی ہیں۔ کلیم اگر بمعنی ہم کلام لیجیے تو اسمِ الٰہی اس کو کیوں کر قرار دیجیے؟ حضرت کا مصرع،

ہست کلامے ز کلام کلیم

مخدوش البتہ ہے، یعنی یا کلمہ از کلام کلیم یا کلامے از کلمات کلیم چاہیے۔ "کلامے از کلام" مفرد میں سے مفرد کو نکالا چاہیے، گو جائز نہ ہو۔

"گو باش" و "گو باشد" ہرگز محل تردّد نہیں۔ اوہام و وساوس قواعد میں پیش نہیں جاتے،

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب

ہرگز یاے معروف نہیں ہے، یاے مجہول ہے۔ یاے معروف یہاں نامقبول ہے:

خداے کہ بالا و پست آفرید

ایسا خدا، ایسا کریم۔ اس تحتانی کو یاے وحدت کہو، یاے توصیف کہو، یاے تعظیم کہو، جس طرح کہو مجہول آئے گی۔

—— (۲۳) ——

جنابِ چودھری صاحب،

سیاہی پھیکی، کاغذ پتلا۔ پیر و مرشد کی عبارت ایک طرف، آپ کی تحریر بھی مغشوش ہو گئی۔ بہرا ہو گیا ہوں مگر حدتِ بصر ہنوز باقی ہے۔ تمھاری عبارت کا جو لفظ پڑھ لیا، قرینے سے اس کا محاورہ بھی معلوم ہو گیا۔ حضرت کی تحریر کا

ایک لفظ سوائے سعادت توام شاہ عالم کے اگر پڑھا گیا ہو تو دیدے پھوٹیں، ایمان نصیب نہ ہو۔ وہ خط بدستور آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اردلی سفید کاغذ[1] پر حرف بحرف اس کی نقل کر کے پھر مجھے بھیج دیجیے تاکہ اس کے جواب لکھنے میں سعادت حاصل کروں، لیکن بہت جلد، بہت جلد، بہت جلد۔ آپ کی نگارش سے انشراح دریافت ہوگیا کہ اب آپ اچھے ہیں۔ الحمد للہ۔

جناب ممتاز علی خاں صاحب کہاں اور مارہرہ کہاں۔ بہرحال میرا سلام۔

(۲۴)

بندہ پرور،

پرسوں تمھارا خط آیا، آج جواب لکھ رکھتا ہوں، کل ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ میرا حال کیوں پوچھو؟ اپنے کو دیکھو جو تمھارا ڈھنگ ہے، وہی میرا رنگ ہے۔ شور دا دام مرض خاص اور رنج عام، یہ ایک اجمال، دوسرا اجمال سنو کہ مہینے بھر سے صاحب فراش ہوں۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ محل سرائے اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے، پر کیا امکان جو جا سکوں۔ صبح کو نو بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے۔ پلنگ پر سے کھسل پڑا، ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا، پھر ہاتھ دھوئے، کلی کی، پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ مدتوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد جلد آتا ہے۔ اس صاحب فراش ہونے کو دیکھو اور دم بدم تقاضا ہے بول کو دیکھو۔ پاخانے اگرچہ دن رات میں ایک دفعہ جاتا ہوں مگر صعوبت کو تصور کرو۔

ایک پھوڑا داہنے پہونچے میں، جس کو ساعد کہتے ہیں، دو پھوڑے بائیں پہونچے میں۔ یہ سہل ہیں۔ بائیں پاؤں میں کف پا و پشت پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت۔ رادعات و محللات[2] سے کچھ نہ ہوا۔ اب تجویز ہے کہ نیب کا بھرتا باندھیے، جب پکے، پھوٹے، تب مرہم لگائیے۔ کہو کف پا میں جراحت کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا؟

یہ حال جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں مجمل و جزوی ہے۔ میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد حضرت صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا۔ اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔

رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔ پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔ فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیال ہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔ سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چربہ دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں۔ رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی

---

[1] ایک قسم کا سفید کاغذ جو ذرا دبیز ہوتا ہے [2] ایسی دوائیں جن کے لگانے سے ورم تحلیل ہو جائے۔

طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہری ہیں: خاقانی اور اس کے اقران، ظہوری اور اس کے امثال، صائب اور اس کے نظائر۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ ان کی طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے، اچھی طرز ہے، مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد، انصاف، انصاف:

اگرچہ شاعران نغز گفتار — زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں — خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ "چیزے دگر" پارسیوں[1] کے حصے میں آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے۔

میر تقی علیہ الرحمۃ:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو — رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو؟

سودا:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار — خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی؟ کیوں کر مانوں — ہے تو نادان مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں، مگر ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔ یاد کیا آوے؟ لیٹا ہوا ہوں۔ دمبدم پاؤں کے ورم کی ٹیس ہوش اڑائے دیتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۱۸۶۳ء)



(۲۵)

آہا ہا، جناب منشی ممتاز علی خاں صاحب مارہرہ پہنچے! صاحب یہ تو سیاح گیتی نوردِ ثانی مخدوم جہانیاں جہاں گرد ہیں۔ بہر حال آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے۔ کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی:" نظم میں وہ پایہ بلند کہ شعری اُن کے شعر پر لآلی انجم نثار کرے، خود بلا گرداں ہو، لولی سا ہر مصرعے پر دل و جان وارے، صدقے، قربان ہو[2]۔

---

[1] پارسیوں سے مراد وہ گروہ نہیں جو مذہباً پارسی مشہور ہے بلکہ اہل ایران مراد ہیں۔ جو پہلے عموماً فارس مشہور تھا۔

[2] سرور نے اپنے نام کے رقعات کو جمع کر کے اس کا نام "مہر غالب" رکھا تھا اور منشی ممتاز علی خاں کے ذریعے سے چھپوانے

(باقی ص ۴۲۶ پر)

"وار کرے" بہ معنی حملہ کرنے کے ہے اور وہ جو آپ کا مقصود ہے اُن معنوں میں "وارنا" اور "وارے" آیا ہے، نہ "وار کرنا اور" وار کرے"۔ آپ کو یاد ہوگا کہ چند سطریں میں نے بہ ہزار دشواری لکھ کر تمھیں بھیجی تھیں۔ خواہش یہ تھی کہ یہی سطریں میرے مخدوم اور مخدوم زادے کی نظر سے گزر جائیں۔ آج ایک خط میں نے پیر و مرشد کا اور پایا، وہ ابھی نہیں پڑھا، مگر شاہ عالم صاحب اس خط کی پشت پر لکھتے ہیں کہ تُو نے میرے خط کا جواب نہیں لکھا، حالانکہ میں ان سطروں میں یہ لکھ چکا ہُوں کہ نہ مجھے تحریر کی طاقت، نہ اصلاح کے ہوش۔ ایک بات کو دس دس بار کیا لکھوں؛ اب میرا انجام کار دو طرح پر متصوّر ہے؛ یا صحت یا مرگ۔ پہلی صورت میں خود اطلاع دوں گا، دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سُن لیں گے۔ یہ سطریں لیٹے لیٹے لکھی ہیں۔

(۲۶)

ایک عبارت لکھتا ہوں، چونکہ لفافہ جناب چودھری عبدالغفور صاحب کے نام کا ہوگا، پہلے وُہ پڑھیں پھر میرے پیر و مرشد کی نظر سے گزرانیں، پھر مرشد زادہ شاہ عالم صاحب کو دکھائیں۔

برس دن سے فسادِ خون کے عوارض میں مبتلا ہوں۔ شور و اورام میں لدرہا ہُوں۔ برس دن میں اوجاع سہتے سہتے روح تحلیل ہوگئی، نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی اور پھوڑے تو خیر، مگر دونوں پنڈلیوں میں ہڈیوں کے قریب دو پھوڑے ہیں، کھرنڈا ہُوا اور ہڈیاں جڑنے لگیں اور رگیں پھٹنے لگیں۔ بائیں پانو پر کف پا سے، جہاں وہ پھوڑا ہے، پنڈلی تک ورم ہے۔ رات دن پڑا رہتا ہُوں۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ کھسل پڑا، بعد رفع حاجت پھر لیٹ رہا۔ اسی صورت سے روٹی کھاتا ہُوں۔ اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف، خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہُوں۔ دو خط چودھری صاحب کے آئے، جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو طعنے دے کر مرد بنایا، جب یہ عبارت لکھی۔ چودھری صاحب کو سلام، حضرت صاحب کو بندگی۔

(دسمبر ۱۸۶۳ء)

(۲۷)

جناب چودھری صاحب

میں تو خدمت بجا لایا[۱]، مگر اس کے صلے میں تین باتیں چاہتا ہُوں۔ ایک تو یہ کہ آرہ کے مولوی فرزند احمد کے مکان کا

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۵) کے آرزو مند تھے۔ اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جو "عودِ ہندی" کے ساتھ چھپ گیا۔ یہ فقرہ اسی دیباچے کا ہے پہلے سرورؔ نے لکھا تھا: شعری ان کے شعر پہ لآلی انجم نثار کرے ...... لولی ساحر مصرعے پر دل و جان وار کرے۔ اس وجہ سے غالبؔ کو "وار کرے" کے حقیقی معنی بتانے پڑے۔ بعد میں فقرہ یُوں بنا دیا گیا: "شعری ان کے شعر پر لآلی انجم تصدق اتارے ..... لولی ساحر مصرعے پر دل و جان وارے۔"

[۱] مختار الدین صاحب آرزوؔ نے فرمایا کہ سرورؔ نے چھتیس شعر کا اردو قصیدہ اور نو قطعات اصلاح کیلیے بھیجے تھے۔ قصیدے کے گیارہ شعروں پر غالبؔ کی اصلاح ہے۔ نو قطعات میں سے ایک انھیں پسند نہ آیا۔

پتا مجھے لکھ بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت لکھوں[1]۔ دوسرے یہ کہ تمھارا خط تم کو واپس کرتا ہوں۔ حضرت صاحب کی دستخطی عبارت حرف بہ حرف اپنے ہاتھ سے لکھو اور مجھ کو بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت کا خط لکھوں[2]۔ واللہ ہرگز مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ تشویش و تشویر میں ہوں کہ کیا کروں۔ تم یہ بوجھ مجھ سے اٹھالو۔ تیسری بات یہ کہ یہ معاملہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب جلد آئے۔

۲۵۔ دسمبر ۱۸۶۶ء غالب

(نقوش مکاتیب نمبر)

صاحب عالم مارہروی

مارہرہ میں ایک بزرگ گزرے ہیں، جن کا نام شاہ برکت اللہ تھا۔ ۱۱۴۲ھ میں واصل بہ حق ہوئے۔ ان کو کئی جاگیریں بادشاہوں نے دی تھیں۔ مدت تک گدی ایک رہی، پھر دو حصوں میں بٹ گئی اور ساری جایداد بھی بہ حصہ برابر تقسیم ہو گئی۔ ایک گدی کو "سرکار کلاں" اور دوسری کو "سرکار خورد" کہتے تھے۔ سید صاحب عالم "سرکار خورد" کے سجادہ نشین تھے۔

۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے یعنی غالب سے ایک برس بڑے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے غالب کو لکھا تھا کہ لفظ "تاریخ" میرا سال ولادت ہے۔ غالب نے مزاحاً یہ شعر لکھ بھیجا:

ہاتف غیب شب کو یوں چیخا ان کی "تاریخ" ہے "میرا" "تاریخا"

یعنی تاریخ کے اعداد میں الف کا ایک عدد بڑھ جائے تو ۱۲۱۲ھ بن جاتے ہیں جو غالب کی تاریخ ولادت ہے۔

صاحب عالم کی ابتدائی تعلیم فرخ آباد میں ہوئی۔ زبردست فاضل اور متبحر عالم تھے۔ خط اچھا نہ تھا۔ جو خط خود لکھتے تھے میرزا سے چودھری عبدالغفور کے پاس بھیج کر صاف لکھواتے تھے، پھر جواب دیتے تھے۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں وفات پائی اور شاہ برکت اللہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ احسن مارہروی مرحوم انھیں کے اخلاف میں سے تھے۔

شاہ عالم، صاحب عالم کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کے نام یقیناً زیادہ خط لکھے گئے ہوں گے، لیکن ان میں سے اکثر ضائع ہو گئے۔ صرف پانچ خط صاحب عالم کے نام کے اور دو خط شاہ عالم کے نام

---

[1] فرزند احمد صفیر بلگرامی کے بیٹے کی ولادت پر تہنیت۔ سرور نے قطعات اسی سلسلے میں لکھے تھے [2] صاحب عالم مارہروی کو اس لیے تہنیت کہ صفیر بلگرامی حضرت کے نواسے تھے۔

کے محفوظ رہ گئے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ چودھری عبدالغفور سرؔور کے اکثر خط ان میں اور صاحب عالم میں مشترک ہیں، بلکہ ابتدائی سطروں کے سوا پورے خط میں صاحبِ عالم ہی سے خطاب ہے۔

(۱)

پیر و مرشد،

سلام نیاز پہنچے۔ کف الخضیب[۱] صور جنوبی میں سے ایک صورت ہے۔ اس کے طلوع کا حال مجھ کو کچھ معلوم نہیں۔ اختر شناسانِ ہند کو اس کا کچھ حال معلوم نہیں اور ان کی زبان میں اس کا نام بھی، یقین ہے کہ نہ ہوگا۔ "قبول دعا وقت طلوع" منجملہ مضامینِ شعری ہے، جیسے کتان کا پرتوِ ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کے منگوایا اور قطعات زمرد اس کے محاذی چشم رکھے۔ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایران و روم و فرنگ سے انواع انواع کپڑے منگوائے۔ چاندنی میں پھیلائے۔ کوئی مسکا بھی نہیں۔

تحویل آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲۔ مارچ کو واقع ہوتی ہے۔ کبھی ۲۱ کبھی ۲۳ بھی آپڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں۔ رہا طالع وقت تحویل درست کرنا، بے کتبِ فن اور مبلغ علم ممکن نہیں۔ میرے پاس یہ دونوں باتیں نہیں؛

نہ دانم کہ گیتی چساں مے رود چہ نیکو، چہ بد در جہاں مے رود

ہیں، تو اب روز و شب اسی فکر میں ہوں کہ زندگی تو یوں گزری، اب دیکھیے موت کیسی ہو:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسب حال ہے۔

سکے کا دار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوقؔ نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر، جو ذوقؔ کے معتقدین میں تھے، اُنھوں نے "دلّی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب (دیکھ) وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سُنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلّی اردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبا مجھ پر رہا۔ پنسن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا؛

چوں جنبش سپہر بہ فرمان داور ست

بیداد نبود آنچہ بما آسمان دہد

یہ تحریر بطریق حکایت ہے، نہ بسبیل شکایت۔

گویند" از ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری؟ فرمود کدام حال خواہد بود کسے را کہ خدا از دے

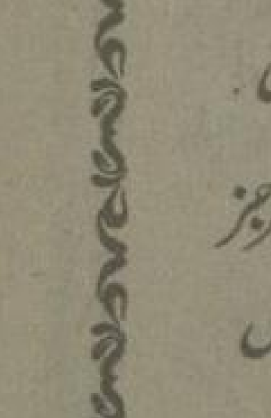
---

[۱] ف مشدد و مضموم خ مفتوح اور ض مکسور شمالی جانب ایک ستارہ مشہور ہے کہ جب وہ دائرہ نصف النہار میں پہنچتا ہے تو قبول دعا کا وقت ہوتا ہے۔ کفِ خضیب کے لفظی معنی پنجۂ رنگین۔

فرض طلبد و پیمبر سنّت ، زن مال خواہد و ملک الموت جان" ؟

قصّہ مختصر اب زلیست بامید مرگ ہے۔ "قاطع برہان" چودھری صاحب کی نثر کے اجزا کے ساتھ بھیجا جائے گا ، بہ مقابلہ" برہان قاطع "منطبعہ دیکھا جائے اور بے حیف و بے میل از راہ انصاف دیکھا جائے۔ مرشدزادوں کو سلام مسنون اور دعاے افزونی عمر و دولت پہنچے۔

(۱۸۵۹ء)



—(۲)—

پیر و مرشد،

مے کنم عرض گو مکرر باشد

آج ہی ایک خط چودھری عبدالغفور صاحب کے نام کا روانہ کیا ہے اور اس خیال سے کہ وہ گرمی ہنگامۂ شادی میں اس خط کا آپ کی نظر سے گزرانا بھول نہ جائیں ، یہ خط جداگانہ آپ کو آج ہی بھیجتا ہوں۔ اصحاب ثلاثہ[۱] کی عبارت نثر مرجز کے باب میں اتنی ہی ہے : "وزن دارد ، سجع ندارد"۔ خدا کے واسطے "وزن" تو شعر کو کہتے ہیں ، وہ مثال کی نثر میں کہاں ہے ؟ "سجع" اس کو کہتے ہیں کہ کلمات فقرتین وزن میں برابر ہوں۔ یہ صنعت مثال کی نثر میں موجود ہے۔ جو ہے اس کا سلب ، جو نہیں اس کا ثبوت کیوں کر مانوں ؟ کیا آپ کی یہ مرضی ہے کہ الفاظ کے ہم وزن ہونے کو وزن ، تقطیع شعر کو "سجع" مان لوں ؟ میں تو نہ مانوں گا۔ آپ کو اختیار ہے۔ یہ کلام معصوم کا نہیں کہ اُس کے مسلّم نہ رکھنے سے آدمی کافر ہو جائے۔ زبان فارسی مردے کا مال ہے ، عرب کے ہاتھ بطریق یغما آیا ہے ، جس طرح چاہیں صرف کریں۔

خواجہ نصیر الدین طوسی آٹھ حرف کا زبان فارسی میں نہ آنا لکھتے ہیں اور "ذال" نقطہ دار کا ذکر نہیں کرتے۔ الّا کوئی لغت فارسی ایسی بتایئے کہ جس میں "ذال" آئی ہو ؟ گزاشتن و گزشتن و پزیرفتن سب "زے" سے ہیں۔ کاغذ دال مہملہ سے ہے اس کا ذال سے لکھنا اور کواغذ کو اس کی جمع قرار دینا تعریب ہے بہ تحقیق۔ آذر اسم آتش بدال ابجد ہے نہ بذال ثخذ۔[۲] کوئی لفظ متحد المخرج فارسی میں نہیں ، بلکہ قریب المخرج بھی نہیں "تے" ہے "طوے" نہیں ، "سین" ہے "ث" نہیں اور "صاد" نہیں۔ "ہاے ہوز" ہے "حاے حطی" نہیں۔ یہاں تک کہ "قاف" نہیں ، اس راہ سے کہ غین متحد المخرج بلکہ قریب المخرج ہے۔ "زے" کے ہوتے "ذال" کیوں کر ہوگی ؟

وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے ، جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ "بے مراد" صحیح اور "نامراد" غلط ، ارے تیرا ستیاناس جائے "بے مراد" اور "نامراد" میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ "نامراد" وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد ، کوئی خواہش ، کوئی آرزو بر نہ آوے۔ "بے مراد" وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو ، از قسم بے مدعا و بے غرض و بے مطلب۔ حسبتہً للہ ان دونوں امروں میں کتنا فرق ہے ؟ "ناپروا" اور

---

[۱] غالباً ملا غیاث الدین رام پوری۔ عبدالرزاق اور عبدالواسع ہانسوی۔ [۲] یعنی "آدر" ہے "آذر" نہیں۔

"ناکام" اور "نادرست" اور "ناچار" کہ یہ مخفف ناچارہ اور "ناہار" کہ یہ مخفف "نہ اہار" ہے اور "نامراد" اور "ناانصاف" یہ سب درست ہیں۔ہاں کہاں گئے ہانسی والے معلم؟

قافیۂ شایگاں کہ جس کو عرب ایطا کہتا ہے، وُہ دو طرح پر ہے، خفی و جلی۔ اہل خرد نے خاک اُڑائی ہے اور بات بنائی ہے۔ خفی اور جلی کی تفسیر میں وُہ کچھ لکھا ہے کہ صاحب طبع سلیم کبھی اس کو نہ سمجھے۔ چہ جائے آنکہ مانے۔

اصل یہ ہے کہ ایطا وہ قافیہ ہے کہ جو دو حرف ایک صورت کے ہوں جیسے الف فاعل، گویا و بینا و شنوا۔ شعر اسیر[۱]:

اے دانۂ تسبیح تجالت دل دانا
سر حلقہ مستانِ رخت دیدۂ بینا

اور نون دال مضارع کا جیسا اُستاد کے اس مطلع میں ہے:

دل شیشہ و چشمان تو ہر گوشہ بر ندش مست است مبادا کہ بناگہ شکندش

اور ایسا ہی ہے الف نون جمع کا، مثل چراغاں و جواناں اور ایسا ہی الف نون حالیہ، مانند گریاں و خنداں۔ پس اگر یہ مطلع میں آپڑے تو ایطائے جلی ہے۔ اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ میں آپڑے، تو ایطائے خفی ہے۔ ائمہ فن نے وُہ کچھ لکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر قائل تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے، تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے۔ باپ نے اس کا نام "میر بادشاہ" رکھ دیا ہے۔



اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل[۲] علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں؟ خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خران نامشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و درد مند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی شعر جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو۔ قوت ممیزہ سے کام لو، ان غولوں پر لعنت کرو، سیدھی راہ پر آجاؤ، اگر نہیں آتے تو تم جانو۔ تمھاری بزرگی پر اور میرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے۔ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو، مگر اس کھتری بچے اور اس معلم[۳] سے مجھ کو کمتر نہ جانو۔ عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ، غور کرو، سمجھو۔ عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہما نہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں۔ مانتے ہو مانو، نہ مانو تم جانو۔

—— (۳) ——

بعد حمد خداوند نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پہلے قبلۂ روح وروان جناب صاحب عالم کو بندگی اور حضرت مقبول عالم کی شادی کی مبارکباد۔ کیا عرض کروں کہ میرا حال کیا ہے؟ اضمحلال قویٰ کا حال مختصر یہ ہے کہ اگر

---

[۱] میرزا جلال اسیر [۲] قتیل [۳] ملا غیاث الدین رام پوری۔

کوئی دوست ایسا کہ جس سے تکلف کی ملاقات ہے آجائے تو اُٹھ بیٹھتا ہُوں، ورنہ پڑا رہتا ہُوں۔ جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ بھی اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہُوں۔ آج دوپہر کو میر عبدالعزیز صاحب آئے۔ میں بے کلاہ و پیرہن پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا۔ اُن کو دیکھ کر اُٹھا، مصافحہ کیا۔ اُنھوں نے جناب شاہ عالم صاحب کا خط مع مسودات اشعار دیا اور فرمایا کہ پرسوں جاؤں گا۔ عرض کیا کہ کل آخر روز آپ تشریف لائیں، خط کا جواب اور اصلاحی مسوّدہ لے جائیں۔ وہ تشریف لے گئے۔ میں لیٹ رہا۔ دن کو سونے کی عادت نہیں ہے۔ جی میں کہا آؤ بیکار کیوں رہو، خط کا جواب آج لکھ رکھو۔ اُٹھے کون، بکس کھولے کون؛ لڑکوں کی دوات قلم مونڈھے پر پلنگ کے پاس رکھ لی۔ اب مقتضی اس کا ہُوا کہ آغاز نامہ بنام اقدس ہو۔

حضرت، نسخہ "قاطع برہان" تیسری چوتھی نظر میں مکمل ہو کر مسوّدات ایک کاتب کے حوالے ہُوئے۔ آٹھ جز لکھے گئے، کم و بیش دو جز باقی ہیں، پرسوں تک آجائیں گے۔ بعد اس کے انطباع کی فکر ہو گی۔ جب وہ عزیمت امضا پذیر ہو جائیگی، حضرت کی نظر سے بھی شرف پائے گی۔ حضرت سیّد عالم کو نیاز، خورشید عالم کو سلام، چودھری صاحب کو نہ سلام، نہ نیاز، صرف یہ پیام کہ ہم تمھارے خط کو مفرح روح سمجھتے تھے، باتوں کا مزہ ملتا تھا، خیر و عافیت معلوم ہو جاتی تھی۔ وُہ وظیفہ روحانی منقطع کیوں ہُوا؛ صاحب یہ روش اچھی نہیں، گاہ گاہ رسل و رسائل کا طور بنا رہے۔

(۴)

پیر و مرشد،

اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیوں کر بجا لاؤں؛ خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان درگاہ سے بھلا کہوانا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادتِ عظمیٰ تھی کہ میں اس وبائے عام میں جیتا بچ رہا۔ اللہ اللہ ایسے کشتنی و سوختنی کو یُوں بچایا اور پھر اس رتبہ کو پہنچایا۔ کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار دیتا ہُوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصوّر کرتا ہُوں۔ واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمائیے گا، ورنہ بندہ دعوئ خدائی کرنے میں محابا نہ کرے گا۔[1]

"کتاب افادت مآب پنج آہنگ نسخہ لطیف شریف تالیف"، اس کے آگے غلام سے کچھ نہ پڑھا گیا، مگر چودھری صاحب اور حضرت شاہ امیر صاحب اور مولوی فضل احمد صاحب یہ تین اسم معلوم ہُوئے۔ پھر بھی دوسرے اسم میں متردّد ہوں کہ آیا میرا قیاس مطابق واقع ہے یا نہیں۔ ہاں چودھری صاحب اور مولوی فضل احمد صاحب، ان دو ناموں میں تردّد باقی نہیں۔ معہذا یہ نہ سمجھا کہ مقصود کیا ہے؛ اگر "پنج آہنگ" مطلوب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا ایک سبطی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ "مجموعہ نثر" اور "کلیات نظم اردو" سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ، ڈر کر عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہو گا، لُٹ گیا۔ ایک ورق نہیں رہا۔ ہاں چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بدو عیب ہیں: ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسم نثر تحریر ہُوا ہے، وہ اس میں نہیں۔ دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔ بہرحال اگر فرمائیے تو لے کر بھیج دوں۔ مخدوم زادہ ہائے والا تبار، پہلا نام سمجھ میں نہیں آیا،



[1] غالب کی مدح میں قصیدہ۔

مگر پہلے ان کی خدمت میں اور پھر سید مقبول عالم کی خدمت میں سلام مسنون اور اشتیاق روزافزوں عرض کرتا ہوں۔

(۱۸۶۱ء)

(۵)

حضرت صاحب قبلہ وکعبہ جناب صاحب عالم کو فقیر اسداللہ کی بندگی،

دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا، مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ لختِ جگر و نور بصر مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں؛ ہاتھ رعشہ دار، آنکھیں ضعیف البصر، حواس مسلوب ہیں۔ فقصہ مختصر من کل الوجوہ غالب مغلوب ہیں۔ دو جیلنے ہوئے منشی ہرگوپال تفتہ بہ سواری ریل یہاں آئے، ایک شب رہے، صبح کو تشریف لے گئے۔

مخدوم زادہ شاہ عالم کو سلام اور یہ پیام کہ بطلان حسِ حافظہ کے سبب آپ کے اخوان کے نام بھول چکا ہوں ان سب صاحبوں کی خدمت میں اور میاں برکات حسن صاحب اور چودھری عبدالغفور صاحب (کی خدمت میں) سلام پہنچائیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ مولوی غلام غوث خاں میر منشی نے آپ کا دیباچہ اور میرا مجموعۂ نثر مرتب کرکے منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا ہے۔ اب چھپوانے میں ان کو اختیار ہے[۱]۔

۲۶۔ اگست ۱۸۶۶ء اسداللہ

شاہ عالم

(۱)

مخدوم زادۂ والا تبار، حضرت شاہ عالم سلام و دعائے درویشانہ قبول فرمادیں۔ آپ کا مع الخیر وطن پہنچنا اور بزرگوں کے قدم بوس اور بھائیوں کے ہم آغوش ہونا آپ کو مبارک ہو:

یوسف از مصر بکنعان آمد

تفرقۂ اوقات، وسفر رام پور و شدت تموز مقتضی اس کی ہوئی کہ ہنوز تمہارے مسودات دیکھے نہیں گئے تا نزول باران رحمت الٰہی اور بھی چپکے بیٹھے رہو۔ اپنے ماموں صاحب کو نیاز معتقدانہ اور اپنے بھائیوں کو سلام مخلصانہ کہیے گا اور اپنے والد ماجد یعنی میرے مرشد ہم عمر و فن کو وہ سلام، جس سے محبت ٹپکے اور اشتیاق برسے، پہنچائیے گا

---

[۱] اس خط میں اغلاً جس دیباچے کا ذکر ہے وہ یقیناً مولوی فرزند احمد صفیر کی کتاب رسالہ تذکیر و تانیث کا دیباچہ ہے جسے تقریظات میں چھاپا جارہا ہے۔ صفیر، صاحب عالم مارہروی کے نواسے تھے۔ آخر میں اپنے اس مجموعۂ مکاتیب کا ذکر ہے جس کی ابتداء چودھری عبدالغفور سرور نے کی تھی۔ میر منشی غلام غوث خاں نے اس میں مزید خطوط شامل کردیے اور یہ "عود ہندی" کے نام سے میرٹھ میں چھپا۔

اور عرض کیجیے گا کہ آرزوے دیدار حد سے گزر گئی۔ یا رب جب تک حضرت صاحب عالم کو مارہرہ میں اور انور الدولہ کو کالپی میں نہ دیکھ لوں اور ان سے ہم کلام نہ ہو لوں، میری روح کو قبض کا حکم نہ ہو۔ لیکن ۱۲۷۷ھ میں دو مہینے باقی ہیں۔ اب کے محرم سے اس ذی الحجہ تک میرا مدعا حاصل ہو جائے۔

مشفقی و مکرمی چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہیے گا اور یہ پیام پہنچایئے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقید مارہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے:

خواہش وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں

ان کے اس خط کا جواب، جو پرسوں مجھ کو پہنچا ہے، موم جامہ میں لپیٹ کر بھیجوں گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ہاں جناب شاہ عالم صاحب، پھر روے سخن آپ کی طرف ہے۔ جناب میر وزیر علی صاحب بلگرامی یہاں تشریف لائے اور میرے مسکن سے ایک تیر پرتاب کے فاصلے پر چاندنی چوک میں قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اترے ہیں۔ مرفی صاحب کا کام ان کے سپرد ہوا ہے۔ یعنی ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں اور ہزار روپے تک کا مقدمہ عدالت دیوانی کا بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہنوز قائم مقام ہیں۔ وہ صاحب جس کا نام لکھ آیا ہوں بطریق رخصت سپاٹو گیا۔ ایک دن فقیر بھی ان کے مکان پر چلا گیا تھا۔ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں ان میں جمع ہیں۔ آنکھیں ان کے حسن صورت سے روشن ہو گئیں۔ واہ خاک پاک بلگرام، میں نے وہاں کے جس بزرگوار کو دیکھا، بہت اچھا پایا۔

(۱۸۶۰ء)

(۲)

مخدوم زادۂ عالی شان، مقدس دودمان، حضرت شاہ عالم، امن و امان و عزّ و شان و علم و عمر سے برخوردار ہیں۔ ہمارے حضرت ہم کو بھول گئے۔ ہاں سچ ہے ان کا لطف چودھری عبدالغفور صاحب کے جوہر مہر و محبت کا عرض تھا۔ جب جوہر نہ رہا تو عرض کہاں؟ بہرحال جناب حضرت صاحب عالم صاحب کو میری بندگی پہنچ جائے اور یہ سطریں ان کی نظر سے گزر جائیں۔ چودھری عبدالغفور خاں صاحب کو سلام کہیے گا اور یہ پوچھیے گا کہ قصیدہ کا بعد اصلاح کے نہ پہنچنا میرا گناہ ہے یا اس کے سوا کوئی اور قصور ہے؟ اگر کوئی جرم ہے تو معاف کیجیے، اگر کوئی اور جرم بھی ہے تو مجھے اطلاع دیجیے۔

ان دو پیام کی تبلیغ کے بعد پھر روے سخن آپ کی طرف ہے۔ آپ کا خط میرے نام کا اور اس کے ساتھ ایک خط ڈپٹی میر وزیر علی صاحب کے نام کا پہنچا۔ وہ پڑھا اور بھجوا دیا۔ جو آدمی خط لے کر گیا تھا، وہ دوبارہ جواب مانگنے کو گیا۔ پہلی بار حکم ہوا کہ کل آئیو، دوسری بار حضرت نہ ملے، میں نے اس کے جواب سے قطع نظر کر کے اپنی خدمت گزاری کی آپ کو اطلاع دی۔

یاے تحتانی لکھ چکا تھا کہ ایک چپراسی آیا اور اس نے خط تمھارے نام کا ٹکٹ لگا ہوا دیا اور کہا کہ ڈپٹی صاحب نے سلام کہا ہے اور یہ خط دیا ہے۔ اب میں یہ خط اپنا مع ان کے خط کے ڈاک گھر میں بھیجتا ہوں۔ صبح کا وقت یک شنبہ کا

دن ۸۔صفر اور ۲۵۔اگست کی ہے۔ ڈپٹی صاحب چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں رہتے ہیں۔ باقی ان کے حالات ان کے خط سے معلوم ہو جائیں گے۔ اپنے ماموں صاحب کی خدمت میں نیاز اور اپنے بھائی صاحبوں کی خدمت میں فقیر کی دعا پہنچائیے گا۔ والسلام

۸۔صفر (۱۲۷۷ھ) ۔ ۲۵۔اگست (۱۸۶۰ء)

(۳)

مخدوم زادہ مرتضوی نژاد کو فقیر غالب علی شاہ کی دعائے خیر پہنچے۔ میں ۱۲۔اکتوبر ۱۸۶۵ء یعنی حال کو رام پور میں پہنچا ہوں اور دسمبر تک اقامت کا ارادہ ہے۔ آپ جواب لکھیں تو رام پور افغاناں اندرون قلعہ سرنامے پر پتا لکھیں۔ کل حضرت کا خط پہنچا، آج اس کا جواب لکھتا ہوں۔ میر محمد علی خوشنویس کے نام سے میرے کان آشنا نہیں، مگر ہاں میر نیاز علی صاحب کو جانتا ہوں۔ خدا خیر کرے وہی ہوں جو میرے خیال میں آئے ہیں۔ یہاں سے میں اس باب میں کچھ نہیں لکھ سکتا، بشرط حیات دِلّی پہنچ کر لکھوں گا اور جو کچھ معلوم ہو جائے گا، وہ آپ کو لکھوں گا۔ حضرت، میرے پاس میری تصنیفات سے کچھ نہیں۔ کلیات فارسی مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں اور کلیات اردو مطبع کان پور میں اور "دستنبو" مطبع رہیل کھنڈ بریلی میں موجود ہیں جو صاحب جس کے مشتاق ہیں اس مطبع سے منگوا لیں اور اگر مجھ کو یہ خدمت بجا لانی چاہیے تو بشرط حیات ہر جگہ سے ہر چیز منگوا کر بھیج دوں گا۔ میرے پیر و مرشد کی خدمت میں میری بندگی عرض کر دو اور کہو کہ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت با کرامت رکھے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر امید وصال نہ ہو تو روح کو جسم سے باہر کر سکتے ہیں۔ فقیر بقول غالب علیہ الرحمۃ؛

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
این کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

رام پور آیا ہوں اور قلعہ میں زیر سایۂ کاخ والی شہر اترا ہوں، اپنا یہ مقطع پڑھ رہا ہوں؛

اتفاقی سفر افتاد بہ پیری غالب
آنچہ از دست نیاید ز عصامی آید

ظاہرا دسمبر تک یہیں رہوں گا۔ چودھری عبدالغفور صاحب کو کچھ نہ کہیے، اگر آپ ان کے آگے میرا نام لیجیے گا تو وہ خفا ہو جائیں گے۔ خبر شرط ہے۔

دوشنبہ ۶۔ نومبر ۱۸۵۶ء
مطابق ۱۷۔جمادی الآخری ۱۲۸۲ھ

جواب کا طالب
غالب

سیّد مقبول عالم

ایک شعر میں نے بہت دن سے کہہ رکھا ہے۔ اس خیال سے کہ میرے بعد کوئی میرا دوست میرا مرثیہ لکھے تو اس شعر کو بند قرار دے کر ترکیب بند رقم کرے۔ وہ شعر یہ ہے:

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مُرد
اسد اللہ خاں غالبؔ مُرد[1]

دو صاحبوں کو اس کام کے واسطے اپنے ذہن میں ٹھہرایا۔ ایک تو نواب مصطفیٰ خاں سو انھوں نے شعر کہنے سے توبہ کی۔ دوسرے نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ وہ اکثر بیمار رہتے ہیں اور شعر کم کہتے ہیں۔ پس اب میں اپنے پیر و مرشد صاحب عالم سے اس عنایت کا امیدوار ہوں کہ یہ کاغذ اپنے پاس رہنے دیں اور وقت پر ترکیب بند لکھیں۔ اللہ اللہ اللہ[2]



قاضی عبدالجمیل جنونؔ

عبدالجمیل نام، جنونؔ تخلص۔ سنہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں بانس بریلی میں پیدا ہوئے اور اس شہر کے رؤسا میں سے تھے۔

ان کے اجداد مغلوں کے عہد میں مصر سے ہندوستان آئے اور معزز عہدوں پر مامور رہے۔ ایک بزرگ آخر میں بانس بریلی کے قاضی مقرر ہوئے تھے، اس لیے وہیں مقیم ہو گئے۔ اس عہدے کے باعث خاندان کے تمام افراد قاضی کہلانے لگے۔

قاضی عبدالجمیل نے اٹھارہ برس کی عمر تک عربی و فارسی میں علوم رسمیہ کی تکمیل کر لی تھی۔ خط و کتابت کے ذریعے سے غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔ آخری عمر میں اپنا سارا کلام تلف کر دیا، صرف تھوڑے سے اشعار باقی رہ گئے، جو ان کے صاحبزادے قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی کی نوازش سے "خمخانۂ جاوید" نیز ادبی خطوط غالبؔ میں نقل ہوئے ہیں۔ دستنبوے کا دوسرا ایڈیشن بریلی میں قاضی صاحب ہی کے زیر نگرانی چھپا تھا۔

جنونؔ غالبؔ کو وقتاً فوقتاً آموں کے تحفے بھیجتے رہتے تھے اور غالبؔ نے ایک مرتبہ دہلی سے قلمیں اور

---

[1] شاہ مقبول عالم حضرت صاحب عالم مارہروی کے خلف اصغر تھے۔ عجیب امر یہ ہے کہ میرزا کا مرثیہ خواجہ حالیؔ اور میر مہدی مجروحؔ نے لکھا۔ خواجہ حالیؔ نے ایک جگہ اس شعر کو ایک بند کی ٹیپ بنایا۔ مجروحؔ نے اسی کو بند قرار دے کر ترجیع بند لکھا۔ [2] معلوم نہیں صاحب عالم مارہروی نے بھی کچھ لکھا یا نہ لکھا۔

سیاہی بھیجی۔ مطبوعہ نسخوں میں ان کے نام صرف سترہ خط ہیں، لیکن منشی مہیش پرشاد مرتّب خطوط غالب نے قاضی عبدالجمیل کے صاحبزادے قاضی محمد خلیل کی نوازش سے تیرہ نئے خط حاصل کر لیے ہیں۔ میں نے انھیں بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا۔ ادبی خطوط غالب میں مرقوم ہے کہ جنون کو ۱۸۹۶ء میں خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ وفات ۲۰۔ مئی ۱۹۰۰ء کو ہوئی (تلامذۂ غالب)

(۱)

مخدوم مکرم و معظم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب کی خدمت میں بعد ابلاغ سلام مسنون الاسلام کے عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کی ارادت میرا ذریعۂ فخر و سعادت ہے۔ دو عنایت نامے آپ کے اوقات مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیے اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حروف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری اچھی ہے اور میں عینک کا محتاج نہیں، لیکن با ایں ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں۔ چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ اور معہذا میرا اندیشہ آپ کو بدیہی ہو جائے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ اس میں اصلاح کہاں دی جائے۔ واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجیے، اس میں بین الافراد و بین المصرعین[1] فاصلہ زیادہ چھوڑیئے۔ اب کے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے حروف اس کے روشن ہیں مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم۔ آپ کی خاطر سے رنج کتابت اٹھاتا ہوں اور ان دونوں غزلوں کو بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں۔ مسودہ تو آپ کے پاس ہوگا، اس سے مقابلہ کر کر معلوم کر لیجیے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کون سی بیت موقوف ہوئی۔

مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے[2]، اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو، اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو۔ والسلام مع الاکرام ۱۲

۱۸۵۴ء

اسداللہ

(۲)

قبلہ،

آپ کو خط پہنچنے میں تردد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، گاہ گاہ انگریزی بھی اور ڈاک کے ہرکارے میرا گھر جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے، وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلّہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ لال کنواں لکھتے رہے اور مجھ کو بلی ماراں میں خط پہنچتا رہا۔

---

[1] یعنی شعروں اور مصرعوں کے درمیان [2] لال قلعہ کے حالات دیکھ کر کتنا صحیح احساس پیدا ہوا۔



یہ اب کے آپ نے حکیم کالے کا نام کیسا لکھا ہے ؟ اس غریب کو تو شہر میں کوئی جانتا بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہُوا۔ جو آپ نے بھیجا وہ مجھ کو پہنچا۔ جواب لکھنے میں جو میری طرف سے تصور ہوتا ہے، اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ حضرت مہینا بھر میں نو پتے لکھتے ہیں۔ میں کہاں تک یاد رکھا کروں ؛ ایک مکان ہو تو لکھ رکھوں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں ؛ میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسو پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں ؟

اب آپ کے خط میں تین مطلب جواب لکھنے کے قابل تھے :

ایک وہ رباعی جو آپ نے اس ننگ آفرینش[۱] کی مدح میں لکھی ہے۔ اُس کا جواب بندگی ہے اور کورنش اور آداب۔

دوسرا امر عاطفت کے نہ پہنچنے کا وسوسہ، سو اس کا جواب لکھ چکا۔

تیسرا امر جناب مولوی اللہ یار خاں صاحب کا میرے ہاں آنا اور میرا اُس وقت مکان میں موجود نہ ہونا۔

واللہ مجھ کو بڑا رنج ہُوا۔ اگر آپ سے ملیں تو میرا اسلام کہیے گا اور میرا ملال ان سے بیان کیجیے گا۔ صبح کو میں ہر روز قلعے کو جاتا ہُوں۔ ظاہراً مولوی صاحب اول روز آئے ہوں گے۔ جب سوار ہو جاتا ہُوں، تب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھتے، حُقہ پیتے۔ اگر قلعے جاتا ہُوں تو پہر دن چڑھے آتا ہُوں۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں ؟

نگاشتہ نہم ربیع الاول ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۰۔ نومبر ۱۸۵۵ء   از اسد

—(۳)—

پیر و مرشد،

فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے۔ جو حکم آپ کا ہوتا ہے، اس کو بجا لاتا ہُوں۔ مگر معدوم کو موجود کرنا میری وسع قدرت سے باہر ہے۔ اس زمین میں کہ جس کا آپ نے قافیہ و ردیف لکھا ہے، میں نے کبھی غزل نہیں لکھی۔ خدا جانے مولوی درویش حسن صاحب نے کس سے اُس زمین کا شعر لے کر میرا کلام گمان کیا ہے۔ ہر چند میں نے خیال کیا، اس زمین میں میری کوئی غزل نہیں۔ دیوان ریختہ چھاپے کا یہاں کہیں کہیں ہے۔ اپنے حافظے پر اعتماد نہ کر کر اس کو بھی دیکھا۔ وہ غزل نہ نکلی۔ سُنیے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں۔ چنانچہ انھیں دنوں میں ایک صاحب[۲] نے مجھے آگرے سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجیے :

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

میں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ اگر یہ کلام میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانۂ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا :

اسد اس جفا پر بُتوں سے وفا کی
مرے شیر، شاباش رحمت خدا کی

---

[۱] یعنی خود میرزا غالب [۲] منشی شیونرائن آرام جیسا کہ ان کے نام کے مکتوب مرقومہ ۲۶۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں مذکور ہے۔

میں نے سُن کر عرض کیا کہ صاحب، جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اُس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسدؔ اور "شیر" اور "بُت" اور "خدا" اور "جفا" اور "وفا" میری طرزِ گفتار نہیں ہے۔ بھلا ان دونوں شعروں میں تو اسدؔ کا لفظ بھی ہے، وہ میرا شعر کیوں کر سمجھا گیا؟ واللہ باللہ وہ شعر "خدنگ" "رنگ" کے قافیہ کا میرا نہیں ۱۲ والسلام

مرسلہ جمعہ ۲۵ ماہ صیام (۱۲۷۵ھ) و ۲۹۔ اپریل سال حال (۱۸۵۹ء) غالب

(۴)

حضرت،

کیا ارشاد ہوتا ہے؟ آگے اس سے جو آپ کے اشعار آئے تھے، وہ دو دن کے بعد اصلاح دے کر بھیج دیے۔ خط ڈاک میں تلف ہو جائے تو میرا کیا گناہ؟ آج آپ کا یہ خط صبح کو آیا، میں نے آج ہی دوپہر کو دیکھ کر ڈاک میں بھجوا دیا، اب پہنچے یا نہ پہنچے۔

دو باتیں سنیے: "طرح" بسکون رائے قرشت بہ معنی فریب ہے، لیکن اُردو میں یہ لفظ مستعمل نہیں۔ وہ دوسرا لغت ہے۔ "طرح" بحرکت رائے قرشت، بروزن "فرح" اس کو بسکون رائے مہملہ بولنا عوام کا منطق ہے۔ معاذاللہ! اگر تقریر میں اس طرح یعنی بہ سکون بولوں، تو زبان اپنی کاٹ ڈالوں، چہ جائے آنکہ نظم میں لاؤں۔ ہاں غزل "طرح" کی، زمین "طرح" کی، یہ بسکون ہے اور بمعنی "روش و طرز"، "طرح" ہے بہ فتحتین۔

(دستاں ......) افسانہ نہیں۔ دستاں کے تین معنی ہیں: ایک تو رستم کے باپ کا نام اور وہ عَلَم ہے۔ دوسرے ...... تیسرے آوازِ خوش اور یہ جو بلبل ہزار داستان کہتے ہیں، سوقی اور فرومایہ (لوگ کہتے) ہیں صحیح "ہزار دستاں" ہے، یعنی بہت طرح کی آوازیں بولتا ہے۔[1]

جناب مولوی احمد حسن صاحب عرشی[2] کو میرا اسلام پہنچے۔

(۲۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

(۵)

صاحب،

وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے، مجھ کو پہنچا اور میں نے اس خط کا جواب تم کو بھیجا اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر۔ ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور

---

[1] تمام مطبوعہ نسخوں میں یہ خط ناقص چھپا۔ منشی مہیش پرشاد مرتب "خطوط غالب" نے اصل سے مقابلہ کیا تو وہ عبارت بوجہ غیر معلوم حذف ہو گئی جسے اب انھوں نے قوسین میں درج کر دیا ہے۔ جہاں نقطے ہیں اس جگہ کی عبارت کیڑا کھا گیا ہے۔ [2] یہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے بڑے بھائی تھے اور غالب کے شاگرد، حج کے لیے جا رہے تھے، بڑودہ میں بیمار ہو کر فوت ہو گئے۔ ان کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔

آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پہ کھڑا ہے، پابرکاب ہوں۔

طرح بالفتح بمعنے "نمونہ" اور بمعنے "فریب" سچ، لیکن طرح بفتحتین اور چیز ہے۔ غیاث الدین رام پور میں ایک ملا ئے مکتبی تھا، ناقل نا عاقل۔ جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا؟

کیستم من کہ "تا ابد بزیم

لاحول ولاقوۃ! یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا ابد بزیم" یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے:

کیستم من کہ جاوداں باشم　　چوں نظیری نماند و طالب مرد
ور بگویند در کدامیں سال　　مرد غالب؛ بگو کہ "غالب مرد"[1]

یہ مادۂ تاریخ ازروئے نجوم نہیں، بلکہ ازروئے کشف ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

پنجشنبہ ۸۔ ستمبر ۱۸۵۹ء　　　غالب

(۶)

حضرت،

بہت دنوں میں آپ نے مجھے یاد کیا۔ سال گزشتہ ان دنوں میں، میں رام پور تھا۔ مارچ ۱۸۶۰ء میں یہاں آگیا ہوں اور یہیں میں نے آپ کا خط پایا ہے۔ آپ نے سرنامہ پر رام پور کا نام ناحق لکھا۔

حق تعالیٰ والی رام پور کو صد و سی سلامت رکھے، ان کا عطیہ ماہ بماہ مجھ کو پہنچتا ہے۔ کرم گستری و استناد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنج سفر اٹھانے کی اور رام پور جانے کی حاجت نہیں۔ مولوی احمد حسن عرشی کے فراق کو نہیں سمجھا کہ کیوں واقع ہوا، بلکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ اور وہ یکجا کہاں تھے اور کب تھے؟ خلیفہ حسین علی صاحب، رام پور میں مجھ سے ملے ہوں گے۔ مگر واللہ مجھ کو یاد نہیں۔ نسیان کا مرض لاحق ہے۔ حافظہ گویا نہ دارد۔ شامہ ضعیف، سامعہ باطل، باصرہ میں نقصان نہیں۔ البتہ حدت کچھ کم ہوگئی ہے[2]

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

بہرحال چونکہ میں دلّی میں ہوں اور وہ رام پور گئے ہیں تو البتہ وہ آپ کے پیام جو اُن کی زبان کے محول تھے، بدستور اُن کی تحویل میں رہے اور مجھ تک نہ پہنچے۔ یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آجائے گا تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا:

---

[1] یہ قطعہ یُوں بھی دیکھا اور سُنا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم؛　　چوں نظیری نماند و طالب مرد
ور بہ پرسند در کدامیں سال　　مرد غالب؛ بگو کہ غالب مرد

[2] یعنی نظر پہلے کی طرح تیز نہیں رہی۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ... الخ

ایک دوست کے پاس بقیۃ النہب والغارۃ[1] میرا کچھ کلام موجود ہے، اُس سے یہ غزل لکھ کر بھیج دوں گا۔

(دلی میں ایک حکیم تھے، ان کا نصر اللہ خاں نام تھا۔ وہ مر گئے اس نام کا کوئی وکیل عدالت دیوانی بھی مَیں نے نہیں سُنا۔ کیسا ڈیرہ پور، کیسا کان پور۔ اب میں کس سے پوچھتا پھروں کہ نصر اللہ خاں کے تم آشنا ہو یا نہیں؟ جب حضرت کو ان کا مسکن مع عہدہ معلوم ہے، تو پھر ان کے احباب کو کیوں ڈھونڈتے ہو؟

غزلیں اصلاح کے بعد پہنچتی ہیں۔

نجات کا طالب غالب

"ننگے پاؤں" واو کے ضمے کو اشباع کیسا؟ یہ تو ترجمہ "پابرہنہ" کا ہے (یعنی "یافتن" سے) اور پھر پاؤں کی یہ املا غلط "پانو"، "گانو"، "چھانو"

"گھنسیٹے گا" نون کیسا؟ "گھسیٹے گا" اس کی املا یوں ہے)[2]

۲۲۔ فروری ۱۸۶۱ء

(۷)

جناب قاضی صاحب کو بندگی پہنچے۔

عنایت نامہ کے ورود نے شادمان کیا، مگر امور مبہمہ جو نگارش پذیر تھے، اُنھوں نے حیران کیا۔ ابہام کی توضیح اور اجمال کی تفصیل کا مشتاق ہوں۔ آموں کے باب میں جو کچھ لکھا یہ کیوں لکھا؟ اہدا کو دوام کیا ضرور ہے۔ خصوصاً جبکہ بذاتِ خود حادث ہو؟ حضرت اب کے سال ہر جگہ آم کم ہے اور جو کچھ ہے وہ خشک اور بے مزہ ہے۔ آم کہاں سے ہو؟ نہ مہاوٹ، نہ برسات۔ دریا پایاب ہو گئے، کنویں سُوکھ گئے۔ اثمار میں طراوت کہاں سے ہو؟ جناب اس کا خیال نہ فرمائیں۔ اپنے کشف کو غلط کر دوں گا،[3] برشکال آیندہ تک جیوں گا۔ آپ کے موہبتی آم کھاؤں گا۔

جون ۱۸۶۱ء

جواب کا طالب غالب

(۸)

..... سلامت،

یہ عہدہ آپ کو مبارک ہو اور مجھ کو اسی طرح صدر الصدوری کے منصب کی مبارکباد لکھنی نصیب ہو۔ غزلیں دیکھ کر بھیجتا ہوں۔ اب کے اصلاح کی حاجت کم پڑی۔

"بردۂ" "رفتۂ" یہ جتنے الفاظ ہیں ان میں بائے تحتانی نہیں لکھتے۔ پس رہی ہائے انتہائی حرکت رہتی ہے

---

[1] لوٹ سے بچا ہوا۔ [2] اس خط کے جو حصے قوسین میں ہیں، وہ منشی مہیش پرشاد نے اصل خط سے مقابلے کے بعد نکالے ہیں۔ پہلے نقل و طباعت میں رہ گئے تھے [3] یعنی مرنے کے متعلق جو پیشگوئی بر بنائے کشف کی ہے، اسے غلط ثابت کر دوں گا اور مزید جیوں گا۔ مر نہیں جاؤں گا۔

پس اگر وہ ساکن ہے تو تو "رفتہ"، "بردہ" اسی صورت رہے گی اور اگر اس کو حرکت لازم آئے تو علامت حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے گا۔ "رفتۂ"، "آمدۂ" اور ان معنوں کے سب صیغوں کا یہی حال ہے۔

پان کا شعر کاٹ ڈالا، وجہ یہ ہے کہ پہلے تو میں "پاں" کا نون بے اعلان بروزن "آں" پسند نہیں کرتا.....[ل]

(۹)

جناب مخدوم و مکرم کو میری بندگی،

تفقد نامہ مرقومۂ ۱۲۔ ستمبر میں نے پایا۔ حضرت کے سلامت حال پر خدا کا شکر بجا لایا۔ کوئی محکمہ تخفیف میں آئے، کوئی گاؤں مثلاً لٹ جائے، آپ کا عہدہ آپ کو مبارک، آپ کا دولت خانہ سلامت۔ ہاں وہ جو اپنے ابن الخال کا اس محکمہ میں وکیل ہونے کا آپ کو کھٹکا ہے، البتہ بجا ہے۔ جب آپ ظاہر کر چکے ہیں تو اس کا اندیشہ کیا ہے، حاکم سمجھ لے گا، وہ وکیل ہیں، محکمہ منصفی میں نہ رہیں گے، محکمۂ صدر امین و سشن جج میں کام کریں گے۔

میں نہ تندرست ہوں، نہ رنجور ہوں، زندہ بدستور ہوں۔ دیکھیے کب بلاتے ہیں[۲]، اور جب تک جیتا رہوں اور کیا دکھاتے ہیں؟ والسلام بالوف الاحترام ۱۲

یکشنبہ ۲۹۔ ستمبر ۱۸۶۱ء — نجات کا طالب غالب

(۱۰)

از اسد بندگی برسد۔ حضرت، یہ غزل قطعہ بند ہے۔ پس خطاب مطلع میں چاہیے مطلع دو دو لکھنے، یہ ایجاد ریختہ والوں کا ہے۔

جناب مولوی اساس الدین صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔

(۱۱)

"اے مشفق من"[۳]، نامربوط اور قبیح، ٹکسال باہر۔ اس شعر کو دور کرو۔ اگر کوئی اور شعر ہاتھ نہ آئے اور اسی کو رکھنا چاہو تو یوں رکھو:

گالیاں دیتے ہو کیوں مشفق من، خیر تو ہے؟

(۱۲)

آداب عرض کرتا ہوں اور چاروں غزلیں دیکھ کر، جا بجا حک و اصلاح کر کر بھیجتا ہوں۔

(۱۳)

"خستہ کام" اور "اندیشہ کام" دونوں لفظ ٹکسال باہر ہیں۔ ہاں "ناکام" اور "دشمن کام" اور "دوست کام"

---

[۱] دوسری وجہ اصل خط میں نہیں لکھی [۲] مطلب یہ کہ کب موت کا بلاوا آتا ہے۔ [۳] مطلب یہ ہے کہ شعر میں محبوب کو "اے مشفق من" کہہ کر خطاب کرنا ٹھیک نہیں۔

لکھتے ہیں اور "تشنہ کام" اور ترکیب ہے۔ "کام" بہ معنی "تالو" کے ہے، نہ بہ معنی "مقصد" و "مدعا"۔ کاغذ لفافے میں اس طرح لپیٹا کیجیے کہ کھلنے کی جگہ باقی رہے۔

—(۱۴)—

"تڑپھنا" ترجمہ "تپیدن" کا املا یوں ہے، نہ "تڑپنا"۔ ہائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط اللفظ ضرور ہے۔

معشوق کو صاحب لکھنا چاہیئے نہ کہ "حضرت" اور جو ایک دو جگہ اصلاح ہے، اس کی توضیح کی حاجت نہیں۔ فارسی غزل، خیر اگر آپ کا جی چاہے تو رہنے دیجیے۔ جس طرح اس میں کہیں سقم نہیں، اسی طرح لطف بھی نہیں۔

—(۱۵)—

"زیرون خانہ" کا لفظ خلاف روزمرہ۔ علاوہ اس سے یہ احتمال ہوتا ہے مگر خود اس شخص کے گھر میں دخل غیر ہے۔

—(۱۶)—

جناب مولوی صاحب،

آپ کے دونوں خط پہنچے، میں زندہ ہوں، لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحب فراش میں ہوں۔ بیس دن سے پاتو پر ورم ہو گیا ہے۔ کف پا و پشت پا سے نوبت گزر کر پنڈلی تک آ ماس ہے۔ جوتے میں پاؤں سماتا نہیں۔ بول و براز کے واسطے اٹھنا دشوار۔ یہ سب باتیں ایک طرف، درد مخلل روح ہے۔ ۱۲۷۷ ہجری میں میرا نہ مرنا، صرف میری تکذیب کے واسطے تھا[1]، مگر اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زلیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں؟ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے، جس طرح طائر قفس میں۔

کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ یہ جو لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقع ہے،

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم

ایسے مخمصے میں اگر تحریر جواب میں قاصر رہوں تو معاف ہوں۔

صبح جمعہ یکم محرم سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۹۔ جون سنہ ۱۸۶۳ء   نجات کا طالب غالب

---

[1] آپ توجیہات کے پر لطف ہونے پر غور کریں۔ پہلے پیشگوئی کی کہ سنہ ۱۲۷۷ھ میں مرجاؤں گا اور خود ہی تاریخ بھی کہہ لی۔ بعد میں کہا کہ یہ پیشگوئی از روئے نجوم نہیں، بلکہ از روئے کشف ہے۔ جب یہ پوری نہ ہوئی تو کہا وبا پھیل گئی تھی اور مرگ عام میں مرنا میرے لیے کسر شان کا باعث تھا اس لیے نہ مرا۔ اب فرماتے ہیں کہ وہ پیشگوئی اس لیے غلط ثابت ہوئی کہ میری تکذیب ہو، میں نے جو غیر مناسب دعویٰ کیا تھا، اس کا جھوٹ ظاہر ہو جائے۔

(۱۷)

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی،

مکرمی مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی کا قول سچ ہے[1]۔ اب میں تندرست ہوں۔ برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی عمر، جتنا خون بدن میں تھا، بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن نمو کہاں جواب پھر تولید دم صالح ہو؛ بہر حال زندہ ہوں اور ناتواں اور آپ کی پرسش ہائے دوستانہ کا ممنون احسان۔ والسلام مع الاکرام ۱۲

دو شنبہ ۱۸۔ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ
مطابق سی ام نومبر ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب غالب

(۱۸)

قبلہ،

مجھے کیوں شرمندہ کیا؛ میں ثنا و دعا کے قابل نہیں، مگر اچھوں کا شیوہ ہے بُروں کو اچھا کہنا۔ اس مدح گستری کے عوض میں آداب بجالاتا ہوں[2] ۱۲

شنبہ ۱۵۔ دسمبر ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب، غالب

(۱۹)

جناب قاضی صاحب کو سلام اور قصیدہ کی بندگی،

اگر مجھے قوت ناظمہ[3] پر تصرت باقی رہا ہوتا تو قصیدے کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔ بات یہ ہے میں اب رنجور نہیں، تندرست ہوں، مگر بوڑھا ہوں۔ جو کچھ طاقت باقی تھی، وہ اس ابتلا میں زائل ہو گئی۔ اب ایک جسم بے روح متحرک ہوں؛

یکے مردہ شخصم بمروی رواں

اس مہینے یعنی رجب سنہ ۱۲۸۰ھ سے سترھواں برس شروع اور استقام و آلام کا شیوع[4] ہے۔ لاموجود الا اللہ

---

[1] منشی غلام غوث خاں بے خبر سے مکتوب الیہ کو معلوم ہوا کہ میرزا اب اچھے ہیں اور یہ بات میرزا کو لکھ بھیجی [2] اس سے ظاہر ہے کہ مکتوب الیہ نے میرزا کی مدح میں قصیدہ بھیجا تھا [3] مطبوعہ نسخوں میں قوت ناطقہ ہے۔ "خطوط غالب" قوت ناظمہ ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ موقع و محل نظم کا ہے قطعہ و قصیدہ کہنے کے لیے [4] یہاں مطبوعہ "عود ہندی" میں لفظ آغاز ہے جو غالباً کسی مصحح نے خود بنایا ہے۔ اس لیے کہ ایک فقرے کے دو ٹکڑوں کے اختتام پر شروع کی تکرار اسے اچھی نہ لگی۔ مرتب "خطوط غالب" نے "شروع" لکھا لیکن غالب نے شیوع بہ قافیہ شروع لکھا ہو گا۔ میں نے اصل خط نہیں دیکھا لیکن یقین ہے کہ شیوع ہی ہو گا۔

✦ ✦ ✦

ولا مؤثر فی الوجود الا اللہ ۱۲

بست و ہفتم رجب ۱۲۸۰ھ

ہفتم جنوری ۱۸۶۴ء　　　　نجات کا طالب غالب

(۲۰)

مہ شوال کو کیا دیکھے جنونِ غمگیں

خنجر ناز نہیں ، ابروے خمدار نہیں

پیر و مرشد،

ماہ شوال کو خنجر و شمشیر سے کیا علاقہ؟ ہلال رمضان دیکھ کر تلوار کو دیکھتے ہیں اور ہلال شوال دیکھ کر سبز کپڑا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اشعار بہت ہیں، ان میں سے کسی کو دیکھ کر مقطع کر دیجیے۔

ہفتم فروری ۱۸۶۴ء　　　　غالب

(۲۱)



غزل سراسر ہموار و ذوق انگیز ہے۔ ایک شعر میں ایک لفظ بنایا گیا، ایک شعر کا پہلا مصرع بدل دیا گیا۔ مومن خاں کے اس مصرع میں تردد کیا ہے:

تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

"سے" بہ معنی "از" نہیں ہے بلکہ بہ معنی "مثل" و "مانند" ہے، یعنی "چوں تو دشمن اگر تہنیت دہد بر آں چہ اعتبار"؛

وصل کے وعدے سے ہو دل شاد کیا
تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

یعنی اگر تم نے کہا کہ لو مبارک ہو، کل ہم آئیں گے یا تجھے بلائیں گے۔ ہم ایسے وعدے سے کیا خوش ہوں؛ تم جیسے دشمن کی مبارک باد دینے سے کیا ہوتا ہے؟

۱۹۔ مارچ ۱۸۶۴ء　　　　غالب

(۲۲)

سہسوان کے صاحب اگر "قاطع برہان" کا جواب لکھتے ہیں، خدا ان کو توفیق دے کہ عبارت کے معنی سمجھ لیں، تب جواب لکھیں۔ والسلام[1]

چہارم اپریل ۱۸۶۴ء

---

[1] یہ کون صاحب تھے؟ انھوں نے جواب لکھا یا نہ لکھا؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ بہ ہر حال سہسوان کے کسی صاحب کا جواب چھپا نہیں۔

(۲۳)

حضرت سلامت،

میاں قدرت اللہ کا تردد بجا۔ "پیش از صبح صادق" نماز کیسی؟ یہ کاتب اوّل کی خوبی اور نقل کرنے والوں کی غفلت ہے۔ اصل فقرہ یہ ہے:

خود بدولت پیش از صبح صادق برخاستہ، بعد بانگ صلوٰۃ، با جماعت فضلا نماز صبح ادا کردہ، بہ جھروکۂ درشن تشریف مے آوردند۔

حضرات نے بہ نفس نفیس بڑھا دیا اور "برخاستہ" کو بجبر اٹھا دیا۔ صبح صادق سے پہلے یعنی دو تین گھڑی رات رہے اُٹھتے اور ضروریات سے فراغت کرتے۔ وضو کے مراسم بجالاتے۔ جب مؤذن اذان دیتا جماعت کی نماز پڑھتے۔ رفع حوائج ضروریہ کو "برخاستہ" کے بعد مقدر چھوڑ جانا بلاغت ہے۔ یعنی اس وقت کے افعال بول و براز ہیں۔ ان کا ذکر مکروہ طبع ہے اور بہ نسبت پادشاہ خصوصاً۔

اور یہ جو فقیر "بہ نفس نفیس" کو غلط کہتا ہے، یہاں ایک دقیقہ ہے یعنی بہت کام ایسے ہیں کہ آدمی آپ بھی کر سکتا ہے اور خادم سے بھی لے سکتا ہے مثلاً چلم پر آگ دھرنا یا پاخانہ میں لوٹا لے جانا اور بہت کام ایسے بھی ہیں کہ ہر شخص کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں، دوسرا نیابۃً نہیں کر سکتا۔ مثلاً حقہ پینا یا پاخانہ جانا۔ سونا، جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ پس افعال مشترکہ میں "بہ نفس نفیس" لکھ سکتے ہیں اور افعال مخصوصہ میں "بہ نفس نفیس" کی قید لغو اور پوچ اور مہمل[۱] ہے۔

میں کیا کروں؟ فی الحال دودمان معنی کا وہ حال ہے، جو ہندوستان کا غدر کے بعد ہو گیا۔ جہلا جانتے نہیں، علماً اعتنا نہیں کرتے۔ چھاپے کو توقیع الٰہی سمجھتے ہیں۔ نسخہ مطبوعہ میں غلطی کا احتمال جائز نہیں رکھتے۔ کاپی نویس کے جرم میں مصنف بیچارہ ماخوذ ہوتا ہے[۲]۔

۸۔ مئی ۱۸۶۴ء   داد کا طالب، غالب

(۲۴)

قبلہ،

ایک سو بیس آم پہنچے۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے۔ دس قلمیں اور چھٹانک بھر سیاہی کہار کے حوالہ کر دی ہے،

---

[۱] سبحان اللہ کیا دقیقہ سنجی اور نکتہ نوازی ہے۔ یہ ہے شان علم و نظر کہ ایک ایک لفظ کے محل و موقع اور معنویت کی پوری دنیا نظروں کے سامنے ہے۔ "بہ نفس نفیس" ویسے بھی بے محل ہے لیکن اس لیے بھی بے محل ہے کہ جن افعال کے موقع پر استعمال ہوا، وہ پادشاہ کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے اور ذاتی افعال میں جو کسی نوع کا اشتراک غیر قبول نہیں کرتے "بہ نفس نفیس" کی قید حشو تھی [۲] غالب کی یہ فریاد بھی بالکل درست ہے۔

خدا خیر کرے بحفاظت آپ کے پاس پہنچے۔ میں مریض نہیں ہوں، بوڑھا ہوں اور ناتواں، گویا نیم جان رہ گیا ہوں۔ ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ کوئی کام دین کا نہیں کیا۔ افسوس! ہزار افسوس!! ۱۲

سہ شنبہ ۲۸۔ جون ۱۸۶۴ء نجات کا طالب، غالب

—(۲۵)—

جنابِ عالی!

وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں میں جانے والا ہوں یعنی عدم، مدعا یہ کہ گم ہو گئی۔ ۱۲

گھات میں مدعا براری کی
تم نے غیروں کی غمگساری کی

تقدیم و تاخیر مصرعتین کر کے رہنے دو۔ اس میں کوئی سقم نہیں۔ مدعا براری کا یقھوں کا لفظ ہے۔ میں اس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں، مگر چونکہ من حیث المعنی یہ لفظ صحیح ہے، مضائقہ نہیں۔

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے۔ بقدر یک مژہ برہم زدن ثبات و قرار ہے۔ حیرت ازالہ حرکت کرتی ہے۔ قطرۂ مے افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بصورت اس تاگے کے بن گیا۔ جس میں موتی پروئے ہوں۔

لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور

یہ بہت لطیف تقدیر ہے۔ "لیتا" کو ربط ہے "چین" سے، "کرتا" مربوط ہے، "آہ و فغاں" سے۔ عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے، بلکہ فصیح و بلیغ۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا، اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔[۱]

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں، نہ سہی، نہ ہم مل سکیں گے، نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں۔ جس سے تو چاہتا ہے، مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل کر لیا تھا، رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے۔

---

[۱] تعقید لفظی ہو یا معنوی، ہر زبان میں معیوب ہے اور میرزا کا شعر اس سے مستثنیٰ نہیں۔

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

مولوی صاحب، کیا لطیف معنی ہیں، واد دینا۔ حسن عارض اور حسن ظن، دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں، یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے، کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسا ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے؟ حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی، ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا، ہوسناک آدمی تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
کہیو سلام میرا اگر نامہ بر ملے!

یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی، مگر کھٹکا یہ ہے کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے۔ ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضع دار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر، اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد معشوق کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، کیسا جواب۔ دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس وقوعے کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب دان تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر؟ اے ندیم تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب، تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا؟

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اس میں کوئی اشکال نہیں۔ جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا؟ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا۔ خدا جانے شہر میں یا لواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔

۲۴۔ اگست ۱۸۶۴ء



—— (۲۶) ——

پیر و مرشد،

نواب صاحب کا وظیفہ خوار، گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا، میں کہاں اور بریلی کہاں۔ ۱۳۔ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرط حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔ نمایش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمایش گاہ کی سیر سے، جس کو دنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں[1]۔ لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ،

---

[1] مطلب ظاہر ہے کہ غالب جب دوسری مرتبہ رام پور گئے تو قاضی عبدالجلیل نے بریلی کی دعوت دی۔ یہ بھی لکھا کر (باقی صفحہ ۴۴۸ پر)

لاموثر فی الوجود الا اللہ۔

۷۔ نومبر ۱۸۶۵ء نجات کا طالب غالب

(۲۷)

آداب بجا لاتا ہوں۔ آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ غزلیں دیکھی گئیں۔ فقیر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کلام میں اسقام و اغلاط دیکھتا ہوں تو رفع کر دیتا ہوں اور اگر سقم سے خالی پاتا ہوں تو تصرف نہیں کرتا۔ پس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان غزلوں میں کہیں اصلاح کی گنجایش نہیں۔

(۲۸)

سبحان اللہ! سر آغاز فصل میں ایسے ثمر ہائے بیش رس کا پہنچنا نوید ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر رُبُّ النوعؑ اثمار ہے۔ اس کی تعریف کیا کروں، کلام اس بات میں کیا چاہتا ہوں کہ میں یاد رہا اور اہدا کا آپ کو خیال آیا۔ پروردگار با این ہمہ رواں پروری و کرم گستری و یاد آوری سلامت رکھے۔ جمعہ کے دن ۸۔ جون کو دوپہر کے وقت کہار پہنچا، اسی وقت خط کا جواب لے کر اور آم کے دو ٹوکرے دے کر روانہ ہو گیا۔ یہاں سے حسب الحکم اس کو کچھ نہیں دیا گیا۔ خاطر جمع رہے۔

(جون ۱۸۶۶ء) خوشنودی کا طالب، غالب

(۲۹)

غزل کے بھیجنے میں دیر لگی۔ قصور معاف ہو۔ جو میرے عزیز بریلی میں وارد ہیں اور ان سے آپ ملتے ہیں، ان کا نام آپ لکھیں تو کمال مہربانی ہو۔

غالب

(۳۰)

جناب مولوی صاحب کو فقیر اسد اللہ کا سلام،

میرزا محمد رضا بیگ ۲، مانوں (ماموں ؟) میرزا علی جان کے پوتے اور میرزا حنیف بیگ کے بیٹے اور میرے بھتیجے ہیں۔ میرزا وقار علی بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ سے پوچھا چاہیے کہ میرزا علی جان بیگ مرحوم رئیس آگرہ ان کے کون ہوتے تھے اور محمد علی بیگ جو لارڈ الن برا بہادر کے زمانے میں دلّی کے منصف ہوتے تھے، وہ میرزا وقار علی بیگ کے کون تھے! میں نے ان صاحبان کو دیکھا نہیں۔ محمد علی بیگ کو دیکھا ہے۔ وہ مانوں میرزا علی جان بیگ مرحوم کے نواسے اور میرے بھانجے ہوتے تھے۔ پس اگر اکسٹرا اسسٹنٹ بہادر محمد علی بیگ کے بھائی ہیں تو وہ بھی میرے بھانجے ہیں۔

چہار شنبہ یکم اکتوبر ۱۸۶۶ء غالب

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۷) یہاں نمایش ہو رہی ہے اسے بھی آگرہ دیکھیے۔ - بہ خط معذرت میں لکھا گیا ۱ نباتات و حیوانات میں سے ہر نوع کی پرورش و نگہداشت کا فرشتہ۔ ۲ بظاہر یہ وہی ہیں جن کے متعلق خط ۲۹ میں استفسار کیا گیا ہے۔ ماموں کا تعلق میرزا علی جان بیگ سے ہے۔

عبدالرزاق شاکرؔ

عبدالرزاق نام، شاکرؔ تخلص۔ اپنے آپ کو جعفری الجیدری لکھتے تھے، جیسا کہ غالبؔ کی تحریر سے ظاہر ہے گورکھ پور کے رہنے والے تھے۔ غالباً وکالت کرتے تھے۔ میرزا محمد عسکری نے تحریر فرمایا ہے کہ اپنے وقت کے مشہور وکیلوں میں سے تھے اور غالبؔ انھیں "اشرف الوکلا" کہتے تھے۔ مالک رام صاحب نے "تلامذۂ غالب" میں لکھا ہے کہ ان کے جد اعلیٰ عرب سے غزنی پہنچے۔ پھر ان کے اخلاف میں سے ایک صاحب شاہان شرقی کے زمانے میں جون پور آئے۔ بعدازاں اس خاندان کی ایک شاخ پھلواری شریف جا بسی، دوسری نے مچھلی شہر میں توطن اختیار کیا۔ شاکرؔ کا تعلق آخری شاخ سے تھا۔ والد کا نام عبدالوہاب، شاکرؔ عربی اور فارسی کے بہت بڑے فاضل تھے۔ جعفری الجیدری کے علاوہ، جعفر الزینبی بھی لکھتے تھے کیونکہ آپ حضرت زینب رضؓ بنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد سے تھے۔ پہلے وکالت کرتے تھے ۱۸۶۲ء میں سرکاری ملازمت قبول کر کے تدریجاً ترقی کرتے کرتے عدالت خفیفہ کی ججی پر فائز ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی۔ جون ۱۹۱۴ء میں بمقام مچھلی شہر انتقال کیا۔ اسّی برس کی عمر پائی۔ تین بیٹے یادگار چھوڑے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میرزا غالبؔ ہی کی زمین میں فارسی کا ایک شعر ہے:

حضرت دہلی مقام حضرت غالبؔ چو شد
غیرت شیراز و رشک اصفہان نامیدمش

غالبؔ کی تحریرات سے مترشح ہوتا ہے کہ شاکرؔ بڑے پایے کے عالم تھے۔ ان کے نام جتنے خطوط بھیجے گئے، ان میں سے کسی پر تاریخ درج نہیں، لیکن عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۶۰ء سے بعد کے ہیں۔ بعض کی تاریخیں بہ آسانی معین کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً خط ۳ غالباً ۱۸۶۴ء کا ہے۔ اس لیے اس میں "دافع ہذیان"، "سوالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی" کا ذکر ہے اور یہ رسالے ۱۸۶۴ء ہی میں چھپے تھے۔ خط ۷ یقینی طور پر اوائل اکتوبر ۱۸۶۵ء کا ہے۔ جبکہ غالبؔ نواب کلب علی خاں مرحوم کے جشن میں شرکت کی غرض سے رام پور جانے والے تھے۔ خط ۸ بلاشبہ رام پور سے لکھا گیا، اس لیے کہ اس میں میرزا رحیم بیگ مؤلف "ساطع برہان" کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"رسالہ اس کا "ساطع برہان" دلّی پہنچ کر ڈھونڈوں گا۔"

خط ۹ جنوری ۱۸۶۶ء کا ہے۔ کیونکہ اس کے آغاز میں رام پور سے مراجعت کا ذکر ہے۔ خط ۱۰ یکم اپریل ۱۸۶۶ء کا مرقومہ ہے۔ اس میں صرف تاریخ درج ہے، سال درج نہیں، لیکن چونکہ آخر مکتوب میں "درفش کاویانی" کا ذکر ہے، جو غالبؔ کے سفر رام پور کے دوران میں چھپی تھی یعنی اواخر ۱۸۶۵ء میں۔

۔ لہٰذا سال کے تعین میں دقت نہیں ہو سکتی۔

(۱)

مخدوم مکرم، مظہر لطف و کرم، جناب مولوی صاحب "اشرف الوکلاء"۔ درویش گوشہ نشین، غالبؔ حزیں کا سلام۔ آپ کے عنایت نامے کے ورود سے میں آپ کا احسان مند ہوا اور دل سے آپ کو دعائیں دیں۔ کیوں حضرت، آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ شخص اتنا فضول اور لغو کیوں ہے؟ خط کے پہنچنے سے اظہار منت پذیری اگر گزاف نہیں تو کیا ہے؟ اب اس خوشی اور دعائیں دینے کی وجہ سنئیے: یعنی آپ کے سبب میں نے اپنے والا برادر از جاں عزیز تر، بہ دل نزدیک واز دیدہ دور، نامہربان، بجز و مغرور، میر قاسم علی خاںؔ[1] کا رقعہ اپنے نام کا پایا۔ اللہ اللہ، اگر آپ باعث نہ ہوتے تو بھائی صاحب کاہے کو مجھ کو خط لکھتے۔ اُنھیں سے پُوچھیے کہ کبھی تم نے اسدؔ کو خط لکھا ہے؟ پس بعد اس توضیح کے آپ کی تحریر کا جواب لکھتا ہوں۔

آپ کا، واسطے اصلاح کلام کے رجوع کرنا میری طرف، موجب نازش کا ہے۔ میرا طریق اس فن خاص میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے اُس کو بدستور رہنے دیتا ہوں اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں، اس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تاکہ آیندہ صاحب کلام اس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔ مطلع کا یہ مصرع،

سرخوش و سرشار و مستم یلّی[2]

لسان فارسی میں "سرشار" صفت ہے پیالے کی، معنی لفظی اس کے لبریز، پس شارب کو لبریز کیوں کر کہیں گے؟ اور یہ جو اُردو میں "مست و سرشار" مترادف المعنی استعمال میں آتے ہیں، امر جداگانہ ہے۔ فارسی میں تتبع اردو کا ناجائز۔

"رند عالم سوز" شعرائے عجم میں بمعنی رند بے نام و ننگ آیا ہے، جیساکہ اُستاد کہتا ہے:

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار

حسن مطلع سست تھا۔ "مے رسد بر بادہ" الخ "بر شیشہ" یہاں انسب ہے۔ "از لحد چوں خاک جستم" الخ خاک کو جستن سے کیا علاقہ؟ "نقد جاں را مہر بستم یلّی" تعقید معنوی ہے۔ "طالب عہد الستم" الخ طالب عہد الست" یعنی عہد الست کس سے مانگتا ہے؟ ہاں "سرخوش عہد الست" برمحل و برموقع۔

متوقع ہوں کہ میرا یہ رقعہ جو آپ کے نام کا ہے۔ جناب میر قاسم علی خاں صاحب کو پڑھا دیجیے گا اور اب جو آپ مجھے خط لکھیں، تو یہ بھی لکھیے گا کہ ہنوز وہ صدر امین ہیں یا ترقی کی اور صدر الصدور ہو گئے اور اگر ترقی نہیں کی تو کیا وجہ؟ ۱۲

(۲)

جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد عبدالرزاق صاحب شاکرؔ کی خدمت میں بعد سلام یہ التماس ہے کہ مولوی صاحب عالی شان مولوی مفتی اسد اللہ خاں[3] بہادر کی خدمت میں فقیر کا سلام پہنچایئے۔ میں تو آپ سے عرض کرتا ہوں، مگر آپ

---

[1] آگرہ اور ہاترس میں منصف رہے۔ بعد میں صدر امین کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے (نادراتِ غالبؔ) [2] فارسی میں کلمہ خوشی و شادمانی [3] مفتی اسد اللہ الہ آبادی بن مفتی کریم قلی، ولادت ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء، مولانا فضل رسول بدایونی اور بعض دوسرے (باقی صہ ۴۵۱ پر)

مفتی صاحب سے کہیے کہ مجھ کو باوجود شدتِ نسیان آپ کا تشریف لانا یاد ہے۔ چھاپے کے اجزاء اُٹھا کر میں نے آپ کے سامنے ایک غزل اپنی پڑھی تھی، جس کے دو شعر قطعہ بند ہیں:

اززندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست ‏ خود را بخاکِ رہ گزرِ حیدر افگنم
منصورِ فرقۂ علی اللّٰہیاں منم ‏ آوازۂ "انا اسداللّٰہ" در انگنم

خدا کرے حضرت کو بھی یہ واقعہ یاد ہو۔ اتحادِ اسمی[1]، دلیلِ مودتِ روحانی ہے۔

اخی مکرم میر قاسم علی خاں کو سلام پہنچے۔ سالِ گذشتہ کی تعطیل کی طرح دِلّی آکر مجھ سے بے ملے نہ چلے جایئے گا۔

پھر حضرت مکتوب الیہ سے کام ہے۔ اشعار بعد حک و اصلاح کے پہنچتے ہیں۔ یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے کہ میں آپ کے کلام میں دخل و تصرف کروں۔ بندہ نواز، فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ[2] عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب کو، جن سے خط و کتابت رہتی ہے، اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ اُن میں جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں، ان سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہُوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں، رسالوں، نسخوں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ، چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے؛ جاں کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق دربار سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں، اُنھیں کو جناب احدیث جلت عظمۃ مقبولِ قلوبِ اہلِ سخن و مطبوعِ طبائعِ اربابِ فن فرمائے اور میں اب انتہائے عمرِ ناپائدار کو پہنچ کر آفتابِ لبِ بام اور بہجوم امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔ پس امیدوار ہوں کہ آپ انھیں نذرِ محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ اردوے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش و فرو ماندۂ کشاکشِ معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دُعا مانگیں۔ اللّٰہ بس ماسوا ہوس۔ ۱۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۰) اساتذہ سے تعلیم پائی۔ پہلے عدالت صدر آگرہ میں قاضی القضاۃ رہے۔ پھر جون پور میں صدر الصدور ہو گئے تھے بیکم جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ / ۱۰۔ مارچ ۱۸۸۳ء کو جون پور میں وفات پائی، محلہ چتر ساری کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ [1] ہم نام ہونا۔ میرزا کا نام بھی وہی تھا، جو مفتی صاحب کا تھا۔ [2] مطبوعہ دیوان میں "وہ" کی جگہ "اب" ہے:

اب عناصر میں اعتدال کہاں

تعقید معنوی کو حضور خود جانتے ہوں گے۔ اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل و تطویل لاطائل کی صورت نظر آتی ہے، لہٰذا خامہ فرسائی بروئے کار نہیں آئی۔ ۱۲

(۳)

حضرت! انہیں دوستوں نے "مؤلف محرق"[1] پر جس کا نام "صاحب تپ محرق" رکھا گیا ہے، جُوتی پیزار کی ہے۔ ایک رسالہ جو موجود تھا، بھیجا جاتا ہے۔ وہ دو نسخے بھی اگر بہم پہنچ گئے تو بھجوا دوں گا۔ غزل بعد اصلاح کے بھیجی جاتی ہے۔ طرز فقیر مبارک ہو۔ ۱۲

سنہ ۱۸۶۴ء

(۴)

حضرت! مطالب علمی و شعری کا لکھنا موقوف سوال پر ہے۔ جب حضور کی طرف سے کوئی سوال آئے گا، بقدر اپنے معلوم کے جواب لکھا جائے گا:

ہیں اپنے گناہ مزیلِ امید
ایمان کہاں ہے، ایک ڈر ہے

اس شعر میں قصد اچھا ہے، مگر بیان ناقص ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ صرف خوف اصل ایمان نہیں، رجا کا بھی شمول چاہیے اور یہ بات اس تقریر میں سے نکلتی نہیں۔

(۵)

پیرو مرشد:

ایک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش، یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمت غلیظ، سحر ناپید۔ گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں، ایک دلیل، صبح کے وجود پر ہے یعنی بجھی ہوئی شمع، اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا دیا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا، وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے، جس گھر میں علامت صبح موید ظلمت ہوگی، وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

---

[1] "محرق قاطع" سید سعادت علی نے غالب کی کتاب "قاطع برہان" کے رد میں لکھی تھی۔ یہ مطبع احمدی واقع شاہدرہ (دہلی) میں چھپی تھی۔ اب بہت کمیاب ہے۔ اس کے رد میں مولوی نجف علی نے "دافع ہذیان"، سیاح نے "لطائف غیبی" اور عبدالکریم نے "سوالات" شائع کیے۔ یہی "تین درست" ہیں، جس کا ذکر مکتوب میں آیا ہے۔ حقیقۃً آخری دو رسالے خود میرزا کے تھے۔

متقابل ہے مقابل میرا　　　رُک گیا دیکھ روانی میری

تقابل وتضاد کو کون نہ جانے گا ؛ نور وظلمت ، شادی وغم ، راحت ورنج ، وجود وعدم ۔ " مقابل " اس مصرع میں بہ معنی " مرتبہ " ہے ، جیسے حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے ۔ مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روے خوے وعادت ضد ہمدگر ہیں ۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا ۔

غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے ۔ آپ اپنی طرف سے اس کو استصلاح سمجھتے ہیں اور میں اس کو اپنی جانب سے استفادہ جانتا ہوں ۔ والسلام ۱۲

—(۶)—

فقیر اسد اللہ نے اس کاغذ کے لفافے پر مرسلۂ محمد عبد الرزاق جعفری الحیدری اڈرکٹ پر شاکر دیکھ کر دیر تک غور کی کہ یہ دو صاحب ہیں ؛[1] بعد تامل یاد آیا کہ مولوی عبد الرزاق صاحب اسم شریف اور شاکر تخلص ہے ۔ غور کیجیے کہ نسیان کا کیا عالم ہے ؛ واللہ اگر مجھ کو یاد ہو کہ سابق میں کوئی غزل آپ کی آئی ہے[2] ۔ یہ لفافہ لکھا ہوا یکم اگست سال حال کا ، کل میں نے ڈاک سے پایا ۔ آج غزل کو دیکھا ۔ کل یہ لفافہ روانہ کروں گا ۔

کوئی آتا نہیں آگے ترے ہمتا ہو کر　　　آئینہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہو کر

یہ مطلع دلنشین ہے مگر اتنا تامل ہے کہ آئینہ کو اندھا کہنا چاہیے یا نہیں ؟

مردم چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا　　　بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

حرمت مے کے لیے پیر مغاں کا ہے یہ حکم　　　ریش قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہو کر

یہ شعر بے لطف ہو گیا کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہی تو وہ ایہام ریش کہاں رہا ۱۲ ۔

" کارگاہ ہستی میں " الخ[3]

داغ ساماں مثل انجم انجمن ، وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ وساماں ہو ۔ موجودیت لالے کی منحصر نمایش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے ۱۲ ۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول کے درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے ، دہقان کو جوتنے ، بونے ، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے ۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج وعنا ہے ۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا ہے ، وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے ۔ حاصل موجودیت ، داغ اور داغ مخالف راحت اور صورتِ رنج ۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ نام کے ساتھ " جعفری الحیدری " کے اضافے کے باعث یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کوئی اور صاحب ہیں اور ان کی کوئی غزل بغرض اصلاح نہیں آئی ۔ [2] پہلے شعر شاکر کے تھے جن میں حک واصلاح ہوئی ۔ اب میرزا غالب شاکر کے استفسار پر اپنے بعض شعروں کی شرح کرتے ہیں ۔ پہلا شعر پورا یہ ہے :

کارگاہ ہستی میں ، لالہ داغ ساماں ہے　　　برقِ خرمنِ راحت ، خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتنہا[1] ..... الخ

کلی جب نئی نکلے، بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے "برگ عافیت" معلوم۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایۂ آرام:

برگ عیسیٰ بگور خویش فرست،

برگ اور سرو برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خواب گل بہ اعتبار خموشی و برجا ماندگی۔ پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی۔ وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے۔ باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشان نصیب ہے۔

ہم سے[2] رنج ..... الخ

پشت دست، صورت عجز اور "خس بدنداں وکاہ بدنداں گرفتن" بھی اظہار عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج واضطراب کا تحمل کس طرح ہو؟

قبلہ، ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل[3] و اسیر[4] و شوکت[5] کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو دُور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیئے[6]۔

بندہ پرور، اصلاح نثر کی ضرورت نہیں۔ آپ کی انشا کی یہ روش خاص، دلچسپ اور بے عیب ہے۔ اس وضع کو نہ چھوڑیئے اور جو میرا تتبع اور مجھ پر توجہ منظور ہو تو پنج آہنگ وغیرہ میری مصنفات کو بہ امعان نظر و صرف ہمت ملاحظہ فرمایئے اور مشق بڑھایئے۔ چشم بددُور، طبیعت حضور کی نہایت عالی اور مناسب اس فن کے ہے۔ میں آپ کی رسائیِ ذہن اور قوت قلم سے امید قوی رکھتا ہوں کہ عنقریب بہت خُوب لکھیے گا۔ میرے اور تمام دوستوں کے فخر اور دشمنوں کے رشک ہو جایئے گا اور اِنَّ ہٰذا من برکۃ العلم یا مولانا و بالفضل و الکمال اولانا۔ ۱۲

یکم اگست ۱۸۶۵ء

---

[1] پورا شعر یہ ہے:

غنچہ تا شگفتنہا، برگ عافیت معلوم — باوجود دلجمعی، خواب گل پریشاں ہے

[2] ہم سے رنج بے تابی، کس طرح اٹھایا جائے — داغ، پشت دست عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

[3] میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی [4] میرزا جلال اسیر اصفہانی [5] شوکت بخاری [6] یہ صریح تردید ہے "آب حیات" کی اس روایت کی کہ میرزا غالب کے اردو اشعار کا انتخاب مولانا فضل حق خیرآبادی اور میرزا خانی کوتوال نے کیا تھا۔

(۷)

قبلہ و کعبہ،

فقیر پا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ، چہار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہوگا۔ تقریب وہاں کے جانے کی رئیس مرحوم[1] کی تعزیت اور رئیس حال[2] کی تہنیت۔ دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔ اب جو کوئی خط آپ بھیجیں تو رام پور بھیجیں۔ مکان کا پتا لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔

مخمس بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ شعر آپ کہتے ہیں اور حظ میں اٹھاتا ہوں۔ حُسنِ اتفاق سے اصلاح خمسہ کے وقت دوست غمگسار، یار وفا شعار، علامۂ روزگار، ختم العلمائے المتبحرین، مولوی مفتی صدر الدین دہلی خاں صاحب بہادر صدر الصدور المتخلص بہ آزردہ دام لطفہٗ و زاد علاؤہٗ کہ مجھ سے ملنے غم خانے پر تشریف لائے ہوئے موجود تھے، خمسے کو دیکھ کر پسند فرمایا۔ حضور کی بلاغت کی تحسین کی۔ عربی مصرعوں کے میرے ساتھ شریک غالب ہو کر مزے لوٹے اور آپ کی شیرینیِ گفتار کے وصف میں تا دیر عذب البیان و رطب اللسان رہے اور مجھ سے بقدر میرے معلوم و بیان کے آپ کی صفاتِ حمیدہ سے واقف و آگاہ ہو کر بہت شاد و خرسند ہوئے۔ مبارک ہو۔ نادیدہ و غائبانہ یعنی محض مشتاقانہ، تمنائے ملاقات، بہ عجز و نیاز لکھنے کو ارشاد کر گئے ہیں، لہٰذا میں لکھتا ہوں، قبول فرمائیے گا۔"

اکتوبر ۱۸۶۵ء

(۸)

قبلہ،

پہلے معنی ابیات کے سُنیئے:

"نقش فریادی[3]......" الخ

ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے، اس کا پیرہن کاغذی ہے؟ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر بہ اعتبار محض ہو، موجب رنج و ملال و آزار ہے۔

"شوق ہر رنگ[4]......" الخ

"رقیب" بہ معنی "مخالف" یعنی شوق سر و سامان کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا تھا، تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر با تن عریاں ہی کھنچتی ہے، جہاں کھنچتی ہے۔

---

[1] نواب یوسف علی خاں ناظم [2] نواب کلب علی خاں نواب

[3] پورا شعر یہ ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

[4] شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

"زخم نے[1] داد...... الخ"

یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے، جیسا کہ اس شعر میں:

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے اور زخمِ تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ "زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی" یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ "پرافشاں" بہ معنی بے تاب اور یہ لفظ تیر کے مناسب حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا؟ وہ تو خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

نامۂ غالبؔ[2] کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے کتاب پڑھ نہیں سکتا، سُن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے[3]۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واے اس ہیچ دپوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ رسالہ اس کا "ساطع برہان" دِلّی پہنچ کر ڈھونڈوں[4] گا، اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا۔

جناب مستطاب میر قاسم علی خاں صاحب صادق القول ہیں۔ میرے گھر آئے ہوں گے، دروازہ بند پایا ہوگا۔ مگر ایک خدشہ ہے کہ حضرت میں اور میرے بھائی میرزا علی بخش خاں میں بہت ربط و اتحاد تھا اور وہ مرحوم، خدا بخش، بیا مرزاد، کذب و گزاف میں ضرب المثل تھا۔ اس تصور سے اگر میں اس جملے کے سچ جاننے میں تامل کروں تو میرا تامل بے جا نہ ہوگا۔ بہرحال ان کو میرا سلام کہیے گا ۱۲

"سیلاب چی" ایک لفظ ہے ہندیان فارسی دان کا۔ اصل لغت "چلمچی" ہے اور یہ لغت ترکی ہے۔ معہذا "حباب آسمان"، حب تک کہ آسمان کو بحر یا دریا نہ کہیں، "حباب آسمان" نہ مقبول نہ مسموع[5]۔ "دنائت" مسموع ہے اگر فتح الف کا اشباع جائز ہو، ورنہ "دنائت پروری" کی جگہ "ادنی پروری" بہتر ہے۔ بلکہ "دنائت"، بہرحال صفت ہے، "پرورش" موصوف کی چاہیے، نہ صفت کی۔ والسلام ۱۲

(اواخر ۱۸۶۵ء)

---

[1] زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

[2] "نامۂ غالب" میرزا نے رحیم بیگ مؤلف "ساطع برہان" کے نام لکھا تھا۔ [3] میرا خیال ہے کہ میرزا غالب کی مجلس میں مختلف اصحاب (میرزا کو خوش کرنے کے لیے) ایسی باتیں کہتے ہوں گے اور میرزا وہی باتیں بے تکلف دوسروں کو لکھ دیتے تھے۔ میرزا رحیم بیگ خاصا پڑھا لکھا تھا اور کسی علمی کتاب کے سلسلے میں دوسروں سے مدد لینا محلِ اعتراض نہیں ہو سکتا اس کے حالات کے لیے دیکھیے "نامۂ غالب" کے آغاز کی عبارت۔ [4] ظاہر ہے کہ خط رام پور سے لکھا گیا۔ [5] "حباب آسمان" شاکر نے ایک شعر میں باندھا تھا، جیسا کہ اگلے خط میں واضح ہو گیا ہے۔

(۹)

قبلہ،

آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا، ۸۔ جنوری کو فقیر پہنچا[1]، تھکا ماندہ، خستہ، رنجور۔ ہنوز افاقت کلی نہیں پائی۔ آج صبحدم ہوا بند ہے، دھوپ تیز ہے۔ پشت بآفتاب تکیہ کے سہارے سے بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ غزل پہنچی ہے۔ گوند میں لتھڑ کر ایک ٹکڑا کاغذ کا الگ ہو گیا ہے۔ حضرت باحتیاط اس کو لفافے سے نکالیں۔

ہے تمہارا آفتابہ آفتاب آسماں　　　دیکھ لو اپنی چلمچی میں حباب آسماں

اگر پسند آئے تو اس مطلع کو یوں رہنے دیجیے۔

مولوی نظام الدین گنجوی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر طالب علموں کے ہاتھ پڑا۔ انھوں نے ازروے قواعد نحو اس میں کلام کرنا شروع کیا۔ مولوی کے پاس جب وہ کلمات پہنچے تو فرمایا "یاراں! شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔"

جو صاحب یہ فرماتے ہیں کہ پہلا مصرع مبتدا نہیں ہو سکتا، اُن سے پوچھا چاہیے کہ کیا آپ اسی پہلے مصرعے میں سے (ظلمت کدے میں میرے) اس کو مبتدا اور (شب غم کا جوش ہے) اس کو خبر ٹھہراتے ہیں؛ پس اگر یوں ہے تو بھی مدعا حاصل ہے۔ دوسرا مصرع دوسری خبر سہی۔ آخر یہ بھی تو مسلمات فن نحو میں سے ہے کہ ایک مبتدا کی دو بلکہ زیادہ خبریں ہو سکتی ہیں۔ ہاں ایک قاعدہ اور ہے یعنی جملہ فعلیہ کے ماقبل جو عبارت ہوتی ہے، اس کو مبتدا نہیں کہتے۔ اس مطلع کا مصرع ثانی جملہ اسمیہ ہے۔ اپنے ماقبل مبتدا کو قبول کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس دستور پر مصرع اوّل کو مبتدا کہا تو بھی قباحت لازم نہیں آتی۔ بہرحال جو وہ صاحب اسی پہلے مصرع کو قرار دیں، وہ مجھے قبول ہے، مگر شعر میرا مہمل نہیں۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں؛ بھائی میر قاسم علی خاں صاحب کو بندگی ۱۲

جنوری ۱۸۶۶ء

(۱۰)

قبلہ! اُس عنایت نامے کا، جو مارچ گزشتہ میں پایا ہے، آج یکم اپریل کو جواب لکھتا ہوں، گویا نماز صبح قضا پڑھتا ہوں۔ جناب مولوی غلام غوث خاں بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب و شمال کا کیا کہنا ہے حسن سیرت وہ، جو بعد ریاضت شاقہ اور بعد تحصیل فضائل اربعہ ملکۂ عدالت و حکمت و شجاعت و عفت حاصل ہوتا ہے، اس دانا دل بیدار مغز کو فطرت نے ودیعت کیا ہے۔ حسن صورت وہ، کہ جو دیکھے پہلی نظر میں حُسن خلق و لطف طبع اس کو نظر آئے۔

فقیر ہمیشہ مورد اعتراضات رہا ہے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعد دو چار دن کے معترض صاحب کا خط آیا ہے۔ لغت و ترکیب معترض فیہ کی سند کے اشعار حضرت نے اس خط میں درج کیے ہیں۔ اللہ اللہ! جو کلکتہ میں شور نشور اٹھا تھا۔ میرا شعر:

---

[1] یعنی رام پور سے دلی۔

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

خستہ جراحتہاے اعتراض ہُوا ہے۔ منشأ اعتراض یہ کہ عالم مفرد ہے، اُس کا ربط "ہمہ" کے ساتھ بحسبِ اجتہادِ قتیل ممنوع ہے قضارا اس زمانے میں شاہزادۂ کامران[1] دُرّانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اُس تک یہ قصّہ پہنچا۔ اُس نے اساتذہ کے اشعار پان سات ایسے پڑھے ہیں، جن میں "ہمہ عالم" و "ہمہ روز" و "ہمہ جا" مرقوم تھا اور وہ اشعار "قاطع برہان" میں مندرج ہیں[2]۔

ہاں صاحب، "قاطع برہان" میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا اور "درفش کاویانی" اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا۔ ایک مجلد اس کا آج اس خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجتا ہوں۔ بعد پہنچنے کے اس کو دیکھیے گا اور اکثر وقت فرصت پیش نظر رکھیے گا اور جس دن پہنچے، اُسی دن یا اُس کے دوسرے دن رسید لکھیے گا اور اگر اور صاحب اس کے طالب اور خریدار ہوں تو مجھ کو لکھیے گا۔ دس پانچ دو چار جلد بھیج دوں گا۔ یہ نسخہ میری طرف سے آپ کی نذر، غزل پھر بھیجوں گا۔

(یکم اپریل ۱۸۶۶ء)

میر غلام حسنین قدر بلگرامی

میر غلام حسنین نام، میر خلف علی کے فرزندِ ارجمند، سادات بلگرام میں سے تھے۔ ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہُوئے۔ ایک بزرگ نے نام تجویز کیا، جس سے تاریخ بھی نکلتی ہے۔ چنانچہ قدر نے خود ایک رباعی میں کہا ہے:

سو جان سے ہوں فداے نام حسنینؑ ہے چشم و دل و جگر مقام حسنینؑ
ہم روزِ ولادت سے ہُوئے نام آور تاریخی نام ہے، غلام حسنینؑ

ابتدائی تعلیم بلگرام میں پائی۔ اس عہد میں شعر و شاعری کو لوازم علم میں سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی شعر کہنے لگے۔ پھر لکھنؤ پہنچے اور شاہ غازی الدین حیدر کی بیگم سرفراز محل کی سرکار میں منشی ہُوئے۔ یہاں امان علی سحر سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کے عزل پر لکھنؤ سے واپس چلے گئے۔

غالباً اسی زمانے میں بوسیلہ مکاتبت میرزا غالب سے تلمذ اختیار کیا، اس لیے کہ میرزا نے جو پہلا

---

[1] شاہزادہ کامران شاہ محمود کا بیٹا اور تیمور شاہ ابن احمد شاہ دُرّانی کا پوتا تھا۔ تیمور شاہ کی وفات سے چند سال بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تھی، جس میں زمان شاہ دُرّانی، شاہ شجاع اور شاہ محمود نے بڑا حصّہ لیا۔ اس میں احمد شاہی سلطنت کمزور ہوگئی اور بارک زئی خاندان برسر اقتدار آگیا۔ کامران مدّت تک ہرات میں حکمراں رہا۔ [2] "قاطع برہان"، صفحہ ۸۳۔

خط قدر کے جواب میں لکھا ہے، اس میں سلطنت لکھنؤ کی تباہی پر اظہار افسوس کیا ہے اور یہ ۲۳۔ فروری ۱۸۵۶ء کا مرقومہ ہے۔ اس وقت دہلی کی سلطنت کا ڈھانچہ قائم تھا۔ تیموریوں کی عظمت اگرچہ مٹ چکی تھی، لیکن اس کا نشان باقی تھا۔ دوسرے خط میں قلعے جانے کا ذکر ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں قدر بلگرام ہی میں تھے۔ اس کے بعد کچھ مدت پنجاب میں گزاری۔ پھر لکھنؤ چلے گئے اور شیخ امداد علی بحر سے اصلاح لینے لگے۔ اس دوران میں میرزا غالب سے بھی استفادے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ خود کہتے ہیں،

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند　　　پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند

مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر　　　بدنام کنندۂ نکو نامے چند

غالب کے بھانجے میرزا عباس بیگ سے اُس زمانے میں خاص تعلق پیدا ہُوا تھا، جب وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بلگرام پہنچے تھے۔ میرزا عباس بیگ ضلع ہردوئی میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہُوئے تو میر قدر نے غالب سے سفارشی خط بھی منگوایا اور محکمہ تعلیم میں ملازمت حاصل کر لی۔

پھر یہ ملازمت چھوڑ دی اور میرزا ہی کی سفارش پر منشی نولکشور کے مطبع میں تصحیح کی خدمت پر مامور رہے بعد ازاں کیننگ کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہُوئے۔ یہیں ایک پانڈے سے عروض ہندی یعنی پنگل کی تعلیم پائی۔ ۱۸۸۴ء میں نواب میر محبوب علی خاں کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا اور حیدر آباد بلائے گئے چار سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی، لیکن بیمار ہو گئے۔ علاج کے لیے لکھنؤ آئے۔ بلگرام میں وفات پائی۔ (۲۳۔ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ / ۱۴۔ ستمبر ۱۸۸۴ء)۔

ایک مرتبہ میرزا غالب سے ملنے کے لیے دہلی بھی آئے تھے۔ دُبلے، پتلے اور پست قد تھے۔ سر پر پٹے تھے، جو گردن کے پاس سے گھومے ہُوئے تھے۔ انھیں بل دیتے رہتے تھے۔ لباس بہت نفیس پہنتے تھے۔

ان کی متعدد تصانیف ہیں مثلاً مثنوی "قضا و قدر"، "شرح قصائد عرفی"، "نظم الارکان فی تقطیع ابیات گلستان"، "مصطلحات اردو"، "کلیہ" (نظم)، دیوان جو غزلیات و قصائد پر مشتمل ہے۔ ۱۳۰۸ء میں بمقام آگرہ چھپا۔ ایک قابلِ ذکر کتاب قواعد العروض ہے، جس کے ساتھ ہندی کی عروض بھی شامل ہے۔ یہ کتاب قدر نے سید علی بلگرامی کی فرمایش پر لکھی تھی۔

―――(۱)―――

بندہ پرور،

آپ کے عنایت نامے کے آنے سے تین طرح کی خوشی مجھ کو حاصل ہُوئی؛ ایک تو یہ کہ آپ نے مجھ کو یاد کیا، دوسرے آپ کی طرز عبارت مجھ کو پسند آئی، تیسرے یہ کہ آپ حضرت علامہ عبد الجلیل اور آزاد[۱] مغفور کی یادگار ہیں اور ہیں

[۱] مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی جو عربی اور فارسی کے یگانہ ادیب اور شاعر تھے اور ان کی کئی تصنیفات چھپ چکی ہیں (باقی صفحہ ۴۹۰ پر)

ان کے حسنِ کلام کا معتقد ۔ خواہش آپ کی کیا ممکن ہے کہ مقبول نہ ہو؟ جب مزاج میں آئے نظم و نثر بھیج دیں، میں دیکھ کر بھیج دیا کروں گا اور آرائش گفتار یعنی حک و اصلاح میں دریغ نہ ہوگا۔

بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف۔ اردو، سو اس میں بھی عبارت آرائی متروک۔ جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔ پانو رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر، کیا لکھوں اور کیا کروں؟ یہ شعر اپنا پڑھا کرتا ہوں:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

آپ ملاحظہ فرمائیں ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں؟ اور کی فیض رسانی اور قدردانی کو کیا رو ئیں؟ اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔ تباہی ریاست اودھ نے باآنکہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہل ہند، جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔

کل آپ کا خط آیا۔ آج میں نے جواب لکھا تا کہ انتظار جواب میں آپ کو ملال نہ ہو۔ والسلام مع الاکرام

نگاشتہ بست و سوم فروری ۱۸۵۶ء ازاسد اللہ



—— (۲) ——

حضرت،

میں نے چاہا کہ حکم بجالاؤں اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر کیا کروں؟ آپ غور کریں کہ اصلاح کی جگہ کہاں ہے؟ اگر بمثل آپ خود نظر ثانی میں کوئی لفظ بدلا چاہیں تو ہرگز جگہ نہ پائیں۔ جس کاغذ پر اصلاح منظور ہوتی ہے، تو بین السطور زیادہ چھوڑتے ہیں۔ جب اس عبارت کو اور کاغذ پر نقل کر دوں، تب جا کر حک و اصلاح کا طور بنے۔ میرا کلام اصلاح عبارت سے ہے، نہ کتابت۔

"زردشت آتشکدہ" الخ زردشت کو آتشکدہ سے وہ نسبت نہیں جو ساقی کو میخانے سے۔ زردشت باعتقاد مجوس پیمبر تھا، آتشکدہ کے پجاری کو موبد اور ہیربد کہتے ہیں۔

"آب حرام اشتیاق"، آب حرام شراب کو محل مناسب پہ کہیں تو کہیں ورنہ بادہ و رحیق و مے و دارو کی طرح اسم نہیں۔ ناچار "شراب شوق" یا "بادۂ شوق" لکھنا چاہیے۔ "اشتیاق" سے "شوق" بہتر ہے۔

"ماہم دوسہ جامگی علی التواتر زدہ بودم"۔ "ما زدہ بودم" تمھارا دل اس ترکیب کو قبول کرتا ہے؟ "من زدہ بودم" یا "ما زدہ بودیم"۔ اس سے علاوہ "دوسہ جامگی" بکاف فارسی یعنی چہ؟ "جام" معلوم کاف تصغیر کا "جامک" چاہیے۔ "جامگ" کیا؟ مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے۔ ظہوری، جلالی، ظہیر، طاہر وحید،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۹) ۵۔ صفر سنہ ۱۱۱۶ھ (۲۹۔ مئی سنہ ۱۷۰۴ء) میں لبعہد عالمگیر پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۷۸۶ء میں وفات پائی۔ ان کے تذکرے مثلاً "خزانۂ عامرہ"، "سرو آزاد"، "مآثر الکرام"، اور عربی دیوان نیز "سبحۃ المرجان" مشہور کتابیں ہیں۔ "حسان الہند" لقب تھا۔ میر عبدالجلیل آزاد کے نانا تھے۔

کسی کے ہاں "جام" کو "جامک" نہیں لکھا، "دوسہ جامگی" کی جگہ "دوسہ ساغر" یا "دوسہ قدح" لکھو۔

"باچناری گلستان بر باغبان است وتیماری او بر قدر دانان"، میں اس فقرے کو نہیں سمجھا، یعنی "بر باغبان" کیا ہے؟ "تیماری" کیا ہے؟ "تیمار" بمعنی "بیمار داری" و "غم خواری" ہے۔ جب یہ لفظ خود افادہ بہ معنی مصدری کرتا ہے تو "یائے مصدری" کیسی؟

"تیرہ شبی ہا بسر آمد"، "تیرہ شبیہا بسر آمد"، خیر، "تیرہ شبے بسر آمد"۔ یعنی چہ؟

"لیلائے دیدم کہ با ہزار طرۂ طرار"۔ طرہ زلف کو کہتے ہیں۔ وہ دو ہوتی ہیں نہ کہ ہزار در ہزار۔

"جامگی" مکرر دیکھا گیا۔ معلوم ہوا، حضرت نے جو کہیں "جامگی خوار" دیکھا ہے تو اس کو "جام خوار" بہ معنی "شراب خوار" سمجھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ "جامگی خوار" اس نوکر کو کہتے ہیں کہ جس کی تنخواہ کچھ نہ ہو۔ روٹی کپڑے پر اس سے کام لیتے ہوں۔ نظامی نوکر حضرت خضر کے کتنا روزینہ سخن پاتے ہیں، جو خضر فرماتے ہیں:

تو اے جامگی خوار تدبیرِ من نہ جامِ سخن چاشتی گیر من

"در توبہ باز است و بابِ رحمت فراز"، معنی اس کے یہ کہ توبہ کا در کھلا ہے اور دروازہ رحمت کا بند ہے۔ "فراز" اضداد میں سے نہیں ہے۔ "باز" کھلا، "فراز" بند۔

"قدر زعفران زار را بوئے گل کرد"۔ اس کا لطف کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ "قدر زعفران زار" کیا؟ اور پھر اس کو کس نے "بوئے گل" کر دیا؟

"سہ کرر"۔ کدام زبان است؟ عربی یا فارسی؟

"حسب لیاقت خود" کافی است، "خودم" چہ محل دارد؟ مگر ہماں شیوۂ قتیل۔[1]

"بندۂ مجبورم"، ہماں سکۂ قتیل۔

صاحب بندہ، تحریر میں اساتذہ کی تحریر کا تتبع کرو۔ نہ یہ کہ مغل کے لہجے کا۔ لہجے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں کا اور شاعروں کا۔ زیادہ زیادہ

جناب نوروز علی صاحب کی خدمت میں میرا سلام نیاز عرض کیجیے گا کہ بیرنگ خط کا ایک آنہ دینا پڑے گا، ہر مہینے میں آٹھ خط تک بلکہ سولہ خط تک میں نہ گھبراؤں گا، بھیجیے۔

رہا جواب کا لکھنا، کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے تو جانتے۔ ہر روز صبح کو قلعہ جانا، دوپہر کو آنا۔ بعد کھانا کھانے کے حضرت[2] کے مسودوں کا درست کرنا۔ احباب کو خط لکھنے کی فرصت بہت کم ہاتھ آتی ہے۔ والسلام

(۱۸۵۷)

ا؎ سبحان اللہ کیا خوب فرمایا ۲؎ مراد ہے بہادر شاہ بادشاہ۔

(۳)

سوال؛

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ناسخؔ

رہن رکھوا کر ترا عمامہ دلوادوں شراب | زاہدا تجھ کو کروں مرہونِ احساں تو سہی

اس "سہی" اور "تو سہی" کا ترجمہ فارسی لغت میں کیا آیا ہے؟ ۱۲

(قدر)

جواب؛

اسماء کے یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربی میں یہ کہتے ہیں اور فارسی میں یہ اور ہندی میں یہ طرز گفتار۔ ہندی کی فارسی یا فارسی کی ہندی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً "چوری کا گڑ میٹھا"، اس کی فارسی تو پوچھے گا، مگر نادان۔ "سہی" اور "تو سہی" کی فارسی کیوں کر بنے؟ یہ روزمرّہ اُردو ہے؛

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس مطلب کے مطابق فارسی عبارت یُوں ہو سکتی ہے۔ "وصل اگر نیست حسرت نیز عالمے دارد"!

زاہدا تجھ کو کروں مرہونِ احساں تو سہی

ایک نوع کی تنبیہ، ایک قسم کا دعویٰ ہے۔ "نامردِ باشم اگر فلاں کار نکنم" یا "فلاں کار نکنم نیا سایم"۔ اہلِ ہند کی فارسی اس طرح خام اور ناتمام رہی کہ اصول میں اُنھوں نے فارسی کے قواعد کی تطبیق عربی سے چاہی اور اُردو کے خاص روزمرّے کی فارسی بنایا کیے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں۔ فارسی میں "ہیچ نیست" کی جگہ "خاک نیست"، کبھی کوئی نہ کہے گا۔ قتیلؔ چاروں شانے چت گرا ہے:

کشتہ برشتہ تپاں بودؔ دگر خاک نبود

یعنی "ہیچ نبود" لاحول ولاقوۃ

ایک جگہ سے مجھ کو خط آیا۔ چونکہ میں بلّی ماراں کے محلّے میں رہتا ہوں، اس نے پتا لکھا کہ "در محلّہ گربہ کشاں"[1]۔

واہ فارسی! ۱۲

مردم از من داستاں را اندواز دورانِ چرخ
گشت صرفِ طعمۂ زاغ و زغن عنقائے من

---

[1] محلّے کا نام بلّی ماراں تھا یعنی ملّاحوں کا محلّہ، کسی نے بلّی کو بِلّی سمجھ لیا اور گربہ کُشاں لکھ دیا۔

(۴)

قدر:

کاٹ کا غیروں کا سر لائے جو میری نذر کو
ڈال دوں سونے کا آنڈو پانو میں جلاد کے

"آنڈو" بہ دال ہندی یا بہ دال عربی؟ بھائی واللہ! یہ لفظ کبھی میری زبان پر نہیں آیا۔ میں اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ ہاں سنا ہے کہ فلانا سردار ایسا بہادر و ثابت قدم تھا کہ معرکۂ کارزار میں ہاتھی کے پاؤں میں "آنڈو" ڈلوا دیے۔ ظاہرا کوئی چیز ہوگی کہ ہاتھی کے مانع رفتار ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بند خاص ہے۔ استعمال اس لفظ کا محل انعام میں نہیں چاہیے۔

"آبستن" و "آبست" کے باب میں یہ قول معترض کا غلط ہے کہ "آبست" کو بجائے "آبستن" جائز سمجھتا ہے۔ "آبست" کوئی لفظ نہیں ہے۔ "آبستن" اصل لفظ اور "آبستنی" مزید علیہ۔ یہ دونوں صحیح، بلکہ آبستنی زیادہ فصیح۔ اگر معترض فیضی کو نہیں مانتا، تو آپ معترض کو کیوں مانتے ہیں؟ فیضی کی سند مقبول اور مسموع۔ "ارمغان" و "ارمغانی" "آبستن" و "آبستنی" اسے یہ تو فارسی لغت ہیں۔ فارسی گویوں نے "حضور" کو "حضوری" اور "فضول" کو "فضولی" اور "نقصان" کو "نقصانی" لکھا ہے۔

آج تک سنا نہیں کہ رب کبریا کسی نے لکھا ہو۔ ہاں "کبریائے الٰہی" یعنی خدا کی بزرگی۔ اس نظر پر "رب کبیر" لکھیں گے، نہ رب کبریا۔ کبریا صفت واقعی ہے، لیکن اگر صفت سے موصوف مراد رکھیں تو ممکن ہے، جیسا "زید عادل"۔ "جناب کبریا" بجائے "جناب الٰہی"۔ ایک نکتہ دقیق ہے، یعنی مذہب حقۂ امامیہ میں مجموع صفات عین ذات ہیں۔ اگر ہم نے خدا کو محض قدرت یا محض عظمت کہا تو موافق ہدایت نبیؐ اور ائمہؑ کے ہمارا قول درست ہے۔

"حال" کی جگہ "حالات" یا "احوال" لکھنا قبیح نہیں ہے، خصوصاً احوال کہ بہ معنی واحد مستعمل ہے اور یہ استعمال یہاں تک پہنچا ہے کہ "احوال" بہ معنی جمع مستعمل نہیں ہوتا، جیسے حور کہ بہ معنی "حورا" کے ہے۔ اہل فارس اس کو صیغۂ واحد قرار دے کر الف نون کے ساتھ اس کی جمع لاتے ہیں۔ سعدی کہتا ہے:

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف
از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

بلکہ "حور" کو "حوری" کہہ کر اس کی جمع "حوریاں" لاتے ہیں۔ حافظ لکھتا ہے:

حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

میں نے ایک مقطع میں حال کی جگہ احوال لکھا ہے:

جان غالبؔ تاب گفتارے گماں داری ہنوز
سخت بے دردی کہ مے پرسی ز ما احوال ما

آخر مجھ کو اور فیضی کو معترض سے زیادہ اساتذہ عجم کے کلام پر اطلاع ہے، وہ "آبستنی" کیوں لکھتا اور میں "احوال"

کیوں لکھتا؟ صائب کی ایک غزل جس کا ایک مصرع یہ ہے:

ہر لحظہ دارم نیتے، چوں قرغۂ رمالہا

اس غزل میں اسی نے ایک جگہ احوالہا لکھا ہے۔ داد کا طالب غالب

"ملک مغرب، بلدۂ دہلی، کٹڑہ رودگراں" یہ کیا لکھا کرتے ہو؟ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے، محلہ غلط، ملک زائد۔ ہندوستان میں دلّی کو سب جانتے ہیں اور دلّی میں مجھ کو سب پہچانتے ہیں۔

انصاف کا طالب غالب

(۵)

"تئیں"، کا لفظ متروک اور مردود، قبیح، غیر فصیح - یہ پنجاب کی بولی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ہاں نوکر رہی تھی۔ وہ "تئیں" بولتی تھی تو بی بیاں اور لونڈیاں سب اس پر ہنستی تھیں:

خروش رعد غرّاں می شود پا در رکاب، از بیم

عناں بر سینہ چوں پیچد کرنگ[1]، برق جولانش

یہ شعر ناطق[2] کا ہے اور ناطق قوم کا بلوچ، سندھ کا رہنے والا۔ اُس کا منطق کیا اور اُس کی زبان کیا؟ پا در رکاب ہونا عبارت ہے میر و سفر کے لیے آمادہ و مستعد ہونے سے، خواہی منشاء عزیمت خوف ہو، خواہی کوئی اور سبب۔

"عنان بر سینہ پیچد" مہمل و محض مہمل۔ نہ روزمرّہ، نہ محاورہ، نہ اصطلاح، نہ مفید معنیِ درنگ، نہ مفید معنی شتاب۔

"طیار"، صیغہ مبالغے کا ہے، لغت عربی، املا اس کی طائے حطّی سے، "طیر" ثلاثی مجرد، "طائر" فاعل، "طیور" جمع۔ بازداروں میں اس لفظ نے جنم لیا، حقیقت بدل گئی، طوے تے بن گئی۔ یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا، بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ فلاں باز، فلاں شکرہ، "طیار شدہ است و صید مے گیرد۔" بہر حال اب تائے قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا اس لغت کو مستحدث اور دراصل اردو اور بہ تائے قرشت اور بمعنی آمادہ، اشخاص و اشیا پر عام تصور کرنا چاہیے اور عبارت فارسی میں اس کا استعمال کبھی جائز نہ ہوگا ۱۲

فقیر کے نزدیک "نقاب" اور "قلم" اور "دہی" ترجمہ جغرات، یہ تینوں اسم مذکر ہیں۔ منکر سے مجھے بحث نہیں۔ مجیب کا میں احسان مند نہیں۔ لغت فارسی ہو اور روزمرّہ فارسی ہو تو اہل زبان کے کلام سے استناد کریں۔ منطق فارسی میں تذکیر و تانیث کہاں؟ پس اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں اور یہ ہم صیغہ متکلم مع الغیر ہے، یعنی ہم اور تم اور مجموع شرفا اور شعرائے دہلی و لکھنو۔ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے۔ زیادہ جھگڑا بے فائدہ ۱۲

بنائیں نذر کی غزلیں جناب غالب نے

تمام جوہر تیغِ زباں اُبھر آئے

[1] سرخ رنگ کا گھوڑا۔ [2] گل محمد خاں ناطق مکرانی، محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں رہا۔

غزل کی زسے یہاں ساکن ہے لیکن یہ سکون جائز ہے۔ "قدم" مفرد "قدموں" جمع ہے ۱۲ غالب

"کھو رہا ہوں" متعدی ہے۔ پورب یے اس کو لازمی جانتے ہیں۔ لازمی "کھو گیا ہوں" "ہم کہیں گے" جاگتے ہیں"۔ اہل پورب کہیں گے "جگتے ہیں"۔ جان و دل، دل و جگر یہ صحیح، "جان و جگر"۔ ٹکسال باہر ۱۲

"فریاد" مؤنث ہے۔ فریاد کر لینی چاہیے، "فریاد کر لینا" انگریزی بولی ہے۔ "فکر" مؤنث ہے۔

معشوق کو ہمزاد بنانا ظرفا کو اپنے اوپر ہنسانا ہے۔

اندیشۂ بلند روِ لامکاں نورد ٭ چوں خواست بام جاہ ترا نردباں نہاد
دیدش ہماں بجا چو سپہر از فراز کوہ ‏ بعد از ہزار پایہ کہ بر فرقداں نہاد[1]

پہلے مصرعے میں اندیشہ فاعل ہے خواست کا، جو مصرع ثانی میں ہے۔ "نہاد" بمعنی مصدری ہے۔ دوسرے شعر میں "دید" اور "نہاد" کا فاعل وہی اندیشہ ہے۔ اب ایک بات سمجھو کہ جب پہاڑ کے پاس سے آسمان کو دیکھو گے تو یہ معلوم ہو گا کہ اگر ہم پہاڑ پر چڑھ جائیں تو آسمان کو چھو لیں گے۔ مگر جب چوٹی پر پہنچو گے تو آسمان کو اتنا ہی دُور پاؤ گے، جتنا زمین سے نظر آتا تھا۔ فرقداں[2] ایک صورت ہے یا ایک کوکب ہے آٹھویں آسمان پر۔ ہمارے قیاس میں آیا کہ فرقداں پر سے بام جاہ ممدوح نظر آوے گا، بہت قریب۔ ہم فرقداں پر گئے۔ وہاں بھی قریب نہ پایا۔ فرقداں پر ہزار پائی رکھی۔ اُس پر چڑھ کے دیکھا، تو بام ممدوح میں اور اس مقام میں اتنا ہی بعد ہے جتنا پہاڑ میں اور آسمان میں۔ یہ مبالغہ حدِ تبلیغ و غلو سے گزر گیا ۱۲

"لگا دیتے ہو" اور "اٹھا دیتے ہو" خطاب جمع حاضر ہے اور تعظیماً مفرد پر آتا ہے یعنی تم۔ معشوق مجازی کو "تم" اور "تُو" دونوں طرح یاد کرتے ہیں۔ خدا کو "تُو" کہتے ہیں یا صیغہ جمع غائب، یعنی صیغہ جمع غائب کا، نظر بہ قرینہ، افادہ قضا و قدر کا رکھتا ہے۔ تمہاری غزل میں دو چار جگہ "دیتے ہو" اس طرح آیا ہے کہ محبوب مجازی اس سے مراد کبھی نہیں ہو سکتا۔

لا کے دنیا میں ہمیں زہر فنا دیتے ہو ‏ ہائے اس بھول بھلیاں میں دغا دیتے ہو

کہو کس سے کہتے ہو؟ سوائے قضا و قدر کے کوئی رنڈی، کوئی لونڈا اس کا مخاطب نہیں ہو سکتا اور علیٰ ہٰذا القیاس دو ایک شعر اور بھی۔ ناچار صیغہ جمع رکھ دیا تاکہ خُوباں اور بُتاں کی طرف ضمیر راجع ہو یا شخص واحد کی طرف، آپ کے لفظ کے ساتھ یا قضا و قدر کی طرف۔ اب خطاب معشوقان مجازی اور قضا و قدر میں مشترک رہا[3] ۱۲ غالب

---

[1] دونوں شعر میرزا غالب کے ہیں۔ دیکھیے قصیدۂ ہشتم فارسی موسوم بہ "رطل گراں"۔ کلیات میں پہلے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے:

چوں خواست بام کاخ ترا نردباں نہاد

یعنی "جاہ" کی جگہ "کاخ" ہے۔ [2] قطب کے پاس دو تارے جن میں سے ہر ایک کو فرقد کہتے ہیں اور دونوں کو فرقدان یا فرقدین۔ یہ شام سے صبح تک درخشاں رہتے ہیں۔

[3] مطلب یہ کہ "ہو" کی جگہ "ہیں" بنا دیا۔

س : "بود" اور "باشد" کے دونوں صیغے مضارع کے ہیں بہ معنی "ہست" آتے ہیں یا نہیں ؟ ۱۲ قدر

ج : البتہ آتے ہیں ۱۲ غالب

س : نظم ونثر میں ماضی مطلق کا ماضی استمراری کے معنی پر لکھنا کیسا ہے ؟ قدر

ج : بے جا ہے۔ جب تک علامت استمرار نہ ہو، معنی استمراری کیوں کر لیے جائیں ؟ غالب

س : پارسی میں مصدر مقتضب اور غیر مقتضب کی کیا شناخت ہے ؟ قدر

ج : خود عربی میں مصدر کی صفت مقتضب نہیں آئی ، فارسی میں کہاں سے ہوگی ؟ مقتضب صفت بحر کی ہے ، نہ صفت مصدر کی ۱۲ غالب

س : کس قسم کے مصدر لازمی سے مصدر متعدی بنتا ہے اور کس طور کے مصدر سے نہیں بنتا ہے ؟ ۱۲ قدر

ج : جب لازمی کو متعدی کرنا چاہیں تو مضارع میں سے مصدر بنائیں اور اس میں فقط الف نون یا الف نون اور تحتانی بڑھائیں۔ مثلاً "گشتن" کو "گشتاندن" نہ لکھیں گے ، "گردد" سے مصدر بنائیں گے "گردیدن" اور اس کو "گرداندن" اور "گردانیدن" کہیں گے ، جس مصدر کے ساتھ مضارع نہ ہوگا ، وہ متعدی نہ بنے گا ، جیسے "برشتن" اور "خستن" ۱۲ غالب



س : پناہ کا ترجمہ لغت اردو میں کیا آتا ہے ؟

ج : اردو مرکب ہے فارسی اور ہندی سے ، یعنی پناہ کا لفظ مشترک ہے اُردو میں اور فارسی میں۔ پناہ کا ترجمہ اُردو میں پوچھنا نادانی ہے ، ہاں پناہ کی ہندی آسرا ہے۔

" بر نہ آنا " فصیح ، " نہ بر آنا " ٹکسال باہر۔ قافیہ ہائے اصلی القافیہ بکثرت ہیں۔ ان کو چھوڑ کر " نسخہ " اور " نامہ " اور " افسانہ " ان الفاظ کو قافیہ کرنا تمھارے نزدیک نامناسب نہیں ؟ ایسا قافیہ غزل بھر میں ایک جگہ لکھو ۱۲ غالب

——(۶)——

حضرت ،

آپ کے خط کا کاغذ باریک اور ایک طرف سے سراسر سیاہ۔ دوسری طرف اگر کچھ لکھا جائے تو میری تحریر ایک طرف تم خود اپنی عبارت کو درست نہ پڑھ سکو گے۔ ناچار جداگانہ ورق پر سوالات کا جواب لکھتا ہوں۔

" رنگ " بہ وزن " سنگ " ترجمہ لون اور لفظ فارسی الاصل ہے۔ جب اس کو اردو میں منصرف یا بقول بعضے منصرف کریں گے تو نون کا تلفظ موہوم سا رہ جائے گا۔

" رنگنا " بہ وزن " چندجا " نہ کہیں گے بلکہ وہ لہجہ اور ہے جیسا کہ اس مصرع میں ،

ہم نے کپڑے رنگے ہیں شنگرفی

یہ صحیح اور فصیح ہے ،

ہم نے رنگے ہیں کپڑے شنگرفی

یہ اعلان نون گنواری بولی اور غیر صحیح اور قبیح ہے۔

"خرام" کو کون مؤنث بولے گا مگر وہ کہ دعویٰ فصاحت سے باز رہے گا: "رفتار" مؤنث اور "خرام" مذکر ہے۔ رفتار کی تانیث کو "خرام" کی تانیث کی سند ٹھہرانا قیاس مع الفارق ہے۔

حرف مسروری جس کو ثنائی بھی کہتے ہیں، موحدہ سے زائے معجمہ تک الف کی جگہ تحتانی بھی قبول کرتے ہیں۔ مولوی آل نبی سہارن پوری اور مولوی امام بخش دہلوی میں اس بات پر جھگڑا ہوا۔ مولوی امام بخش "با" کو "بے" کہنا جائز نہیں رکھتے تھے۔ آخر مولوی آل نبی نے ائمہ فن کلام کے کلام سے اس کا جواز ثابت کر دیا، مگر صرف از روئے تلفظ اور اس کی اجازت۔ کوئی قاعدہ خاص اس کے واسطے نہیں۔ اردو میں طا کو طوے اور ظا کو ظوے کہتے ہیں اور باقی حروف کے آخر میں تحتانی بولتے ہیں۔ لسان عرب و عجم میں موحدہ سے زائے معجمہ تک اواخر حروف میں الف بھی لاتے ہیں اور تحتانی بھی۔ "طا" "ظا" کو "طا" "ظا" ہی کہیں گے، نہ طوے، ظوے، نہ "طے" "ظے"۔ علیٰ ہذا القیاس حروف باقیہ۔

انوری:

ز غایت کرم اندر کلام تو "نے" نیست ـــ با عتقاد تو ضد است "نون" مگر "بے" را
بعہدِ جود تو دائم بیک شکم زاید ـــ زمانہ صوت سوال و صدائے "آرے" را

(۷)

حضرت،

کیا فرماتے ہو؟ "ہوا بھی ہو" "قضا بھی ہو" اس ردیف کے ساتھ قافیہ معمولی آ نہیں سکتا۔ "بیتابی ہو" "مہتابی ہو" کیوں کر درست ہوگا؟ وہاں موحدہ کے مابعد ہائے ہوز ہے، یہاں موحدہ کے آگے نہیں۔ "چاپی" کہ بائے فارسی اور یائے حطی ہے، کاپی اور راپی اور پاپی یہ قافیہ ہمدگر ہو سکتے ہیں۔ چاپی لغت انگریزی ہے۔ اس زمانے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے، بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار بجلی و دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیے ہیں۔ اوروں نے بھی باندھے ہیں۔ روبکاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ داری، خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔ چابی بہ معنی کلید شوق سے لکھو، نہ چابھی۔ ناسخ لکھتا ہے: "میم صاحب" کے آگے کے الفاظ بھول گیا۔ آخر مصرع یہ ہے:

.... مس کے ـــ ناز بے جا اٹھاؤں کس کس کے

الٰہی بخش خاں معروف لکھتے ہیں:

نگین دل سوا کھو دے تو گھر نیلام ہو جائے

صاحب، تم نے مثنوی خوب لکھی۔ کہیں املا میں کہیں انشا میں، جو اغلاط تھے دُور کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اس کے تحت میں لکھ دی: فکر تاریخ مثنوی سے مدت العمر معاف رہوں ۱۲ والسلام

غالب

(۱۲۷۴ مطابق ۱۸۵۸)

(۸)

مشفق میرے،

میں بعد آپ کے جانے کے دِلّی سے رام پور آیا اور یہاں میں نے آپ کا دوسرا خط پایا۔ پہلا خط مجھے دلّی میں پہنچا تھا، مگر چونکہ اس خط میں آپ کے مسکن کا پتا نہیں لکھا تھا، میں تحریر جواب میں قاصر رہا۔ اب جو یہ خط رام پور میں پہنچا، اس میں پتا مرقوم تھا، میں پاسخ نگار ہوا۔ آپ کے مسودات ایک بکس میں تھے، وہ بکس وہیں رہا۔ اب جب تک دلّی نہ جاؤں گا، اُن کو نہ پاؤں گا اور ایک آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ جب میں دلّی تھا تو ایک خط میاں نوروز علی خاں کا تمھارے نام بہ نشان میرے مقام کے آیا تھا، چونکہ اُن دنوں میں مجھ کو آپ کا مسکن معلوم نہ تھا، میں نے اس پر لکھ دیا کہ وہ بلگرام گئے۔ خدا جانے تمھارے پاس وہ خط پہنچا یا نہیں؛

برخوردار میرزا عباس[۱] کو دوبارہ تحریر کی حاجت نہیں۔ اگر وہ سعادت مند ہیں تو وہی ایک خط کافی ہے۔ اب آپ مجھ کو خط بھیجیے، تو رام پور بھیجیے۔ پتا مقام کا کچھ ضرور نہیں، رام پور کا نام اور میرا نام کفایت کرتا ہے۔

خوشنودی کا طالب، غالب

(سنہ ۱۸۶۰ء)

(۹)

سیّد صاحب،

تمھارا مہربانی نامہ مع دو غزلوں کے پہنچا۔ جواب کے لکھنے میں اگر درنگ ہوئی تو آزردہ نہ ہونا۔ اب غزلوں کو دیکھا، کہیں حک و اصلاح کی حاجت نہ پائی۔ مدعائے خاص کا جواب یہ ہے کہ اجزائے خطابی یہاں شامل اسم نہیں ہیں۔ صرف اسم مبارک خطوط و عرائض پر لکھا جاتا ہے۔ رہا قصیدے کا بھیجنا، زاید محض اور بے فائدہ۔ اگر میں یہاں رہتا اور تم بھی تکلیف رہروی اُٹھاتے اور یہاں آتے اور قصیدہ گزرانتے تو بطریق صلہ کچھ ملنے کا احتمال تھا۔ یہ طرز کہ تم بھیجو اور میں گزرانوں، اس سے قطع نظر کہ احتمال نفع بھی نہیں رکھتی، بہ توسط میرے خلاف وضع ہے۔ مجھ کو معاف رکھیے اور اب جو خط بھیجیے، دلّی کو بھیجیے گا کہ میں اس مہینے میں اُدھر کو جاؤں گا۔ رویت ہلال ماہ صیام اغلب ہے کہ دلّی ہی میں ہو۔ والسلام مع الاکرام

سہ شنبہ ۱۳۔ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء

غالب

(۱۰)

سعادت و اقبال نشان میر غلام حسنین کو غالب گوشہ نشین کی دعا پہنچے۔ حضرت کشفیؔ کے دیوان کے انطباع کی تاریخ اچھی ہے، کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ مگر دوسری تاریخ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس فن کے قاعدے کے موافق مصرع تاریخ میں سے تکلف کے عدد نکالنے چاہئیں یعنی پانسو تیس؛

کلوخ انداز را پاداش سنگ است

---

[۱] میرزا غالب کے بھانجے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ غالباً قدرؔ نے ان کے پاس سفارش لکھوائی تھی۔

اس مصرع کے اعداد میں اتنی گنجایش کہاں کہ پانسو تیس نکل جائیں اور ۱۲۷۸ بچ رہیں؟

صاحب، تم بہت دن سے بیکار ہو۔ ایک جگہ مساعدت روزگار کی صورت ہے۔ تم بے تکلف میرا یہ رقعہ مُہری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ، مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی یعنی منشی نولکشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ ان کو پڑھوا دو۔ اپنی نظم و نثر اُن کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم اُن پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کارگزار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمھارے سپرد کر دیں گے۔ مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا۔ معزز و مکرم رہو گے، زندگی کا لطف اٹھاؤ گے، لیکن شرط یہ ہے کہ جلد چلے جاؤ۔ لکھنؤ تم سے نزدیک ہے، اتنی راہ کا قطع کرنا کچھ دشوار نہیں۔ اگر نوکر نہ ہو جاؤ گے، پھر چلے آنا۔ بخت آزمائی ہے۔

(۱۱)

بندہ پرور،

آپ کا خط لکھنؤ سے آیا، حالات معلوم ہوئے۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کیا کام آپ کے سپرد ہوا ہے؟ یہ بھی لکھیے۔ چند روز صبر کرو۔ اگر وطن میں ہوتے تو اس بیکاری میں گھر کی خبر کیا لیتے؟ جس طرح جب گزرتی، اب بھی گزر جائے گی۔ بلکہ تمھارا خرچ کم ہو گیا۔ بہر حال ابھی اضافے کے واسطے نہ تم کہو، نہ میں لکھوں۔ دو چار مہینے کام کرو۔ اس اثنا میں اگر بلگرام میں چھاپے خانہ جاری ہو گیا تو استعفا دے کر چلے جائیو۔ یہاں بعد چند روز کے اضافہ ہونا بھی حیز امکان سے باہر نہیں۔

(۱۸۶۱ء)

(۱۲)

سید صاحب سعادت و اقبال نشان میر غلام حسنین صاحب کو غالب کی دعا پہنچے۔ آپ کا خط آیا اور میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ اس رقعہ کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کی کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے؟ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا؟ جاری ہے تو صحیح کس کے طور پر ہے؟ قصیدہ اور تاریخ کلیات کا مطبع میں پتا لگا ہے یا نہیں؟ اگر وہ دونوں کاغذ گُم ہو گئے ہوں تو مثنیٰ بھیج دوں؟

یوسف میرزا صاحب بذریعہ میرے خط کے آپ سے مل گئے ہیں یا نہیں؟ "قاطع برہان" کے اجزا کی جلدیں بندھ گئی ہیں یا نہیں؟ اگر بندھ گئی ہوں تو جناب منشی صاحب سے کہہ کر، وہ جو پچاس جلدیں میں نے لی ہیں، اُن میں سے ایک جلد لے کر، جناب فیض مآب، خداوند نعمت، آیۂ رحمت، قبلہ و کعبہ، جناب مجتہد العصر کی خدمت میں حاضر ہو اور میری طرف سے کورنش عرض کرو اور کتاب نذر کرو اور کہو کہ غلام نے بہت خونِ جگر کھا کر فارسی کی تحقیق کو اس پایے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔ یہ مجال کہاں کہ داد کا طلبگار ہوں، صرف عزِ قبول کا اُمیدوار ہوں۔

سمجھے سید صاحب؟ منشی صاحب سے چار سوالوں کا جواب اور جو قبلہ و کعبہ فرمائیں۔ اُس تقریر میں تغیر بالمرادف[1] بھی

---

[1] یعنی جو کچھ وہ فرمائیں، اسے لفظاً لفظاً لکھیں کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ بھی نہ آنا چاہیے۔

نہ ہو۔ جو الفاظ حضرت کی زبان سے سُنو، ہُو بہُو لکھ بھیجو۔

ہاں مولوی ہادی علی صاحب کا جو حال معلوم ہو، وہ بھی ضرور لکھنا اور اس خط کا جواب بہت جلد بھیجنا۔ بھائی صاحب، ازراہِ احتیاط تلف ہونے کے ڈر سے اس خط کو بیرنگ بھیجتا ہوں۔

دوشنبہ پنجم ذی القعدہ و مئی سال رستاخیز (۵ ذی قعدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۵ مئی ۱۸۶۲ء)

(۱۳)

سید صاحب،

آپ کا خط، جس میں قبلہ و کعبہ کا مہری و دستخطی توقیع ملفوف تھا، پہنچا۔ میں تم سے بہت راضی ہُوا کہ تم نے تکلیف اُٹھائی اور میری نذر وہاں پہنچائی۔ اب ایک اور تکلیف دیتا ہُوں کہ جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہہ کر اُن کے حکم سے ایک اور نسخہ "قاطع برہان" کا مطبع میں سے لو اور مکان معلوم کر کے جناب مفتی میر عباس صاحب کے پاس جاؤ اور میرا سلام کہو اور کتاب دو اور عرض کرو کہ جو خونِ جگر میں نے اس تالیف میں کھایا ہے، یقین ہے کہ اس کی داد تمھارے سوا اور سے نہ پاؤں گا۔

ہاں صاحب، منشی صاحب سے یہ کہہ دینا کہ پچاس میں سے تین جلدیں میں نے پائیں، اب قیمت کا روپیہ بھیج کر سینتالیس اور منگائے لیتا ہُوں۔ کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیوں لکھوں؟ اہلِ مطبع کو خدا منشی صاحب کے سایۂ عطوفت میں سلامت رکھے، کہہ لیں گے۔ چھاپا ۷۸ھ (۱۲۷۸ھ) میں شروع ہُوا، ۷۹ھ (۱۲۷۹ھ) میں تمام ہوگا۔ مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو اور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا بھی حال معلوم کر کے لکھو۔

۲۴ مئی ۱۸۶۲ء — جواب کا طالب، غالب



(۱۴)

سید صاحب،

آپ نے خوب کیا کہ مفتی میر عباس صاحب کا ہدیہ غیر کو نہ دیا۔ اپنے پاس امانت رکھیے، جب مفتی صاحب آئیں اُن کو پہنچا دیجیے۔

تمھارا قصد یکم جون کو بلگرام جانے کا تھا۔ وہاں کے ہنجار میں کچھ سستی پائی جو فسخ عزیمت کیا؟ اس کی کیفیت ضرور لکھیے اور جو تم نے سپارش کے باب میں لکھا ہے، میں اس خواہش کو کیوں کر قبول کروں؟ وہ شخص میرا شاگرد نہیں، مرید نہیں، صورت آشنا بھی تو نہیں، کیوں کر لکھوں؟ معہذا تمھارے واسطے میرا لکھنا مضر ہے۔ یعنی وہ صاحب سمجھیں گے کہ حضرت نے کچھ میری شکایت و حکایت لکھی ہوگی، جب غالب نے مجھ کو یہ لکھا ہے۔

اس وقت آپ کی وحشت انگیز تحریر پہنچی۔ ادھر اس کو پڑھا اور اُدھر یہ خط تمھیں اور ایک مرزا عباس[1] کو اور ایک

---

[1] مرزا کے بھانجے۔

خطِ تہنیت کا منشی صاحب کو لکھا۔ لیکن چونکہ بلادِ شرقیہ کو ڈاک نو دس بجے روانہ ہوتی ہے، ناچار یہ تینوں خط بند کر کے تمھارا اور مرزا عباس کا خط بیرنگ اور منشی جی کا خط پیڈ رکھ چھوڑتا ہوں۔ کل صبح کو بعد از طلوعِ آفتاب ڈاک میں بھجوا دوں گا، خاطر جمع رکھو۔ میں نے برخوردار کو ایسا کچھ لکھا ہوگا کہ مفیدِ مطلب ہوگا، اِن شاءاللہ العلی العظیم،

چہارشنبہ بارہ پر تین بجے (ذی حجہ ۱۲۷۸ھ مطابق جون ۱۸۶۲ء) خوشنودیِ احباب کا طالب غالب

(۱۵)

صاحب،

واللہ، سوائے اس خط کے تمھارا کوئی خط نہیں آیا۔ کیسے چار خط تم نے بھیجے؟ کیوں باتیں بناتے ہو؟ یہاں بھی ٹکٹ پر تحریر کی ممانعت ہے۔ بہتر یہی ہے کہ طرفین سے خطوط بیرنگ بھیجے جائیں کہ یہ قصہ مٹ جائے۔ برخوردار میرزا عباس کی بدلی کی خبر میں نے پہلے ہی سے سُنی ہے، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ اب دریافت ہُوا کہ تمھارے ہمسایے میں آئے ہیں۔ اب اُن سے ملیے، خدا اُن کو مروّت کی توفیق دے۔

مطلع میں اپنا نام لکھنا رسم نہیں ہے۔ میرؔ کا تخلص اور صورت رکھتا ہے۔ میر جی اور میر صاحب کر کے وُہ اپنے کو لکھ جاتا ہے اور کو اس بدعت کا تتبع نہ چاہیے۔

غالب

(۱۶)

صاحب،

تم سے پہلے یہ پُوچھا جاتا ہے کہ جب تم جانتے ہو کہ میرزا عباس میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے تو پھر میں میرزا کی اولاد کا نانا کیوں کر بنا؟ میرزا کی بی بی میری بہو ہے، بیٹی نہیں۔ تم نے جو کچھ لکھا ہے کہ میرے نواسے کی شادی ہے، کیا سمجھ کے لکھا؟ میں میرزا کی اولاد کا نانا کیوں کر بنا؟ بھانجے کی اولاد پوتا پوتی ہے، نہ نواسا نواسی۔ مجھ کو اس کی اولاد کا جد فاسد لکھنا ٹکسال باہر بات ہے۔

خیر، یہ تو ظرافت تھی، تم یہ تو بتاؤ کہ میرزا لکھنؤ کیوں جاتا ہے؟ اگر کچھ اسباب خریدنا تھا تو ایک معتمد کو بھیج دیا ہوتا۔ بذاتِ خود اس تکلیف بے جا کو گوارا کرنا کیا ضرور؟ یہ بات جواب طلب ہے۔

میرے آنے کی یہ صورت ہے کہ میرزا کی استدعا سے قطع نظر، میرا دل بھی تو پتھر یا لوہے کا نہیں جو اپنے بچّوں کو دیکھنے کو نہ چاہے۔ ایک بہن، اس کی مجموع اولاد وہاں۔ میرا تو وہ خانہ باغ ہے۔ بہار کے موسم میں باغ کی سیر کو جی نہ چاہے گا؟ بشرطِ صحت آؤں گا۔ اِن شاءاللہ۔

صبح یکشنبہ ۳۔ رمضان ۲۲۔ فروری سال حال

(۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء)

(۱۷)

میر صاحب،

ماجرا یہ ہے کہ میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنسن جاری ہوگیا۔ لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہل دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمھارا دربار اور خلعت، واگزاشت ہوگیا، مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالہ آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے نبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالہ نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا۔ میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بُلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔[۱]

آغاز دیوان کے شعر یعنی مطلع میں ہرگز حروف و الفاظ کی قید نہیں ہے۔ ہاں ردیف الف کی، یہ امر قابل پرسش کے نہیں، بدیہی ہے۔ دیکھ لو اور سمجھ لو۔ یہ جو صاحب دیوان مشہور ہیں، حافظؔ و صائبؔ و کلیمؔ و سلیمؔ، ان کے آغاز کی غزل کے مطلع دیکھو اور حروف و الفاظ کا مقابلہ کرو۔ کبھی ایک صورت، ایک ترکیب، ایک زمین، ایک بحر نہ پاؤ گے، چہ جائے اتحاد حروف و الفاظ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

۱۸۶۳ء

(۱۸)

صاحب،

میں برس دن سے بیمار تھا۔ ایک پھوڑا اچھا ہُوا، دُوسرا پیدا ہُوا۔ اب فی الحال دونوں پانو ہاتھوں میں نو پھوڑے ہیں۔ دونوں پانو پر دو پھوڑے پنڈلی کی ہڈی پر ایسے ہیں کہ جن کا عمق ہڈی تک ہے۔ اُنھوں نے مجھ کو بٹھا دیا، اُٹھ نہیں سکتا۔ حاجتی دھری رہتی ہے، پلنگ پر سے کھسل پڑا، پھر پڑ رہا۔ روٹی بھی اسی طرح کھاتا ہوں۔ پاخانے کیا کہوں کیوں کر جاتا ہوں؛ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ یہ سطور لیٹے لیٹے لکھے ہیں۔ نیم مُردہ ہوں، قریب بمرگ ہوں۔ افادہ و استفادہ و اصلاح کے حواس نہیں۔ غزل رہنے دی۔ یہ حال تم کو لکھ بھیجا۔

شنبہ ۲۔ اگست ۱۸۶۳ء — نجات کا طالب، غالب

(۱۹)

سیّد صاحب،

تم نے جو خط میں برخوردار کامگار میرزا عباس بیگ خان بہادر کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے۔ تم کیوں شکر گزار ہوتے ہو؛ جو کچھ نیکی اور نکوئی اُس اقبال نشان نے تمھارے ساتھ کی ہے، اس کا سپاس میں ادا کروں۔

---

[۱] یہ واقعہ ۳۔ مارچ ۱۸۶۳ء کا ہے۔ جیسا کہ میرزا نے خواجہ غلام غوث کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

خدا کی قسم، دل سے دعائیں دے رہا ہوں۔ بھائی، اس کا جوہر طبع از روے فطرت شریف ہے۔ پروردگار اس کو سلامت رکھے اور مدارج اعلیٰ کو پہنچائے۔ یہ اپنے والد کے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی ماں کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے، پس وہ فخر میری طرف بھی عائد ہوتا ہے۔ وہ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ ماموں میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور صرفِ زر سے جی چرایا۔ میں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا، مگر کیا کروں کہ مجھ میں دم ہی نہ تھا۔ کاشکے جب ایسا ہوتا، جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسّر آتا ہے۔ میں اب اچھا ہوں۔ برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے زخم باراں اور ہر زخم خون چکاں۔ ایک درجن پھاہے لگ جاتے ہیں۔ جسم میں جتنا لہو تھا، پیپ ہو کر نکل گیا۔ تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے، وہ کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی کھاتا ہوں، کبھی پیتا ہوں۔ مرض کے آثار میں سے اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پانو کی دو دو انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔ معہٰذا متورم ہیں، جوتا نہیں پہنا جاتا۔ ضعف کا تو بیان ہو ہی نہیں سکتا، مگر ہاں یہ میرا شعر:

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمے میرم ہم ز ناتوانی ہاست

اب کے رجب یعنی ماہ آیندہ کی آٹھویں تاریخ سے ستّرواں برس ہوگا:

چو ہفتاد آمد اعضا رفت از کار

پس اب شکوۂ ضعف نادانی ہے، ایمان سلامت رہے۔

سہ شنبہ ۲۴۔ نومبر ۱۸۶۳ء　　　　نجات کا طالب، غالب

(۲۰)

قرۃ العین میر غلام حسنین سلمکم اللہ تعالیٰ

تمھارا خط پہنچا، دل خوش ہوا۔ مولوی نجف علی صاحب کی کیا تعریف کرتے ہو؟ تم کچھ لکھو تو جانوں۔ واللہ! اگر کبھی مولوی صاحب میرے گھر آئے ہوں یا میں نے ان کو دیکھا ہو، چہ جاے اختلاط و ارتباط صرف برعایت جانب حق چند کلمات انھوں نے لکھے ہیں۔ تم میرے یار ہو اور میری خدمت گزاری کے حقوق ہیں تم پر، مجھ کو مدد دو اور اپنی قوت علمی صرف کرو۔ "محرق قاطع برہان" میرے پاس موجود ہے، مجھ سے منگواؤ۔ میں ہر موقع پر خطا اور زلّتِ[1] مولف کا اشارہ کر دوں گا۔ تم ہر فقرے کو بغور دیکھو اور بے ربطی الفاظ اور لغویت معانی کو میزان نظر میں تولو۔ عامی نہیں ہو، عالم ہو۔ آخر مولوی نجف علی صاحب نے بھی تو اپنی قوت عاقلہ سے بے اعانت غیر "محرق" کے جامع کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ تمھارے پاس دو نسخے، ایک "دافع ہذیان" ایک "سوالاتِ عبدالکریم"، مع استفتاء و افتاء دستخطی علماء دہلی موجود ہیں اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشاراتِ سودمند پہنچیں گے، تم کو معارضہ بہت آسان ہوگا۔ مدعی کا کلام دراصل لغو، پھر تمھارے پاس سرمایہ علمی موجود اور یہ تین نسخے معقول اس پر مزید علیہ۔

---

[1] یعنی لغزش

اس پر "محرق" کا خاکہ اُڑ جائے گا۔ میرے پاس اس خط کے پہنچتے ہی جواب لکھیے اور اجازت بھیجیے کہ میں نسخہ مطبوعۂ نامطبوعۂ "محرق" لبسبیل ڈاک بھیج دوں۔ مگر جس دن سے کہ کتاب پہنچ جائے، اُسی دن سے آپ اُردو زبان میں رسالہ لکھنا شروع کیجیے اور بعد اختتام مجھے اطلاع دیجیے۔ پھر میں جیسا لکھوں ویسا عمل میں لائیے۔ غالب اثنا عشری حیدری۔

ہاں صاحب آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی کا خط مع اشعار آیا اور میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ اب جو ڈھونڈا تو میرا مسودہ ہاتھ آیا، مگر آغا کا خط نہ آیا۔ اس مسودہ کو صاف کر کے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ آغا صاحب کا جب خط نکل آوے گا، وہ بھی بھجوا دیا جائے گا۔

سعادت و اقبال نشان میرزا عباس بیگ خاں کو میری دعا کہنا اور یہ ورق ان کو سراسر پڑھا دینا۔[1]

(۲۱)

سیّد صاحب،

تم "قدر" اور نورچشم میرزا عباس "قدردان"، خاطر جمع رکھو۔ نوکری تمہاری ہو جائے گی۔ صاحب کی اور راجا کی تعریف کے قصیدے واقعی گلدستے[2] ہیں، مگر میرزا کی مدح کے قصیدے کو گلدستہ نہ کہو۔ یہ تو ایک باغ ہے سرسبز و شاداب، جس میں گلبن ہزار در ہزار، میوہ دار درخت بے شمار، زمین سراسر سبزہ زار، بہت خوش، بہت نہریں۔ مٹی نظر نہیں آتی، سبزہ یا لہریں۔ فقیر غالب تمہارا خیر خواہ اور تمہارے ممدوح کا دعاگو ہے۔

سنہ ۱۲۸۴ھ ۔ سنہ ۱۸۶۵ء

(۲۲)

حضرت،

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے۔ اصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر سننا تو ممکن ہی نہیں، شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی عمر[3]، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا، نہ غزل کی داد۔ بقول انوری:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح
وے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

سب شعرا اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔

اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب والمخاطب بہ نجم الدولہ، خداایش بیامرزاد

---

[1] اس خط کے ساتھ آغا محمد حسین شیرازی کے نام کا فارسی خط بھی بھیجا تھا۔ جسے فارسی مجموعے میں دیکھنا چاہیے۔ مجموعہ اردو میں اسے شامل نہیں کیا جا سکتا۔ [2] صاحب سے مراد ولیم ہینڈ فورڈ ڈائرکٹر تعلیمات اور راجا سے راجا مان سنگھ ہیں۔ [3] پچھتر برس کی عمر نہیں ہوئی۔ یوں ہی لکھ دی۔

نواب کلب علی خاں بہادر

نواب کلب علی خاں والی رام پور (۲۹-اپریل ۱۸۳۵ء - ۲۲-مارچ ۱۸۸۷ء) ۲۱-اپریل ۱۸۶۵ء کو مسند نشین ہوئے۔ صاحب علم وفضل تھے۔ ان کے عہد میں رام پور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا مرکز بن گیا تھا۔ دوران حکومت میں حج بھی کیا۔ حرمین شریفین میں خاص رقمیں رفاہی کاموں کے لیے خرچ کیں۔ جامع شاہ جہانی دہلی کی مرمت کے لیے گراں قدر رقم پیش کی شعر بھی کہتے تھے۔ نوابؔ تخلص تھا۔ بعد وفات "خلد آشیاں" کہلائے۔

(۱)

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت، سلامت

بعد تسلیم معروض ہے۔ ورود توقیع ولو بدعفو نے رواں پرسوں کی۔ سو روپے بابت تنخواہ اکتوبر ۱۸۶۶ء از روے ہنڈوی ملفوفہ معرض وصول میں آئے۔ یا امیر المسلمین حضرت کا عزم رونق افزائی اکبرآباد سن کر چاہا کہ وہاں آ اڑوں[۱]۔ ریل کی سواری کی تاب ہرگز نہ پائی۔ منزل بہ منزل جانے میں سوچا کہ آگرہ سات منزل، رام پور چھ منزل، یہاں جو جاؤں، وہیں کیوں نہ جاؤں! عزم مصمم کیا کہ اپنے فرزند اور آپ کے غلام کو بھیجوں[۲]۔ وہ بھی خوش خوش آمادہ رہروی ہوا۔ ناگاہ تپ محرقہ نے گھیرا۔ شانے کا درد علاوہ۔ مہینا بھر ہوا نہ تپ اترتی ہے، نہ شانے کا درد جاتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی تجویز سے فصد بھی کھلی، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کسی شب کو سو رہتا ہے، ورنہ ساری رات جاگتا اور ہائے ہائے کرتا ہے۔ اس کے ساتھ سب جاگتے ہیں

راحتے نیست دراں خانہ کہ بیمارے ہست

مجمل یہ ہے اور مفصل میر محمد زکی عرض[۳] کریں گے۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

معروضہ روز شنبہ پنجم نومبر ۱۸۶۶ء — عریضہ اسد اللہ بے دستگاہ

(۲)

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت، سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کہ کل حضرت کے اقبال سے ایک مسرت تازہ مجھ کو پہنچی، تفصیل اس کی یہ کہ اقبال نشان میرزا شہاب الدین خاں انگریزی خواں ہے۔ اخبار انگریزی دیکھا کرتا ہے اس نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے انگریزی اخبار میں دیکھا کہ جناب نواب صاحب قبلہ جو شریک اجلاس کونسل ہوئے، نواب گورنر جنرل بہادر مع اور کونسل نشینوں کے نواب صاحب کے حسن صورت وفرط

---

[۱] نواب کلب علی خاں نے گورنر جنرل کے دربار میں جانے کا قصد کیا تھا جو نومبر ۱۸۶۶ء میں بمقام آگرہ منعقد ہوا تھا [۲] بظاہر حسین علی خاں ابن عارف جسے غالب نے بیٹا بنا لیا تھا [۳] ان سے مراد غالباً سید محمد زکریا خاں زکی ہیں جو غالب کے شاگرد تھے (۱۸۳۹ - ۱۹۰۲) امیر تھے، مگر سب کچھ تباہ ہو گیا تو محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس بن گئے۔ ختم ملازمت کے بعد بدایوں میں مقیم ہو گئے۔ وفات دہلی میں پائی (تلامذہ غالب)

خلق و لطف تقریر سے بہت راغنی و خوشنود ہوئے اور ان کی رائے سب کو پسند آئی۔

این مراتب کہ دیدہ ای جزوے است

کارِ کلی ہنوز در قدر است

روز افزوں دولت و اقبال کے مدارج ابھی بہت سنوں گا اور دیکھوں گا ان شاء اللّٰہ العظیم

۲۶۔ جنوری ۱۸۶۷ء — دوام دولت کا طالب

غالب

—(۳)—

حضرت ولی نعمت، ابرِ رحمت۔ سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع ٹھہری کہ میرا مُردہ بے گور و کفن نہ رہے گا، جیسا کہ جلال اسیر کہتا ہے:

جرعۂ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں[1] کو لکھا ہے، خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجۂ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپے کرایے کے مکان اس کے تحت میں ہیں۔ ابن الرحمٰن اس کا بھانجا ہے، مفتی جی کا کوئی نہیں ہے[2]

---

[1] نواب مرزا داغ جو اس زمانے میں رام پور میں ملازم تھے۔ [2] یہ خط پہلے پہل "آجکل" دہلی کے "غالب نمبر" (بابت ماہ فروری ۱۹۵۲ء) میں چھپا۔ عجیب بات ہے کہ غالب کی اس تحریر کو مفتی صدر الدین آزردہ کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے پر محمول کیا گیا۔ اس لیے فرمایا گیا کہ غالب کی سیرت کا یہ پہلو قابلِ اعتراض ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہے۔

رکاوٹ پیدا کرنے کا کون سا موقع تھا جب کہ پانسو روپے مفتی صاحب کی بیوہ کو بھیجے جا چکے تھے؛ جیسا کہ خود زیرِ غور خط سے واضح ہوتا ہے۔ غالب کی تحریر کا مدعا صرف یہ ہے کہ جب رام پور کی سرکار سے اس محترمہ کی امداد کے لیے پانسو روپے بھیج دیے گئے جو ساٹھ روپے ماہانہ کرایے کے مکانوں کی مالکہ ہے تو میرے لیے اور میرے متعلقین کے لیے انتظام بدرجۂ اولیٰ مناسب ہوگا، جبکہ ان کے لیے کوئی دوسرا ذریعۂ معاش موجود نہیں۔ مفتی صاحب کی بیوہ کی مثال اس غرض سے پیش نہیں کی گئی، کہ اس کے وظیفے یا امداد میں رکاوٹ پیدا ہو۔ اس غرض سے پیش کی گئی کہ اس محترمہ سے زیادہ بے یار و مددگار لوگ زیادہ ترحم کے مستحق ہیں۔ غالب یقیناً معصوم نہ تھا اور اس کی بشریت سے بھی کسی کو انکار یا اختلاف کی ضرورت نہیں لیکن بشریت کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مرزا کو خواہ مخواہ اخلاقی کمزوریوں کا مورد ٹھہرایا جائے یا اس کی کسی عام تحریر میں قباحت کے پہلو پیدا کیے جائیں اگرچہ ان کے لیے کوئی بنا موجود نہ ہو۔

نواب کلب علی خاں مرحوم نے مفتی صاحب کی بیوہ کے لیے دو سو روپے ماہوار مقرر کر دیے۔ یقیناً مفتی صدر الدین مرحوم کی بیوہ ہر اعزاز و اکرام کی مستحق تھی، مفتی صاحب کے علم و فضل کے اعتبار سے بھی اور ۱۸۵۷ء میں خوفناک مصائب کا شکار ہو جانے کے اعتبار سے بھی لیکن (باقی [illegible] پر)



اب میں اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں ۔ آخر عمر میں تین التماسیں ہیں آپ سے: ایک تو یہ کہ ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری التماس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور (تیسری التماس یہ کہ) یہ سو روپے مہینا جو مجھے ملتا ہے، اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار پائے۔ یہ دونوں خواہشیں (یعنی دو آخری) خواہ میری زندگی میں، خواہ میرے بعد اجرا پائیں:

تم سلامت رہو قیامت تک

دولت و عز و جاہ روز افزوں

روز شنبہ ۵۔ ربیع الثانی (۱۲۸۱ھ)

۲۷۔ جولائی (۱۸۶۶ء)

عرضداشت دولت خواہ

اسد اللہ

(۴)

تین التماسیں سابق (میں) پیش ہوئیں۔ سو اب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ اِن شاءَ اللہُ الکریم حسب ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ء میں آئندہ مستان یعنی نومبر دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ بھی مقرر ہو جائے گی۔

معروضہ ۱۳۔ اگست ۱۸۶۸ء

شہزادہ بشیر الدین میسوری

ٹیپو سلطان شہید کے پوتے اور شہزادہ شکر اللہ کے فرزند، توفیق تخلص، عربی اور فارسی کے عالم تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۶) میرزا غالب کی بیوہ یکسر بے اعتنائی کا ہدف بنی، اگرچہ اس کے مالی وسائل بدرجہ صفر تھے۔ میرزا کے وظیفے کا جز بھی بیوہ کو مل جاتا تو اس کی زندگی کے باقی دن، جو ایک سال سے زیادہ ثابت نہ ہوئے۔ اطمینان سے گزر جاتے۔ ممکن ہے نواب کلب علی خاں مرحوم کو حقیقی حالات کا علم نہ ہوا ہو، میرزا کے عریضے کا اصل مقصد تو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ دم واپسیں کے قریب پہنچ کر اس سرکار کو حقیقی حالات سے بے کم و کیف آگاہ کر دیا جائے جو برسوں سے ان کی روزی کا ظاہری وسیلہ بنی ہوئی تھی اور جس مثال کے بیان کی غرض و غایت یہ تھی کہ جو فرمانروا تھوڑے بہت وسائل رکھنے والے پر نوازش فرما رہا ہے وہ یک قلم بے وسیلہ خاتون پر بھی توجہ فرمائے، اس سے بالکل اُلٹا نتیجہ نکال لیا گیا۔ اس صورت حال کو منصفانہ موازنہ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟

نواب کلب علی خاں نے مفتی صاحب کی بیوہ کے لیے دو سو روپے ماہوار مقرر دیے یقیناً مفتی صدر الدین مرحوم کی بیوہ ہر اعزاز و اکرام کی حقدار تھی لیکن غالب کی بیوہ کے لیے کچھ مقرر نہ ہوا۔ حسین علی خاں کو بعد میں ملازمت دے دی گئی جسے چھوڑ کر وہ دہلی میں مقیم ہو گیا تھا۔ داغ دہلوی جو اس زمانے میں ملازم سرکار رام پور تھے۔

مولوی عبدالرحیم گورکھپوری، جو معقول پسندی میں غالباً حدِ اعتدال سے تجاوز کے باعث دہری مشہور تھے، شہزادہ بشیر الدین ہی کے استاد تھے۔ سید احمد شہید بریلوی کے سفرِ حج میں مولوی عبدالرحیم اور ایک میسوری شہزادے سے بھی کلکتہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ غالباً وہ شہزادہ بشیر الدین ہی تھے۔ "نگارستانِ سخن" میں ہے، شہزادہ علم و فضل کے علاوہ اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ برگزیدہ سے بھی مزین تھا اور دقیقہ سنجی و موزونیٔ طبع میں بھی فخرِ خاندان تھا۔ (نگارستانِ سخن ص ۱۹) ان کے چند شعر بھی نقل کیے ہیں جن سے شہزادے کی طبیعت اور اسلوبِ فکر کا اندازہ ہو سکتا ہے،

دلِ آزادہ داری ازیں خوشتر چہ مے خواہی
درونِ سادہ داری ازیں خوشتر چہ مے خواہی
تو اے عاشق ز اشکِ سرخ در پیمانۂ چشمت
مصفا بادہ داری ازیں خوشتر چہ مے خواہی

نہ دیدہ است کس از شاخِ خشک میوۂ تر
بجز قلم کہ دہد میوۂ تر و شیریں



"پنج آہنگ" میں بھی شہزادے کے نام ایک خط ہے۔ وفات (۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء)

(۱)

پیر و مرشد، سلامت۔

اعضا فرسودہ اور بودے ہو گئے۔ روح ان میں دوڑتی نہیں پھرتی، مگر ابھی مفارقت نہیں کر گئی۔ خدا جانے کس مکمن[۱] میں ہے۔ قویٰ نکمے ہو گئے۔ اب وہ کام جو اُن سے متعلق تھے، بند ہو گئے۔ آپ کا حکم ماننا اور آپ کی خدمت بجا لانی دل سے تعلق رکھتی ہے، وہ لطیفۂ غیبی یعنی روح کے کام ہیں جب تک وہ باقی ہے سرانجام پاتے جائیں گے۔

"خاکم بدہن" واسطے اقوال کے ہے۔ جب کوئی کلمہ مکروہ طبع کہتے ہیں تو "خاکم بہ دہن" کہہ لیتے ہیں:

برخاک بریختی مئے ناب مرا ... "خاکم بہ دہن" مگر تو مستی ربّی

اور "خاکم بسر" اور "خاکم بفرق" عام جیسا کہ میں ایک شہزادے[۲] کے مرثیے میں کہتا ہوں:

اے اہلِ شہر مدفنِ ایں دودماں کجاست؟
"خاکم بہ فرق" خواب گہِ خسرواں کجاست؟

۱۔ بروزن مقتل یعنی پوشیدہ ہونے کا مقام

۲۔ فرخندہ شاہ بن بہادر شاہ ظفر

اُستاد[1]:

"خاکم بسر" کہ عاشق کار آزمودہ ام
دانم کہ با رقیب بخلوت چہا رود

آپ کے ہاں اور مولوی روم کے ہاں "خاکم بدہن" کا متوقع نہیں، جیسا کہ مولوی معنوی نے نہیں لکھا، حضرت بھی اپنے ہاں نہ لکھیں:

فرق است درمیانہ کہ بسیار نازک است

نجات کا طالب غالب

(۲)

پیرومرشد برحق سلامت،

تقصیر معاف، میں مدعی اور آپ مدعا علیہ بھی اور حاکم بھی۔ وجہ استغاثہ یہ کہ آپ نے مجھے اپنے حلقۂ ارادت سے خارج کر دیا۔ عرائض جواب طلب کا جواب نہیں۔ ایک عنایت نامۂ سابق میں:

آب زلعل میرود بر پرچنگ

یہ جملہ مرکبہ لکھا ہوا تھا، میں اس کو پڑھ بھی نہ سکا، معنی تو علاوہ رہے۔ میں نے عریضہ لکھا اور جملے کی حقیقت حال کا انکشاف چاہا۔ اب تک جواب نہیں پہنچا۔ جی گھبرا رہا ہے۔ جب تک اس کا جواب نہ پاؤں گا، آرام نہ آئے گا۔

برخوردار اقبال نشان میرزا شہاب الدین خاں بہادر[2] کی زبانی آپ کے مزاج مبارک کی خیر و عافیت سُنی، مگر وہ جو تحریر و دستخطی سے تسلی ہوتی ہے، وہ کہاں! حضرت اب تو خالصاً للہ والرسول میرا گناہ معاف اور دستخط خاص سے مجھ کو اس جملے کے معانی لکھ بھیجیے۔ زیادہ حد آداب۔

عفو جرم کا طالب، غالب

(۳)

بندہ پرور،

مہربانی نامہ آیا، سر پر رکھا اور آنکھوں پر لگایا۔ فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبعیت کی ہے۔ پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ اشعار قتیلؔ و واقفؔ و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی، نہ معانی نازک۔ ہاں الفاظ فرسودہ وعامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں، وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں صرف کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام باستیفا دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور

---

[1] یہ شعر مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ہے [2] ثاقب ابن نواب ضیاء الدین احمد خاں

ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے، تب آدمی جانتا ہے کہ یہ فارسی ہے۔

منکہ[1] باشم الخ

اس کی شرح جو چھاپے میں لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیجیے اور معانی میرے خاطر نشان کیجیے تو میں سلام کروں۔

پہلے نظر یہاں لڑنی چاہیے کہ "اوج بیاں انداختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے؟ اگر "عقل کل" کو "انداختہ" کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کدامیہ ٹھہراؤ گے، تو بے شبہ "انداختہ" کے فاعل دو ٹھہریں گے: ایک "ناوک انداز ادب" اور ایک "مرغ اوصاف تو" ایک فعل اور دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے؟

اب فقیر سے اس کے معنی سنیے۔ "من انداختہ" کا مفعول "را" مقدر، "منکہ" کا "کاف" توصیفی، "ناوک انداز ادب"، ادب آموز یعنی استاد، "مرغ توصیف تو" فاعل، مجھ کو، کہ عقل کل کا استاد ہوں، تیرے مرغ توصیف نے اوج بیان سے گرادیا۔ "عقل کل" تک کہ وہ علویوں میں اعلیٰ ہے، اس کا ناوک پہنچ سکتا تھا، مگر مرغ اوصاف اس مقام پر ہے، جہاں اس "ناوک انداز" کو ناوک کے پہنچانے کی گنجائش نہیں، اوج بیان سے گرنا عاجز آجانا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوج بیان سے گر گیا۔ کیا اچھا مبالغہ ہے مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا خوب مضمون ہے اظہار عجز باوجود دعوائے قدرت! ۱۲

ایثار تو بر دوختہ[2] چشم و دہن آز

اس کے معنی تو وہی ہیں جو چھاپے میں لکھے ہیں۔ مصرع ثانی کی شرح میں گمراہ ہوگیا۔

"احسان تو ہر قطرۂ دریا بشگافت، تاہم بقید حساب نیامد"۔ یہ ہیچمدان اس معنی کے معنی نہیں سمجھا۔ سیدھی بات ہے، مگر خیال میں جب آئے گی کہ اساتذہ کے مسلمات معلوم ہوں۔ کمال ایثار و عطا میں مروارید و یاقوت و بحر و معدن کی کمبختی آتی ہے۔ لعل و دُر کا معدوم ہو جانا اور بحر و کان کا خالی رہ جانا، نئی نئی طرح سے باندھا ہے۔ چنانچہ میں نے کسی زمانے میں اس زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیرالدولہ والیٔ ٹونک کو بھیجا تھا، اس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں:

ناموس نگہ داشتی از جود بہ گیتی — جز پردگیانِ حرم معدن و یم را
وقت است کہ ایں قوم بہ ہر کوچہ و بازار — پرسند ز ہم منشا رسوائی ہم را

"پردگیانِ حرم معدن و یم" لعل و گوہر، جو کثرت ایثار سے کوچہ و بازار میں خاک آلودہ پڑے ہوئے ہیں، وہ باہمدگر دردمندانہ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ اس شخص نے سب کی حرمتیں رکھ لیں اور سب کی آبروئیں بچائیں، ہم کو اس قدر

---

[1] عرفی کا شعر ہے، جس کی شرح چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کے نام کے خط میں بھی آچکی ہے (مجلد ہذا صفحہ ۴۰۲) عجیب بات یہ ہے کہ دونوں خطوں کے الفاظ تک یکساں ہیں۔ گویا ایک خط دوسرے کی نقل ہے۔

[2] یہ شعر عرفی کا ہے:

ایثار تو بر دوختہ چشم و دہن آز — احسان تو بشگافتہ ہر قطرۂ یم را

بے حرمت و ذلیل کیوں کر رکھا ہے؟ قطرۂ دریا کا حساب کے واسطے چیرنا، بے حساب ہے۔ مقصود عرفیؔ کا یہ ہے کہ جتنے موتی دریا میں ہاتھ آئے، وہ بخش دیے اور بخشش کا ذوق باقی رہا۔ چونکہ قطرہ میں بالقوۃ استعداد موتی ہو جانے کی ہے، تو اس احتمال سے ہر قطرۂ دریا کو چیر ڈالا کہ اگر موتی ہاتھ آئیں، تو وہ سائلوں کو دیے جائیں۔ پہلے مصرع میں حرص کا سیر کر دینا، موافق مسلمات شعرا کے ممتنع اور اس کا وقوع میں آنا، اغراق، دوسرے مصرع میں باحتمال استعداد بالقوۃ قطرے کو چیر ڈالنا اور پھر اس طرح کہ ہر قطرے کو، یہ اغراق سے گزر کر تبلیغ و غلو ہے ۱۲

داد کا طالب، غالبؔ

(۴)

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آج منگل، ۱۶۔ جون ۱۸۶۷ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدۂ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو کھچوا کر بہ صورت تصویر[۱] آپ کی خدمت میں بھیجا۔

لفافہ انگریزی اقبال نشان شہاب الدین خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا۔ اس فرمان میں اس لفافے کی رسید نہ پائی۔ ظاہراً ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکر بے روح کے ٹکڑے اڑا دیے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کو بھیجی ہوئی لفافے میں لپیٹ کر روانہ کی۔ اب جب آپ اور لفافہ بھیجیں گے تو مطالب باقی کا جواب مع اوراق اشعار بھیجوں گا۔ زیادہ حد آداب۔

(۵)

در پرستش ستم و در کاہجوئی استوار

بادشہ را بندۂ کم خدمت پُر خوار ہست

حضرت پیر و مرشد برحق، روز افزونی کاہش اب اس حد کو پہنچی ہے کہ:

تقسیم جزو لایتجزیٰ محال ہے ہُ

آگے باد زمہریر نے لہو خشک کر دیا تھا، اب آتشِ دوزخ نے رہا سہا جلا دیا[۲]۔ کل عنایت نامہ آیا۔ آپ جو رقم فرماتے ہیں کہ تو نے میرے خط کا جواب نہیں بھیجا، مجھ کو باوصف استیلائے نسیان خیال میں آتا ہے کہ میں حضرت کے فرمان کا جواب لکھ چکا ہوں۔ ڈاکیے اب ڈاکو ہو گئے ہیں۔ اگر وہ لفافہ ڈاک میں تلف ہو گیا تو کچھ بعید نہیں۔ متوقع ہوں کہ اس کا نہ پہنچنا میری نارسائی بخت کی تاثیر سمجھنا چاہیے۔ میں مجرم نہ ٹھہروں۔ زیادہ حد آداب۔

روز دوشنبہ، ۱۱۔ اپریل ۱۸۶۸ء

نجات کا طالب غالبؔ

---

[۱] تصویر [۲] ظاہراً زمہریر سے مراد سرما ہے اور آتشِ دوزخ سے گرما۔

مفتی سیّد محمد عباس

مفتی صاحب سیّد اکبر علی شوستری کے صاحبزادے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے (ربیع الاول ۱۲۲۴ / مئی ۱۸۰۹) وہیں وفات پائی (۲۵- رجب ۱۳۰۶ / ۲۷- مارچ ۱۸۸۹) تفسیر، حدیث، فقہ، رجال، لغت، ہیئت نیز فارسی، عربی اور اردو نظم و نثر میں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ کم و بیش ساڑھے تین سو تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ فارسی، مادری زبان تھی۔ سیّد تخلص فرماتے تھے۔

میرزا نے "قاطع برہان" مفتی صاحب کو بھیجی تو لفافے پر یہ عبارت لکھی:

کان پور، بہ مکان نواب باقر علی خاں صاحب موصول و بخدمت خدام مخدومی جناب مفتی میر محمد عباس صاحب زاد مجدہ مقبول و در بارہ بخشیدن اطلاع رسیدن ارمغاں عنایت مبذول باد
(مرسلہ چہارم اگست ۱۸۶۲ء)

گویا مفتی صاحب اس زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت غازی الدین حیدر کے فرزند نواب باقر علی خاں (معین الدولہ انتظام الملک ظفر جنگ) کے ہاں کانپور میں مہمان تھے۔ مفتی صاحب نے "قاطع برہان" کی تاریخ کہی:

غالب آں مہر سپہر نظم و نثر　　ہم صفیر صائبا و طالبا
تحفہ با مہر از مہرش رسید　　شد رقم تاریخ "مہر غالبا"

مفتی صاحب نے میرزا کی مدح میں ایک رباعی بھی کہی تھی:

در فن معانی ید بیضا دارد
در سحر بیانی لب عیسیٰ دارد
گر شیوۂ منشیان دیگر جادوست
آواز قلمش عصائے موسیٰ دارد

قبلہ،

حضرت کا نوازش نامہ آیا، میں نے اس کو حرز بازو بنایا۔ آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عز و افتخار ہے۔ فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی، نہ سرسری بلکہ سراسر دیکھا جائے۔ نہ پیش نظر دھرا رہے، بلکہ اکثر دیکھا جاوے۔ میں نے جو نسخہ وہاں بھجوایا ہے، گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے۔ نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچہ و خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں، سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ طرز عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش ظرافت سے خالی نہ ہوگی۔ گزارش لطائف سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدأ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے: ماخذ میرا صحیح اور

طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں، مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد، تربیت استاد سے حُسن و قبحِ ترکیب پہچاننے لگا، فارسی کے غوامض جاننے لگا۔

بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔ "قاطع برہان" کا لکھنا کیا تھا گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہُوا۔ ہے ہے یہ ننگ مایہ معارضِ اکابر سلف ہُوا! ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "قاطع برہان" کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہُوں کہ حضرت "برہانِ قاطع" و "قاطع برہان" ایک نمط ہے۔ "برہان قاطع" نے کیا لٹھا، نینو، نین سکھ قطع کیا ہے، جو آپ نے اس کو "قاطع" لقب دیا ہے؟ "برہان" جب تک غیر کی کسی برہان کو قطع نہ کرے گی کیوں کر "برہان قاطع" نام پائے گی؟ "برہان قاطع" کی صحت میں جتنی تقریر کیجیے گا، وہ "قاطع برہان" کی صحت کے ثبوت کے کام آئے گی۔ قطعۂ تاریخ کا کیا کہنا! گویا یہ کتاب معشوق اور قطعہ اس کا گہنا ہے۔

جناب نواب صاحب کا نیاز مند اور بندۂ فرمانبردار ہُوں۔ بعد عرض سلام شعر کے پسند آنے کا متشکر گزار ہوں۔ آپ کے علم و فضل و فہم و ادراک کی جو تعریف کی جائے وُہ حق ہے، لیکن میرے شعر کی تعریف صرف خریداری دکان بے رونق ہے[1]۔[2]

عبدالغفور خاں نسّاخ

نسّاخ کے والد قاضی فقیر محمد صدر دیوانی کلکتہ میں وکیل تھے اور جامع التواریخ انھیں نے مرتب کی تھی۔ عبداللطیف خاں، جنھوں نے قومی خدمات میں ناموری حاصل کی، نسّاخ کے بھائی تھے۔ نسّاخ ڈپٹی کلکٹر بن گئے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں راج شاہی پہنچے اور وہاں کوئی ہم ذوق و ہم مشرب نہ ملا تو کہا:

فغاں از جاہلانِ راج شاہی ، وائے ناکامی
من و یزداں کسے ایں جا نمے فہمد زبانم را

میرزا کا مکتوب نسّاخ کے دیوان "دفتر بے مثال" کے متعلق ہے۔ نسّاخ کا تذکرہ شعرا (سخن شعرا)

---

[1] نواب صاحب سے مراد نواب باقر علی خاں ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنے مکتوب میں یہ بھی لکھا تھا کہ نواب صاحب آپ کے اس شعر پہ وجد کرنے لگے اور اسے مکرر پڑھا:

از من بہ من سلام ہم از من بہ من پیام
رنج و سنے مباد سلام و پیام ما

[مر]زا کے مکتوب کے آخری حصّے میں اسی معاملے کا ذکر ہے۔

[2] دفتر بے معنی سے مراد "قاطع برہان" ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے مکتوب کے آخر میں بھی یہ لکھ دیا تھا کہ ظرافت نے مصیبت برپا کی:

ظرافت نے آفت کو برپا کیا   درشتی نہ کرنی تھی یہ کیا کیا

مشہور ہے، مگر اب تک بہت کمیاب ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس نساخ کے کلیات کا ایک نسخہ تھا، جسے انھوں نے سادہ اوراق کے اضافے کے ساتھ مجلد کرا لیا تھا۔ اس میں جا بجا نئی غزلوں کے علاوہ کہیں کہیں یادداشتیں بھی لکھی تھیں۔ غالباً وہ سخن شعراُ کے لیے، جو ۱۲۸۱ / ۶۴-۱۸۶۵ میں مکمل ہوا تھا، مزید مواد فراہم کر رہے تھے۔

نساخ یکم شوال ۱۲۴۹ (۱۱- فروری ۱۸۳۴) کو پیدا ہوئے۔ وفات غالباً ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ ان کے فرزند کا نام شمس تھا۔ ریکارڈز آفس میں ملازم تھے۔ کلکتہ میں انھیں کی وجہ سے اردو شاعری کا چرچا تھا۔ وحشت مرحوم اور دوسرے اصحاب شمس ہی کے شاگرد تھے۔

جناب مولوی صاحب قبلہ،

یہ درویش گوشہ نشین، جو موسوم بہ اسداللہ اور متخلص بہ غالب ہے، مکرمت حال کا شاکر اور آیندہ افزایش عنایت کا طالب ہے۔ "دفتر بے مثال" کو عطیہ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ سمجھ کر یادآوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچمیرز ہیچداں کو قابل خطاب و لائق عطاے کتاب جانا۔ میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم بامسمیٰ ہے۔ "دفتر بے مثال" اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔ ہم فقیر لوگ اعلاءِ کلمۃ الحق میں بیباک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش علیہ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے، آپ اُن سے بڑھ کر بصیغۂ مبالغہ بے مبالغہ نساخ ہیں۔ تم داناے رموز اردو زبان ہو، سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان ہو۔

خاکسار نے ابتداے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں، مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کا فکر، نہ اُردو کا ذکر، نہ دنیا میں توقع، نہ عقبیٰ کی امید۔ میں ہوں اور اندوہ ناکامی جاوید۔ جیسا کہ خود ایک قصیدۂ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں:

چشم کشودہ اند بہ کہ دار ہاے من
ز آیندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

ایک کم ستر برس دنیا میں رہا اب اور کہاں تک رہوں گا؟ ایک اُردو کا دیوان، ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا، تین رسالے نثر کے،[1] یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا؟ مدح کا صلہ نہ ملا،

---

[1] لہ ناہنجہ، پنج آہنگ، مہر نیمروز اور دستنبو۔



غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔ بقول طالب آملی علیہ الرحمۃ:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود، بہ شد

سچ تو یوں ہے کہ قوت ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزہ، سر میں وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے، اس سبب سے فن کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ جو اس کا بھی بقیہ اس قدر ہے کہ معرض گفتار میں مطابق سوال، جواب دیتا ہوں۔ روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھیے وہاں[1] کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گنہگار بندہ کیوں کر بخشا جاتا ہے؟ حضرت سے یہ التماس ہے کہ آپ جو اہدا کے بادی اور مجھ کو ارسال نامہ کی سبیل کے بادی ہوئے ہیں، جب تک میں جیتا رہوں، نامہ و پیام سے شاد اور بعد میرے مرنے کے دعاے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے گا۔ والسلام بالوف الاحترام۔

مردان علی خاں رعناؔ

ان کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا کہ مہاراجا کپورتھلہ کے مقربین میں سے تھے اور کلکتہ بھی گئے تھے۔ کیونکہ نساخ نے "سخن شعرا" میں لکھا ہے۔ راقم نے انھیں کلکتہ میں دیکھا ہے اور ان کی ایک کتاب "غنچۂ راگ" کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۱)

خاں صاحب عالی شان مردان علی خان صاحب کو فقیر غالب کا سلام۔ نظم و نثر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اس فن میں تم یکتا ہو، خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی "جفا" کے مؤنث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں کہ "ہتھنی آیا" اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں، ورنہ ستم و ظلم و بیداد مذکر اور جفا مؤنث ہے۔ بے شبہ و شک۔ والسلام والاکرام ۱۲

(۲)

خاں صاحب مشفق عالی شان کو میرا سلام۔ کل تمھارا عنایت نامہ پہنچا۔ رام پور کا لفافہ آج رام پور کو روانہ ہوا۔ کاغذ اشعار میں نے دیکھ لیا۔ کہیں اصلاح کی حاجت نہ تھی۔ "نالہ در" الخ "نالہ دل" بنا دیا[2]۔

---

[1] بارگاہ باری تعالیٰ میں وقت پرسش نیک و بد [2] رعناؔ کا شعر یہ تھا:

گزرا ہے مرا نالہ درِ چرخِ کہن سے تھا روح کا ہمدم نہ پھرا جا کے وطن سے

غالب کا مدعا یہ ہے کہ "درِ چرخِ کہن" کی جگہ "دلِ چرخِ کہن" بنا دیا۔

نواب صاحب اردو کا تذکرہ لکھتے ہیں۔ فارسی غزل تم نے بے فائدہ لکھی۔ دیکھو صاحب تم نے اپنے مسکن کا پتا لکھا، سو میں نے دوسرے دن تمھارے خط کا جواب روانہ کیا۔ منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے، مجھ سے ملے تھے۔ بہت خوب صورت اور خوش سیرت سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمھارے مداح اور میں اُن کا ثنا خواں۔ خدا تم کو اور اُن کو سلامت رکھے[1]۔ ۱۲

میرزا یوسف علی خاں عزیزؔ

اجداد کا وطن بنارس تھا لیکن ان کے والد میرزا نجف علی خاں جنونؔ بنارس چھوڑ کر علی گڑھ میں آ رہے اور وہاں کچھ جائداد بھی پیدا کر لی تھی۔ وہ سر رشتہ دار اور تحصیلدار بھی رہے۔ جنوری ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا۔ یوسف علی خاں عزیزؔ ناتجربہ کاری کے باعث جائداد کھو بیٹھے اور دہلی چلے آئے۔ میرزا غالب نے ان کیلیے کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ بلّی ماران کے ایک ہندو رئیس کے لڑکوں کو پڑھاتے بھی رہے۔

مرثیہ گوئی اور سوز خوانی میں اچھی دستگاہ تھی۔ میرزا اور حکیم احسن اللہ خاں کی کوشش سے بہادر شاہ نے عزیزؔ کو "سراج الشعرا" اور "سراج الذاکرین" کے خطاب دیے نیز تیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا غالباً حیدر آباد میں درخواست دی تھی، جیسا کہ میرزا ذکاؔ کے نام میرزا کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے۔ (خط ۱۱) تلاش روزگار میں بھوپال گئے اور وہیں ۱۲۸۹/۱۸۷۲ میں وفات پائی۔

(۱)

سعادت و اقبال نشان میرزا یوسف علی خان کو بعد دعا کے دل نشین ہو کہ تذکیر و تانیث ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں۔ اے لو! "لفظ" اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے، اہلِ پورب اس کو مؤنث بولتے ہیں۔ خیر، جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گروہ نے کچھ مان لیا، ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔ اس کا قاعدہ منضبط نہیں۔

الف مذکر، ب، ت، ث مؤنث۔ جیم مذکر، ح خ مؤنث، دال ذال مؤنث، رے زے مؤنث، سین شین مذکر، ص ض، ط ظ مؤنث، عین غین مذکر، ف مؤنث، قاف، کاف، لام، میم، نون مذکر۔ واؤ، ہے، یے مؤنث، ہمزہ مذکر۔ لام الف حروف مفردہ میں نہیں، مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا۔ مثلاً لام الف کیا خوب لکھا ہے؛ کہیں گے، "کیا خوب لکھی ہے" نہ کہیں گے۔

"خزادہ" "خداوندزادہ" کا مخفف ہے لیکن فارسی نہیں عربی نہیں۔ اُردو کا روزمرّہ تھا۔ "خزادہ" اور "خزادی" مرادف

---

[1] اس خط میں نولکشور کے دہلی آنے کا ذکر ہے اور وہ ستمبر ۱۸۶۱ء میں آئے تھے لہٰذا یہ خط ۱۸۶۱ء کے بعد کا ہونا چاہیے۔

صاحبزادہ اور صاحبزادی ہے مگر فی زمانناً متروک ہے۔

"فق" فارسی لغت نہیں ہو سکتا، عربی بھی نہیں۔ روزمرہ اردو ہے۔ جیسا کہ میر حسن لکھتا ہے:

کہ رستم جسے دیکھ رہ جائے فق

شعرائے حال کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

"تکیہ" لفظ عربی الاصل ہے، فارسی و اردو میں مستعمل۔ دونوں زبانوں میں ہم بہ معنی "بالش"، ہم بہ معنی "مکان فقیر" آیا ہے۔ ایران میں تکیۂ مرزا صائب مشہور ہے۔

"گل تکیہ" لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے۔ گل مخفف گال کا اور تکیہ بہ معنی "بالش" وہ چھوٹا سا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں "گل تکیہ" کہلاتا ہے۔ "گل" بہ معنے پھانسی انگریزی لغت ہے۔

انگریزی زبان نے بنگالے میں سو برس اور دلّی اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ "گل تکیہ" وضع کیا ہوا نور جہاں بیگم کا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ "گل" کیا چیز ہے۔

"معنی مفرد بہ لفظ جمع" اس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا۔ معنی مفرد، معانی جمع۔ اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ "اس شعر کے معنی کیا ہیں" یا "اس شعر کے معنی کیا خوب ہیں"۔ اس میں دخل نہیں کیا جاتا۔ خاص و عام کی زبان پر یونہی ہے۔ معانی کی جگہ معنی بولتے ہیں۔

"رت" لفظ ہندی الاصل "ورتھ" ہے، بہ ہائے مضمرہ۔ بعض مذکر بولتے ہیں، بعض مؤنث۔ شعر بہت اچھا ہے، صاف و ہموار ہے۔

(۱۸۵۶ء) راقم، غالب ۱۲

—— (۲) ——

میاں،

کل زین العابدین فوق کا خط، مع اشعار کے، ٹکٹ دار لفافہ کے اندر رکھ کر بسبیل ڈاک بھجوا دیا ہے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں نے جواب لکھا، تیسرے پہر کو روانہ کیا۔

"موتیوں کا پنکھا" البتہ بہت مناسب ہے، خیر "موتیوں کا نوالہ" بھی سہی۔

حافظ کے شعر کی حقیقت جب سمجھو گے جب قواعد مقررۂ اہل سخن دریافت کر لو گے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر مطلع میں یا اور اشعار میں قافیے کی احتیاج آ پڑے اور اس کی اطلاع ایک شعر میں کر دیں تو عیب جاتا رہتا ہے۔ جیسا کہ استاد کا قطعہ ہے۔ اس میں ربود و غنود کا لبو کا قافیہ ہے اور شعر آخیر قطعہ کا یہ ہے:

غلط کردم دریں معنے کہ گفتم زنخدانِ نگارِ خویش را سیو

GALLOWS

حالانکہ صحیح "سیب" ہے بیائے موحدہ۔ شاعر نے اطلاع کردی کہ میں نے غلط کیا جو "سبو" لکھا۔

اسی طرح حافظ فرماتا ہے:

بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

حاصل اس کا یہ کہ دیکھ کتنا تفاوت ہے، ایک جگہ حرف ردی ساکن اور ایک جگہ متحرک، مگر یہاں ابھی معترض کو گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ ہاں تفاوت کو ہم بھی جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ تفاوت تم نے کیوں رکھا؟ اس کا جواب پہلا مصرع ہے:

صلاح کار کجا و من خراب کجا

یعنی حافظ فرماتا ہے کہ: عاشق زار و دیوانہ ہوں۔ صلاح سے مجھ کو کیا کام؟

پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے، تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ "سانس" میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مؤنث بولے گا تو میں اس کو منع نہیں کرسکتا۔ خود "سانس" کو مؤنث نہ کہوں گا۔

سیف کو "عدو کش" اور کمند کو "عدو بند" کہتے ہیں، سیف "عدو بند" نہیں ہو سکتی۔ تم کو کہتا ہوں کہ تم تلوار کو "عدو بند" نہ کہو۔ کوئی اور اگر کہے تو اس سے نہ لڑو۔

"زلف" کو "شب رنگ" اور "شبگوں" کہتے ہیں۔ "شبگیر" زلف کی صفت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ "شبگیر" اس سفر کو کہتے ہیں کہ پہر چھ گھڑی رات رہے چل دیں۔ نالۂ شبگیر، آہ و زاریٔ آخر شب کو کہتے ہیں، "زلفِ شبگیر" نہ مسموع، نہ معقول۔



سخن کا قافیہ بھی درست ہے اور تن بھی جائز ہے، یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی ہے اور اس پر متقدمین اور متاخرین اور اہلِ ایران اور اہلِ ہند کو اتفاق ہے۔

"قبۂ خشخاش" پوست کے ڈوڈے کو کہتے ہیں، اس میں کچھ تامل نہ چاہیے۔

تم اپنی تکمیل کی فکر کرو، زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔ والدعا

—— (۳) ——

بھائی،

تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنتے جاتے ہو؟ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا؟ ہاں، بھائی ضیاءالدین خاں صاحب ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟۔

ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے اور نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف، عربی اور فارسی ملی ہوئی زبان میں، حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔

یہ کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اس کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر منشی امیر علی خاں میرے کلام کے مشتاق ہیں تو یہ نسخہ موسوم بہ "دستنبو" مطبع مفید خلائق میں سے منگالیں اور ملاحظہ فرمائیں۔

میر احمد حسین میکش

میر کرار حسین کے صاحبزادے اور میرزا غالب کے عزیز شاگرد، دہلی کے سیدزادوں میں سے تھے۔ زیادہ تر فارسی کہتے تھے۔ میرزا نے میر مہدی مجروح کو ایک خط میں جو فروری ۱۸۵۸ء کا ہے، لکھا ہے:

میکش چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا۔ اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔ (خط ۱)

اسی حالت میں وہ غریب گرفتار ہوا اور پھانسی دے دی گئی۔ میرزا ایک خط میں لکھتے ہیں:

احمد حسین کا حال کچھ تم کو معلوم ہے؛ مخنوق ہوا (یعنی پھانسی پاگیا) گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔



بھائی میکش!

آفرین، ہزار آفرین۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے، جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب:

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی۔ اس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے۔ اس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمھارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسن طلب ہے کہ ناحق دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی دفعہ لے کر آیا ہے، ابھی خرمے لے کر آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بفرض محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے، تو ہم بھی کہیں گے:

"تازہ شے بہتر، بارہ سے بہتر۔"

۱۸۵۶ء

میاں عجیب اتفاق ہے۔ نہ میں تمھارے دیکھنے کو آسکتا ہوں، نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرما سکتے ہو۔ وہ قدم رنجہ

کہاں سے کراو، سراپا رنجہ ہو۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تعطیل کے دن کیا ناخوش گزرے۔ یوسف مرزا سے، میر سرفراز حسین سے تمھارا حال سن لیتا ہوں اور رنج کھاتا ہوں۔ خدا تمھارے حال پر رحم کرے اور تم کو شفا دے۔ خواہش یہ ہے کہ ناتوانی کا عذر نہ کرو اور اپنا حال اپنے ہاتھ سے لکھو۔ والدعا

اسد

پیارے لال آشوب

رائے بہادر، سلسلۂ نسب راجہ ٹوڈر مل سے ملتا ہے۔ آپ کے بزرگواروں میں سے رائے بال مکند اور رائے سیتا رام مرہٹوں کے عہد میں مناصب جلیلہ پر فائز رہے۔ آپ سری رام صاحب مولف خمخانۂ جاوید کے عم محترم تھے۔ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ پرانے دہلی کالج میں ماسٹر رام چندر سے ریاضی کی اور مولانا امام بخش صہبائی سے فارسی کی تعلیم پائی۔ پھر گوڑگانوہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر کوآن کی تبدیلی ہوئی تو وداع کے لیے ایک جلسہ قرار پایا اور صاحب موصوف کے لیے چاندی کا ایک قلمدان بطور یادگار پیش کرنے کی تجویز ہوئی۔ اس پر ایک شعر کندہ کرانا تھا۔ آشوب ایک دوست کے ساتھ میرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجوزہ شعر کے لیے درخواست کی۔ میرزا نے مندرجہ ذیل قطعہ موزوں فرمایا:

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم
عاشق ہے اپنے حاکم عادل کے نام کی
سو یہ نظر فروز قلمدان نذر ہے
مسٹر کوآن صاحب عالی مقام کی

اسی وقت سے آشوب کے گہرے تعلقات میرزا سے قائم ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں ریل کے افتتاح کے لیے پنجاب کے گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ نے ایک دربار منعقد کیا تھا۔ اس میں میرزا بھی شریک تھے۔ آشوب سہارا دینے کے لیے میرزا کے ساتھ ہو گئے۔ میرزا نے گورنر سے کہا یہ میرا بیٹا تو نہیں مگر بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔ پھر آشوب لاہور میں سررشتۂ تعلیم کے کیوریٹر بعد ازاں انسپکٹر مقرر ہوئے۔ رائے بہادر کا خطاب (۱۸۹۲ء) پنشن (۱۸۹۵ء) "رسوم ہند" کے پہلے تین باب، قصص ہند حصہ اوّل و سوم، اردو کی تیسری کتاب، ترجمہ تاریخ انگلستان، ترجمہ تاریخ قیصری وغیرہ آشوب کی تصانیف ہیں۔

—— (۱) ——

شفیق مکرم بابو پیارے لال صاحب کو سلام۔ کل رقعہ مع مسودہ بابو چندر لال صاحب کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔ یقین ہے کہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا اور آپ مسودہ کرنے پر متوجہ ہوں گے[۱]۔ جلدی نہیں۔ آپ بغور اچھی طرح تامل سے لکھیے۔ جب صاف

---

[۱] ظاہر ہے کہ میرزا نے کوئی درخواست پنجاب کے گورنر کی خدمت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کا انگریزی ترجمہ آشوب کے ذمہ لگایا تھا۔

ہو جائے گا مجھے دیجیے گا۔ میں اپنی مہر کر کے ڈاک میں بھجوا دوں گا۔

ابھی ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس سے آیا ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ کل لارڈ صاحب آئیں گے اور پرسوں شملہ تشریف لے جائیں گے۔ بطریق اطلاع آپ کو لکھا جاتا ہے، یہ منظور نہیں کہ عرضی آج تیار ہو جائے اور کل میں آپ[1] کو دوں۔ ڈاک میں ارسال کرنا منظور ہے۔

۳۰۔ اپریل ۱۸۶۶ء — راقم اسد اللہ خاں غالب

(۲)

کیوں صاحب، ہم سے ایسے خفا ہو گئے کہ ملنا بھی چھوڑا! خیر میری تقصیر معاف کرو اور اگر ایسا ہی گناہ عظیم ہے کہ کبھی بخشا نہ جائے گا تو وہ گناہ مجھ پر ظاہر کر دو تاکہ میں اپنے قصور پر اطلاع پاؤں۔

برخوردار ہیرا سنگھ تمھارے پاس پہنچتا ہے اور یہ تمھارا دست گرفتہ ہے۔ رہتک میں اسے نوکر رکھوا دیا تھا۔ خیر وہاں صورت بگڑ گئی[2]۔ اب یہ غریب بہت تباہ ہے اور امور معاش میں سخت تنگ دل۔ تمھیں دست گیری کرو تو یہ سنبھلے، ورنہ اس کا نقشِ ہستی صفحۂ دہر سے مٹ جائے گا۔

عنایت کا طالب

غالب

(۳)

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے۔ ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور انھیں کون صیقل کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اس کو "الف صیقل" کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہو گیا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے:

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشقِ جنوں ہے۔ اب تک کمالِ فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا۔ بس وہی ایک لکیر صیقل کی جو ہے، سو ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب آثارِ جنوں ہی سے ہے۔

غالب

(۴)

فرزند ارجمند اقبال بلند بابو ماسٹر پیارے لال کو غالبؔ ناتواں نیم جان کی دعا پہنچے۔ لاہور پہنچ کر تم نے مجھے خط نہ

---

[1] آپ سے مراد لاٹ صاحب یعنی گورنر ہے۔ [2] رائے چھج مل کا بیٹا اور جواہر سنگھ جوہر کا بھائی جسے آشوب ہی نے رہتک میں ملازم رکھوایا تھا۔ وہ صورت بگڑ گئی تو اب کسی دوسری ملازمت کے انتظام کے لیے لکھا۔

بھیجا۔ اس کی حقیقی شکایت کروں، بجا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں تمھارا عاشق ہُوں اور کیوں کر نہ عاشق ہوں؛ صورت کے تم اچھے، سیرت کے تم اچھے۔ شیوہ و روش کے تم اچھے۔ خالق نے خوبیاں تم میں کُوٹ کُوٹ کر بھر دی ہیں۔ اگر میرا صلبی فرزند ایسا ہوتا تو میں اس کو اپنا فخرِ خاندان سمجھتا اور اب تم جس قوم اور جس خاندان میں ہو، اس قوم اور اس خاندان کے ذریعۂ افتخار ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال و جاہ و جلال عطا کرے۔

میاں، تم کو یاد ہے کہ میں نے تم کو سابق اس سے نورِ چشم میرزا یوسف علی خاں کے باب میں کچھ لکھا ہے[1]؟ میرے اختلالِ حواس کا حال تم جانتے ہو۔ خدا جانے اس وقت کس خیال میں تھا اور کیا لکھ گیا۔ جو لکھا وہ سہل انگاری تھی، اب جو لکھتا ہوں براستِ گفتاری ہے۔ مختصر یہ یعنی میرزا یوسف علی خاں عزیز بڑے عالی خاندان اور بڑی بزرگ قوم کے ہیں۔ شاعر بھی بہت اچھے ہیں، شعر بھی خوب کہتے ہیں، صاحبِ استعداد ہیں، علم ان کو اچھا ہے۔ یہ بھی گویا اہلِ علم و فضل سے ہیں اور ترقی کے قابل ہیں۔ نورِ چشم مولوی نصیر الدین کو میری دعا کہنا۔

محررۂ ۳۰۔ جنوری ۱۸۶۶ء



جواہر سنگھ جوہر

میرزا غالب کے عزیز دوست اور رفیق رائے چھجمل کا بیٹا، اس سے اور اس کے بھائی ہیرا سنگھ سے میرزا کو اولاد کی طرح پیار تھا۔ جوہر فارسی شعر کہتے تھے۔ سرکاری ملازمت میں ترقی پاکر تحصیلدار بن گئے۔ میرزا کی وفات سے پیشتر پنشن لے چکے تھے۔ "اردوئے معلّٰی" کی ترتیب و طباعت میں بھی جوہر نے سرگرمی سے حصّہ لیا۔ میرزا نے ایک رباعی میں میکش اور جوہر دونوں کا ذکر کیا ہے:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم شان دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

(۱)

برخوردار منشی جواہر سنگھ کو بعد دعا دوامِ عمر و دولت معلوم ہو، خط تمھارا پہنچا، خیر و عافیت تمھاری معلوم ہُوئی۔ قطعے جو تم کو مطلوب تھے، اس کے حصول میں جو کوشش ہیرا سنگھ نے کی ہے، میں تم سے کہہ نہیں سکتا، نری کوشش نہیں، روپیہ صرف کیا۔ پندرہ روپے جو تم نے بھیجے تھے وہ، اور پچیس تیس روپے اور صرف کیے۔ پانچ پانچ اور چار چار روپئے اور دو دو روپئے کو قطعے مول لیے اور بنوائے۔ خریدمیں روپئے جدا دیے اور بنوانے میں روپئے جدا لگائے۔ دوڑتا پھرا۔ حکیم صاحب کے پاس کئی بار جاکر حضورِ والا[2] کا قطعہ لایا۔ اب دوڑ رہا ہے۔ ولیعہد بہادر کے دستخطی قطعے کے واسطے یقین ہے

---

[1] اس سے ظاہر ہے کہ آشوب کے نام خط اور بھی تھے، جو محفوظ نہ رہے [2] بہادر شاہ، حکیم صاحب سے مراد بظاہر حکیم احسن اللہ خاں ہیں۔

کہ دو چار دن میں وہ بھی ہاتھ آئے اور بعد اس قطعے کے ہاتھ آنے کے وہ سب کو یکجا کر کے تمھارے پاس بھیج دے گا۔ مدد میں بھی اس کی کر رہا ہوں، لیکن اس نے بڑی مشقت کی۔ آفرین صد آفرین! پندرہ روپے میں سے ایک روپیہ اپنے صرف میں نہیں لایا اور ماں کو عاجز کر کے اس سے بہت روپے لیے۔ جب سب قطعے تمھارے پاس پہنچیں گے، تب اس کا حسن خدمت تم پر ظاہر ہو گا۔

کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا۔

(۱۸۴۹ء)[1] اسد اللہ

(۲)

برخوردار،

تمھارے خطوں سے تمھارا پہنچنا اور چھاپے کے قصیدے کا پہنچنا اور ہیرا سنگھ کا ادھر آنا معلوم ہوا۔ ہاں لالہ چھجمل اکثر بیمار رہتے ہیں۔ ان دنوں میں خصوصاً اس شدت سے نزلہ چھاتی پر گرا کہ وہ گھبرا گئے اور زیست کی توقع جاتی رہی۔ بارے کچھ صحت ہو گئی ہے۔ بھائی یہ آفتاب سرکوہ ہیں[2]۔ ”ہیرا“ کا اُن کے پاس رہنا اچھا ہے۔ تم سے جو ہو سکے گا تم اس کے مصارف کے واسطے مقرر کر دو گے۔

غزل تمھاری ہم کو پسند آئی۔ اصلاح دے کر بھیج دی گئی۔ اس کا تم خیال رکھا کرو کہ کس لفظ کو کس معنی کے ساتھ پیوند ہے:

چرا نہ یاس بجان امیدوار افتد

یہاں افتد مہمل ہے۔ ”یاس بہ دل افتادن“ و ”یاس بہ جاں افتادن“ روزمرہ نہیں اور بھی کئی ”افتد“ ایسے ہی ہیں:

سیاہ بختم اگر بر سرم گزار افتد — بسان سایہ ہما نیز سوگوار افتد

سوگوار ہونا سایے کا بہ اعتبار سیاہی رنگ ہے۔ اب یہاں دونوں ”افتد“ ٹھیک ہیں۔ گزار افتادن روزمرہ اور دوسرا



---

[1] اس خط کو ۱۸۴۹ء کا قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ غالب کے فارسی خطوط میں یکم دسمبر ۱۸۴۶ء کا مرقومہ ایک خط جوہر کے نام ہے، جس میں لنگی کی فرمایش ہے۔ ملاحظہ ہو کلیات نثر غالب فارسی صفحہ ۲۵۰

[2] رائے چھج مل کا انتقال ۱۸۶۰ء میں ہوا۔ غالب کے عزیز دوست تھے۔ سفر کلکتہ کے دوران میں کئی خط انھیں لکھے جو ”پنج آہنگ“ میں موجود ہیں۔ تاریخ وفات بھی کہی:

گویند رائے چھج مل، شیریں کلام مرد — دیرینہ دوست رفت ازیں تنگنا، دریغ

گفتم کسے ز سال وفاتش نشاں دہد — غالب شنید و گفت، چہ گویم: ”لبسا دریغ“

۱۲۷۷ھ

* * *

"افتد" بہ معنی "واقع شود":

شنیدہ ام، بجفاے تو مبتلاست عدو — چرا نہ شور بجانِ امیدوار افتد

شورافتادن روزمرّہ ہے اور "یاس افتادن" غلط:

بہ حیرتم کہ ز دوزخ کسانِ دوزخ را — کجا برند چو آہم شرارہ بار افتد

یہاں "افتد" بہ معنی "واقع شود" ٹھیک:

نہ گبرم و نہ مسلماں، بحیرتم کہ مرا — سواے دوزخ و مینو کجا گزار افتد

یہ شعر تمھارا بہت خوب ہے، آفریں:

قرار در وطن افسردہ مے کند دل را — خوشا غریب کہ دور از دیار و یار افتد

یہاں بھی "افتد" صحیح و بامعنی:

نیم رقیب کہ رسوائیم خجل نکند — خوش است پیشم اگر یار پردہ دار افتد

یہاں بھی "افتد" بہ معنی "واقع شود":

ترا، کہ شیوہ دگرگوں کنی بہ زعم بُتاں — خوش است، گر ز جفا بر وفا قرار افتد

"افتد" یہاں بھی ٹھیک ہے۔ بات اتنی ہی تھی کہ "بود" گدلا لفظ تھا "کنی" صاف[۵۱] ہے:

خط رخ تو بدل دادہ خط آزادی — خوشم کہ در شکن زلف تابدار افتد

وہ صورت اچھی نہ تھی یہ طرز خوب ہو گئی۔ معنی کا عیار کامل ہو گیا:

چکد ز خامۂ جوہرؔ سخن چناں کہ مگر — بزور موج دُر از بحر بر کنار افتد

دولت و اقبال روزافزوں روزی باد

نگاشتہ شنبہ نہم اپریل ۱۸۵۳ء — از اسد اللہ

(۳)

برخوردار کامگار سعادت و اقبال نشان منشی جواہر سنگھ جوہرؔ کو بلب گڈھ کی تحصیلداری مبارک ہو۔ پیلی سے نوح آئے نوح سے بلب گڈھ گئے۔ اب بلب گڈھ سے دلّی آؤ گے، ان شاءاللہ۔

سُنو صاحب، حکیم میرزا جان، خلف الصدق حکیم آغا جان صاحب کے، تمھارے علاقہ تحصیلداری میں بصیغۂ طبابت ملازم سرکار انگریزی ہیں۔ ان کے والد ماجد میرے پچاس برس کے دوست ہیں۔ ان کو اپنے بھائی کے برابر جانتا ہوں۔ اس صورت میں حکیم میرزا جان میرے بھتیجے اور تمھارے بھائی ہوئے۔ لازم ہے کہ اُن سے یکدل و

---

۵۱ مطلب یہ ہے کہ جوہرؔ نے پہلا مصرع یُوں لکھا تھا: "ترا کہ شیوہ دگرگوں بود بہ زعم بُتاں" غالبؔ نے "بود" کی جگہ "کنی" بنا دیا۔

یکرنگ رہو اور ان کے مددگار بنے رہو۔ سرکار سے یہ عہدہ بصیغہ دوام ہے۔ تم کو کوئی نئی بات پیش کرنی نہ ہوگی۔ صرف اسی امر میں کوشش رہے کہ صورت اچھی بنی رہے۔ سرکار کے خاطر نشان رہے کہ حکیم میرزا جان ہوشیار اور کارگزار آدمی ہے۔

۲-فروری ۱۸۶۴ء
غالب

منشی ہیرا سنگھ

رائے چھج مل کا چھوٹا بیٹا۔ جواہر سنگھ جوہر کا بھائی۔ میرزا کے کہنے پر آشوب نے اسے رہتک میں ملازمت دلوادی تھی۔ وہ قائم نہ رہی تو دوبارہ ملازمت کا انتظام کر دیا۔

(۱)

فرزند دلبند سعادت مند، منشی ہیرا سنگھ کے حق میں میری دعائیں قبول ہوں اور ان کے جتنے مطالب و مآرب ہیں وہ عنایت الٰہی سے پورے ہوں۔ بھائی "لبِ ساحل" کی سند پر یہ شعر ہے طالب آملی کا:

مدتے آں گدائے خونیں دِل   بود تنخالۂ لبِ ساحل

"لبِ بام"، "لبِ فرش"، "لبِ گور"، "لبِ چاہ"، "لبِ دریا"، "لبِ ساحل" بہ معنی کنارے کے ہے، مستعمل اہلِ ایران۔ "لبِ بام" اس مقام کو کہتے ہیں کہ جہاں ایک قدم آگے بڑھائیے تو دھم سے انگنائی میں آ رہیے۔ پس "لبِ دریا" اسے سمجھیے جہاں سے قدم بڑھائیے تو پانی میں جا رہیے۔ "لب ساحل" وہ ہوا، جہاں سے آگے بڑھے تو دریا میں گرے۔ "لبِ دریا" سے پاؤں دریا میں رکھا جاتا ہے، جیسا نہانے کے واسطے اور "لب ساحل" سے دریا میں کودتے ہیں، جس طرح سلطان جی کی باؤلی میں "لبِ بام" سے تیراک کودتے ہیں۔ اسی طرح تیراک جہاں دریا کا پانی نشیب میں ہوتا ہے، وہاں کراڑے کے کنارے پر سے کودتے ہیں۔ کراڑا "ساحل" اور کراڑے کا کنارا "لبِ ساحل"۔ جو صاحب کہ لبِ ساحل کو صحیح نہیں جانتے کیا وہ طالب آملی کو بھی نہیں مانیں گے؛ اور اس لفظ پر اعتراض کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان بیچاروں نے سوائے گلستان بوستاں کے کوئی فارسی کی کتاب نہیں دیکھی۔ اگر مدت تک قدما کی تصنیفات نظر میں رکھیں گے تو یقین ہے کہ دیکھ لیں گے۔

نجات کا طالب، غالب

(۲)

نورچشم غالبِ غم دیدہ، منشی ہیرا سنگھ کو دعا پہنچے۔ تمھارا خط محررہ ۱۱-جنوری پہنچا۔ دورے کا سفر بارے تمام ہوا۔ اب جاڑے کے دن آرام سے کاٹو۔ گھبراؤ نہیں، سال بھر پڑھائے جاؤ۔ جب لرڈ کا شد بد سے آگاہ ہو جائے، تب ڈپٹی کمشنر سے ترقی کی درخواست کرنا۔ اگر نائب تحصیلدار ہو جاؤ گے تو رفتہ رفتہ اکسٹرا اسسٹنٹ ہونے کی گنجائش ہے۔ مدرسے کے علاقے میں تو نوکر نہیں ہو جو بابو پیارے لال کو تمھاری بدلی کا اختیار ہو۔ زنہار میں اس باب میں

نہ بابو صاحب سے کہوں گا اور نہ یہ خط تمھارا منشی جواہر سنگھ کو دکھلاؤں گا۔ ناحق اُلجھو، کیوں؟ اس اُلجھنے سے فائدہ کیا؟ خاطر جمع رکھو:

کہ رحم گر نکند مدعی خدا بکند

مَیں ویسا ہی ہُوں جیسا تم دیکھ گئے ہو اور جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔

۱۴۔ جنوری ۱۸۶۶ء — غالب

بہاری لال مشتاق

دہلی کے کائستھ، منشی من بھاون لال کے صاحبزادے، ولادت ۱۸۳۵ء۔ وفات ۱۹۰۸ء۔ پہلے حکیم رضا خاں کے چھاپے خانے "اکمل المطابع" میں ملازم تھے اور "اکمل الاخبار" جاری کر رکھا تھا۔ حکیم محمود خاں مرحوم سے بھی وابستہ رہے۔ آخر میں رائے بہادر سری کرشن داس رئیس دہلی کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔

(۱)

سعادت مند باکمال، منشی بہاری لال بہ یُمن تاثیرِ دعائے غالب خستہ حال، عمر و دولت و اقبال فراواں ہو۔ منشی من بھاون لال تمھارے والد ماجد کا انتقال موجب رنج و ملال ہُوا۔ اگرچہ اس رہروِ جادۂ فنا سے میری ملاقات نہ تھی، لیکن تمھارے تنہا اور بے مربی رہ جانے کا میں نے بہت غم کھایا۔ خدا ان کو بخشے اور تم کو صبر عطا کرے۔

۲۶۔ فروری ۱۸۶۶ء — غالب

(۲)

برخوردار بہاری لال،

مجھ کو تم سے جو محبت ہے، اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ تمھارے خال فرخ فال منشی مکند لال[1] میرے بڑے پرانے یار ہیں۔ خوش خُو، خوش رُو، بذلہ گو۔ دوسرے تمھاری سعادت مندی اور خوبی اور علم اور بقدر حالِ علم، اُردو نظم و نثر میں تمھاری طبع کی روانی اور تمھارے قلم کی گل فشانی، مگر چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل تحریر ہمیشہ رہتا ہے، بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمھاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو جا بجا آگاہ کرتا رہتا ہُوں۔ خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ بالکل زائل ہو جائے۔ مگر بہاری لال! اس نونہال باغ دولت یعنی حکیم غلام رضا خاں کے دوام صحبت کو اپنے طالع کی یاوری سمجھو۔ یہ دانشمند ستودہ خو سے امیر نامور ہونے والا اور مراتب اعلیٰ کو

---

[1] مشتاق کے ماموں منشی مکند لال ابو ظفر بہادر شاہ کے مصاحب خاص تھے۔

پہنچنے والا ہے۔ اس کی ترقی کے ضمن میں تمھاری بھی ترقی ہونے والی ہے۔

بیا داماں صاحب دولتے گیر — کہ مرد از صاحب دولت شود پیر

میاں سچ تو یوں ہے کہ اکمل المطابع، اجمل المطابع بھی ہے۔ حکیم غلام نبی خاں منجملہ خوبان روزگار ہیں۔ نکوخو ہے اور نیکوکردار ہیں۔ میر فخر الدین آزاد منش اور سعادت مند نوجوان ہیں۔ کم گفتار اور مرنجاں مرنج ہیں۔ تم چاروں شخص یکیہ صدق و صفا اور مہر و ولا کے چار عنصر ہو۔ جہاں آفریں، تم چاروں صاحبوں کو خوشنود و دلشاد اور اکمل المطابع کو بارونق اور آباد رکھے۔

۷۔ جون ۱۸۶۸ء — غالب

کیول رام ہوشیار

دہلی کے کائستھ، میرزا غالب کے شاگرد، ان کے والد سلطان سنگھ بیگم سمرو کی فوج میں بخشی کے عہدے پر مامور تھے۔ کیول رام عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ ہندی بھی جانتے تھے۔ ذہین و ذکی تھے۔ پہلے بیگم سمرو کی سرکار میں ملازم رہے۔ پھر معلم بن گئے۔ امیرزادوں کو پڑھاتے تھے۔ پھر جیل خانے میں قیدیوں کو تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔ آخر یو۔پی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنا دیے گئے۔ ضعیفی کے باعث دورے کے شدائد برداشت کرنے کی ہمت نہ رہی تو چاند پور میں صدر مدرس بن گئے۔ چھوٹی بڑی اسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

غالب خاکسار کہتا ہے کہ شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنوران ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں۔ اہل ایران میں رودکی و فردوسی سے لے کر جامی تک اور جامی سے صائب و کلیم تک کسی نے لغت کی کوئی کتاب لکھی ہو، کوئی فرہنگ جمع کی ہو، تو ہمیں دکھاؤ۔ اس کو اگر میں نہ مانوں اور سند نہ جانوں تو میں گنہ گار۔ جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں، نام ان کے کہاں تک لوں۔ مشہور و غیر مشہور کچھ کم سو رسالے ہوں گے، ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں، کوئی اہل زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذۂ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے، بمناسبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دیے۔ استنباط معنی کا مدار قیاس پر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط ہے۔ میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔

ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی[1] یعنی جامع "برہان قاطع" احمق اور غلط فہم اور معوج الذہن ہے، مگر قسمت کا اچھا ہے۔ مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجہ

---

[1] محمد حسین تبریزی صاحب "برہان قاطع" جسے غالب عموماً دکنی لکھتے ہیں، اس لیے کہ وہ دکن میں تھا اور وہیں کتاب مرتب کی۔

بید[۱] کے برابر مانتے ہیں ۱۲

"گیا"، اور "گیاہ" بکاف فارسی مکسور سبزگھانس کو کہتے ہیں۔ "گیا" بہ کاف فارسی مفتوح کوئی لغت فارسی نہیں ہے، ہرگز نہیں ہے۔ مولوی رومؔ اور حکیم سنائیؔ کے ہات کے لکھے ہوئے شعر کس نے دیکھے ہیں کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے کاف پر دو مرکز اور فتحہ بنایا ہو۔ فرہنگ نویسوں کی رائے کی تباہی اور قیاس کی غلطی ہے، جو ایسا سمجھتے ہیں۔ نہ گیا بہ معنی پہلوان ہے، نہ کارگیا کوئی لفظ ہے، نہ کوئی لغت ہے ۱۲

"کے" بہ کاف مفتوح بروزن مے ایک لغت فارسی ہے، ذومعنیین یعنی دو معنی دیتا ہے، ایک تو "کب" یعنی "کس وقت" اور دوسرے معنی اس کے ہیں حاکم اور مالک کے۔ الف جو اس کے ساتھ آتا ہے، وہ کثرت کے معنی دیتا ہے جیسے "خوشا"، "بہت خوش"، "بدا"، "بہت بد"۔ "کیا"، "بڑا حاکم"؛

عشق آں بگزیں کہ جملہ اولیا یافتند از عشقِ او کار کیا

یعنی بہ سبب عشق کار بزرگ یافتند۔

سر فرو بردیم تا بہ سروراں سرور شدیم
چاکری کردیم تا کار کیائی یافتیم

یہاں بھی وہ کار بزرگ یعنی بڑا۔ پس یائے تحتانی اگر "مجہول" ہے تو "تعظیمی" ہے، اگر "معروف" ہے تو "مصدری" ہے، یعنی بزرگی کا کام، حکومت کا کام۔ "دہ کیا" مضاف اور مضاف الیہ مقلوب ہے، یعنی "کیائے دہ" اور "حاکم دہ"۔ "کار کیا" مثلہ یعنی "کیائے کار"، "مالک کار"۔ جہاں ماقبل اس کے رائے مکسور لائیں گے، وہاں "کار" موصوف اور "کیا" صفت ہے۔ نہایت تحقیق و اصل حقیقت یہ ہے۔ فقیر نے جہاں "کیا" کے لفظ پر خط مستقل کھینچا ہے، وہ علامت فتحہ ہے۔ دوسرا مرکز نہیں جو کاف فارسی سمجھا جائے گا ۱۲

داد طلب، غالب

مولوی کرامت علی

ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ غالباً انبالہ میں رہتے تھے۔

فقیر اسد اللہ جناب مخدومی مولوی کرامت علی صاحب کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ آپ کی تحریر کے دیکھنے سے یاد آیا کہ آپ یہاں آئے ہیں اور آپ کی ملاقات سے حظ اٹھایا ہے۔ حل معنی اشعار کی یہ صورت ہے کہ ہندی کے شعر میرے نہیں۔ شعرائے لکھنؤ میں سے کسی کے ہیں۔ بلکہ اغلب ہے کہ ناسخ کے ہوں۔ اشعار فارسی البتہ میرے ہیں:

---

[۱] یعنی وید جو ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتابیں ہیں۔

خواست کز ما رنجد و تقریب رنجیدن نہ داشت

جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نہ داشت

"داشتن" بمعنی "رکھنے کے ہے"۔ لیکن اہل زبان بمعنی "بایستن" بھی استعمال کرتے ہیں۔ ظہوری:

گر اسیر زلف و کاکل گفتہ باشم خویش را ؎

گفتہ باشم، ایں قدر بر خویش پیچیدن نہ داشت

میرے شعر میں پہلے مصرعے کا داشت بمعنی رکھنے کے اور دوسرے مصرعے کا داشت بمعنی "بالیست" ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ دوست ایسا حیلہ ڈھونڈھتا تھا کہ اس کے ذریعہ سے مجھ پر خفا ہو۔ چاہتا تھا کہ آزردہ ہو، مگر سبب نہیں پاتا تھا۔ قضارا کچھ دنوں کے بعد رقیب سے معشوق کو ملال ہوا۔ میری جو شامت آئے، میں نے دوست سے پوچھا کہ رقیب نے کیا گناہ کیا جو راندۂ درگاہ ہوا؟ معشوق اس گستاخی کو بہانۂ عتاب ٹھہرا کر آزردہ ہو گیا، اب شاعر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے ہائے "پرسیدن نداشت"۔ یعنی "پوچھنا نہ چاہیے تھا"۔

دیر خواندی سوے خویش و زود فہمیدم دریغ

پیش ازیں پایم ز گردِ راہ پیچیدن نہ داشت

عاشق ایک عمر تک منتظر رہا کہ یار مجھ کو بلا وے، مگر اس عیار نے نہ بلایا۔ رفتہ رفتہ میں اپنے غم سے ایسا نزار و ناتواں ہو گیا کہ طاقتِ رفتار نہ رہی اور گردِ راہ سے میرے پاؤں اُلجھنے لگے۔ جب اس نے یہ جانا کہ اب نہ آسکے گا۔ تب بلایا۔ عاشق کہتا ہے کہ تو نے میرے بلانے میں دیر کی اور میں اس کی وجہ جلد سمجھ گیا کہ تو نے میرے بلانے میں اس واسطے دیر کی کہ اس سے پہلے میں ایسا ضعیف نہ تھا کہ تو بلائے اور میں نہ آؤں۔ "دریغ" کو یہ نہ سمجھا جائے کہ "زود فہمیدن" پر ہے یا پہلے سے یار نہ ہونے پر ہے۔ دریغ ہے دوست کی بیوفائی اور بے سبب آزار دینے اور اپنی عمر کے تلف ہونے پر:

من بوفا مردم و رقیب بدر رزد نیمہ لبش انگبین و نیمہ تبرزد

انگبین، شہد کو کہتے ہیں اور تبرزد مصری کو کہتے ہیں، ان معنوں میں کہ یہ مانند قند اور بتاشوں کے جلد ٹوٹنے والی نہیں جب تک اس کو تبر سے نہ توڑو مدعا حاصل نہیں ہوتا۔ "بدر زدن" اگرچہ لغوی معنی اس کے ہیں، "باہر مارنا"، یعنی "بدر" "باہر" اور "زدن" "مارنا"، لیکن روزمرہ میں اس کا ترجمہ ہے نکل جانا۔ اب جب یہ معلوم ہو گیا تو یوں سمجھیے کہ معشوق کے ہونٹوں کو میٹھا کہتے ہیں اور قند اور مصری اور شہد سے نسبت دیتے ہیں اور البتہ مکھی مٹھاس کی عاشق ہے۔ پس جو مکھی کہ مصری پر بیٹھی، وہ جب چاہے، بے تکلف اُڑ جائے اور جو مکھی کہ شہد پر بیٹھے گی، جب وہ اُڑنے کا قصد کرے گی، پر و بال اس کے شہد میں لپٹ جائیں گے اور وہ مر کر رہ جائے گی۔ پس اب یہ کہتا ہے کہ میرے معشوق کے ہونٹ شیرینی میں میرے واسطے شہد ہو گئے اور رقیب کے واسطے مصری، یعنی وہ چاٹ کر، لطف اُٹھا کر، صحیح و سالم چلا گیا اور میں پھنس کر وہیں مر کر رہ گیا:

در ملکش بین و اعتماد نفوذش گر بہ مے انگندہم بہ زخم جگر زد ؎

" زدن " لازمی بھی ہے اور متعدی بھی۔ لازمی کے معنی ہندی ہیں " لگ جانا " اور متعدی کے معنی " مارنا "۔ یہاں زدن لازمی ہے۔ اب یہ سمجھا چاہیے کہ نمک شراب کو بگاڑتا ہے یعنی اگر شراب میں لون ڈال کر ایک آدھ دن دھوپ میں رکھیں تو اس میں نشہ جاتا رہتا ہے اور وہ سرکہ ہو جاتا ہے اور زخم پر اگر ڈالیں تو وہ کٹا کٹا کرتا ہے اور زخم کو بڑھاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ کہ تو میرے معشوق کے نمک کو دیکھ اور دیکھ کہ اسے نمک کے نفوذ پر کتنا بھروسا ہے۔ اگر وہ اس نمک کو شراب میں ڈال دیتا ہے تو وہ شراب میں نہیں ملتا، زخم جگر پر جا لگتا ہے۔ یعنی اگر بے محل بھی کرشمہ کرتا ہے تو بھی اپنا کام کر رہتا ہے:

کیست دریں خانہ کز خطوطِ شعاعی　　　مہر نفس ریزہ ہا بہ روزنِ در زد

یہ خیال ہے۔ یعنی ایک گھر میں اس کا محبوب بیٹھا ہوا ہے اور اس نے جان لیا ہے کہ کون ہے، مگر بطریق تجاہل بھولا بن کر پوچھتا ہے کہ آیا اس گھر میں ایسا کون ہے کہ مہر یعنی آفتاب نے اپنی سانس کے ٹکڑے فرطِ شوق سے دروازے کے روزن پر پھینک دیے ہیں؟ آفتاب کے خطوطِ شعاعی کا روزنوں پر پڑنا اور ان خطوطِ شعاعی کا یعنی سورج کی کرن کا بصورت سانس کے ٹکڑوں کے ہونا ظاہر ہے۔

دعوی او را بود دلیل بدیہی　　　خندۂ دنداں نما بہ حسنِ گہر زد

" خندۂ دنداں نما " اس ہنسی کو کہتے ہیں جو تبسم سے بڑھ کر ہو اور اس میں دانت ہنسنے والے کے دکھائی دیں۔ معشوق موتیوں کے حُسن پر ہنسا، اور ہنستا کوئی اس چیز پر ہے، جس کو اپنے نزدیک ذلیل سمجھ لیتا ہے۔ اصل معنی یہ کہ میرا معشوق موتیوں کے حُسن پر ہنسا۔ گویا اس نے یہ دعویٰ کیا کہ موتی کچھ اچھی چیز نہیں۔ اب دعوے کے واسطے دلیل ضرور ہے۔ سو شاعر یہ کہتا ہے کہ میرے معشوق کے دعوے پر دلیل بدیہی ہے یعنی ہنسنے میں اس کے دانت نظر آئے، معلوم ہوا کہ وہ حُسن جو لوگ موتی میں گمان کرتے تھے وہ لغو ہے۔ حُسن یہ ہے کہ جو معشوق کے دانتوں میں ہے۔ پس اسی دلیل نے سب کو دکھا دیا اور چونکہ بدیہی تھی، مان لیا۔

غیرت پروانہ ہم بروز مبارک　　　" نہ چہ آتش ببال مرغ سحر زد

پروانے کی غیرت دن کو بھی مبارک سمجھنی چاہیے۔ پروانے کی غیرت وہ غیرت نہیں کہ جو پروانے میں ہو یا پروانے کو ہو، بلکہ وہ غیرت کہ جو اور کو آتی ہو پروانے پر، یعنی رشک۔ حاصل معنی یہ کہ میں تو دن رات عشق میں جلتا ہوں۔ رات کو جو پروانہ جلتا ہوا دیکھتا تھا تو مجھ کو اس پر رشک آتا تھا۔ لو وہی غیرت اور وہی رشک جو پروانے پر شب کو تھا، اب دن کو بھی مبارک ہو۔ یعنی میرے صبح کے نالوں سے مرغ سحر کے پروں میں آگ لگ گئی اور میں اپنی مستی اور بیخودی میں یہ نہیں جانتا کہ یہ میرے نالے کے سبب سے ہے۔ مجھ کو وہ رنج اور غصہ تازہ ہو گیا جو رات کو پروانے کو دیکھ کر کھاتا تھا۔ اب مرغ سحر کو جلتے ہوئے دیکھ کر جلتا ہوں کہ ہائے یہ کون ہے جو میری طرح جلتا ہے:

لشکر ہوشم بزور مے نہ شکستی　　　غمزۂ ساقی نخست راہ نظر زد

" نظر " کو بھی کہتے ہیں اور " نگاہ " کو بھی۔ یہاں نگاہ کے معنی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں ایسا نہ تھا کہ شراب کی

تاب نہ لاتا اور شراب پی کر بیہوش ہو جاتا، مگر کیا کروں کہ پہلے غمزۂ ساقی نے نگاہ کو خیرہ اور مغلوب کر دیا۔ پھر اس پر شراب پی گئی۔ بیخودی کا استعداد تو بہم پہنچ ہی گیا تھا، ناچار ہوش جاتے رہے۔

زان بُتِ نازک چہ جاے دعویِ خون است　　دست وے و دامنے کہ او بکمر زد

اس شعر کا لطف وجدانی ہے، بیانی نہیں ہے۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ اس معشوق سے کہ وہ بہت نازک ہے، خون کا دعویٰ کیا کریں کہ اس کے وقتِ عزمِ قتل، دامن گردانتے وقت وُہ صدمہ پہنچا ہے کہ اس کا ہات ہے اور وُہ دامن کہ جو اُنھوں نے گردان کر کمر پر باندھا ہے۔ ایسا لچکا کمر کو پہنچا ہے کہ وہ آپ اپنے دامن پر داد خواہ ہو رہا ہے۔ پس کوئی اس سے خُون کا کیا دعویٰ کرے گا۔

برگ طرب ساختیم و بادہ گرفتیم　ق　ہر چہ ز طبع زمانہ بیہدہ سر زد
شاخ چہ بالد گر ارمغان گل آورد　　تاک چہ نازد اگر صلاے ثمر زد ۴

شاعر کہتا ہے کہ یہ روئیدگیاں بمقتضاے طینتِ خاک ہر طرف ظاہر ہُوا کرتی ہیں۔ مثلاً گنا۔ اب کچھ خاک کو اور ہُوا کو یہی منظور نہیں کہ اس کا رس نکلے اور اس کا قند بنے۔ یہ آدمی کی دانشمندی ہے کہ اس نے گھاس میں سے یہ بات پیدا کی۔ پس اس طرح انگور ہیں اور گلاب کے پھُول ہیں۔ شاخِ گُل کیا جانے کہ پھُول میں یہ خُوبی ہے اور تاک کیا جانے کہ میرے پھل میں کیا ہُنر ہے؛ ہم نے اپنے زورِ عقل سے انگور کی شراب بنائی اور پھُولوں کو ہر ہر رنگ سے اپنے کام میں لائے۔

کام نہ بخشیدہ ای، گنہ چہ شماری؛　　غالبؔ مسکین بہ التفات نیرزد

یہ گستاخانہ اپنے پروردگار سے کہتا ہے کہ جب اس عالم میں تو نے میری داد نہ دی اور میری خواہشیں پُوری نہ کیں تو بس اب معلوم ہُوا کہ میں لائقِ التفات کے نہ تھا۔ پس جب میں لائقِ توجہ کے نہیں تو اب عالمِ عقبیٰ میں میرے گناہوں کا مواخذہ کیا ضرور ہے؛ جب ہمارے مطالب آپ نے ہم کو نہ دِیے تو ہمارے معاصی کا بھی شمار نہ کیجیے، جانے دیجیے، ہم میں التفات کی ارزش نہیں ہے ۱۲

غالبؔ

نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ

نواب صاحب قوم کے بنگش تھے۔ ان کے دادا ولی داد خاں کوہاٹ سے دہلی آئے۔ والد ماجد عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر نے لارڈ لیک کی معیت میں کارہاے عظیم انجام دیے اور صِلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ بہ طور جاگیر پایا۔ جہانگیر آباد کا علاقہ اُنھوں نے خود خرید کیا۔ جو اب تک ان کی اولاد کے قبضے میں ہے۔ مرتضیٰ خاں کی شادی محمد بیگ ہمدانی کی نواسی اور اسماعیل بیگ کی صاحبزادی سے ہُوئی تھی۔ وُہی شیفتہ کی والدہ تھیں۔ پلول کی جاگیر تین لاکھ روپے کی تھی۔ مرتضیٰ خاں کی وفات کے بعد

وہ ضبط ہوگئی اور خاندان کے لیے پچیس ہزار کی پنشن مقرر ہوئی۔

نواب مصطفیٰ خاں ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بہترین تعلیم و تربیت پائی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص فرماتے تھے۔ اہل ذوق کے نزدیک غالب کے بعد فارسی اور اردو میں ان جیسا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ دہلی کی آخری مجلس علم و فضل کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ۱۸۳۵ء میں سفر حج اختیار کیا اور ایک سفرنامہ لکھا، جس کا عربی نام "ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک" اور فارسی نام "رہ آورد" ہے۔ یہ سفرنامہ اب بہت کمیاب ہے۔ ریختہ گو شعراء کے حالات میں "گلشن بے خار" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔ تریسٹھ برس کی عمر پاکر ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں غالب سے صرف چند ماہ بعد وفات پائی۔ نور اللہ تعالیٰ مضجعہ۔ غدر میں ان پر سخت مصیبت آئی تھی۔ خود گرفتار ہوئے، جاگیریں ضبط ہوگئیں، مقدمہ چلا اور سات سال قید کی سزا پائی، لیکن مرافعہ میں رہا ہوگئے اور صرف جہانگیر آباد کا علاقہ بحال رہا۔

شیفتہ کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ان کے چھوٹے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں نے کلیات شیفتہ و حسرتی کے نام سے چھپوا دیا تھا۔ ہمارے ممتاز قومی کارکن نواب اسماعیل خاں بیرسٹرایٹ لا مرحوم (میرٹھ) شیفتہ کے پوتے تھے۔ میرزا غالب نے شیفتہ کی محبت کے متعلق جو دستاویز "حبسیہ" میں پیش کردی ہے۔ اس کے نقوش دلوں سے کبھی محو نہ ہوں گے،

خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے   پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است

گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

جناب بھائی صاحب قبلہ،

یقین ہے کہ آپ مع الخیر اپنے دار الریاست میں پہنچ گئے ہوں اور جمعیت خاطر روزہ رکھتے ہوں سو یہاں کے کوئی خیال اور مولوی الطاف حسین[1] کے فراق کے سوا کوئی وجہ ملال نہ ہو۔ خدا کرے تم کو یاد آجائے کہ مفتی جی[2] شگفتی کو شگفت کا مزید علیہ مسلم نہیں جانتے تھے۔ سکندر نامہ میں دیکھا،

بسے در شگفتی نمودن طواف   عنان سخن را کشد در گزاف

صہبائی[3] شفق صبح کو غلط اور اس رنگ کو مخصوص بہ شام جانتا تھا۔ محمد سعید اشرف مازندرانی کے کلام میں نظر پڑا،

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مصاحب بن گئے تھے [2] مفتی صدر الدین آزردہ [3] مولوی امام بخش صہبائی، آخری دور میں فارسی کے مشہور معلم، غالب کے ہم عصر ۱۸۵۷ء میں انھیں گوروں نے بیگناہ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔



ہمچو صبح شفق آلودہ رخش سرخ و سفید

اب جو فقیر کا یہ مطلع مشہور ہُوا:

از جسم بہ جاں نقاب تا کے ایں گنج دریں خراب تا کے

حضرات کو اس میں تامل ہے۔ خرابہ کی جگہ خراب کو نہیں مانتے۔ آیا یہ نہیں جانتے کہ لغت عربی اصل "خراب" اور "خرابہ" مزید علیہ، "ویران" لغت فارسی الاصل اور "ویرانہ" مزید علیہ، "موج" لغت عربی اصل "موجہ" مزید علیہ ہے؛ مزید علیہ جائز اور لغت اصلی ناجائز کیوں ہو؛ یہ ایک مصرع قدما میں سے کسی کا ہے مگر پیش مصرع مجھے یاد نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کا ہے:

چوں مہر در کسوفم و چوں گنج در خراب

میں خود کہتا ہُوں کہ اس کو نہ مانو، اس راہ سے کہ میں قائل کا نام نہیں بتا سکتا۔ یہ مطلع مرزا محمد علی صائب علیہ الرحمۃ کا ہے اور اس کے دیوان میں موجود ہے،

بہ نکر دل نہ فتادی بہیچ باب دریغ بگنج راہ نہ بردی دریں خراب دریغ

گنج و خراب، گنج و خرابہ، گنج و ویران، گنج و ویرانہ مستعمل اہل ایران ہے۔ اس بات میں متردد ہونا محض عدم اعتنا ہے۔ والسلام

صبح سہ شنبہ دہم ماہ صیام، سال غافرپئے اہل اسلام

(۱۰۔ رمضان ۱۲۸۱ھ مطابق ۷۔ فروری ۱۸۶۵ء)

مولوی ضیأ الدین خاں ضیاؔ دہلوی

(شمس العلما ایل ایل ڈی ایڈنبرا)

(۱)

بخدمت والا صاحب معظم، مسلّم علماء عرب و عجم مولوی ضیأ الدین خاں صاحب ضیاؔ دہلوی نبیرۂ نواب سابق بستی دارا پور۔

جناب مولوی صاحب

میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص ...[۱] کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے، معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن و صوفی صافی تھا، میرے شہر[۲] میں وارد ہُوا،

---

[۱] یہاں بھی "وارد ہُوا" مرقوم ہے لیکن ظاہر ہے کہ وارد ہُوا کا اصل موقع آگے ہے اور تکرار غلط۔ میرزا غالب از دہیں دو مرتبہ اسے لکھ گئے۔ [۲] یعنی آگرہ

اور لطائف فارسی بحت اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی، اس سے میرے حالی ہُوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوندازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد اور بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہو گئی۔

اہل پارس جو قِدم عالم کے قائل ہیں، وُہ مثل ہنود کے آفرینش عالم کا آغاز و انجام دسرو بن نہیں بتاتے۔ ہمارے مذہب کے مطابق بھی کیومرث وغیرہم کو دو چار ہزار برس سے کم ہرگز نہ گزرے ہوں گے۔ تالہ[1] اور نجوم اور طب اور فقہ اور النساد[2] کون سا علم اور کون سا فن ہو گا جو اس گروہ میں نہ ہو گا۔ سکندر جب ایران پر مسلط ہُوا تو ارسطو نے کتاب خانۂ دارا سے بہت سے علوم یونانی زبان میں نقل کیے۔ الحمد للہ اس گروہ کو دیکھیے، جن کا کلام علم حکمت میں حکمائے یونان کا ماخذ ہُوا۔ اگر بوعلی سینا قابوس[3] وشمگیر کے کتاب خانے سے کتب حکمائے یونانیہ لے کر مطالب حکمی زبان عرب میں نقل نہ کرتا تو اکابر عرب میں سوائے مسائل فقہیہ شرعیہ، علم معقول کا نشان نہ پایا جاتا۔

دو تین ہزار برس قبل آج سے کہ عرب و عجم بیگانہ ہمدگر تھے۔ اہل پارس اپنے مطالب علم بلکہ علوم متنوعہ کو کس زبان میں شروع کیا کرتے تھے اور تعلیم و تعلم و سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہو گا، بے شُبہ وہ الفاظ پارسی ہوں گے۔ جب خلیفۂ ثانی[4] کے عہد میں یزدجرد[5] مارا گیا اور پارس پر اعراب مسلط ہُوئے، درفش کاویانی کا جواہر آمیز چرم پارہ پارہ ہو کر غازیان اسلام پر بٹ گیا۔ کتاب خانے پارس کے کیا بادشاہی اور کیا رعایا کے چولھے میں جھونکے گئے، یعنی ان سے حمام گرم ہُوئے۔ جیسا کہ میں نے ایک جگہ اس واقعہ کو فارسی عبارت میں لکھا ہے۔ وھی ھذا:

کتاب خانہ ہائے پارسیاں افروزینہ گلخن گرمابہ ہائے بغداد شد۔ ہمانا احکام آتش پرستی ہم بر آتش بازگشت[6]۔

اگرچہ بلاغت خاص اہل عرب کے حصے میں آئی، لیکن فصاحت میں اہل پارس بھی اعراب کے شریک ہیں۔ بالجملہ اعیان عجم و لبنائے عرب میں امتزاج و اختلاط و مہر و محبت و قرب و روابط پیدا ہُوئے۔ اختلاف مذہب اٹھ گیا تھا اور ریاست و سیاست بہ صلاح و صواب دید فریقین ہونے لگے۔ طبیعتیں بہ طبیں ودراک۔ فارسی و عربی کو باہم ربط دے کر ایک اردو پیدا کیا۔ سبحان اللہ وہ زبان نکلی کہ نہ نری فارسی میں وہ مزا نہ، نہ نری عربی میں وُہ ذوق۔ زبان فارسی کے قواعد کے کتب خاکستر ہو گئے تھے۔ اس میں طرہ یہ کہ عربی کے قواعد کے بڑے بڑے جلیل القدر رسالے مرتب ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے۔ بے چارہ فارسی زبان

---

[1] الہیات [2] موسیقی [3] امیر شمس المعالی قابوس وشمگیر خاندان زیاریہ کا مشہور بادشاہ جس کا مرکز جرجان تھا۔ یہ اہل علم کا مربی تھا۔ قابوس نامہ اسی کی تصنیف ہے۔ یہ غلط ہے کہ بوعلی نے یونانی علوم عربی میں منتقل کیے۔ یہ علوم اس سے پیشتر منتقل ہو چکے تھے۔ [4] حضرت فاروق اعظم رض [5] ساسانی خاندان کا آخری بادشاہ جو حضرت عمر رض نہیں بلکہ حضرت عثمان رض کے عہد میں مارا گیا تھا۔ [6] میرزا کا یہ سارا بیان سراسر غیر محقق اور عام افسانوں پر مبنی ہے۔ عرب و ایران کی آویزش کے وقت بغداد کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ شہر عباسی خاندان کی حکومت قائم ہونے کے بعد منصور نے آباد کیا۔

❖ ❖ ❖ ❖

غریب الوطن، بے سروسامان۔ نہ اس کی کوئی فرہنگ، نہ اس کے قوانین کا کوئی رسالہ، نہ علم پارسی کا کوئی عالم باقی۔ دو چار ہزار لغت واسم ومثل زبان زد اہل عصر ہوں گے۔ فارسی کا حرف کہاں؟ فارسی کا نمونہ کہاں؟ فارسی زبان اعراب کی لونڈی، جو چاہا نام رکھ دیا، ضوٗ النہار کہہ کر پکارا، شمس النہار کہہ کر یاد کیا اور لونڈی چھوکری کہہ کر بلا لیا۔ سو بھی جو اکابر فریقین موجدِ زبان اُردو ہوئے تھے، وہ تسمیہ قواعد پارسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ ۸۰۰ھ ۹۰۰ھ میں ہوسناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے، نہ ایک، نہ دو بلکہ ہزار در ہزار فرہنگیں فراہم ہوگئیں[1]۔ یہاں تک کہ قتیل تو مسلم لکھنوی اور غیاث الدین ملا سے مکتب دار رام پوری اور کوئی روشن علی جونپوری اور کہاں تک کہوں کون کون، جس کے جی میں آئی وہ متصدی تحریر قواعد انشا ہوگیا۔ میں ان سب کو یا ان میں سے مختص فلاں وبہماں کو اپنا مطاع کیوں کر جانوں اور کس دلیل سے ان کے تحکم کو مانوں؟

پارسیان سابق جو جانتے نہ تھے کہ فاعل کس کو کہتے ہیں اور جمع کس مرض کا نام ہے، امر کا صیغہ کون جانور ہے اور اسم جامد کس قسم کے پتھر کو کہتے ہیں، انھوں نے کبھی نہ کہا ہوگا کہ دانا وبینا صیغۂ اسم فاعل اور نالاں وگریاں صیغۂ فاعل یا حالیہ ہے۔ ایک جماعت نے کہہ دیا ہے کہ الف نون افادہ معنی فاعلیت کرتا ہے۔ ایک صف پکار اٹھی کہ الف نون حالیہ ہے۔ خدا جانے اہل پارس اپنی زبان میں صیغہ امر کو کیا کہتے ہوں گے اور الف فاعل ان کی لسان میں کون ہوگا۔ آخر یہ فن امور دینی میں سے تو نہیں ہے کہ جو امام اعظم رح کے قول کو نہ مانے وہ مرتد ہے۔ قوت قیاس کا مادہ اوروں میں تھا، ہم کو مبداء سے یہ قوت عطا نہیں ہوئی اور پھر الف نون حالیہ کے وجود کے اعتراف میں میں ہی منفرد نہیں ہوں، بقول تمھارے اور اشخاص بھی ہیں۔ سوال اسی قدر ہے کہ الف نون حالیہ موجود ہے یا نہیں؟ سائل کا جواب وہیں تمام ہوا، یہاں تم نے فرمایا کہ سابقین افتاں وخیزاں کو الف نون حالیہ لکھ گئے۔ لاحقین نے کہا کہ یہ الف نون فاعل کا ہے۔ خیر ایک تردد اگر پیدا ہوا تو تسمیہ میں پیدا ہوا۔ متاخرین کا قول متقدمین کے کلام کا ناسخ اور الف نون حالیہ کے وجود کا مبطل تو نہیں ہوا۔ بہرحال یہی لکھ دو کہ بعض لوگ اس نون کو فاعل کا الف نون بتاتے ہیں اور بعض الف نون حالیہ کہتے ہیں۔ قصہ مختصر کاغذ استفتاء مع دستخط حضرات یا بے دستخط کل میرے پاس بھیج دیجیے۔

تھوڑی تقریر اگرچہ خارج از مبحث ہے لیکن اس واسطے وہ تقریر تحریر میں لاتا ہوں کہ پھر مجھے کچھ لکھنا نہ پڑے۔ اہل پارس کے منطق میں رواں ودواں مع نظائر کے بہت ہیں۔ کسی اسم کے ساتھ مختص نہیں۔ اہل عرب نے، بلکہ توبہ توبہ ان کو کیوں متہم کروں، فرہنگ نگاران ہند نے یہ نام موافق اپنے قیاس کے رکھے۔ ہم افادۂ معنی فاعلیت کے قیاس کو نہیں مانتے۔ الف نون حالیہ کہنے والوں کی ہم نے مطابقت رائے کی ہے۔ فارسی میں اسم فاعل دو صورت پر ہے یا گوینده یا گویا۔ صیغۂ امر کے مابعد جو الف نون ہے، وہ حالیہ ہے، ہاں فعل کا ایک توہم سا گزرتا ہے سو اگر بہ امعان نظر دیکھیے تو ویسا ہی ایک وہم مفعولیت کا بھی پایا جاتا ہے۔ پس نظر اس بات پر کہ فاعلیت کی حالت اور مفعولیت کی حالت معاً پائی جاتے ہی یہ الف نون حالیہ ہے اور اپنے وجود کے اثبات میں قواعد نحو عربیہ کا محتاج نہیں۔ خاص "افتادن" میں دیکھو کہ نہ "افتنده" مستعمل ہے،

---

[1] یہ سراسر مبالغہ ہے۔

مثل گوینده، نہ "افتاد" مسموع موجود ہے، مثل گویا" افتاں" صیغہ فاعل کہاں سے آگیا؟ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ" افتاں" توہم اسم فاعل جب مانتے کہ" افتاد" " بیفت" بہ معنی امر اہل زبان یعنی جو مالک ملکہ اردو سے فارسی و عربی ہیں[۱]، ان کی نظم و نثر میں آیا ہوتا۔ اصل مادہ" افتاں" جو" افت" ہے موجود نہیں، افتاں کہاں سے بہ معنی فاعل نکل آیا؟ مگر گرنے کی حالت جس پر طاری ہو وہ افتاں ہے ازروے حالت بہ حسب فعل۔" میرنده" کہو، مردن سے کیوں نہ بنایا؟ صیغہ فاعل متروک رہا۔ صرف صیغہ مفعول یعنی مرده پر قناعت کی اور یہ جو قبلہ اہل سخن فردوسی طوسی علیہ الرحمۃ کے ہاں آیا ہے،

میراں کسے داد ہرگز ممیر

مجاز ہے امر بھی اور تعدیہ بھی۔ متاخرین میں سے میرزا عبد القادر بیدل کہتا ہے:

بہ میراے سرکش ناپاک تا یک دم بیاسائی

بلکہ اُردو میں بھی گراں جاں آدمی کو کہتے ہیں،" اے فلاں کے فلاں مرچک"۔ سودا کہتا ہے:

جیتا رہے گا کب تک اے خضر مر کہیں

یہ سب بطریق مجاز ہے۔ خلاصہ یہ کہ الف نون فاعل نہ فارسی بحت میں، نہ فارسی آمیختہ بہ عربی میں ہے۔ قیاس کو میں مانتا نہیں۔ الف نون جہاں اسماء جامد کے آگے ہے، جمع کا ہے۔ جہاں صیغہ ہاے امر کے آگے ہے، حالیہ ہے۔

والسلام بہ الوف احترام۔

پہلا رقعہ بعد پڑھنے کے یا نقل لینے کے استفسار کے کاغذ کے ساتھ مجھ کو واپس مل جائے۔

نجات کا طالب، غالب

(۲)

جناب مولوی صاحب،

کرم از شما کمی از ما۔ اچھوں کے ساتھ سب بھلا کرتے ہیں، بُروں کے ساتھ نیکی کرنا جوانمردی ہے۔ اگر اپاہج نہ ہوتا، فوراً آپ کے پاس پہنچتا۔ اب متوقع ہوں کہ آج اس وقت یا اور وقت، مگر آج ہی تشریف لائیں اور ضرور تشریف لائیں۔ شام تک چشم براہ رہوں گا۔

۲۷- فروری ۱۸۶۶ء

عنایت کا طالب، غالب

قاضی محمد نور الدین حسین خاں



مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نور الدین حسین خان[۲] بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار مرزا شہاب الدین خاں بہادر نے یہ اجزا مجھ کو دیے۔ نظم سے میں نے بالکل قطع نظر کی۔ کامل صاحب کی نثر جو آغاز میں ہے، اس کو بھی نہیں دیکھا۔ صرف آپ کی نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست کر دیا۔ بعض موقع پر منشار اصلاح لکھ دیا ہے۔ مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی

---

[۱] یعنی فارسی آمیختہ بہ عربی [۲] قاضی نور الدین حسین خاں مؤلف" مخزن شعرا" (جو شاعروں کا تذکرہ ہے) اس تذکرے کی تکمیل کے ایک عرصہ بعد مصنف نے ایک نسخہ بغرض اصلاح غالب کے پاس بھیجا تھا۔

نثر میں دخل کروں۔ بہ فحوائے الامر فوق الادب حکم بجا لایا ہوں۔ مرحبا، آفرین۔ بخدا خوب نثر لکھی ہے۔ اللہ سبحانہٗ آپ کو مدارج اعلیٰ کو پہنچا دے اور سلامت رکھے۔

مرقومہ دوشنبہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۲ء — خوشنودی احباب کا طالب،
غالب

محمّد حسین خاں

اخبار "دبدبہ سکندری" رام پور کے ایڈیٹر تھے۔

(۱)

مشفقی مکرم محمد حسین خاں صاحب کو فقیر غالب کا سلام پہنچے۔ اسد اللہ ہر ہفتہ "دبدبۂ سکندری" کے معائنے سے سرور اُٹھاتا ہے۔ رام پور کے حالات پڑھ کر نہایت خوش ہے۔ ایک رباعی آپ کو اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ "دبدبۂ سکندری" میں، جہاں رام پور کا آپ لفظ لکھتے ہیں، پہلے یہ رباعی لکھ دیا کیجیے اور علی الدوام اس کا التزام رہے۔ یعنی ہر اخبار میں اس مقام پر یہ رباعی لکھی جایا کرے اور وہ رباعی یہ ہے:

آں کیست کہ جسم ملک را جاں باشد؛ — آں کیست کہ ہمسر سلیماں باشد؟
آں کیست کہ انجمش بہ فرماں باشد؛ — کس نیست مگر کلب علی خاں باشد؛

اور ایک قطعہ اس مراد سے لکھتا ہوں کہ جہاں رام پور کی نمایش گاہ کا ذکر لکھو، اس عبارت کے خاتمے پر یہ قطعہ لکھ دو اور اگر یہ قطعہ نمایش گاہ کے ذکر کے بعد پہنچے تو اس کی اطلاع لکھ کر دینا۔ یہ قطعہ ایک ہی بار لکھا جائے گا۔

نمایش گہے در خورِ شان خویش — بر آراست نواب عالی جناب
بہ شب زُہرہ و مہ قنادیل سقف — بود پیشکارش بہ روز آفتاب
ز غالب چو پرسیدہ شد سال آں — چنیں گفت آں رند خانہ خراب
ازاں جا کہ در بزمِ عیش و سرور — ز بخشش جہانے شدہ کامیاب
چو بینی نہایت ندارد "طرب" — بگو سال آں "بخششِ بے حساب"

"بخشش بے حساب" کے ۱۲۸۵ ہوتے ہیں۔ جب طرب کی "ب" کے عدد کو دور کر دیجیے تو ۱۲۸۳ھ ہوتے ہیں۔ فقط
مگر بھائی صاحب نواب صاحب سے بغیر اجازت لیے اور کسے ہرگز نہ چھاپنا۔

۱۱۔ اپریل ۱۸۶۷ء — جواب کا طالب، غالب

۱؎ ایڈیٹر دبدبۂ سکندری۔

(۲)

خان صاحب مشفق مکرم محمد حسین خاں صاحب کو غالب کا سلام پہنچے۔ آگے میں نے ایک خط مع ایک قطعہ اور ایک رباعی کے بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ آپ نواب صاحب سے اجازت لے کر اس کو موافق میری خواہش کے چھاپ دیں گے۔

۲۵۔ اپریل ۱۸۶۷ء — راقم اسداللہ خاں

(۳)

شفیق مکرم محمد حسین خاں صاحب کو فقیر اسداللہ خاں کا سلام۔ آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ مطالب دل نشین ہوئے۔ ۷۲ کی عمر ہوئی۔ اگر سن تمیز چودہ برس رکھیے تو ساٹھ برس کے نیک و بد، سیاہ و سفید کا تجربہ کار ہوں اور حقیقت ہر بات کی کماحقہٗ فوراً ذہن میں آجاتی ہے۔ واللہ باللہ ثم تاللہ تمہارا خط پڑھتے ہی مجھ کو یقین آگیا۔ آپ بھی اس کو یقین سمجھیے گا۔ اب جو تم کو دوست صادق الولا جانا تو حقیقت لکھتا ہوں [1]

۵۔ محرم ۱۲۸۴ھ (۱۰۔ مئی ۱۸۶۷ء)



صوفی منیری

جلیل الدین حسین نام، ابو محمد کنیت عرف شاہ فرزند علی متخلص بہ صوفی۔ ولادت ۹ شوال ۱۲۵۲ / ۶۔ جنوری ۱۸۳۸ وفات ۶۔ ذی قعدہ ۱۳۱۸ / ۲۵۔ فروری ۱۹۰۱۔ خانقاہ منیر کے سجادہ نشین تھے۔

زبدۂ اولاد حضرت خیرالانام، قبلہ و کعبہ مجموع اہل اسلام، حضرت پیر و مرشد عالی مقام کی خدمت میں فقیر غالب کی بندگی قبول ہو۔ اپنے ابوالآبا کے بوڑھے غلام کو آپ نے اتنا کیوں شرمایا کہ وہ بے چارہ شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے کافی تھا ان اشعار کا بھیج دینا اور حک و اصلاح کی اجازت دینا۔ میری مدح آپ کے غلاموں کو موجبِ ننگ و عار اور میرے آبا و اجداد کو ذریعہ عز و افتخار۔ حکم بجالایا۔ دو ایک جگہ املا کی صورت بدل گئی۔ کہیں مصرع کی جگہ مطلع لکھا گیا۔ بے شائبہ تکلف و تملق آپ کا کلام معجز نظام ہے۔ لفظ عمدہ، ترکیب اچھی، معنی بلند۔ فقیر اپنا حال زار لکھتا ہے۔ اکہتر برس کی عمر، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔ دو سطریں لکھیں، بدن تھرآیا، حرف سوجھنے سے رہا۔ قوتیں ساقط، حواس مختل، غذا قلیل بلکہ اقل:

---

[1] معلوم ہوتا ہے یہ خط چھاپنے والے نے پورا نقل نہیں کیا۔ آخر کا حصہ چھوڑ دیا۔ غالباً اس وجہ سے کہ اس میں کچھ باتیں ایسی ہوں گی جنھیں اس وقت شائع کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

ایام شباب میں کہ بحر طبع روانی پر تھا۔ جی میں آیا کہ غزلیات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا، داستان طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اس آٹھ نو سو شعر کو چھپوا لیا۔ اغلاط "برہان قاطع" از روئے انصاف نکالے اور اس کا ایک رسالہ مرتب کیا۔ "قاطع برہان" اس کا اسم اور "درفش کاویانی" اس کا علم۔ ان دونوں رسالۂ مطبوع کو ایک پارسل میں اور حضرت کے بھیجے ہوئے اوراق بھی اس پارسل میں اور یہ خط جداگانہ ڈاک میں بھجوا دیا اور توقع رکھتا ہوں کہ اس کی رسید روز ورود یا دوسرے دن لکھی جائے۔

منشی نول کشور

منشی نولکشور ۱۸۳۶ء میں بستوئی (ضلع علی گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ پہلے وطن میں تعلیم پائی، پھر تکمیل علوم کے لیے آگرہ چلے گئے۔

ان کے دادا منشی بال مکند ضلع آگرہ کے خزانچی تھے۔ والد منشی جمنا پرشاد تحصیلدار رہے۔ بڑے بھائی رائے مکھن لال سب جج تھے۔ منشی نولکشور کو ابتدا ہی سے اخبار نویسی کا شوق تھا۔ بھائی نے انھیں منشی ہرسکھ رائے مالک "کوہ نور" کے پاس لاہور بھیج دیا۔ منشی جی نے یہاں کچھ مدت گزاری۔ اخبار کو خاصی ترقی دی اور منشی ہرسکھ رائے ازالہ حیثیت عرفی کے ایک مقدمے میں قید ہو گئے تو ان کی امداد میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۱۸۵۸ء میں وہ لکھنؤ چلے گئے، جہاں مطبع قائم کیا اور "اودھ اخبار" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کر دیا۔ یہ اخبار اکانوے برس کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس وقت بند ہوا۔ جب منشی جی کے وارثوں نے پوری جایداد تقسیم کر لی۔

منشی جی نے رفتہ رفتہ مطبع کو ترقی دی اور علوم و السنہ مشرقیہ کی بے شمار کتابیں چھاپیں۔ ان میں فارسی، عربی، اردو، سنسکرت کی کتابیں شامل ہیں۔ قرآن مجید کی طباعت کا انتظام کیا تو ایک کمرہ اس کے لیے مخصوص کر لیا جس میں مشینوں کے تمام کارکن باوضو کام کرتے تھے۔ حفاظ کی ایک جماعت کے ذمے صحت کا انتظام تھا۔

پھر اس مطبع کی شاخیں کان پور، لاہور، اجمیر اور جبل پور میں قائم کیں۔ کاغذ کا ایک کارخانہ بھی جاری کیا۔ سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور نادار طلبہ کے لیے وظائف کا انتظام کر دیا تھا۔ کئی شفاخانے بنوائے۔ آگرہ کالج کے لیے بیس ہزار کے خرچ سے ایک ہوسٹل بنوا دیا۔ سرسید مرحوم کی تحریک پر علی گڑھ کے لیے دس ہزار نقد دیے اور بیس ہزار کی کتابیں پیش کیں اور بھی کئی خیراتی کاموں میں کشادہ دلی سے حصہ لیا۔ عربی، فارسی اور اردو کی جتنی کتابیں محفوظ ہو گئیں ان کے لیے سب سے بڑھ کر مستحق سپاس منشی نولکشور ہی ہیں، اردو کی بھی بے حد خدمت انجام دی کیونکہ مختلف علوم و فنون کی سیکڑوں فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے کرا کے انھیں چھاپا۔

---

[۱] ابر گہر بار

اودھ اخبار ادیبوں کی ایک اہم تربیت گاہ بن گیا۔ ۱۹۔ فروری ۱۸۹۵ء کو منشی صاحب نے انسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور عام روایت کے مطابق ایک کروڑ کی جائداد چھوڑی، جس میں غیر منقولہ جایداد کا بھی خاصا بڑا حصّہ تھا۔ ان کی ارتھی سپیشل ٹرین میں لکھنؤ سے کان پور لے گئے جہاں دریا کے کنارے آخری رسمیں منشی جی کے اکلوتے فرزند منشی پراگ نرائن بھارگو نے ادا کیں۔

منشی جی ایک مرتبہ دہلی گئے تھے تو میرزا غالب سے بھی ملاقات کی تھی۔

منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نول کشور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و جلال روزافزوں نصیب ہو۔ چونکہ احباب کامیابی و شادکامی سے شاد ہوتے ہیں، اس واسطے مجھے ان دنوں یاوری اقبال سے ایک امر خوشی کا پیش آیا ہے آپ کی خوشی کے واسطے لکھتا ہوں۔ بلکہ نظر ہمدگر کے اتحاد پر تم کو تہنیت دیتا ہوں۔

آپ کو مبارک ہو کہ آخر ماہ گزشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو سہ شنبہ کے دن ۳۱۔ مارچ ۱۸۶۳ء کو اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا اور ازراہِ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا۔ سبحان اللہ جو لوگ متعلق ہیں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے، وہ قسمتوں کے کتنے اچھے ہیں۔ جناب نواب معلی القاب کے مکارم اخلاق وہ روح افزا کہ جس سے مُردہ زندہ ہو جائے، صاحب والا مناقب تامس ڈگلس فورسائتھ صاحب[۱] بہادر سکرتر کے کلمات شفقت آمیز وہ روح آسا کہ جس کو سُن کر بیمار شفا پائے۔ میں ۔۔۔۔۔ شادماں آیا، بلکہ بڑھا، جوان آیا۔ سچ ہے:

وزیرے چنیں شہریارے چناں
جہاں چوں نہ گیرد قرارے چناں

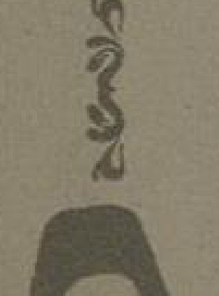
لفٹنٹ گورنر بہادر اور صاحب سکرتر بہادر کا کیا کہنا ہے۔ آفتاب و ماہتاب ہیں، پنڈت من پھول سنگھ[۲] میر منشی بھی دیانت و امانت و کارپردازی و مظلوم نوازی میں انتخاب ہیں۔ یہ نہ مبالغہ ہے، نہ خوشامد ہے، بیان واقعی ہے۔ شاعرانہ سخن سازی کو میں نے دخل نہیں دیا ہے۔ وہ لکھا ہے جو سچ اور واجبی ہے۔

دوام دولت سرکار انگریزی کا طالب
رنجور ناتواں اسداللہ خاں غالب

---

[۱] (Thomas Doughlas Forsyth) (۱۸۲۷ - ۱۸۸۶) انبالہ میں ڈپٹی کمشنر رہا۔ سقوط دہلی کے بعد باغیوں کی سزادہی کے لیے سپیشل کمشنر مقرر ہوا۔ کاشغر کا سفر بھی کیا۔ ۱۸۷۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔

[۲] مشہور نام پنڈت من پھول ہی تھا۔ "سنگھ" خدا جانے کیوں لکھا گیا۔



عزیز الدین

عزیز الدین بدایونی، ثم دہلوی۔ بدایوں میں پیدا ہوئے مگر دہلی کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔ فاضل شخص تھے اور میرزا کے شاگرد۔ پہلے عزیزؔ تخلص کرتے تھے۔ پھر صادقؔ اختیار کر لیا۔ وفات ۱۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ / ۲۵۔ نومبر ۱۸۹۲

صاحب،

کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو، دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو، جیسی آگے تھی؟ قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے[1]۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں[2] کی حویلی اسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب ہوتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی[3] مع قبائل و عشائر لوہارو میں ہیں۔ لال کنوئیں کے محلّے میں خاک اڑتی ہے۔ آدمی کا نام نہیں۔ تمہارے مکان میں جو چھوٹی بیگم رہتی تھی، اس کے پاس لکھمی کی دکان پر اس اشتہار کو بھیجا۔ بیگم لاہور گئی ہوئی ہے۔ لکھمی کی دکان پر کتے لوٹتے ہیں۔ مولوی صدر الدین صاحب لاہور، ایزد بخش، تراب علی، ان لوگوں سے میری ملاقات نہیں۔ میں نے آپ مُہر کر دی۔ حکیم احسن اللہ خاں اور میاں غلام نجف اور بہادر بیگ اور نبی بخش خاں ساکن دریبہ، ان کی مُہریں ہو گئیں۔ محضر آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ خط از روئے احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ پوسٹ پیڈ اکثر تلف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عبد الجمیل صاحب کا خط، جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے دیکھا ہو۔ آپ ان سے میرا سلام نیاز کہیے اور خط نہ پہنچنے کی ان کو خبر پہنچایئے[4]۔

غلام بسم اللہ

غلام بسم اللہ تاریخی نام تھا۔ اصل نام شاکر علی تھا۔ بسملؔ تخلص، میرزا کے شاگرد، میرٹھی مشہور تھے۔ پیدائش ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء وفات ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء۔ مفتی سلطان حسن خاں صدر الصدور سے تعلیم پائی۔ خط میں مصنف سے مراد یہی سلطان حسن خاں ہیں۔

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ خط ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ ہی دیر بعد کا ہے۔ [2] غلام حسین خاں مسرور بن فیض اللہ بیگ بن شرف الدولہ قاسم جان، میرزا غالب کے ہم زلف تھے۔ [3] یعنی ضیاء الدین احمد خاں نیّر اور امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو [4] عزیز الدین، قاضی عبد الجمیل سے ملے ہوں گے اور سنا ہو گا کہ خط کا جواب نہیں آیا۔ میرزا نے بتا دیا کہ خط ملا ہی نہیں اور انہیں حقیقت حال سے آگاہ کر دیجیے۔

منشی صاحب شفیق مکرم، مظہر لطف و کرم منشی غلام بسم اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ

صاحب یہ نیا ڈھنگ ہے شکایت کا۔ اگر تمھارے کلام میں اصلاح کم ہو تو کلام کی خوبی ہے۔ اس کو استاد کی سہل انگاری کیوں سمجھو؟ آپ کے منصف کی غزل میں اصلاح کم ہوتی ہے۔ پس ان کو چاہیے کہ خوش ہوں، نہ کہ مجھ سے گلہ کریں!

سنیے حضرت، خط میں خط[1] تداخل بُرا ہے۔ اگر یہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا تو مجھ سے پچاس روپے لیے جاویں گے یا قید کا حکم ہوگا[2]۔ آئندہ آپ خط جداگانہ بھیجیے۔ اس باب میں تاکید چاہیے۔ کوئی حیلہ جواز کا آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا۔

غالب

عزیز اللہ شاہ عزیز صفی پوری



میرزا غالب کے شاگرد نام محمد ولایت علی خاں تھا۔ مرشد سے بیعت کی تو نام بدل کر عزیز اللہ شاہ رکھ لیا۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں پنج رقعہ ولایت کے نام سے مشہور فارسی نثر پنج رقعہ کا جواب لکھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، نظم و نثر دونوں میں عمدہ دست گاہ تھی۔ ولادت ۶- صفر ۱۲۵۹ / ۸- مارچ ۱۸۴۳، وفات ۱۳- محرم ۱۳۴۷ / ۲- جولائی ۱۹۲۸ء (تلامذہ غالب)

(۱)

خاں صاحب عنایت مظہر سلامت

آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ اوراق پنج رقعہ نظر افروز ہوئے۔ خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں۔ نگارش تمھاری پنج رقعہ سابق کی تحریر سے لفظاً اور معناً بڑھ کر ہے۔ اس میں یہ معانی نازک اور الفاظ آبدار کہاں؟ مگر ایک امر سے تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ظہوری کی نہیں ہے۔ ارادت خاں متخلص بہ واضح عالمگیری سرداروں میں سے ایک شخص تھا۔ مینا بازار اور پنج رقعہ اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ توابی کسرات کی طرز ایجاد کی ہوئی اس کی ہے۔ موجد سے مقلد بہتر نکلا یعنی تم نے خوب لکھا:

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

جہاں آپ نے فقیر کا مطلع لکھا ہے، وہاں آپ بہ عرف میرے معترف ہوئے ہیں۔ متوقع ہوں یا شعر نکال ڈالو یا عرف

---

[1] اپنے خط میں کسی اور کا خط رکھ کر بھیجنا۔ معلوم ہوتا ہے لوگ ڈاک کے خرچ سے بچنے کے لیے یہی کرنے لگے تھے یعنی ایک کے خط میں دوسرے بھی خط رکھ دیتے۔ لہٰذا حکومت کو سخت سزا تجویز کرنی پڑی۔ [2] میرزا کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی جرمانہ ادا نہ کرے تو اسے قید کا حکم ہوگا لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی۔ سزا کا مستوجب خط رکھنے والا ہوگا، نہ کہ مکتوب الیہ۔ میرزا نے کیوں کہا کہ مجھ سے پچاس روپے جرمانہ لیا جائے گا؟ کہنا چاہیے تھا۔ تداخل کرنے والے پر یہ جرمانہ ہوگا۔

کی جگہ تخلص رکھو۔[1]

نجات کا طالب

غالب

(۲)

سخن شناس نہ ای مشفقا خطا ایں جاست۔ یہ جملہ کہ "یا میرا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھ دو"، موجب ملال خاطر کیوں ہوا؟ اس سے یہ مفہوم کیوں کر پیدا ہوا کہ میں تمہارے کلام کو اصلاح نہ دوں گا؟ تمہیں غور کرو کہ شعر کو علاقہ تخلص سے یا نام سے ...... عرف سے؟ میں نے تو اصلاح دی، تم نے برا مانا۔ ذہن تمہارا معوج ہے۔ مگر کجی کی طرف جاتا ہے۔ تمہاری اس نثر میں حک و اصلاح کی گنجایش نہیں۔ پنج رقعہ سابق سے لفظاً و معناً تمہاری عبارت بہتر ہے۔ اس قول کو باور نہ کرو گے تو منشا اس کا وہی اعوجاج طبع ہوگا مع سوء ظن۔

نجات کا طالب

غالب

سیّد محمد زکریّا خاں زکیؔ دہلوی

میرزا غالبؔ کے شاگرد وطن دہلی تھا اور اجداد امرا تھے۔ ان کے عہد میں جائداد بک گئی اور محکمہ تعلیم میں ملازمت پر مجبور ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس بن گئے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔

بندہ پرور!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ از روے شرافت نسبی و لیاقت حسبی آفتاب و ماہتاب ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے۔ اس عمر میں علم و فضل میں وہ پایۂ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسرے کو یہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ مثنوی کے اشعار میں نے دیکھے اور پسند کیے۔ بطریق سہل ممتنع کہے ہیں۔ اردو فصیح، عبارت سلیس، الفاظ نہایت سنجیدہ و متین۔ حرف حرف شگفتہ و رُفتہ۔ جو خوبیاں نظم میں چاہئیں، وہ سب موجود، مگر میری مدح میں اتنا مبالغہ کیوں کیا؟ میں تو اقلیم سخن کا گداے خاک نشیں ہوں۔ شہنشاہ

---

[1] میرزا کا ارشاد بالکل درست تھا۔ شاعر شعروں کے تعلق میں اپنے تخلص کی بنا پر معروف و متعارف ہوتا ہے نہ کہ اسم و عرف کی بنا پر۔ اگر اس کا کوئی شعر اتفاقاً کہیں لکھا جائے تو تخلص بنانا چاہیے لیکن عزیز صاحب نے خدا جانے اس سے وہ مطلب کیوں کر نکال لیا، جس کا ذکر میرزا نے دوسرے خط میں کیا ہے۔ غالبؔ کا نام زبان پر آتے ہی ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ شعر کس کا ہے۔ میرزا نوشہ یا اسد اللہ خاں لکھا جائے تو کون جانے گا؟ (یہ دونوں خط نقوش کے مکاتیب نمبر سے لیے گئے ہیں) ۲؎

کہاں سے ہو گیا، خیر آپ کی ارادت میرے لیے موجبِ سعادت ہے۔

جو صاحب شعر میں خود ستائی کو بُرا جانتے ہیں کیا اُنھوں نے یجوز للشاعر مالا یجوز لغیرہ[1] نہیں سُنا ہے یا اساتذۂ مستند الکمال کا فخریہ کلام ان کی نظر سے نہیں گزرا؟

اللہ اللہ اس امرِ خاص میں کیا کیا بلند پروازی اور اپنے کلام کی کیسے کیسے مدح طرازی کی ہے۔ شیدائے عالمگیری[2] کہتا ہے:

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حسن را پروردگارے، عشق را پیغمبرے

تین شعر، میں تین شاعروں کے بسبیل نمونہ یہاں لکھتا ہوں، باقی فائدہ کلام اہلِ سخن پر حوالے کرتا ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

بہ اقلیم معنی رسول امینم
سنائیؔ و فردوسیؔ از امتانم

دوسرا اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہے:

بہ مُلکِ سخن آں خدائے قدیرم
کہ معنی یکے باشد از بندگانم

تیسرا کچھ اور ہی راگ گاتا ہے:

حوضِ کوثر کہ مشرب الروح است
ناودانے ز پارگین من است

ناودان بمعنی موری اور پارگین اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مطبخ اور حمام وغیرہ کا پانی جمع ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ من شطحیات الشعراء۔

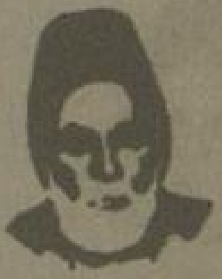
میر صاحب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس پر امراضِ متضادۂ مزمنہ میں گرفتار، قویٰ بالکل مضمحل۔ اُٹھنا، بیٹھنا، لکھنا، پڑھنا سب مشکل، احیاناً اگر تحریرِ جواب میں تاخیر ہو جائے، معاف رہوں۔

والسلام مع الوف الاحترام فقط

۹۔ جنوری ۱۸۶۶ء بروز چہار شنبہ

دعائے خیر کا طالب

فقیر غالب



---

[1] شاعر کے لیے جو کچھ جائز ہے وہ دوسرے کے لیے جائز نہیں [2] شیدا کو عالمگیری نہیں شاہجہانی لکھنا چاہیے اور اس شعر پر باز پرس بھی شاہ جہاں ہی نے کی تھی۔ یہاں تک کہ شیدا کو مملکت سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔

(یہ خط نقوش کے مکاتیب نمبر سے ماخوذ ہے)

سندِ شاگردی

یہ سند سید محمد زکریا خاں زکی رضوی دہلوی ڈپٹی انسپکٹر مدارس نے اپنے دیوان مطبوعہ جون ۱۸۹۵ء کے ساتھ شائع کی۔

سبحان اللہ سرٹیفکیٹ لکھنے کا کس وقت میں اتفاق ہوا ہے کہ میں نیم جان چند روز کا مہمان ہوں۔ مہینا بھر سے غذا بالکل مفقود، صرف گوشت کے پانی پر مدار ہے اٹھنا دشوار اگر اٹھوں تو دوران سر سے گر پڑوں۔ سید محمد زکریا خاں نسب میں سید امیر زادہ، عالی دودماں ان کے بزرگ وزارت کا منصب پا چکے ہیں، جاگیر اب تک تھی۔ پھر بہ عوض جاگیر پنسن مقرر ہوئی۔ معہذا یہ شخص بذاتِ خود نیک اور صاحب علم اور متواضع اور دانشمند اور نیک طینت اور رنگین طبع۔ معنی سے طبیعت کو علاقہ اچھا ہے شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اس فن میں میرے شاگرد رشید ہیں۔ (اسد اللہ خاں غالب)

سیّد احمد حسین تمنّا مرزا پوری

سید موصوف کے مفصل حالات نہ مل سکے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ لندن مشن سکول مرزا پور میں ہیڈ مولوی تھے۔ "مرقع ادب" میں ان کا تخلص مینا بتایا گیا ہے اور نمونہ کلام میں وہی دو شعر پیش کیے ہیں، جو میرزا غالب کے مکتوب اوّل میں منقول ہیں۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مولوی فرزند علی اخگر وکیل عدالت مرزا پور سے تمنّا کے روابط گہرے تھے۔

تمنّا کے دو رسالے بھی عزیز مکرم محمد عالم مختار حق (جھگیاں ناگرا۔ لاہور) نے دکھائے:

۱۔ تفرید التوحید، مطبوعہ مطبع گلزار احمدی مراد آباد (محرم ۱۳۰۴ / اکتوبر ۱۸۸۶ء) جس میں بعض متصوفہ کے اس قول کی تردید کی گئی ہے کہ تمام انبیاء و اولیاء وحدت وجود کے قائل ہیں۔ تمنّا نے مستند علماء اور اہل تصوف کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ نہ وحدت وجود عقائد دینیہ میں سے ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی صریح بات صحابہ، تابعین، قدماء صوفیہ سے منقول ہے، صرف آٹھ صفحے کا رسالہ ہے جو "نغمۃ الہدیٰ" کے ساتھ شائع ہوا۔ اس میں تمنّا نے اپنی کتاب "برہان القدس" کا ذکر بھی کیا ہے۔

۲۔ "اثبات العقل بالنقل" دیہ دس صفحے کا رسالہ ہے، مطبوعہ مطبع گلزار احمدی

ان رسالوں سے دو باتیں ثابت ہو گئیں۔ اوّل احمد حسین تمنّا عربی و فارسی کے فاضل تھے۔ دینیات

---

[1] آجکل بابت مارچ ۱۹۵۱ء

پر انھیں عبور حاصل تھا اور عقائد بھی خالص اسلامی تھے۔ دوم ان کا تخلص تمنّا ہی تھا، نہ کہ مینا۔ دونوں رسالوں میں نام کے ساتھ تمنّا ہی درج ہے۔

(۱)

جانِ غالب،

کل تمھاری دونوں غزلیں بعد اصلاح ٹکٹ والے لفافے کے اندر رکھ کر بھجوا دی ہیں۔ مطلع تم نے میری زبان میں کہا ہے:

ادائے یوسفی ہے لوٹ قاتل کے لڑکپن پر
سوادِ دیدۂ یعقوب کے دھبّے ہیں دامن پر

اس زمین میں میری غزل، (ہے) اور ناسخ و آتش کی بھی غزلیں میں نے دیکھی ہیں۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھی ہے۔ گردن کا قافیہ مجھے پسند آیا:

نزاکت ان کی وقتِ قتل مقتل میں یہ کہتی ہے
یہ اتنے خونِ ناحق جس سے اُٹھیں، اس کی گردن پر

غرضکہ ساری غزل بے مثل ولاجواب ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ابھی تمھارا شباب ہے۔ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ اس غزل میں تو تم نے جوانی کا زور دکھایا ہے۔

قصیدے کا وعدہ نہیں کرتا، اگر بے وعدہ پہنچ جائے گا تو لطف زیادہ آئے گا اور اگر نہ پہنچے گا تو محلِ شکایت نہ ہو گا۔[۱]

بندہ پرور میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہُوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی۔ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیتے تھے۔ سو ان دوستوں کا زمانۂ غدر میں گھر ہی لُٹ گیا۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا پھر میں اپنا کلام نظم و نثر کہاں سے لاؤں!

مولوی فرزند علی انگہ کا کون مشتاق نہ ہو گا، حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں ان میں جمع ہیں۔ فقیر ان سے مل کر بہت خوش ہُوا۔ آنکھیں ان کے حسنِ صورت سے روشن اور دل ان کے حسنِ سیرت سے مسرور ہو گیا۔

اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔[۳] میں یُوں ہی خدمت گزاری کو حاضر ہوں۔ جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں۔ میرا سلام اور یہ پیام کہہ دیجیے گا۔

۱۳- جولائی ۱۸۶۷ء

غالب

---

[۱] مطلب غالباً یہ ہے کہ مکتوب الیہ نے غالب کا کوئی قصیدہ مانگا تھا۔

[۲] ان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہُوا کہ مرزا پور میں وکیل عدالت تھے (تلامذۂ غالب) وہ غالباً دہلی میں میرزا سے ملے تھے [۳] بظاہر کوئی رقم بطور ہدیہ میرزا کی خدمت میں بھیجی گئی تھی۔

(۲)

بندہ پرور!

کل دوپہر کو آپ کے عنایت نامے کے ساتھ ہی انگر صاحب کا مہربانی نامہ مع غزل پہنچا۔ آج جواب آپ کو لکھتا ہوں۔ غزل میں نے دیکھ لی۔ سوائے ایک دو جگہ کے کہیں اصلاح کی حاجت نہ تھی۔ آج اس فن میں وہ یکتا ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ وہ بلا مبالغہ سراپا تصویر محبت ہیں۔ نظم تو نظم، ان کی نثر کے فقرے بھی قیامت ہیں۔ اس دوبارہ عطیے[1] اور یاد آوری کا احسان مانا۔ میری جانب سے قدر افزائی کا شکریہ ادا کر دیجیے گا کہ حضرت نے اس ہیچ میرز و ہیچ مداں کو قابل خطاب اور لائق جواب سمجھا۔ میں دروغ گو نہیں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ غزل دیکھی۔ الفاظ متین، معانی بلند، بندش دل پسند، مضمون عمدہ۔ سوائے ایک دو جگہ غزل بھر میں ایک نقطے کی بھی گنجایش نہ تھی۔ اصلاح کیا دیتا۔ بجنسہٖ واپس کرتا ہوں۔

قبلۂ حاجات، میرا حال کیا پوچھتے ہیں، زندہ ہوں مگر مُردے سے بدتر۔ جو حالت میری آپ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما گئے تھے، اب تو اس سے بھی بدتر ہے[2]۔ مرزا پور کیا آؤں۔ اب سوائے سفر آخرت کے نہ کسی سفر کی مجھ کو طاقت ہے، نہ جرأت۔ جوان ہوتا تو دعائے صحت کا طلب گار ہوتا۔ بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں:

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

سچ تو یہ ہے کہ قوت ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزا اور سر میں وہ سودا کہاں! پچاس پچپن برس کی مشق کا کچھ ملکہ باقی رہ گیا ہے۔ اسی سبب سے فن کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ حواس کا بھی بقیہ میرے اس شعر کا مصداق ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

جب تک زندہ ہوں نامہ و پیام سے شاد اور بعد میرے دعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے۔

سانس میری زبان پر مذکر ہے۔ رند کا یہ مطلع:

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

میرے لیے سند نہیں۔

بندہ پرور! لکھنؤ اور دہلی میں تذکیر و تانیث کا بہت اختلاف پائیے گا۔ سانس میرے نزدیک مذکر ہے۔ لیکن اگر اہل لکھنؤ اسے مؤنث کہیں تو میں ان کو منع نہیں کر سکتا۔ خود سانس کو مؤنث نہ کہوں گا۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہیے،

---

[1] یہ بھی کسی رقم ہی کی طرف اشارہ ہے۔ [2] دہلی میں ملاقات کی توثیق۔

کیجیے۔ مگر "جفا" کے مونث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا "جفا کیا"۔
چشم بد دور حضرت کی طبیعت نہایت اعلیٰ اور مناسب اس فن کے ہے۔ اللہ نگاہ بد سے محفوظ رکھے۔[۱]

مولوی نعمان احمد

مولوی صاحب کے متعلق اس کے سوا کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ مہیوا، پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور (یوپی) کے تھے اور مرزا نے سرنامے پر تعلقہ دار لکھا ہے۔

(۱)

جاں بر سر مکتوب تو از ذوق فشاندن ؎
از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد ؎

ابر رحمت، سلامت، یاد آوری کا شکر بجا لاتا ہوں۔ کیوں اتنی میری تعریف کی، جو میں اپنے کو اس کے لائق نہیں پاتا۔ ہرگز میں ایسا نہیں کہ خدا نے مجھ سے پہلے کوئی ایسا نہ پیدا کیا ہو۔ غایت ما فی الباب یہ ہے کہ سخنوران گزشتہ کا طرز شناس اور ان کی نازک خیالیوں کا پیرو ہوں۔ مبدءِ فیاض سے مجھ کو ان کی تقلید میں پایۂ تحقیق ملا ہے اور میں صاحب طرز جدید ہوں۔[۲]

اب یہاں ایک بات میں سچ کہتا ہوں۔ آپ باور کریں۔ واللہ میرے ایجاد کیے ہوئے طرز میں آپ سے بہتر نثر کسی نے نہیں لکھی۔ نہ یہ مبالغہ ہے، نہ تملق۔ خالصاً للہ آپ سچ ارشاد کریں کہ بعض اشخاص جو اس روش پر چلتے ہیں، باآنکہ خوش رفتار نہیں لیکن مجھ کو بُرا جانتے ہیں اور بُرا کہتے ہیں۔ یہ حق ناشناسی اور ناانصافی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب ضرور لکھیے۔

جو "قاطع برہان" میں کہیں کہیں سہو طبعی واقعی تھا، ناچار اس کی ترمیم و تکمیل کے واسطے اس نسخے میں کچھ بڑھایا اور ایک دیباچہ اور لکھا اور اس رسالے کا "درفش کاویانی" نام رکھا۔ کل یک شنبہ ہے۔ پارسل ڈاک میں روانہ ہو نہیں سکتا۔ پرسوں دو شنبہ کو بھیجوں گا۔ اس کے سوا وہ پرسش جس کا خط میں وعدہ ہے اس کا منتظر اور جلد پہنچنے کا آرزومند ہوں۔[۳] اب کے خط کے عنوان پر جو خیال میں آئے گا وہ لکھوں گا اور معذور رہوں گا۔ آئندہ خانی، نوابی یا جو اور الفاظ اسم مبارک کے ساتھ معمول ہوں، ان پر اطلاع پاؤں۔

شنبہ ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء   اسد اللہ

(لفافے پر یہ الفاظ مرقوم ہیں)

مقام مہیوا، پرگنہ مہولی، ضلع سیتاپور پہنچ کر فلک رفعت مخدوم مکرم و معظم جناب نعمان احمد صاحب تعلقہ دار زاد مجدہٗ



---

[۱] یہ دونوں خط مجھے میر مہدی مجروح کے پوتے سید سبط حسن فاضل زیدی (محلہ غریب آباد، نواب شاہ) نے مرحمت فرمائے۔ ان کی اس عنایت کا ممنون ہوں۔ [۲] گویا اگرچہ ابتدا سخنوران گزشتہ کی پیروی سے ہوئی لیکن بفضل اللہ درجۂ تحقیق و اجتہاد پر پہنچ گئے اور صاحب طرز جدید ہوئے۔

[۳] بظاہر یہ پہلا خط ہے۔ مکتوب الیہ نے خود کوئی اہم اطلاع بہم پہنچانے کا وعدہ کیا ہوگا جس کے آرزومند ہیں

کی خدمت میں مقبول ہو۔ پیدبیر ضروری

جواب کا طالب

غالب

—— (۲) ——

مولانا و بالفضل اولانا!

فقیر میں جہاں اور عیب ہیں، ایک یہ بھی عیب ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔ حکام سے بسبب ریاست خاندانی کے علاقے کے اکثر ملاقات رہتی ہے اور معاملات بھی آپڑتے ہیں۔ کبھی خوشامد کسی کی نہیں کی۔ بھلا حضرت سے جھوٹ کیوں بولتا اور آپ کی خوشامد کیوں کرتا؛ ایسا عامی بھی نہیں کہ واللہ باللہ کو تکیہ کلام جانتا ہوں۔ موحدہ کو اور واوؔ کو قسمیہ جان کر ازروے قسم لکھا تھا اور اب بھی ازروے قسم کہتا ہوں کہ نثر کے اس شیوۂ خاص میں اور مدعیوں سے آپ بہتر ہیں۔ آپ کو اپنا ہم فن اور ہم زبان سمجھ کر اپنا دردِ دل آپ کے سامنے کہا تھا۔ آپ نے غمخواری نہ کی بلکہ اور اُلٹا آپ مجھ سے ملول ہوئے۔ خیر یہ بھی میرے بخت کی برگشتگی تھی کہ حضرت کے ذہن نے میرے خلاف مقصود کی جہت انتقال کیا۔ برسوں سے خطوط فارسی لکھنے چھوڑ دیے۔ اب شاہزادہ بشیر الدین بہادر نبیرہ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع۔ بہتر برس کی عمر، حواس مسلوب، قویٰ مضمحل، بصارت میں ضعف، ہات میں رعشہ، نسیان مستولی۔ اے لو آپ کا خط آیا، پڑھا، جواب اور وقت[۲] پر حوالے کرکے خط مع سرنامہ رکھ چھوڑا۔ آج جو جواب لکھنے بیٹھا، خط نہیں ملتا۔ نہ بکس میں، نہ کتابوں میں، نہ طاق میں۔ حیران کہ اب کیا کروں۔ بارے جو کچھ یاد آگیا، اس کا جواب لکھا۔

قِران کے باب میں عرض یہ ہے کہ زہرہ و مشتری کا ایک برج اور درجہ و دقیقہ میں برابر ہونا "قران السعدین" ہے اور یہ قرانات جزئیہ میں سے ہے اور اکثر واقع ہوتا ہے اور یہ قران جب سلطنت موعود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قران آپڑا ہوگا، بہ شرط آنکہ برج طالع میں یا از وتد ثلثہ یا مائل اوتاد میں واقع ہوا کہ نظر اس کی طالع موعود پر ہو تو وہ افادۂ صحت و عیش و عشرت کرتا ہے اور بس۔ وہ قرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقال سلطنت ہوتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ قران تھا کہ زحل و مریخ سرطان میں فراہم ہوئے ہیں[۳]، سراسر ہندوستان کی خاک اُڑادی[۴]۔

قصہ مختصر، جو بادشاہ صاحب قران کہلاتا ہے، بہ اعتبار افراط جاہ و جلال و قوت حال کہلاتا ہے۔ طالع ولادت میں قران السعدین واقع ہونا ضروری نہیں۔ "صاحب قران" مرادف شاہنشاہ ہے، سو بھی صرف سلاطین تمریہ[۵] میں دو شخص "صاحب قران" کہلاتے ہیں، امیر تمر اور شاہ جہاں۔ تتبع کلام اساتذہ سے معلوم ہوگا کہ خاقانی نے اپنے کو "صاحب قران" لکھا ہے۔ اسی طرح فقیر نے بھی لکھا ہے:

---

[۱] یہ اشارہ ہے خط ۱ کے واللہ باللہ کی طرف۔ [۲] یعنی دوسرے وقت پر۔ [۳] یعنی اکٹھے ہوئے ہیں۔ [۴] یہ اشارہ غالباً ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی طرف ہے۔ [۵] تیموری بادشاہ

سزدگر نویسند "صاحب قرانم"[۱]
اور بیان مدت توقیع نویسی علت نہیں ہے صاحب قرآن کہلانے کی۔ فقط
شنبہ ششم اکتوبر ۱۸۶۶ء

اسد اللہ | ۱۲۷۸ غالب | [۲]

از روئے احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔

(لفافے کا پتا یہ ہے)

مہیوا، پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور۔ بخدمت مخدوم ومکرم مولوی نعمان احمد صاحب زاد مجدہ مقبول باد از اسد

(۳)

حضرت آپ کو اپنے حال پر متوجہ پا کر اور مائل تحقیق جان کر کل چار سواد میں نے بہ سبیل پارسل روانہ کیے ہیں۔

۱۔ ایک "دافع ہذیان"۔ مصنف اس کے مولوی نجف علی، مجمع البحرین علم فارسی وعربی۔ سبب تالیف یہ کہ ایک شخص عامی فضول نے اپنی شہرت کے واسطے "قاطع برہان" کے مطالب کے رد میں ایک کتاب لکھی۔ "محرق قاطع برہان" اس کا نام رکھا۔ عبارت مہمل، مقاصد لوچ۔ مولوی نجف علی نے منصفانہ اس کے رد میں ایک رسالہ لکھا۔ موسوم بہ "دافع ہذیان" فارسی قدیم کی طرز پر۔

۲۔ دوسرا رسالہ، "سوالات عبدالکریم"۔ یہ شخص طالب علم ساکن دہلی ہے۔

۳۔ اس نسخہ کے خاتمے پر استفتاء ہے، جس کو میں نے تیسرا سواد شمار کیا ہے۔

۴۔ چوتھا "لطائف غیبی"۔ یہ رسالہ زبان اردو میں ہے۔ اس کا حال اس کے مشاہدے سے کھلے گا۔ متوقع ہوں کہ اس پارسل کی رسید ضرور لکھیے گا اور پارسل سے کئی دن پہلے ایک خط بھیجا ہے۔ اس کے جواب کا بھی طلب گار ہوں۔

۱۹۔ اکتوبر ۱۸۶۶ء
اسد اللہ بے دستگاہ

نظر بہ احتیاط یہ خط بیرنگ بھیجا ہے، قصور معاف۔ ۱۲

(۴)

قبلہ! آج خیال آیا کہ نامہ مرقومہ ۳۱۔ اکتوبر کے بعد کوئی خط میرے حضرت کا نہیں آیا۔ اس میں میری بھیجی ہوئی کتابوں کی

---

[۱] پورا شعر یوں ہے:

چہل سال توقیع معنی نوشتم   سزدگر نویسند صاحب قرانم

مطلب یہ ہے کہ میں نے ادب میں اپنے رتبے کی رفعت کے اعتبار سے اپنے آپ کو صاحب قراں لکھا۔ توقیع نویسی میں چالیس برس کی عمر گزارنا صاحب قراں کہلانے کی علت نہیں بلکہ محض اظہار واقعہ ہے۔ [۲] یہ مہر ہے جس پر ۱۲۸۷ تاریخ ثبت ہے۔ یہ تاریخ بداہتہً غلط ہے غالباً ۱۲۷۸ کو غلطی سے ۱۲۸۷ لکھ دیا گیا۔ غالب نے یہ مہر ۱۲۷۸ھ میں بنوائی ہوگی۔

رسید اور آپ کا عازم اکبر آباد ہونا مندرج تھا۔ اکبر آباد کا ہنگامہ تمام ہُوا۔ غالب ہے کہ آپ بھی اپنے دارالریاست کو پہنچ گئے ہوں گے۔ عجب ہے کہ وہاں پہنچ کر بھی آپ نے یاد نہ کیا۔

للہ الحمد کہ اقبال نشان، عالی دودمان مولوی سلطان احمد خاں کی نوید صحت ازروے مکتوب معلوم ہوگئی ہے۔ فقیر کی دعاے بے ریا ان کو پہنچے۔ میں حسب الحکم خط بیرنگ بھیجتا ہُوں۔ مگر طریق احوط یہ ہے کہ آپ کے خطوط بھی بیرنگ روانہ ہُوا کریں کہ فی الجملہ اس میں تلف ہونے کا اندیشہ کم ہے۔

جانتا ہوں کہ آپ شعر کہتے ہوں گے۔ اگر میرا گمان سچ ہے تو جیسا کہ نثر سے متمتع ہُوا ہُوں، نظم سے بھی بہرہ اندوز ہوں۔

نامۂ غالبِ بے ادب، تقصیر معاف، جواب طلب

دوشنبہ، ۱۷۔ دسمبر ۱۸۶۶ء

(لفافے کا پتا)

ضلع سیتاپور، پرگنہ مہولی۔ مقام مہیوا، بہ والا خدمت مولوی صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان مولوی نعمان احمد خاں بہادر تعلقدار زاد مجدہٗ مقبول باد۔

اسد یک رنگ بے رنگ

سیّد بدرالدین احمد کاشف

سید بدرالدین احمد کے متعلق اس کے سوا کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ "فقیر" مشہور تھے اور کاشف ان کا تخلص تھا۔ غالباً بے پور یا بھرت پور میں ملازم تھے۔ میرزا غالبؔ کے ہم زلف نواب غلام حسین خاں مسرور نیز میرزا کے عزیز دوست حسین میرزا سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ دونوں کا ذکر مکاتیب میں آیا ہے۔ مثلاً میرزا لکھتے ہیں،

"تمھارے بھائی غلام حسین خاں مرحوم کا بیٹا حیدر حسن خاں (ممّو)، خدا ہی خدا ہے جو بچے"؛

اس سے مراد علمی اور حقیقی برادری نہیں بلکہ ذاتی تعلق کی اخوت ہے۔

(۱)

مخدوم و مکرم جناب فقیر صاحب کی خدمت عالی میں عرض کیا جاتا ہے کہ بہت دن سے آپ نے مجھ کو یاد نہیں کیا اور مجھ کو کچھ آپ کا حال معلوم نہیں۔ بابو صاحب[۱] خدا جانے کہاں ہیں اور کس کام میں ہیں؛ ان کا بھی کچھ حال مجھ کو معلوم نہیں۔ منشی ہرگوپال تفتہ کی تحریر سے بابو صاحب کا حال اکثر اور تمھاری خیریت گاہ گاہ دریافت ہو جاتی تھی۔ سو وہ بہت دنوں سے علی گڑھ میں ہیں۔ اگرچہ خط ان کے آتے رہتے ہیں۔ مگر ان کو بھی بابو صاحب کا حال معلوم نہیں اور تم سے تو بُعد ہی ہے۔ پھر تمھاری خیر و عافیت کیا لکھیں۔

---

[۱] بابو صاحب سے مراد جانی بانکے لال رند ہیں، جن کے داماد کی وفات کا ذکر اگلے خط میں ہے۔

بہ ہر حال مقصود اس تحریر سے یہ ہے کہ نواب میر علی نقی خاں صاحب آپ سے ملیں گے۔ یہ بہت عالی خاندان ہیں۔ نواب ذوالفقار خاں اور نواب اسد خاں[۱] کی اولاد میں سے ہیں اور تمھارے ماموں صاحب یعنی نواب محمد میر خان کے بڑے دوست ہیں۔ اب یہ نوکری کی جستجو میں نکلے ہیں۔ آپ ان کی تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں اور راج کا حال سب ان پر ظاہر کریں اور اہالی سرکار سے ان کو ملوادیں اور بابو صاحب کو جو ان سے ملوائیے تو میرا خط جو آپ کے نام کا ہے، جناب بابو صاحب کو پڑھوا دیجیے۔ کیا خوب ہو کہ یہ اس سرکار میں نوکر ہو جائیں اور اگر نوکری کی صورت نہ بنے تو راج سے ان کی رخصت بہ آئین شائستہ عمل میں آوے۔ نواب اسد خاں عالمگیر کے وزیر تھے اور فرخ سیر ان کا بٹھایا ہوا تھا[۲]۔ جب فرخ سیر نے ذوالفقار خاں کو مار ڈالا تو از روے کتب تواریخ ظاہر ہے کہ سلطنت کیسی برہم ہو گئی اور خود فرخ سیر پہ کیا گزری۔ قصۂ کوتاہ ان کی تقریب میں جو مدارج آپ صرف کریں گے اور جس قدر آپ ان کی بہبودی میں کوشش کریں گے، احسان مجھ پر ہوگا۔ زیادہ، زیادہ۔

سنہ ۱۸۵۴ء اسد اللہ

(۲)

حضرت مخدوم مکرم و معظم جناب نقیر صاحب برکاتہم۔ بعد بندگی عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا، حال معلوم ہوا۔ بابو صاحب کے واسطے میرا جی بہت جلا۔ زمانہ ان دنوں میں اُن سے برسرِ امتحان ہے۔ پروردگار ان کو سلامت رکھے اور صبر و شکیب عطا کرے۔ علاوہ مساعدت روزگار کی وہ صورت، شدائد رنج سفر کی وہ حالت، ناسازگاری مزاج کا وہ رنگ۔ ان سب باتوں سے علاوہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ جوان داماد مرجاوے اور بیٹی بیوہ ہو جاوے۔ مرگ و زیست کا سررشتہ خدا کے

---

[۱] نواب اسد خاں کا اصل نام ابراہیم تھا۔ وہ عالمگیر اعظم کا وزیر اعظم اور خالو تھا، اس لیے کہ اس کی شادی ارجمند بانو بیگم ممتاز محل صاحبۂ روضۂ تاج کی حقیقی بہن سے ہوئی تھی اور اس کا فرزند اسماعیل ذوالفقار خاں عالمگیر کا خالہ زاد بھائی تھا۔ دکن کی جنگوں میں ذوالفقار خاں نے بڑا نام پیدا کیا تھا اور جنجی کا قلعہ اسی کے ہاتھ سے سر ہوا تھا۔

شاہ عالم بہادر اوّل کی وفات پر اس کے بیٹوں میں تخت کے لیے جنگ ہوئی تو ذوالفقار خاں نے معز الدین جہاندار شاہ کا ساتھ دیا۔ وہی کامیاب ہوا۔ باقی تینوں بھائی یعنی رفیع القدر جہاں شاہ، خجستہ اختر (والد محمد شاہ روشن اختر) رفیع الشان اور عظیم الشان مارے گئے۔ عظیم الشان کے فرزند فرخ سیر نے سادات بارہہ کی مدد سے جہاندار شاہ کے خلاف جنگ کی اور فتح پائی۔ بعد جلوس ذوالفقار خاں کو قتل کرادیا۔ اسد خاں نے چار پانچ برس کے بعد وفات پائی۔ مورخین اسے "خاتم الامرا" لکھتے ہیں۔ بیٹے کے قتل کی تاریخ خود کہی تھی:

ہاتف شام غریباں با دو چشم خونفشاں گفت ابراہیم، اسماعیل را قرباں نمود

اسی ذوالفقار خاں کی مدح میں ناصر علی سرہندی نے کہا تھا:

اے شانِ حیدری ز جبین تو آشکار نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

[۲] مطلب یہ ہے کہ فرخ سیر دہلی پہنچا تھا تو اسد خاں نے اس کی حمایت کی تھی، اس لیے کہ جہاندار شاہ کے اوضاع سے اسد خاں کو سخت اختلاف تھا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فرخ سیر کو اسد خاں نے تخت دلوایا تھا۔

ہاتھ ہے، آدمی کیا کرے۔ دل پر جو میرے گزری وہ میرا دل جانتا ہے۔ ہاں بحسب ظاہر تعزیت نامہ لکھنا چاہیے۔ حیران ہُوں کہ اگر خط لکھوں تو کس پتے پر لکھوں؛ ناچار ابھی تامل ہے۔ جب وہ بھرت پور آجائیں تو آپ ان کے آنے کی مجھ کو اطلاع دیجیے گا۔ کچھ لکھ بھیجوں گا۔

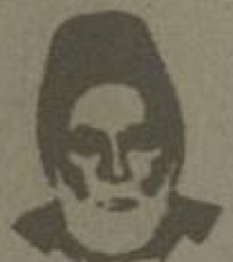
نواب علی نقی خاں صاحب کے خط کے جواب ہیں، جو آپ نے مجھ کو لکھا تھا، وہ مجھ کو یاد رہے گا۔ جب نواب آجائیں گے، میں ان کو سمجھا دوں گا۔

آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی۔ ہاں ہندی غزلیں قلعہ کے مشاعرہ میں دوچار لکھی تھیں، سو وہ یا تمھارے دوست حسین میرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاؑ الدین خاں صاحب کے پاس۔ میرے پاس کہاں؛ آدمی کو یہاں اتنا توقف نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا کر نقل اُتروا کر بھیج دوں۔ سید محمد صاحب کو اور ان کے دونوں بھائیوں کو میری دعا پہنچے۔

نگاشتہ ۴۔ شنبہ ۱۳۔ ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ

مطابق ۳۔ جنوری ۱۸۵۵ء اسد اللہ

(۳)



حضرت،

آپ کے خط کا جواب لکھنے میں درنگ اس راہ سے ہُوئی کہ میں منتظر رہا میاں کے آنے کا۔ اب جو وہ مجھ سے مل گئے اور ان کی زبانی سارا حال سُن لیا تو جواب لکھنے بیٹھا۔ سنو صاحب ایک منشی محمد تقی ہی تو نہیں، یہاں تو ساتا روحن[1] ہے۔ محمد تقی ایک، اس کی دو بہنیں تین، منشی آغا جان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا چار، یہ سات مدعی۔ ایک ان میں سید کی بی بی بھی سہی۔ نہ وہ حکام ہیں جن کو میں جانتا تھا، نہ وہ عملہ ہے جس سے میری ملاقات تھی، نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہُوا نیرنگِ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں، "یا حافظ"، "یا حفیظ" وردِ زبان ہے۔ تمھارے بھائی غلام حسین خاں مرحوم کا بیٹا، حیدر حسن خاں، خدا ہی خدا ہے، جو نچے۔ آج تیرھواں دن ہے کہ نہ تپ مفارقت کرتی ہے، نہ دست بند ہوتے ہیں، نہ قے موقوف ہوتی ہے۔ چار پائی کاٹ دی ہے۔ حواس زائل ہو گئے ہیں۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ کام تمام ہے۔ والسلام والاکرام

مرقومہ ۲۴، ذیقعدہ ۱۲۷۹ھ۔ ۱۳، مئی ۱۸۶۳ء عافیت کا طالب، غالب

(۴)

سید صاحب جمیل المناقب عالی خاندان سعادت و اقبال توامان۔

مجھ کو اپنی یاد سے غافل اور سید احمد کی خدمت گزاری سے فارغ نہ سمجھیں۔ پر کیا کروں صورت مقدمہ عجیب و غریب ہے۔ یہ

---

[1] سات بھیڑیوں کا مجموعہ، کنایۃً بہت سے آدمی جو مل کر ایک شخص کی ایذا رسانی پر تل جائیں۔

بہنیں اور ان کا بھائی باہم موافق رہیں گے تو کوئی صورت نکل آئے گی۔ صامت وناطق، سیم وزر، روپیہ اشرفی، سنتا ہوں کہ کچھ نہیں۔ ہاں جاداد، سو سید کے اظہار سے معلوم ہوا کہ وہ تقسیم نہ ہوگی۔ کرایہ اس کا تقسیم ہوجائے گا۔ میں رائے کیا دوں اور سمجھاؤں کیا! کئی دن ہوئے کہ میں حسین مرزا صاحب کے ہاں گیا تھا۔ وہاں میاں بھی بیٹھا تھا۔ باہم ان دونوں صاحبوں میں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بھی میری مانند حیرت زدہ تھے۔ قضا و قدر پہ چھوڑو، نیرنگِ تقدیر کے تماشائی رہو۔ گھاٹا نہیں، ٹوٹا نہیں، نقد مال کا پتا نہیں۔ املاک کا کرایہ بٹ رہے گا۔ گھبراتے کیوں ہو؟ یہ دلّی والوں کی خفقانیت کے حالات ہیں۔

تمہارا بھتیجا یعنی حیدر حسن خاں بچ گیا۔ عوارض کی آندھی دفع ہوگئی۔ توقع زلیست کی قوی ہے، صرف طاقت کا آنا باقی ہے۔ صدمہ بڑا اٹھایا ہے۔ جیسے بھرمیٔ جیسے تھے، ویسے ہی ہوجائیں گے۔ اِن شاء اللّٰہ العلی العظیم۔

صبح دوشنبہ ۲۵۔ مئی ۱۸۶۳ء

(۵)

پیرومرشد،

آج نواں دن ہے حسین مرزا صاحب کو الور گئے۔ اگر ہوتے تو اُن سے پوچھتا کہ حضرت میرا دیوان کس مطبع میں طبع ہوا اور حاشیے اس پر کس نے چڑھائے۔ خدا جانے حسین میرزا نے کیا کہا اور حضرت کیا سمجھے۔ اب یہ حقیقت مجھ سے سنیے۔ ۱۸۶۲ء یعنی سال گزشتہ میں "قاطع برہان" چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مول لیں اور یہ وہ زمانہ ہے کہ آپ دلّی آئے ہیں۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تمہارے کس کام کی ہے، تمہیں نہ دی۔ تم مانگتے اور میں نہ دیتا، تو گنہ گار تھا۔ اب کوئی جلد باقی نہیں ہے۔ رہا دیوان، اگر ریختہ کا منتخب کہتے تو وہ اس عرصہ میں دِلّی اور کان پور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔ فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا، جب چھپا تھا، پھر نہیں چھپا۔ مگر ہاں سال گزشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی، جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں، یعنی کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہوگیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو پیشگی بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔ جب جلدیں آجائیں گی ایک آپ کو بھیج دوں گا۔ نواب محی الدین خاں صاحب کا حال سن کر جی بہت خوش ہوا، میری طرف سے سلام و نیاز کے بعد مبارک باد دینا۔

ہرگوبند سہائے

پیدائش کول (علی گڑھ) ۱۸۲۶ء۔ وفات ۳۔ مئی ۱۸۹۱ء۔ پہلے دہلی میں صدر امین رہے۔ پھر گوالیار میں میر منشی مقرر ہوئے۔ بعد ازاں عدالت دیوانی میں نائب سررشتہ دار اور پھر وکیل (۱۸۶۲) میونسپل کمشنر

---

۱ عرف بڑے صاحب جن کا حال دوسری جگہ مرقوم ہے۔

آگرہ (۱۸۶۸) ریاست کوٹہ میں جج (۱۸۷۵)۔ آخر طبیعت پر مذہب کا ذوق چھا گیا۔ دریاے گنگا کے کنارے ایک دھرم شالہ کی تعمیر کرائی اور ایک بہت بڑا گیہ کیا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

(۱)

برخوردار بہت دن ہُوئے ہیں نہ تم کو خط لکھا ہے۔ اب اس خط کا جواب ضرور لکھو اور جلد لکھو۔ دو سوال ہیں تم سے، ایک تو یہ کہ یہاں مشہور ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر الہ آباد سے کانپور آ گئے، کوئی کہتا ہے آویں گے۔ اس کا حال جو کچھ تم کو معلوم ہو، لکھو، دوسرا سوال یہ ہے کہ دو قسم کی انگریزی شراب، ایک تو کاس ٹیلین[1] اور ایک اولڈ ٹام[2]۔ یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے، حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی تھی، اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ وہاں تم دریافت کرو کہ اس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بطریق ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؛ یہ دونوں امر دریافت کر کے مجھ کو جلد لکھو۔ اگر بہ قیمت مناسب ہاتھ آئے اور اس کا بھیجنا ممکن ہو تو یہاں سے روپے کی ہنڈوی بھیج دوں اور تم خرید کر بیل گاڑی کی ڈاک پر روانہ کر دو۔ جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے اور یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت[3] ہے۔ ضروری، جواب طلب۔

چہار شنبہ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۹ء　　　　از غالبِ جاں بلب

(۲)

صاحب، تم کو دعا کہتا ہوں اور دعا دیتا بھی ہُوں۔ شراب کی قیمت کے دو خط بھیجے۔ بھائی، کاس ٹیلن اور اولڈ ٹام دونوں چوبیس روپے درجن ہمیشہ لیا کرتا تھا۔ اب یہاں مہنگی ملتی ہے۔ میں نے تم سے پوچھا۔ جب وہاں بھی اسی قیمت کو ملتی ہے تو میرا مقدور نہیں۔ میں سمجھا تھا کہ شاید وہاں ارزاں ہو۔ خیر اس کو جانے دو۔ روٹی ہی ملے جائے تو غنیمت ہے۔ مہینے بھر کی روٹی کا مول ایک درجن کی قیمت ہے۔

جنوری ۱۸۶۰ء

---

[1] کیسٹیل (ہسپانیہ) کی شراب کا نام ہے۔ [2] وسکی کی ایک قسم۔ [3] گڑ چھال کی شراب سے مراد دیسی شراب ہے۔ اس کی مذمت غالب نے کئی جگہ کی ہے۔ مثلاً:

غالب شراب قندی ہندم دماغ سوخت　　　زاں بعد بادہ ہاے گوارا کشیدہ باد

نیز پنجاب کی فتح کے بعد ہارڈنگ کے قصیدے میں کہتے ہیں:

کنوں کہ ملک مطیع است و راہ بے خس و خار　　　زمن بگو بہ فروشندگان بادۂ ناب
شراب قندی ہندوستاں و ما غم سوخت　　　ز شیرہ خانۂ کشمیر آورند شراب

شاہ کرامت حسین ہمدانی بہاری

(۱)

شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ صوفیوں کی اصطلاح میں محاورت و مسامرت[1] اور مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ میرا شعر پڑھو:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

مطلب یہ ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لیے دہان زخم پیدا کرنا چاہیے، یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو، یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاہد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے، اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ سحابی رباعی میں لکھتا ہے:



اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ دورِ تو و نزدیک تو در حالِ تباہ
کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد آں را بہ تغافل کشی، ایں را بہ "نگاہ"

اب میرا شعر سنو:

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے "تغافل" سے تنگ آ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے، جب اس نے توجہ کی تو ایک نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

۱۳۔ دسمبر ۱۸۶۳ء نجات کا طالب، غالب

(۲)

شاہ صاحب،

میری ایک رباعی سنو:

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے، مگر مضمون بالکل نیا ہے۔ باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

---

[1] عبد و معبود کے درمیان مکالمت۔

دوسری رباعی سنو:

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے، اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

دیکھو، تم نے ایسی شوخی کہیں نہیں دیکھی ہوگی۔ یہ بالکل نئی بات ہے اور میرا حصّہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ہرچند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کے سلام کرتے ہیں، مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ و لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں، آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر دل میں خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرد، وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ شام کو صبح کرنا اور صبح کو شام کرنا خدا کا کام ہے، تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ زیادہ والدعا

۲۲۔ فروری ۱۸۶۴ء — نجات کا طالب،
غالب



صفیر بلگرامی

سید فرزند احمد بن سید عبدالحی عرف میر سید احمد حسینی واسطی سید، بلگرامی ثم آردی (کواتھ نزد آرہ، بہار) پیدائش ۲۸۔ ذی قعدہ ۱۲۴۹ / ۹۔ اپریل ۱۸۳۴ وفات ۲۱۔ رمضان ۱۳۰۷ / ۱۱۔ مئی ۱۸۹۰ حضرت صاحب عالم مارہروی کے نواسے تھے۔ پٹنہ میں انتقال ہوا، آرہ میں دفن ہوئے۔ ان کا تذکرہ "جلوۂ خضر" نیز بوستان خیال کا اردو ترجمہ (دس جلدیں) بہت مشہور ہیں۔ صفیر ایک مرتبہ میرزا سے ملاقات کے لیے دہلی بھی آئے تھے۔

(۱)

مولوی سید فرزند احمد صفیر کو اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔ آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستّرھواں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے:

سنین عمر کے ستّر ہوئے شمار برس — بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس[1]

نامۂ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور، دل میں سرور آیا اور قصّہ "سروش سخن" اس کے دوسرے دن پہنچا۔ قصّہ دیکھا۔

---

[1] اس کے جواب میں صفیر نے لکھا تھا:

سُنا صفیر، یہ کہتے ہیں حضرت غالب — بہت جیوں تو جیوں اور پانچ چار برس
مگر یہ پہلے سے امداد فیین کی ہے دعا — خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس

آپ کے جوہرِ طبع کی لمعانی اور فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصّہ تو بچّوں کے سلانے کی کہانی ہے، مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر "فسانۂ عجائب" کا مقابلہ کیا ہے، تو کیا کیا ہے؟ ابھی دیکھتا ہوں آیندہ اس کی اطلاع دی جائیگی۔ اس میں جابجا "لاچار" دیکھا ہے۔ "لا" کا لگانا کاتب کی جہالت ہے۔ ہائے خدا کی مار کاتبانِ ناہنجار پر۔ یہ میرا "دیوان" اور "پنج آہنگ" اور "مہرِ نیم روز" ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔

لو، بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک ان کو چپکا بٹھا رکھا اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں۔

۲۸۔ نومبر ۱۸۶۳ء[۱]

نجات کا طالب،
غالب



(۲)

مخدوم مکرم سید فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے۔ مجھ کو حضرت بر جبیس فطرت جناب حضرت صاحب عالم سے نسبت اویسی[۲] ہے۔ غائبانِ خاص کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے۔ آپ کی طرزِ نگارش نظماً اور نثراً درخشندگی جوہرِ طبع سے خبر دیتی ہے۔ اگر آپ کی طرف سے استصلاح کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا۔ باوجودِ خواہش خدمت کیوں نہ بجالاؤں؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں۔ مجموع ایک ورق میں کیوں کر گنجایش پائیں؟ ناگزیر جو اس نظم و نثر میں ہے، اس کو عرض کرتا ہوں[۳]:

۱۔ بسر در آوردن مخلِّ معنی۔ در آوردن کافی۔

۲۔ شور در سر انگیختن ٹکسال باہر، از سر انگیختن مناسب۔

۳۔ نہ برانگیزد نہ برخیزد فارسی ہند۔ برنخیزد و نینگیزد فارسیِ عجم۔

۴۔ "نالہ ہا کہ از دل سر بر زدہ اند" یعنی چہ؟ غیر ذی الروح بلکہ غیر ذی العقول کی جمع کی خبر بصیغۂ مفرد اسم ہے؟

۵۔ "پریستان" اصل لغت، مخفف اس کا "پرستان"۔ "پری استھان" توہم محض۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ آدم الشعراء رودکی سے فخر المتاخرین شیخ علی حزیں تک کسی کے کلام میں "پریستان" یا "پرستان" دیکھا نہیں۔

حضرت صاحب[۴] قبلہ کی جناب میں میرا سلام عرض کیجیے اور کہیے کہ آپ کا عطوفت نامہ اور ساتھ اس کے چودھری صاحب[۵] کا مودت نامہ پہنچا۔ دونوں نگارشیں جواب طلب نہ تھیں۔ کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا پارسل[۶]، جس کا عنوان

---

[۱] یہ تاریخ میرے نزدیک غلط ہے بہ ۱۸۶۳ء کی جگہ ۱۸۶۴ء چاہیے، ورنہ غالب کی عمر ستر برس کی نہیں بنتی۔ حالانکہ صاف کہتے ہیں۔ میں نے حساب کیا یہ سترھواں برس ہے۔ [۲] نسبت اویسی سے مراد یہ ہے کہ دیکھا نہیں مگر عقیدت ہے۔ [۳] میں نے غالب کی تصحیحات پر نمبر لگادیے ہیں تاکہ ان کے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔ [۴] صاحب عالم مارہروی [۵] چودھری عبدالغفور مارہروی [۶] یہ غالباً میرزا کی مثنوی "ابرِ گہربار" تھی، جس کی مدح میں صفیر نے ایک مثنوی لکھی۔

سیّد فرزند احمد کے نام کا ہے، ارسال کیا ہے۔ آپ بھی بہ نظرِ اصلاح مشاہدہ کیجیے گا۔ ہاں، پیر و مرشد فارسی کے کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ہیں یا نہیں؟ بہ قول انشاء اللہ خاں "یہ میری عمر بھر کی پونجی ہے"۔

جناب سیّد فرزند احمد سے التماس ہے کہ حضرت صاحب کو سلام و پیام پہنچا کر حضرت شاہ عالم صاحب کو اور ان کے اخوان کو اور حضرت مقبول عالم کو میرا سلام کہیے گا اور جناب چودھری عبد الغفور صاحب کو سلام کہہ کر یہ فرمائیے گا کہ وہ اپنے عم نامدار اور استاد عالی مقدار کو میرا سلام کہیں۔ زحمت تبلیغ سلام و پیام تقدیم خدمت۔ اصلاح کا دستہ مزدہ ہے[1]۔ والسلام

یوم الخمیس ذی الحجہ و ۱۲ مئی سال حال
(۱۲ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ - ۱۲ مئی ۱۸۶۴ء)

نجات کا طالب،
غالب

(۳)

مخدوم زادۂ مرتضوی دودمان، سعادت و اقبال توامان، مولوی سیّد فرزند احمد صاحب کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ ہیں نے استصلاح اشعار میں امتثال امر کیا ہے تو اس واقعے کو یوں سمجھ لیا جائے کہ میں امیر المومنین کا بوڑھا غلام ہوں۔ امیر نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ میرے سپرد کیا ہے کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر، ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں! اپنے نانا کی خدمت میں فقیر کی بندگی عرض کیجیے گا۔ اگرچہ حضرت میرے ہمعصر ہیں، مگر ان کے ابو الآبا کا غلام ہو کر سلام کیا لکھوں! مجھ کو ارادت میں ان سے نسبت اویسی ہے اور محبت بھی بے تکلف ویسی ہے جیسی اس معنی نسبت میں چاہیے۔

(یوم الخمیس پنجم ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ)[2]

نجات کا طالب
غالب

(۴)

نورِ چشم، لختِ جگر، زبدۂ اولادِ پیغمبر، حضرت مولوی سیّد فرزند احمد زاد مجدہٗ۔ اس درویش گوشہ نشین کی دعا قبول فرمائیں۔ "بوستان خیال" کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک۔ حضرت! یہ آپ کا احسان عظیم ہے، مجھ پر خصوصاً اور بالغ نظران ہند پر عموماً۔

---

[1] صفیر نے ایک غزل بھی بہ غرض اصلاح بھیجی تھی، جس کے دو شعروں میں میرزا نے اصلاح دی۔

خیال روے تو اے قبلۂ نظر کردم   ز دیدنت نظر خویش بہرہ ور کردم
بلند شد شب ہجراں چو شعلہ و آہم   چراغ ماہ خمش گشتہ بود، بر کردم

پہلے شعر میں میرزا نے "تو اے" کی جگہ "ترا" بنا دیا۔ دوسرے شعر کا آخری مصرع یوں بدل دیا: "چراغ مہ بر فلک مردہ بود بر کردم"۔

[2] تاریخ یقیناً غلط ہے۔ پہلا خط ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ کا تھا اور یہ ۱۹ یا ۲۶ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ کا ہونا چاہیے۔ اس خط کے ساتھ میرزا نے اس مثنوی کے بعض شعر درست کیے تھے، جو صفیر نے "ابر گہر بار" کی ستایش میں لکھ کر بھیجی تھی۔ نیز ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ کا آغاز جمعہ سے ہوا تھا، اس کے یوم الخمیس کو ۵ تاریخ کیوں کر ہو سکتی تھی۔

جناب میر ولایت علی[1] صاحب سے بعد ارسال قیمت و محصول دو جلدیں مانگی ہیں۔ خدا کرے وہ یہ پارسل پہلے بھیجیں اور یہ رقم تمہارے پاس بعد۔

۸۔ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ غالب

(۴۔ اپریل ۱۸۶۵ء)

(۵)

بہ علاقۂ مہر و محبت نورِ چشم، سرورِ دل اور بہ رعایت سیادت، مخدوم مولوی سیّد فرزند احمد صفیر طول اللہ العمرہٗ

اشعار گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سب اچھے ہیں، مگر جو میرے دل میں اُتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں:

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

ورق ہیں جوششِ مضمونِ گریہ سے بادل بسان ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

کبھی ہوں گرم، کبھی سرد، حسبِ موقع و وقت صفیرؔ آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ اور موحدانہ مضمون اور بالغانہ الفاظ:

تم سلامت رہو قیامت تک صحت و لطفِ طبع روز افزوں

۲۵۔ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ نجات کا طالب

مطابق ۲۱۔ اپریل ۱۸۶۵ء غالب

(۶)

بہ علاقۂ مہر و محبت، نورِ چشم و سرورِ دل و بہ رعایت سیادت مخدوم و مطاع مولوی سیّد فرزند احمد طال بقاؤہٗ زاد علاؤہٗ، اس مصرع سے میرا مکنون خبر دریافت فرمائیں:

بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

یارب وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معمائی سمجھتے ہیں؟ اصل فطرت میں میرا دن تاریخ، معمّا کے ملائم و مناسب نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں از راہِ شوخی طبع گنتی کے عامیانہ معمّے لکھے ہیں۔ وہ مبادی کلیاتِ فارسی میں موجود ہیں۔ تاریخیں اگر ہیں تو مادّے اوروں کے ہیں اور نظم فقیر کی ہے۔ یہ کلام نہ بطریق کسرِ نفسی ہے، نہ بسبیل اغراق، سچ کہتا ہوں اور سچ لکھتا ہوں۔

اس نامۂ مہر افزا کو دیکھ کر مبادی پرستان خیال کی عبارت یاد آئی۔ افسوس ہے کہ اس ہیچ میرز کے اجزائے خطابی اس مسودے کی تسوید کے وقت تک آپ نے نہیں سُنے تھے، ورنہ اس کے کیا معنی کہ خط میں لکھے جائیں اور کتاب میں اندراج نہ پائیں؟ محمد رضا برقؔ کا خطاب معلوم تھا تو آپ نے لکھا ہے۔ حکایت ہے، شکایت نہیں...... پہلی جلد جس کا نام انق الخیال ہے، اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں۔ جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید ہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو، بے طلب بھیج دیں اور معاً قیمت لکھ بھیجیں۔

---

[1] میر ولایت علی اس مطبع کے منتظم تھے، جس میں بوستان خیال کا ترجمہ چھپتا تھا۔

لطیف احمد بلگرامی

میاں لطیف،

مزاج شریف غالب گوشہ نشین کی دعا۔ تمھارا مسودہ آیا۔ کمتر جگہ اصلاح کی پائی۔ روشِ تحریر بھی مجھے پسند آئی۔ دل خوش ہوا، لیکن:

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن　　　　نعت شہ کونین و مدیح کے و جم را

سید ابن حسن خاں صاحب وہاں موجود، میں یہاں محض بے وجود۔ وہ تو میرے نزدیک علامہ ہیں اور جوان ہیں۔ میں اُن کے نزدیک ایک مشتِ استخواں ہُوں، وہ بھی بوسیدہ اور ناتواں۔ اگر خاں صاحب وارستہ مزاج ہیں تو سید غلام حسنین قدر سہی۔ وہ تو میرے نزدیک قدر داں بھی ہیں اور رشد اگر دبھی ہیں۔ اگر کچھ بھی اپنے دل و دماغ میں قوت پاتا تو اپنی طبیعت کو آپ سے اصلا دریغ نہ کرتا۔ کیا لکھوں اور کیا کہوں؟ نورِ آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور۔ ہاتھ میں رعشہ طاری ہے، کان سماعت سے عاری ہے:

عتاب عروساں در آمد بجوشش　　　　صراحی تہی گشت و ساقی خموشش

فخرِ ایجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے، غالب نیم مُردہ و نیم جاں رہ جائے:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا۔ اسّی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں، دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ شراب کمبخت اب بھی چھوٹتی نہیں۔ نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

نجات کا طالب، غالب

حکیم غلام مرتضیٰ خاں

یہ اور حکیم غلام رضا خاں (جنھیں ایک جگہ افسر الاطبا، اشرف الحکما، مسیح وقت اور افلاطون دہر کہا گیا ہے)، شریف خانی حکیموں کے خاندان سے تھے۔ حکیم غلام مرتضیٰ پٹیالہ میں ملازم تھے۔ جیسا کہ ان کے نام خط سے ظاہر ہے۔ حکیم غلام رضا خاں کو غالب نے اردوئے معلّیٰ کے حقوق دے دیے تھے وہ اکمل المطابع کے مالک تھے، جہاں اردوئے معلّیٰ کی طباعت پہلی مرتبہ ہوئی۔

خان صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب۔ دردمند کا سلام۔ خوب یاد کیجیے کہ میں نے کبھی کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی۔ اب ایک طرح کی عنایت کا سائل ہوں۔ حامل ہٰذا المکتوب پنڈت جے نرائن میرا خط لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کے بزرگ نواب احمد بخش خاں کی سرکار میں مناصب عالیہ اور عہدہ ہائے جلیلہ رکھتے تھے۔ اب موقع یہ آیا ہے کہ جستجوے نوکری میں پٹیالہ آتے ہیں۔ آپ میرے سر کی قسم، جہاں تک ہو سکے سعی کر کے ان کو موافق ان کی عزت کے کوئی منصب دلوا دو گے تو میں یہ جانوں گا کہ تم نے مجھ کو نوکر رکھوا دیا ہے۔ بڑا احسان مند ہوں گا۔

نجات کا طالب

غالب

۱۳۔ شوال ۱۲۸۱ھ

(مطابق ۱۱۔ مارچ ۱۸۶۵)

حکیم غلام رضا خاں



نور دیدہ، سرور دل و راحت جان، اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں کو غالب نیم جان کی دعا پہنچے۔ تم سے رخصت ہو کر اور تمھیں خدا کو سونپ کر روانۂ رام پور ہوا۔ موسم اچھا تھا۔ گرمی گزر گئی تھی۔ جاڑا چمکا نہ تھا۔ عالم اعتدال آب و ہوا، سایہ و سرچشمہ جا بجا۔ آرام سے رام پور پہنچا۔ نواب صاحب[1] حال بمقتضاے الولد سر لابیہ حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ[2] کے برابر بلکہ بعض شیوہ و روش میں اُن سے بہتر ہیں۔ بمجرد مسند نشینی کے غلے کا محصول یک قلم معاف، علی بخش خانساماں[3] کو بیس ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکاری بخش دیا۔ مفصل حالات بذل و نوال عند الملاقات زبانی کہوں گا۔

سنو صاحب! میں فقیر آزادہ کیش ہوں۔ دنیادار نہیں، مکار نہیں۔ خوشامد میرا شعار نہیں۔ جس میں جو صفات دیکھتا ہوں، وہ بیان کرتا ہوں۔ نواب صاحب تو گھر بیٹھے سو روپے مہینا دیتے ہیں، تم مجھ کو کیا دیتے ہو، جو تمھارے باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر بمثل میر اکوئی صلبی بیٹا ایسا ہوتا، جیسے تم ہو، تو میں اُ ، کو اپنا فخر و شرف جانتا۔ علم و عقل و خلق و صدق و سداد و حلم کے جامع، تورع و زہد و تقویٰ کے حاوی۔ علم اخلاق میں حکماے روحانی نے سعادت کے جو مدارج لکھے ہیں، وہ سب تم میں پائے جاتے ہیں۔ پروردگار تم کو عمر طبعی عطا کرے اور دولت و اقبال شمار سے زیادہ دے۔ ان شاء اللہ کہ ہمچنیں خواہد بود۔

غالب

۱۸۶۵ء

---

[1] نواب کلب علی خاں [2] نواب یوسف علی خاں [3] مولانا محمد علی مرحوم رئیس الاحرار کے دادا تھے۔

سیّد احمد حسن قنوجی

نواب سید صدیق حسن خاں (والاجاہ امیر الملک) مرحوم و مغفور کے بڑے بھائی تھے۔ والد کا نام سید اولاد حسن تھا جو مجاہد کبیر سیّد احمد بریلوی کے رفیق خاص تھے اور جہاد میں سیّد صاحب کے ساتھ سرحد گئے تھے۔ بعد میں ان کے حکم کے مطابق واپس آ گئے۔

احمد حسن ۱۹۔ رمضان المبارک ۱۲۴۶ھ (۳۔ مارچ ۱۸۳۱ء) کو پیدا ہُوئے۔ ایسے نادر روزگار آدمی قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ حافظہ گویا لوح محفوظ تھا۔ تمام علوم پر حاوی تھے۔ عربی اور فارسی کے یگانہ ادیب اور شاعر تھے۔ فنون سپہ گری میں خاص کمال بہم پہنچایا۔ اسپ دوانی، نیزہ بازی اور بندوق زنی میں اپنی نظیر آپ تھے۔

کئی مرتبہ حج کا ارادہ کیا لیکن والدہ ہمیشہ یہ کہہ کر روک دیتیں کہ سب اکٹھے چلیں گے۔ آخر ان کا دینی جذبہ زیادہ توقف کا متحمل نہ ہو سکا اور ۱۸۵۹ء میں نکل پڑے۔ منزل بہ منزل اندور ہوتے ہُوئے مارچ ۱۸۶۰ء میں بڑودہ پہنچے اور مولانا غلام حسین قنوجی کے ہاں مقیم ہُوئے۔ رمضان گزرا پھر ارادہ ہو گیا کہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آگے چلیں گے۔ خارش کی شکایت راستے میں پیدا ہو گئی تھی، اس کا علاج کراتے رہے۔ اسی اثنا میں تپ اسہالی کا عارضہ شروع ہو گیا۔ مولانا غلام حسین نے بہتر سے بہتر اطبا سے علاج کرایا لیکن صحت نہ ہُوئی۔ ۲۵۔ نومبر ۱۸۶۰ء کو وہیں فوت ہُوئے۔ قمری سنین کے حساب سے تیس برس سات مہینے اور بیس روز کی عمر تھی۔

عربی اور فارسی میں ان کی نظم و نثر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کتنا صحیح ذوق تھا اور کتنے بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ کئی قصیدے ایسی زمینوں میں کہے ہیں، جن میں مشہور اساتذہ کے قصیدے موجود ہیں، لیکن سید احمد حسن کے ہاں بالکل نئے اور اچھوتے مضامین ملیں گے۔ عرشی تخلّص تھا۔ اُردو کلام بھی موجود ہے۔ نظم و نثر میں غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ خود کہتے ہیں:

مغلوب ہیں سب اہل جہاں میرے سخن سے
ہوں زلّہ ربا غالبِ اعجاز رقم کا

غالب کو معلوم نہ تھا کہ وُہ حج کے لیے نکل چکے ہیں اور غالباً سید احمد حسن نے اپنے پہلے خط میں تخلص نہیں لکھا تھا۔ اس لیے بڑودہ سے خط آیا تو حیران ہُوئے کہ یہ کون ہیں۔ قاضی عبدالجمیل جنون، عرشی کے دوست تھے۔ ان کے نام ۲۸۔ اگست ۱۸۵۹ء کے خط میں عرشی کو سلام لکھتے ہیں۔ پھر قاضی صاحب نے غالباً ان کے سفر حج کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے فراق کا ذکر کیا۔ غالب لکھتے ہیں:

"مولوی احمد حسن کے فراق کو میں نہیں سمجھا کیوں واقع ہُوا......" الخ

دوسرے خط سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ احمد حسن مرحوم نے حج کے لیے جاتے ہوئے دہلی میں غالب سے ملاقات کی تھی، لیکن وہ سب کچھ بھول گئے۔

(۱)

یارب یہ ایک خط مجھ کو بڑودہ گجرات سے آیا ہے۔ کاتب نے اپنے کو احمد حسن قنوجی بتایا ہے۔ ادھر سے اظہارِ آشنائی ہے میری طرف سے یہ بیحیائی ہے کہ مجھ کو ان کی اور اپنی ملاقات یاد نہیں آتی، سوچتا ہوں کوئی بات یاد نہیں آتی۔ خانۂ نسیاں خراب۔ عشرۂ قنالہ کے مرحلے کا رہ گیا ہوں۔ شاید اگر جیوں گا تو اس کا بھی مجھے علم نہ رہے گا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ پینسٹھ برس کی عمر، ٹی۔ حواس ظاہری میں سے سامعہ و شامہ باطل، حواس باطنی میں سے حافظہ زائل، بسبب نسیاں کے اکثر مطالب ضروری تلف ہو جاتے ہیں۔ خدایا، کیا اس عمر میں سب آدمی ایسے خرف ہو جاتے ہیں۔ حیران ہوں کہ آپ کو سید لکھوں، مولوی لکھوں، خان لکھوں، خط تو خیر کچھ لکھوں گا، خط کا کیا عنوان لکھوں۔

بندہ پرور، فقیر معاف رہے، حضرت کا دل غبار کدورت سے صاف رہے مولوی عبدالجمیل صاحب بریلوی کو جانتا ہوں بلکہ ان کا احسان مانتا ہوں کہ باوجود عدم ملاقات ظاہری اکثر ان کے خطوط آتے رہتے ہیں، گویا وہ اپنا نام ہمیشہ مجھ کو یاد دلاتے رہتے ہیں، نہ آپ کہ بعد ایک عمر کے ناگاہ نامے سے یاد فرمائیں اور اپنی اور میری ملاقات کا زمانہ یاد نہ دلائیں۔ بہر حال تمھارا دعا گو ہوں۔ اس خط کے جواب میں ایسا کچھ لکھو کہ تم کو پہچان جاؤں۔ کب ملے تھے؟ کے ملاقاتیں ہوئی تھیں؟ یہ سب مدارج جان جاؤں۔ نثر کے شیوہ و انداز کا تو ڈھنگ اچھا ہے، خود تمھاری تحریر سے معلوم ہوا کہ شاعر ہو، شاعر بھی ہو تو تخلص کیا ہے؟

نامہ نگار کا حال بہ سبیل اجمال یہ ہے کہ سیاست سے محفوظ رہا ہوں اور حکام کی عنایت سے محظوظ رہا ہوں۔ بے وفائی کا داغ نہیں لگا ہے۔ پنسن قدیم کو بدستور حکم اجرا[۱] ہے۔ زندگی کا رنگ اچھا دیکھتا ہوں۔ دیکھیے مرنے کے بعد کیا دیکھتا ہوں۔

یہ مکرم مخدوم، آپ کے ہم نام جناب مولوی احمد حسن صاحب عالی مقام ظاہر اور درویش نواز ہیں کہ اس گمنام گوشہ نشیں کو حضرت نے سلام لکھا ہے۔ میری طرف سے سلام بہ اشتیاق تمام پہنچائیے۔ والسلام

راقم
جواب نامہ کا طالب
اسد اللہ المتخلص بہ غالب

(۲)

مخدوم مکرم مولوی سید احمد حسن خاں صاحب باور کریں کہ یہ درویش گوشہ نشیں تمھارا دوست اور تمھارا دعا گو ہے۔ تمھاری نثر کی طرز پسند، تمھاری خواہش مقبول، سید احمد حسن صاحب کی خدمت گزاری منظور؛

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

---

[۱] پنشن کا جمع شدہ روپیہ مئی ۱۸۶۱ء میں ملا۔ یہ خط بہر حال مئی اور ستمبر کے درمیان کا ہے۔

پینسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلال قویٰ، ضعف دماغ، فکرِ مرگ، غم عقبیٰ۔ جو آپ مجھے دیکھ گئے ہیں، میں اب وہ نہیں ہوں۔ نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے ورنہ جو ہر فکر کی رخشندگی کہاں۔ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے، زور نہیں دلوا سکتا۔ بہ ہر حال حکیم صاحب کو میرا سلام کہیے اور کہیے کہ آپ بے تکلف اپنا کلام بھیج دیا کریں۔ یہاں سے بعد حک و اصلاح کے خدمت میں پہنچ جایا کرے گا۔

۱۲۔ ستمبر ۱۸۶۰ء غالب

میر بندہ علی خاں

میر صاحب شفیق مکرم و معظم، میر بندہ علی خاں، عرف میرزا میر صاحب کو غالبِ بے برگ و نوا کا سلام پہنچے۔ آپ کا پیام روح افزا پہنچا۔ بلکہ وہ عبارتِ سراسر بشارت میں نے خود پڑھ لی جناب سری راؤ راجہ[1] صاحب نے جو میرے حق میں فرمایا، سو بجا ہے۔ پانچ برس کی عمر میری تھی کہ میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہ مہاراجہ بختاور سنگھ بہادر کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں جس کا تالڑا[2] نام ہے، مجھ کو برائے دوام ملا۔ آپ یوں سمجھیے کہ ادھر دودھ پینا چھوڑا اور راج کی روٹی کھائی۔ چار برس کے بعد نصراللہ بیگ خاں میرا چچا مر گیا۔ نو برس کی عمر میں سرکار انگریزی سے بہ عوض چچا کی جاگیر کے نقدی مقرر ہوئی۔ اب تک اسی پر معاش کا مدار ہے۔ عمر بھر نوکری کی تو بہادر شاہ سے نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ خطاب پایا۔ کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا، پھر استاد کہلایا۔ اب ایک کم ستر برس کی عمر ہے۔ کانوں سے بہرا ہو گیا ہوں، بغیر لاٹھی کے چل نہیں سکتا۔ تکیہ یا دیوار کے آسرے بغیر بیٹھ نہیں سکتا۔ دنیا دار نہیں، فقیر ہوں۔ بہت سی عزت اور تھوڑی سی دولت چاہتا ہوں۔ حضور کو خدا سلامت رکھے، وہ مجھے عزت بھی دیں گے اور دولت بھی بخشیں گے۔ قطع نظر اس سے حضور کا جمال دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ میں نے تو مسند نشینی کی تہنیت اور تاریخ کا قطعہ مع عرضداشت کے بھیجا۔ حضور نے کیوں میری عرضی کا جواب نہ لکھا اور کیوں مجھ کو نہ بلا بھیجا؟ راج کا قدیم متوسل انگریز[3] کا پنسن دار اور خیر خواہ بعد غدر کے پنسن جاری، گورنمنٹ سے اور حکام دہلی سے ملاقاتیں بدستور، خطوط کی آمد و رفت جانبین سے بدستور۔ اب بہ فتح و نصرت سفر سے معاودت فرمائیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ حاضر ہوں گا اور وہ سب کاغذ نظر سے گزرانوں گا۔ آپ سے خاص اس مہربانی کا امیدوار ہوں کہ یہ خط اپنے نام کا بہ احتیاط اپنے پاس رہنے دیجیے۔ حضور تشریف لائیں تو یہ خط حضور کی نظر سے گزار دیجئے۔ میں تو حضور کے تشریف لانے کی خبر سن کر فوراً الور روانہ ہوں گا۔ ان شاء اللہ العلی العظیم۔

۸۔ شعبان ۱۲۸۰ھ (۱۸۔ جنوری ۱۸۶۴ء) راقم: اسد اللہ خاں

۱؎ شیو دھیان سنگھ والی الور ۲؎ تالڑا عبداللہ بیگ کے مرنے پر میرزا اور ان کے بھائی کے نام مقرر ہوا ہوگا لیکن کب اور کس وجہ سے یہ ضبط ہوا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ ۳؎ مہاراجہ الور۔

جد امجد احمد عزیز کیفی

گمان زیست بود بر منت ز بے دردی   بد است مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

مجھے زندہ سمجھتے ہو، جو نثر فارسی کی فرمائش کرتے ہو؟ غنیمت نہیں جانتے کہ مردہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ پنسن اگرچہ ملے گا، لیکن دیکھیے کب ملے گا؟ اس کے ملنے تک کیا ہوگا اور اس کے ملنے سے میرا کیا کام نکلے گا؟ قطع نظر ان امور سے، اس وجہ قلیل کو کس بستی میں بیٹھ کر کھاؤں گا؟ یہ شہر اب شہر نہیں، "ڈ" رہے۔ قصیدے کے اشعار ابھی کیوں بھیجو۔ جب زیب انطباع پا چکے، تب ایک نمبر مجھ کو بھیج دینا۔

میں نے بعد توطیۂ و تمہید آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگزشت لکھی ہے اور بہ حیثیت اقتضاء مقام وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔ شیوۂ لزوم مالایلزم مرعی رکھا ہے، یعنی فارسی بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان بھی نہیں، تا بہ ہندوستان چہ رسد؟ چالیس صفحے لکھ چکا ہوں، اتمام میں انتظار یہی ہے کہ پنسن کا مقدمہ طے ہو چکے۔ ملے یا جواب ملے اور میں بہ ہر حال کسی جگہ اقامت گزیں ہو لوں۔ ہاں اس کے دقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانب اجانب سے معلوم ہوگا، وہ ناچار لکھوں گا۔ یہاں کوئی چھاپے خانہ نہیں ہے۔ اگر اجازت دو گے تو بعد اختتام ان اوراق کو تمہارے پاس بھیج دوں گا تاکہ ہزار جلدیں طبع ہو کر قلمرو ہند میں پھیل جائیں:

مگر صاحب دلے روزے بہ رحمت
کند در حقِ ایں مسکیں دُعاے

ثیر زماں خاں اپنے باپ کی رہائی کی فکر میں میرٹھ گئے ہیں، یہ کس واسطے کہ غریب یہاں کی حوالات میں سے تحقیقات کے لیے وہاں بھیجا گیا۔[۱]

یک شنبہ ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء   غالبِ بے نوا

عبدالحق

(۱)

بھائی۔ یہ نہ سمجھو کہ "سلطان" بہ معنی مصدر آتا ہے۔ سلطنتہ[۲] اگرچہ من حیث القیاس صحیح لیکن ٹکسال باہر ہے۔

۱؎ منقول از رسالہ "تصویر جذبات" بہ حوالہ مرقع ادب از جناب صفدر میرزا پوری۔ رسالہ "تصویر جذبات" کے ایڈیٹر سید احمد عزیز کیفی نے فرمایا کہ یہ خط ان کے جد امجد کے نام تھا۔ نام معلوم نہ ہو سکا۔ ۲؎ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا نے ایک عرضی بنام ملکہ وکٹوریہ عبدالحق کے ذریعے سے لکھوائی تھی اس نے دو اعتراض کیے:

۱۔ سلطانہ کے بجائے 'سلطنتہ' لکھنا چاہیے۔   ۲۔ ملکہ وکٹوریہ کی رعایت سے ضمیر مونث لکھی جائے۔

یہ رقعہ انہی دو باتوں کے جواب پر مشتمل ہے۔

"خلد اللہ ملکہ وسلطانہ" لکھتے ہیں۔ منشیان ایران وروم یوں ہی لکھتے آئے ہیں۔ "ضمان" بمعنی "ضامن" اور بمعنی "ضمانت"، "سلطان" بمعنی "بادشاہ" اور بمعنی "سلطنت" اس میں کچھ تامل نہ کرو۔ کس کی مجال ہے کہ اس پر ہنس سکے؟

لیکن "ملکہ وسلطانہ" علامت مذکر ہے۔ اگر "ملکہا وسلطانہا" بن جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ خیر یونہی رہنے دو۔ ہم سے کوئی پوچھے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ برعایت شکوہ سلطنت ہم نے تانیث کی رعایت نہ کی اور سچ تو یوں ہے کہ اگر کاتب سگھڑ ہو تو ہائے ہوز کا شوشہ مٹا دینا دشوار نہیں ہے۔ بن سکے تو بنوا دو اور سلطانہ کو خدا کے واسطے مت بدلنا، یہ بلغائے عرب و عجم کا قرارداد ہے۔ بعد اس تحریر کے عرض ہے کہ پرسوں پنجشنبہ کو عرضی لکھی ہوئی میرے پاس آجائے۔

(۲)

جناب عالی،

یہ خط فتح پور سے آپ کے نام آیا ہے۔ میں اس وقت حاضر نہ ہو سکا۔ خط پہنچتا ہے، اس کو ملاحظہ کر کے جب اس کا جواب مجھ کو دیجیے گا تو میں فتح پور روانہ ہو جاؤں گا۔

شادی پادشاہ کے فرزند کی اور بزم گاہ دیوان خاص۔ رقعے لکھے جائیں گے صمصام الدولہ کی طرف سے۔ صمصام الدولہ امیر ہیں اور امرا باہمدگر طریقہ فروتنی کا مسلوک رکھتے ہیں، یعنی تشریف لائیے، ممنون کیجیے۔ پس اب میں اس رقعے کی عبارت میں کیا الفاظ صرف کروں؟ تشریف شریف اور قدوم میمنت لزوم کو دیوان خاص سے مباعدت محض اور پھر داعی صمصام الدولہ۔ اگر شہزادے اور دیوان خاص کے لائق الفاظ لکھے جائیں تو حضرت مکتوب الیہ برا مانیں گے کہ ہم کو صمصام الدولہ نے کیا لکھا ہے۔ اگر متواضعانہ عبارت لکھی جاوے تو کسر شان سلطنت ہے۔ اب آپ مجھ کو ہدایت کیجیے کہ نگارش کا کیا انداز ہو۔ والسلام[1]



اسد اللہ

میر ولایت علی

جناب میر ولایت علی صاحب، مہتمم مطبع عظیم المطابع، عظیم آباد

واسطے اپنے جد کے میری تقصیر معاف کیجیے۔ درحقیقت میرا گناہ نہیں:

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

ستر برس کی عمر، حافظہ معدوم، نسیان مستولی، کل آپ کو بہ طلب "بوستان خیال" مترجمہ سفیر بلگرامی خط لکھا۔ لفافہ کرتے وقت ٹکٹ لپیٹنا بھول گیا۔ آج جو بکس کھولا، ٹکٹ بکس میں پائے۔ ذلیل و خوار، خجل و شرمسار، آج یہ لفافہ جدید ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ خدا کرے کتاب وہاں سے پہلے روانہ ہو اور یہ لفافہ وہاں بعد پہنچے۔[2]

۶- اپریل ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب

غالب

---

[1] مکتوب الیہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ شاید یہ میرزا جواں بخت کی شادی کا معاملہ ہو۔ ممکن ہے کسی دوسرے شخص نے میرزا سے یہ تحریر لکھوائی ہو کیونکہ ابتدائے خط میں فتح پور جانے کا ذکر ہے۔ [2] یہ خط علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں چھپا تھا۔

سخاوت حسین

محمد سخاوت حسین مدہوش انصاری بدایوں کے تھے۔ آپ کے دادا تیرھویں صدی کے مشہور بزرگوں میں سے تھے ١٢٥٨ / ١٨٤٢ میں انتقال ہُوا۔ مدہوش کی عمر کا زیادہ حصّہ شاہ جہان پور میں گزرا۔ وکیل عدالت دیوانی تھے۔ آنریری مجسٹریٹ اور بلدیہ کے نائب صدر بھی رہے۔ اپنے دور کی قومی تحریکات میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ کانگرس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ تقریر میں بارہا "ہم" کہتے رہے۔ ایک صاحب نے پُوچھا ہم سے آپ کی مراد کیا ہے؟ فرمایا "ہ" سے ہندو اور "م" سے مسلمان۔ تصانیف میں رسالہ تعلیم مسلماناں ہے اور "رقعات مدہوش" ہیں تذکرۃ الواصلین پر تقریظ بھی لکھی تھی۔

مشفقی و مکرمی منشی سخاوت حسین صاحب سلمہ اللّٰہ تعالیٰ۔

سبحان اللّٰہ آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں، اپنے کو نفرین کروں اگر شتاب نہ لکھوں۔ اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے تمہارا خط دیا، ادھر پڑھا، ادھر جواب لکھنے کا قصد کیا۔ میں ایک شخص گوشہ نشین، فلک زدہ، اندوہگیں، نہ اہل دنیا، نہ اہل دیں۔ مجھ جیسے نکمّے آدمی کا جو مشتاق ہو، اس کے خط کا جواب لکھنا کیوں مجھ پر شاق ہو؟ ظاہرا تم خود مجمع حسن اخلاق ہو اور نہ کیوں تم کو میرا اس قدر اشتیاق ہو؟ ہاں ایک بُری بھلی شاعری، اس کا حال یہ کہ آگے جو کچھ کہا، سو کہا۔ اب شاعر بھی نہیں رہا۔ بہرحال تمہاری فقیر نوازی کا شکر گزار ہوں اور طالب دیدار ہوں۔



چاشتگاہ دوشنبہ ٤ فروری سنہ ١٨٦١ء [1]

نجات کا طالب

غالب

مہاراجہ سردار سنگھ والیٔ بیکانیر

بحضور والا فر اسرور، جناب سری مہاراجا صاحب والا مناقب، عالی شان قلزم فیض و احسان دام اقبالہ و زاد افضالہ [2] لوازم نیاز و تسلیم از روے مودت و ارادت بجاے آورده مطالب و مقاصد را بہ زبان اُردو عرضہ مے دارد۔ یہ گوشہ نشین سرکار فیض آثار انگریزی کا بہ عوض جاگیر پنشن دار اور گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور تین رقم خلعت پانے والا اور حضرت قدر قدرت ملکہ معظمہ دوراں کا مداح اور بقلم وزراے شاہنشاہی سارٹی فکٹ خوشنودی کا پائے ہوئے ہے۔ وربن والا منشی کشوری لال صاحب نے کہ وہ میرے دوست اور حضور کے خیر خواہ ہیں۔ مجھ پر مسودۂ عرضداشت اور سکّہ حضور کی فرمائش کی۔[3]

---

[1] یہ خط رسالہ "سراج سخن" (شاہجہان پور) میں شائع ہوا تھا (فروری ١٩٤٩ء صفحہ ٢٨) وہاں سے اردوے معلی میں نقل ہُوا۔ [2] مہاراجا سردار سنگھ والی بیکانیر، پیدائش ١٨١٩ء، مسند نشینی ١٨٥٢ء، وفات ١٨٧٢ء۔ [3] بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ والی بیکانیر نے اپنے نام کا سکہ جاری کرنا چاہا لیکن (باقی ص ٥٣٩ پر)

میں حضور کی خدمت بجا لانے کو اپنا فخر و سعادت سمجھتا ہوں اور عرضداشت کا مسوّدہ اس نیاز نامہ میں ملفوف بھیج کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ مسوّدہ پسند نہ آئے تو یہ کاغذ مجھے واپس مل جائے اور اگر اسی مسوّدے کے موافق عرضداشت لکھنی منظور ہو تو میرا بھیجا ہُوا یہ مسوّدہ کہ بہ مہر و دستخط میرے ہے، دفتر میں رہے اور حرف بہ حرف مطابق اس کے عرضداشت لکھی جائے۔ میرے لکھے ہُوئے فقروں میں اور فقرے داخل نہ کیے جائیں اور کوئی لفظ بدلا نہ جائے[۱]۔

اسم مبارک کے سکّے کے باب میں عرض یہ ہے کہ اگر سنہ جلوس اس کو قرار دیجیے کہ ہندوستان میں بادشاہی عملداری ہوئی تو یہ بات نامناسب ہے۔ کیا وہ اس سے پہلے بادشاہ نہ تھیں؟ اور اگر وہ سال منظور رکھیے کہ جس سال وہ ولایت میں تخت پر بیٹھی ہیں تو نِرا تکلف محض ہے۔

بہتر یہ ہے کہ دو سنہ لکھے جائیں: ایک از روے اطاعت سنہ ۱۸۵۹ عیسوی اور ایک موافق رواج ملک و ملّت سنبت ۱۹۱۵۔[۲]

سکّۂ مبارک کے تین نقشے بھیجتا ہوں: دو مع تصویر اور اس میں سکہ منظوم یعنی ایک شعر جیسا کہ سلاطین ماضی کا ہر ملک میں دستور ہے اور ایک نثر۔ ان نقشوں میں سے جو نقشہ سری مہاراج کی پسند آئے، وہ حضور کو مبارک ہو۔

اب نیازمند اس عنایت کا متوقع ہے کہ آئندہ میں راج کا متوسل اور سری مہاراج کا دولت خواہ اور دعاگو گنا جاؤں اور جو کام میرے لائق ہو، بے تکلف اس کے سرانجام کا مجھ کو حکم ہُوا کرے۔ زیادہ حدِ ادب۔

بہارستان جاہ و جلال بے خزاں و بہار دولت و اقبال جاوداں باد۔

نگاشتہ پنجم جنوری ۱۸۵۹ء — نیاز نامہ اسد اللہ خاں شاعر غالب تخلص

اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ
نجم الدولہ دبیر الملک
۱۲۶۷ ہج

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۸) ملکہ وکٹوریہ سے اس کی اجازت لینی ضروری تھی کیونکہ ۱۸۵۸ء میں کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی تھی اور ہندوستان براہِ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آ گیا تھا۔ عرضداشت غالباً سکّے کے اجرا کی اجازت کے لیے لکھوائی گئی تھی۔

۱۔ یہ اس لیے لکھا کہ میرزا کی عبارت میں دخل نفس مطالب پر بھی اثر انداز ہو سکتا تھا اور اس سے عبارت کے حسن پر بھی زد پڑ سکتی تھی۔

۲۔ مطلب یہ کہ اگر ملکہ کی بادشاہی ہند کا سال رکھا جائے تو اس لیے نامناسب ہوگا کہ وہ اس سے پیشتر بھی بادشاہ تھیں۔ اگر انگلستان کا سال جلوس رکھا جائے (۱۸۳۷ء) تو یہ محض تکلف ہوگا۔ لہٰذا بہتر یہ ہو گا کہ ۱۸۵۹ء از روے اطاعت رکھا جائے اور ۱۹۱۵ء رواج ملک کے مطابق ہے۔

حکیم محب علی

حکیم محب علی کا سلسلہ نسب امام محمد بن الحنفیہ تک پہنچتا ہے ۔ پردادا اٹاوہ میں چکلے دار اور دادا گلاؤٹھی میں ملازم تھے ۔ والد (حکیم مشتاق علی) نے مین پوری میں طبابت شروع کی ۔ حکیم محب علی طبابت بھی کرتے تھے اور وکالت بھی ۔ غالباً وہ خط و کتابت کے ذریعے سے اصلاح لیتے تھے ۔

بندہ پرور ! آپ کی تحریر سے مستنبط ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے میرٹھ میں ملے تھے ، مگر میں ہر چند یاد کرتا ہوں ۔ مجھ کو وہ صحبت اور آپ کی ملاقات کی صورت یاد نہیں آتی ۔ بہر حال ارسال مسودات کی خواہش مقبول اور حک و اصلاح کی خدمت بجا لانی بہ دل منظور ۔ تمہارے ابوالآبا کا کہ وہ ابوالائمہ بھی ہیں غلام ہوں ، علیہ الصلوٰۃ والسلام ۱۲

" ماہ نیم ماہ " مانگتے ہو ۔ یہ نہیں جانتے ہو کہ وہ آسمان ہی ٹوٹ پڑا جس پر ماہ نیم طلوع کرتا ، بات یہ ہے کہ جس طرح مسافر سفر میں آدھی منزل طے کر کے دم لیتا ہے ۔ میں نے آدم سے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا ۔ قصد تھا کہ اب جلال الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا کہ ناگاہ یہ فتنۂ عظیم حادث ہوا اور اکبر و ہمایوں کے خاندان کا نام و نشان جاتا رہا ۔ عرفت ربی بفسخ العزائم ۱۲ " پنج آہنگ " " مہر نیم روز " " دستنبو " " قاطع برہان " " دیوان اردو " یہ پانچ رسالے البتہ کتب میں شمار کیے جائیں ۔ " باد مخالف " کئی ورق کی ایک مثنوی ہے ۔ منجملہ ان مثنویوں کے جو " کلیات نظم فارسی " میں مندرج ہیں بجائے خود کتاب نہیں ہے ۔ ہاں یہ تو فرمائیے کہ " قاطع برہان " آپ کے ہات کہاں سے آئی ؟ شاید نواب مصطفیٰ خاں صاحب سے آپ نے لی ہوگی ۔ مآخذ " قاطع برہان " ضرور دیکھیے ۔ ۱۲

گمان زیست بود بر منت ز بے دردی
بد است مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

ہے ہے ! تم اب تک یہ جانتے ہو کہ " غالب " شعر کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے ۔ ایک پانو رکاب میں ، ایک ہات باگ پر ۔ اس صورت میں کیا کہوں گا اور کیا لکھوں گا ؟ اخ مکرم و معظم نواب مصطفیٰ خاں گواہ ہیں کہ میں اب (شعر) نہیں کہتا ۔ اللہ اللہ لاموجود الا اللہ ۱۲

چہار شنبہ (۱۸ ، جنوری) ہنگام نیمروز غالب ۱۲

نواب یوسف علی خاں ناظم

نواب محمد یوسف علی خاں والی رام پور (۵ ۔ مارچ ۱۸۱۶ء ۔ ۲۱ ۔ اپریل ۱۸۶۵ء) ابتدائی تعلیم



دہلی میں مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور میرزا غالب سے پائی۔ ۱۸۵۵ء میں مسندنشین ہُوئے۔ شاعری میں میرزا کے شاگرد تھے۔ رام پور سے میرزا کی وابستگی انھیں کے عہد میں ہُوئی۔ بعد وفات یوسف علی خاں کے لیے "فردوس مکان" کا لقب تجویز ہُوا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ناظم تخلص تھا۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے توقیع دقیع عزّ ورود لایا۔ بذریعہ ہنڈوی سو روپے بابت جنوری ۱۸۶۵ء معرضِ وصول میں آئے۔

دیکھیے کب غسل فرماتے ہیں آپ
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے[۱]

زیادہ حد آداب

تم سلامت ہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۸۔ فروری ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب
غالب

یہ دونوں خط نادم صاحب سیتاپوری نے "خیاباں" (لکھنؤ نومبر ۱۹۳۳ء) سے لے کر طویل تمہید و حواشی کے ساتھ مارچ ۱۹۶۳ء کے ماہنامہ "آجکل" دہلی میں شائع کیے تھے۔ ان میں سے پہلا میرزا کے بھانجے عباس بیگ کے نام ہے جو سیتاپور میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور اسی ضلع میں علاقہ بڑا گاؤں بطور جاگیر ملا تھا۔ نیز چھ سو روپے ماہوار الگ ملتے تھے۔ وہ ملازمت سے سبکدوش ہُوئے تو لکھنؤ میں اقامت اختیار کر لی اور وہاں ایک امام باڑہ بھی بنوایا۔ چھہتر برس کی عمر پا کر $\frac{۱۲۹۰}{۱۸۷۳}$ میں فوت ہُوئے تو اپنے ہی امام باڑے میں دفن کیے گئے۔ ان کی نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔ صرف ایک صاحبزادی وجیہہ النساء بیگم تھی جس کی شادی عباس بیگ نے اپنے بھتیجے محمود بیگ بن عاشور بیگ سے کر دی تھی جس کے نام دوسرا مکتوب ہے۔ وجیہہ النساء بیگم والد کی زندگی میں ہی انتقال کر گئی تھی۔ عباس بیگ نے پوری جائداد اپنے

---

[۱] "حمام کے" والا شعر میرزا کی ایک غزل میں موجود ہے جو غالباً ۱۸۵۲ء میں کہی گئی تھی۔ اسی زمانے میں بہادر شاہ کے غسل صحت کی خبر تھی چنانچہ فرمایا:

شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

اس کا پہلا مصرع بدل کر نواب یوسف علی خاں کے غسل صحت کی تقریب پیدا کر لی۔

بھتیجے مرزا فیاض بیگ (بن میرزا جواد بیگ عرف میرزا مغل) کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا اس لیے پوری جایداد اس کے نام کر دی۔

میرزا عباس بیگ کا ذکر غالب نے کئی خطوط میں کیا ہے۔

اس خاندان کے مزید حالات یہاں بیان کرنے غیر ضروری ہیں۔ دونوں خطوں سے مترشح ہوتا ہے کہ خط و کتابت بھی جاری تھی اور غالباً گاہ گاہ کوئی میرزا کو دیکھنے کے لیے بھی آتا رہتا تھا۔ چنانچہ محمود بیگ کے خط میں ہے: "جب مجھ کو دیکھو گے تو جانو گے کہ کیا حال ہے۔"[1]

میرزا عباس بیگ

بھائی میرزا عباس بیگ بہادر۔ میں حیران ہوں کہ تم سرکار کے کام کو کیوں کر انجام دیتے ہو؟ اور مضامین قانون کو کیوں کر سمجھ لیتے ہو اور مقدمات کے فیصلے کیوں کر کرتے ہو؟ مجھ کو نواب گورنر جنرل بہادر کا دربار کب نصیب ہوا؟ نہ انھوں نے دلی میں دربار کیا۔ نہ میں انبالہ گیا۔ میں نے تم کو لکھا کہ ادھر تو مجھ کو اپنے فرزند کی شادی میں شریک نہ ہونے کا رنج رہا ادھر دربار میں حاضر نہ ہونے کا غم رہا۔ اخبار میں نے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب یعنی جناب منٹ گمری[2] صاحب اور ان کے سکرٹری تامس ڈگلس فورسائتھ صاحب[3] اور ان کے میر منشی پنڈت من پھول سنگھ صاحب کی تعریف چھوڑی۔ اس اخبار کی عبارت سے یہ بات نکلتی ہے کہ منشی نے مجھے خلعت دلوایا اور یہ بھی محل غور ہے کہ گورنر جنرل کے دربار میں خلعت پایا۔ بکتے ہو اور پھر میر منشی من پھول سنگھ[4]۔۔۔ کو اس کا سبب جانتے ہو۔ وہ میر منشی لفٹنٹ گورنر کے ہیں ان کو گورنر کی سرکار میں کیا دخل!

مجھ کو ہرگز دیدار نواب گورنر جنرل لارڈ ایلگن بہادر کا نصیب نہیں ہوا۔ ہاں جب نواب لفٹنٹ گورنر منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا۔ بہت عنایت فرمائی۔ ایک شالی رومال سوزن کار اور ایک گلوبند سوزن کار اور ایک الوان کی فرد چار گز لمبی۔ یہ تین کپڑے مجھ کو دیے۔ میں نے عرض کیا کہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے مگر میری جان اُلجھی ہوئی ہے لارڈ صاحب کے دربار و خلعت میں۔ فرمایا اچھا اچھا۔ دوسرے دن لارڈ صاحب آئے[5]۔۔۔ تیسرے دن لفٹنٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے لگا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اساوری کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالا یہ سہ رقم ہمیشہ پایا کیا ہوں اور اب یہ دربار اور خلعت بند ہے۔ اس کا مجھ کو بڑا غم ہے فرمایا کہ غم نہ کرو تمھارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ میں نے اپنا ہاتھ دکھایا اور کہا کہ حضرت

---

[1] مکتوب الیہ کی بیٹی وجیہہ النسا بیگم جس کی شادی محمود بیگ سے ہوئی تھی۔ [2] منٹگمری (۱۸۰۹ء۔ ۱۸۸۷ء) فروری ۱۸۵۹ء سے جنوری ۱۸۶۵ء تک لفٹنٹ گورنر پنجاب رہا۔ [3] تامس ڈگلس فورسائتھ (۱۸۲۷ء۔ ۱۸۸۶ء) اس نے یارقند اور یورپ کے سفر بھی کیے۔ انبالہ میں کمشنر بھی رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد باغیوں کی سزا دہی کے لیے کمشنر بنا دیا گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لفٹنٹ گورنر کا سیکرٹری کب سے کب تک رہا۔ [4] من پھول سنگھ میر منشی پنجاب جو مولانا محمد حسین آزاد اور بعض دوسرے افراد کو لے کر ترکستان گیا تھا۔ [5] یعنی وائسرائے اور گورنر جنرل اس زمانے میں لارڈ ایلگن اس عہدے پر مامور تھا۔ ۱۸۶۲ء میں یہاں آیا اور ۲۰ نومبر ۱۸۶۳ء کو دھرم سالہ (ضلع کانگڑہ) میں فوت ہو گیا۔ یہ لارڈ ایلگن اول تھا۔ اس کا بیٹا ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۹ء تک وائسرائے رہا۔

بوڑھا ہوں اور زخمی ہوں - انبالہ کس طرح جاؤں ... خیر آیندہ دربار میں پاؤ گے -

جو عرضی میری تم نے میری طرف سے لکھ کر مجھ کو بھیجی تھی اور میں نے اپنی مُہر کر کے رجسٹری کروا کر کلکتہ بھیجی تھی اس کا کچھ میں نے جواب نہیں پایا[1] شاید یہ حکم اسی عرضی پر ہُوا ہو - لیکن اس عرضی کو گئے ہُوئے بہت دن ہُوئے اور دربار و خلعت کی واگزاشت کا حکم اب صادر ہُوا ہے - چنانچہ مولوی اظہار حسین خاں میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمھارے دربار اور خلعت کے واگزاشت کا حکم دے کر کلکتہ سے ادھر کو روانہ ہُوئے ہیں - دوسرے نواب گورنر جنرل بہادر کا نام لارڈ ایلگن بہادر ہے اور چیف سکرتر بہادر کا کرنیل ڈورینڈھی بہادر نام ہے - ہیرنگٹن صاحب شاید سال آیندہ سکرتر ہوں یا پرائیویٹ سکرتر ہوں یا کونسل کے ممبر ہوں -

بہر حال اگر تمھارے سبب سے یہ کام ہُوا تو کیا غضب ہُوا - مگر آشنا جان لو کہ واگزاشت کا حکم سنتا ہُوں کہ ہو گیا ہے میرے پاس تحریر اس حکم کی ابھی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہُوئی، یعنی نہ میں دربار میں گیا، نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور امر ہے - یہ اور بات ہے - اس امر سے اور اس بات سے اس کو علاقہ نہیں -



اب میں نے جناب کرنیل ڈورینڈھی بہادر چیف سکرتر کو فارسی میں خط بھیجا ہے اور وہ کاغذ انگریزی آمدہ ولایت اس کے ساتھ بھیجے ہیں - جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستور مقرری جاری ہیں، دربار، خلعت، خط، بعد غدر کے تینوں دستور بند ہو گئے - اب دربار اور خلعت کی واگزاشت کی خبر سن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے - جواب کے آنے پر دلجمعی کا مدار ہے - اگر جواب آیا تو تم کو ضرور اطلاع دوں گا - ۱۲

واسطے خدا کے ان سطروں کو غور سے دیکھنا اور ان کو اچھی طرح سمجھ لینا اور غلط نہ سمجھنا - دوسرا ورق بنام محمود مرزا کے ہے اس کو دینا اور اگر تمھارے پاس نہ ہو تو جہاں ہو بھیج دینا[2] ۱۲

مرقومہ سہ شنبہ ۲۳ - ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ — راقم غالب

مطابق ۱۲ - مئی ۱۸۶۳ — ضروری جواب طلب

مرزا محمود بیگ

برخوردار اقبال نشان محمود مرزا کو دُعا پہنچے - بھائی میں تمھارا خط دیکھ کر بہت خوش ہوا - خط تمھارا اچھا ہے - خدا کرے

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا عباس بیگ نے بھی ماموں کی پنشن، دربار اور خلعت کے اعزازات کی بحالی کے لیے کوشش کی تھی -

[2] معاملات کو سمجھ لینے کی بار بار تاکید سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرزا غالب کے نزدیک میرزا عباس بیگ زیادہ غور و توجہ کے عادی نہ تھے اسی لیے محمود بیگ کے خط میں انھیں "مست خود پرست" لکھا ہے -

خط سرنوشت بھی اچھا ہو۔

خدا کی قسم، تمھارے سہرے کے دیکھنے کی بہت خوشی[1] تھی مگر آنہ سکا۔ اگر جیتا رہا اور اسباب نے مساعدت کی تو اکتوبر نومبر یعنی جاڑوں میں آؤں گا اور تم لوگوں کو دیکھوں گا۔ ۱۲

پھوڑا اب اچھا ہو گیا ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ چھ مہینے کے دن رات کی ٹیس نے جو روح تحلیل کی ہے، اب بڑھاپے میں وہ پھر کہاں سے آئے۔ بیٹا تیرے سر کی قسم، اگر میں لنگ باندھے ہوئے ننگا بیٹھا ہوں تو میری شکل آکھ کی بڑھیا کی سی ہو گی۔ شاید ہوا کے جھونکے (سے) اور جاؤں۔ جب مجھ کو دیکھو گے تب جانو گے کہ کیا حال ہے ۱۲

تمھارے چچا اللہ میاں کے "مست خود پرست" بندے ہیں۔ بات ہے کچھ، سمجھتے ہیں کچھ۔ نہ اخبار کا مطلب سمجھے، نہ میرا حال۔ نہ میرا مقدمہ جو کچھ واقع ہوا اس کو سمجھے۔ اب میں نے ان کو ایک خط جدا گانہ لکھا ہے۔ اپنی طرف سے اظہار حال میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ خدا کرے سمجھ جائیں لیکن مجھ کو توقع نہیں کہ سمجھیں۔

تم نے اپنی والدہ کی اور اپنی بھاوج کی اور خداداد[2] اور رفیع الدین[3] کی خیر و عافیت نہ لکھی۔ اب جو اس خط کا جواب لکھو تو ان سب کی خیر و عافیتیں لکھو۔ ۱۲

غالب

سہ شنبہ ۲۳۔ ذی قعدہ (۱۲۷۹ھ)

۱۲۔ مئی سنہ حال (۱۸۶۳ء)



نامعلوم

(۱)

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف بر طرف
ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ہجوم غم سے فراغ نہیں۔ اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں، لیکن حسب رابطہ ازلی کثیر الاحباب ہوں۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں۔ ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں، جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں بعد اصلاح بھیج دیے جاتے ہیں۔

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ میں نے انھیں، نہ انھوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبت دلی اور نسبت روحانی سہی، لیکن صاحب بلاد دور دست کیا جانیں میرا کیا حال ہے؛ ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں فصل آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعف سامعہ و قلت اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں۔ حس حافظہ کا بطلان

---

[1] شادی میں شرکت کی آرزو تھی مگر بیماری کے باعث شریک نہ ہو سکے [2] میرزا خداداد بیگ محمود بیگ کے بھائی تھے [3] میرزا رفیع الدین بیگ وحشی تخلص۔ ان کا مختصر سا دیوان ایک مرتبہ چھپا تھا اب کمیاب ہے۔

علاوہ، جوں عمر بڑھتی گئی، یہ امراض بڑھتے گئے۔ قصۂ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ مع دوات قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو دوست آتے ہیں پرسشِ مزاج کے سوا اور کچھ کہنا ہوتا ہے، وہ لکھ دیتے ہیں میں ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔

غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح آٹھ دس بادام کا شیرہ، سہ پہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب۔ نسیان حد سے گزر گیا۔ رعشہ، دورانِ سر، ضعفِ بصر، یہ یاران نو آمدہ ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع ورد زبان ہے:

مشہور ہیں عالم میں، مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط کس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ آگے لیٹے لیٹے خط لکھتا تھا۔ اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔ صاحبِ "اکمل الاخبار" اور صاحبِ "اشرف الاخبار" نے، جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں، از روئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کر کے اس اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کل دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر ان کا احسان مند ہوگا۔

اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو تقاضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا، اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا۔ جب بالکل نکما ہوگیا، نہ حواس باقی رہے، نہ طاقت، پھر اب کیا کروں؛ بقول خواجہ وزیر:

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار ہوتا[۱]۔ اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں[۲]۔

غالب

—(۲)—

قبلہ!

آپ سے رخصت ہو کر بھیگتا بھاگتا بھوکا، جاڑا کھاتا پرسوں گیارہ بجے دن کے گھر پہنچا۔ اقربا و احباب کو زندہ و صحیح سالم پایا۔ الشکر للہ۔ اب میں تندرست ہوں۔ اس سفر میں سراسر خستہ و رنجور رہا، اتمام سفر اختتام رنج تھا گویا

کیا عرض کروں۔ غازی آباد شہر سے سات کوس ہے۔ شب کو وہیں مقام تھا، وہیں سے طبیعت اصلاح پر آنے لگی۔ قبض و انقباض رفع ہوگیا۔ صحت سے اعادۂ طاقت حاصل ہے۔ ۱۲

---

[۱] دیکھیے کمال تحریر۔ فرماتے ہیں کہ جوان ہوتا تو صحت کی آرزو ہوتی، بڑھاپے میں صحت کی آرزو کا کون سا محل ہے؛ اب تو چل چلاؤ ہے منزلِ زندگی کی منزل آج قطع ہوئی یا کل۔ اب صرف مغفرت کی دعا کا طلبگار ہوں۔ [۲] یہ خط جناب صفدر مرزاپوری نے رسالہ اردو میں چھپوا دیا تھا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کے نام بھیجا گیا تھا

"قاطع برہان" تم درفش کاویانی کا پارسل پہنچتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کو دیکھنا اور غور سے دیکھنا۔ جس طرح "لطائف غیبی" کو دیکھا ہے اس طرح نہ دیکھنا۔ تم نقاد نقود معنی ہو تم ہی داد نہ دو گے تو کون دے گا؟ یہ کتاب نہیں گنج اسرار حکمت ہے۔ من قال سے قطع نظر قال کو دیکھو۔[1]

۱۱۔ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء　　　　بے دستگاہ اسد اللہ

(۳)

میاں،

وہ عرضی کا کاغذ افشاں کیا ہوا اور عرضی کا مسودہ میں نے جگل کشور کو پرسوں دے دیا ہے۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا اور یقین ہے کہ وہ اپنے گھر میں اس کو لکھ رہے ہوں گے۔ اگر تمھارے پاس آجائیں تو ان کو کہہ دینا کہ جلدی کریں اور نقشۂ تحریر کا کاغذ سادہ پر مجھ کو اور تم کو دکھلا لیں۔ پھر اس کے موافق اور اس کو افشانی کاغذ پر لکھیں۔ زیادہ، زیادہ۔[2]

سنہ ۱۸۵۴ء　　　　غالب

(۴)

بندہ پرور!

آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کر دی اور صبح کو آپ کا کہار مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام کا مجھ کو دے گیا۔ اس عنایت کے شکر میں کیا خدمت بجا لاتا۔ بارے ایک رباعی بھیجتا ہوں۔ اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیجیے۔

امید بہ تشدید میم و تخفیف میم دونوں طرح مستعمل ہے۔ البتہ ایسا نہ ہو کہ جناب ممدوح اس کو زحاف سمجھیں۔ پہلے اور دوسرے مصرع میں بہ تخفیف میم ہے۔ تیسرے مصرع کا میم مشدد ہے۔[3]

غالب



---

[1] میرزا رام پور سے چلے تھے تو مراد آباد پہنچ کر بیمار ہو گئے۔ پانچ دن مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور کے ہاں ٹھہرے رہے۔ جب طبیعت سنبھل گئی تو چلے۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ میرزا نے ۷، اور ۸۔ جنوری کی درمیانی شب غازی آباد میں گزاری۔

یہ خط پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے قلمی دیوان واقف (مکتوبہ ۱۸۱۷) کی جلد میں شامل ہے۔ دیوان میں کیوں کر شامل ہو گیا؟ یہ دو صورتیں ذہن میں آتی ہیں یا تو یہ ہوا کہ جس شخص کے ہاتھ یہ خط آیا اس نے دیوان کی جلد بندھواتے وقت اس خط کو بھی شامل کر لیا تاکہ محفوظ رہے یا دیوان کا یہ نسخہ مکتوب الیہ کا تھا اور اس نے بغرض حفاظت یہ تدبیر اختیار کر لی۔ ایک صورت یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ واقف کا دیوان میرزا کے پاس رہا ہو اور انھوں نے خود خط دیوان کے کسی صاف ورق پر اس غرض سے نقل کر لیا ہو کہ اسے اردو مکاتیب کے مجموعے میں شامل کر دیں گے، جو اس زمانے میں زیر ترتیب تھا لیکن یہ مفروضہ چنداں معقول نظر نہیں آتا۔ [2] ممکن ہے اس رقعے کا تعلق اس رقعے سے ہو جو عبدالحق کے نام لکھا ہے۔ [3] رباعی نہیں ملی۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اردو میں تھی یا فارسی میں۔

(۵)

یہ سگِ دنیا کہ اسد کہلاتا ہے اور تخلص اپنا غالب بتاتا ہے "قول المامور معذور" کا پاس کرتا ہے اور حضرت انجم نیض (کذا) سے التماس کرتا ہے کہ میں استفتا کے سزاوار نہ تھا۔ اور اب جو پوچھا گیا تو سچ سچ کہتا ہوں کہ میں فن تاریخ ومعمّا سے بیگانہ ہوں۔ دیوان میں جو تاریخیں مندرج ہیں بیشتر مادّے اوروں کے اور قطعے فقیر کے ہیں۔ کبھی کوئی مادہ بھی عامیانہ کہہ دیا ہوگا۔ ہاں حضرت مبدأ فیاض نے گنجینۂ معنی سے بہت کچھ حصّہ مجکو دیا۔ میں نے سراسر قصیدہ و غزل و مثنوی و رباعی میں صرف کیا۔ البتّہ بزورِ قوّتِ ابداع مادّۂ تاریخ میں نیا شیوہ نکالا۔

زسال واقعہ مرزا میتا بیگ   مآت راست شمار ائمہ امجاد
صحیفہ ہاے سماوی مبیّن از عشرات   حدیقہ ہاے بہشتی مشخّص از آحاد

۱۲۴۸

ایضاً

از بروج سپہر جوئی مآت   عشرات از کواکب سیّارہ[۱]

۱۲۷۰

یہ دونوں قطعے کلیات فارسی منطبع مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں چھاپے گئے ہیں اور وہ مجلد مجموع بلاد ہند میں پہنچ گئے ہیں۔ اشرف البلاد حیدرآباد میں اگر دو چار ہوں گے تو ایک نسخہ میرا بھیجا ہوا جناب منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔ کے پاس ضرور ہوگا اوس میں مشاہدہ کیا جائے۔ اب بہ اتباع حکم احباب جس فن کو نہیں جانتا اُدس کے خصوص میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے یہ مسائل اس سفینہ کے سوا کبھی نہیں دیکھے۔ اب جو دیکھے تو باللہ اس سے زیادہ نہیں سمجھا کہ ایک گروہ تاے دراز کے چار سو عدد اور تاے مدوّرہ کے پانچ عدد گنتا ہے۔ پس نہ جناب نواب صاحب وجیہ الدین خاں بہادر معنّی اپنے دعوے میں منفرد اور نہ حضرت سیّد صاحب میر محمد زکی اپنے دعوے میں تنہا ہیں جو ایک جہت اختیار کروں تو دوسرے جہت والوں کو کہ وہ بھی اشخاص کثیر اور سب فاضل و نحریر ہیں، کیا جواب دوں اور ان کے دلائل کو کن دلائل سے ردّ کروں۔ امید کہ حضرات طرفین بموجب مفہوم لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا اس پیر ہفتاد و شش سالہ ضعیف الحواس کو عفو فرمائیں۔

جنگ بہادر نظام
الملک اسد اللہ خاں
نجم الدولہ دبیر

---

[۱] تفضل حسین خاں کی وفات کا قطعہ نیز میتا بیگ والا قطعہ کلیات نظم فارسی میں موجود ہیں۔ تفضل حسین خاں والے شعر سے ۱۲۷۰ نکلتے ہیں۔ وفات ۱۲۷۱ کی ہے۔ مرزا نے لکھا ہے: گفت آحاد، گفت شرمت باد   از خداوند واحد القہار

(۶)

کسی صاحب کے خط میں دو فارسی شعروں کا مطلب بیان کیا ہے :۔

شباہتے است مرآں راکہ بہ نیامدہ است
وگرنہ موے بہ باریکیِ میانِ تو نیست

سب کمر کو بال باندھتے ہیں، شاعر کہتا ہے کہ استغفر اللہ، بال کو کیا نسبت ہے کمر سے؛ کہ نظر آتی ہی نہیں، اور بال نظر آتا ہے۔ ہاں وہ بال جو ابھی نہیں اُگا اور نہیں نکلا اس کو کچھ شباہت ہے کمر کے ساتھ۔

در صفحہ نبودم ہمہ آنچہ در دل است
در بزم کمتر است گل و در چمن بسے است

پھول باغ سے آیا کرتے ہیں۔ باغ میں ہزاروں پھول ہوتے ہیں، مجلسوں میں دس دس پانچ پانچ ہوتے ہونگے شاعر کہتا ہے کہ میرے مضامین پھول ہیں اور میرا دل چمن ہے اور صفحہ انجمن ہے۔ مضامین اتنے ہی نہ تھے جو دیوان میں آگئے۔ چمن میں پھول اور دل میں معنی بہت ہیں۔

نامۂ غالب

بنام میرزا رحیم بیگ

میرزا رحیم بیگ، کے والد پیر بیگ دلی کے باشندے تھے، لیکن ترک وطن کر کے سردہنہ ضلع میرٹھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ رحیم بیگ سردہنہ میں پیدا ہوئے، پھر میرٹھ چلے آئے اور حکیم بو علی خاں سے علوم ضروری حاصل کیے۔ شاعری میں مولوی محمد بخش ناداں کے شاگرد ہوئے۔ ابتدا میں شرر تخلص کرتے تھے۔ پھر استاد کے مشورے سے رحیم تخلص اختیار کر لیا۔ (”ادبی خطوط غالب“ و ”سخن شعرا“) حکیم احسن اللہ خاں کی فرمایش پر قصص الانبیاء کو نظم کیا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک مثنوی ”دعوت عام“ کے نام سے اُردو میں لکھی تھی، جو سنہ ۱۲۶۶ھ میں چھپی۔ اس کے کل ایک سو گیارہ شعر تھے۔ میں نے طبع دوم کا ایک نسخہ دیکھا ہے۔ آخری عمر میں اندھے ہو گئے تھے۔ میرٹھ میں معلمی ذریعہ کسب معاش تھا۔

انھوں نے ”قاطع برہان“ کے جواب میں ”ساطع برہان“ لکھی تھی، جو سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مطبع ہاشمی میں چھپی۔ اس کی ضخامت ۱۷۴ صفحے ہے۔ اسی کے جواب میں ”نامۂ غالب“ لکھا گیا تھا۔ جس کے تین سو نسخے مطبع محمدی دہلی میں چھپوا کر میرزا نے اپنے دوستوں میں تقسیم کیے۔ بعد ازاں یہ نامہ ”اودھ اخبار“ کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء) میں من و عن شائع ہو گیا۔ غرض یہ ”قاطع برہان“ کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

بخدمت مشفقی مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ قلبہٗ بالاسرار و عینہٗ بالانوار۔

سخنے چند گفتہ میشود:

نہ در منطق پارسی دری

ہمیں ہندیِ سادہ و سرسری

جس طرح توحید میں نفی ماسوی اللہ دستور ہے، مجھ کو تحریر میں حذفِ زوائد منظور ہے۔ عزم مقابلہ نہیں، قصد مجادلہ نہیں، سر تا سر دوستانہ حکایت ہے، خاتمے میں ایک شکایت ہے۔ شکوۂ دردمندانہ منافی شیوۂ ادب نہیں۔ معہذا اظہار درد دل مراد ہے۔ کوئی بات جواب طلب نہیں۔ احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی[۱] کی طرح آدھا نام میرا نہ لکھا۔ ان کے حسنِ ظن کے مطابق مجھ کو معشوق میرے استاد[۲] کا نہ لکھا اور اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ بقول غالب ”باکدام خرہ سس درجوال شدہ ام“ بہم کیے یا اور دو چار جگہ کلمۂ توہین رقم کیے، میں نے اپنے لطف طبع اور حسن عقیدت سے پہلے فقرے کا

---

[۱] میر سعادت علی مؤلف محرق قاطع ”یہ کتاب غالب کی کتاب ”قاطع برہان“ کے رد اور ”برہان قاطع“ کی تائید میں محرم الحرام سنہ ۱۲۸۰ھ (جون ۱۸۶۳ء) میں مکمل ہوئی اور مطبع احمدی میں چھپی تھی۔ اس میں غالب کو جا بجا میرزا اسد اللہ غالب لکھا گیا۔ پورا نام میرزا اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ خطابات اس کے علاوہ تھے۔ غالباً اسی بنا پر میرزا نے شکوہ کیا کہ سعادت علی نے میرا آدھا نام لکھا۔ سید سعادت علی ریزیڈنسی راجپوتانہ میں منشی تھے۔ پنشن لے کر دہلی آ گئے۔

[۲] ہرمزد ثم مولانا عبدالصمد۔

مفہوم یوں اپنے دلنشیں کیا کہ حضرت نے محمد حسین دکنی جامع "برہان" کو موافق میرے قول کے خرس یقین کیا یا "خرس در جوال شدن" عبارت ہے صحبت سے، خواہی مدافعت کے واسطے ہو، خواہی محبت سے۔ مجھ کو اس کا قرب بسبیل آویزش ہے، تم کو اس کا قرب از روئے آمیزش ہے۔ دوسرے فقرے کے معنی یہ ٹھہرائے بلکہ بے تکلف میرے ضمیر میں آئے کہ خرس کو مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت باعث دردِ دل ہوئی۔ شدتِ درد میں آدمی چیختا ہے، چلاتا ہے، ہائے وائے کرتا ہے، غل مچاتا ہے، جیسا کہ سعدی بوستاں کی اس حکایت میں جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

شبے زیت فکرت ہمی سوختم

فرماتا ہے:

کہ ناچار فریاد خیزد ز درد

جناب مرزا صاحب! کیا تم نہیں جانتے؟ بے شبہ جانتے ہوگے کہ اکابر امت کو امور دینی میں کیا کیا منازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت بہ تکفیر یک دیگر پہنچی ہے۔ اگر فن لغت میں ایک شخص دوسرے شخص کا معتقد نہ ہوا، یہاں تک کہ اس کی تحمیق بھی کی تو اور مدعیان علم و عقل اس مسکین کے جگر تشنۂ خون کیوں ہو جائیں اور جب تک اس کا نقشِ ہستی صفحۂ دہر سے نہ مٹائیں، آرام نہ پائیں۔ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے "قاطع برہان" میں لکھا ہے، نہ اس کو سمجھتے ہیں اور جو کچھ آپ لکھتے ہیں، نہ اُس کے معنی سمجھتے ہیں۔ "سوال دیگر جواب دیگر" پر مدار ہے۔ خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے۔ "برہان قاطع" والے کی محبت سے دل بے قرار ہے۔ فرطِ غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار ہے۔ منشی سعادت علی نہ ناظم ہے، نہ نثار ہے، بموجب اس مصرع کے،

مقتضائے طبیعتش این است

ناچار تم کو معرضِ تحریر میں تحمل و تامل چاہیے، نہ سخن پروری و جانب داری میں توغل چاہیے۔ بحسب اختلاف طبائع مانو یا نہ مانو مگر پہلے یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے۔

فرہنگ نگاراں زبان فارسی

اگرچہ "قاطع برہان" میں جا بجا لکھتا آیا ہوں مگر اب ہندی کی چندی کر کے لکھتا ہوں کہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی میں بقدر تحصیل مسلم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں۔ جس نے چاہا ہے، اُس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کے جو فرہنگ ان حضرات نے لکھے ہیں، مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس اُستاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعۂ کتب سے نہیں نکالے ہیں۔ پہلے تعلیم و تعلم ہے، پھر کتب قواعد کے جا بجا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے؟

شیدائے[1] ہندی سیکروی نے حاجی محمد جان[2] قدسی علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مرزا جلالائے طباطبائی



[1] ملا شیدا شاہ جہاں کے عہد کا شاعر ہے۔ قندھار میں پیدا ہوا پھر فتح پور سیکری میں مقیم ہو گیا۔ اسی لیے (باقی صفحہ ۵۲۹ پر)

علیہ الرحمۃ نے رشید اکو خط لکھا ہے۔ سرآغازِ خط کا ایک قطعہ جس میں "صحرا" و "دریا"، "قافیہ" اور "برساند" ردیف ہے۔ شعرِ اخیر کا مصرعِ ثانی یاد رہ گیا ہے:

یعنی بہا دہو مقوٰی برساند

خلاصہ مضمونِ خط یہ کہ تو صاحبِ زبان نہیں ہے، زبان دان ہے، یعنی مقلد اور کاسہ لیس اہلِ ایران ہے۔ حاجی محمد جان کے کلام کو سند پکڑ، تجھے کس نے کہا ہے کہ اُس سے لڑ؟

کیا تُو نے سُنا نہیں جو عرفی و فیضی میں گفتگو ہوئی تھی اور مؤتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے رُوبرُو ہوئی ہے؟ لغاتِ فارسی اور ترکیبِ الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہُوا ہُوں، اپنے گھر کی بڑھیوں سے لغات، فارسی اور ترکیبیں سُنتا رہا ہُوں۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے، وہ ہم نے خاقانی و انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ تقصیر معاف، خاقانی و انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیرزالوں کا ہے۔ ہائے تمیز کہاں سے لاؤں جو دیکھے کہ یہ حال قلمرو ہند کے صاحب کمالوں کا ہے۔ قیاس مع الفارق کی بہار دیکھو۔ مجرد تقدم زمانہ کا اعتبار دیکھو۔ مانا کہ عرفی تحصیل علوم عربیہ میں اُن سے کمتر ہے، صاحبِ زبان اور ایرانی ہونے میں برابر ہے۔ کیا عرفی، کیا انوری، کیا خاقانی، ایک شیرازی، ایک خاوری، ایک شروانی۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالبؔ تیرا بھی مولد ہندوستان ہے۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے:

هرچه از دستگه پارس به یغما بردند
تا بنالم هم ازاں جمله زبانم دادند

زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی مآب ہیں، لیکن کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے باب میں ہیں؟ رہے فرہنگ لکھنے والے، خدا ان کے پیچ سے نکالے، اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے، وہ بھی نہ کوئی ہمقدم، نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو لیسو پراگندہ و تباہ۔ رہنما ہو تو راہ بتائے، اُستاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی، نہ استاد اصفہانی، زہے رگِ گردن و خہے دعوائے زبان دانی میرا یہ قول خاص ہے، نہ عام ہے، مجموعِ فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ جامعِ "برہان" کا

(بقیہ حاشیہ ص ۵۴۸) غالب نے اسے سیکروی لکھا ہے۔ اس نے قدسی کے ایک قصیدے پر اعتراضات کیے تھے۔ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں وفات پائی۔ ۲؎ حاجی محمد جان قدسی مشہد کا باشندہ تھا۔ شاہ جہاں کے دربار سے گراں قدر صلے اور انعامات پاتا رہا۔ پادشاہ نامہ بھی نظم کیا تھا۔ ۱۶۴۶ء بعارضہ اسہال لاہور میں فوت ہُوا۔ ۱؎ عرفی و فیضی دونوں فارسی کے مشہور شاعر ہیں۔ عرفی شیراز سے آیا۔ پہلے حکیم ابوالفتح گیلانی سے بعد میں خانخاناں سے متعلق ہُوا۔ ۱۵۹۱ء میں وفات پائی۔ فیضی اکبر کا مشیر اور شاعرِ خاص ۲؎ خاقانی و انوری فارسی کے مشہور اساتذہ۔ ۳؎ درخور، لایق، شایستہ۔

ماخذ "فرہنگ رشیدی"[1] و "جہانگیری"[2] ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو ہیں کیا پیری ہے؛ قطب شاہ و جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشاے برتری ہے تو بے چارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری[3] ہے۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ لکھتا ہوں، اگر خفا نہ ہو جاؤ گے، تو حظ اٹھاؤ گے۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں، یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں، تو بتو اور لباس در لباس، وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے، چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی نظر آئیں گے، معنی موہوم۔

ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ہے، آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں، جو میرے دلنشین ہے۔ فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی لغات فارسی میں نہ سراسر غلط ہے، البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے خصوصاً دکنی[4] تو عجیب جانانہ ہے، لغو ہے، پوچ ہے، پاگل ہے، دیوانہ ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یاے اصلی کیا ہے اور یاے زائدہ کیا ہے۔ حیران ہوں کہ اس کی جانب داری میں فائدہ کیا ہے؟ خدا جانتا ہے کہ میں یک رنگ ہوں، مگر دکنی کے جانب داروں کا چور رنگ[5] ہوں۔ مجھے جو چاہو سو کہو، اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو؟ کہیں جامع[6] لطائف غیبی کو برا کہتے ہو، کہیں نگارندۂ[7] "دافع ہذیان" سے جھگڑتے ہو۔ جانتا ہوں کہ دکنی کی عبارت کی خامی، اس کی رائے کی کجی، اس کے قیاس کی غلطی، اگرچہ سب جگہ، بلکہ بعض جگہ سچ جانتے ہو، مگر یہ میں نہیں جانتا کہ اتنی محنت کرنی اور اس کے رفع تخطیہ کے واسطے توجیہات بار دہ ڈھونڈھنی کس واسطے؟ ایسا اس کو کیا مانتے ہو؟ مجھ پر جدا منہ آتے ہو۔ مولوی نجف علی اور میاں دادخاں سے جدا بگڑتے ہو۔ بھائی صاحب، مغلچہ پن پر آ گئے، گو بار[8] اڑتے ہو۔

اپنی غلطیوں کا اعتراف

سچ ہے غالب آگندہ گوش ہے کسی کی نہیں سنتا۔ اسی آپ کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے موافق بحلف کہتا ہوں کہ تم نے "قاطع برہان" و "دافع ہذیان" و "لطائف غیبی" کو ہرگز نہیں دیکھا۔ "آویزہ" و "افسوس" کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں دادخاں شرمسار[9] ہے۔ جو کچھ اس مصنف نے اس باب میں لکھا، وہ قول فیصل اور کافی ہے۔ مانیں یا نہ مانیں، ناظرین کو اختیار ہے۔

رگھری بکاف فارسی مکسور، بوزن اگھری، لغت ہندی الاصل، اس کی شرح میں جداگانہ ایک فصل، کاف فارسی مکسور کی جگہ کاف عربی مفتوح، اعراب کا بوزن تشتری وضوح، مجھے اور میرے دوست سیف الحق کو دو سہو طبعی پر استعذار

---

[1] مؤلف فرہنگ رشیدی جس کا نام عبدالرشید تھا، ٹھٹھہ کا رہنے والا تھا۔ وفات ۱۰۷۷/۱۶۶۶۔ [2] مؤلف فرہنگ جہانگیری جس کا نام جمال الدین حسین اور وہ خاندان انجو سے تھا۔ وفات ۱۰۳۵/۱۶۲۶۔ [3] یعنی فرخ سیر کے زمانے میں گزرا ہے، بلکہ عالمگیر کے زمانے میں بھی تھا، برتری کے قافیے کی رعایت سے فرخ سیر لکھا ہے۔ مطلب یہ کہ محض تقدم زمانی کوئی وجہ برتری نہیں۔ [4] محمد حسین مؤلف برہان قاطع۔ [5] مقتول و مجروح [6] یہ کتاب خود غالب نے لکھی تھی لیکن اپنے شاگرد میاں دادخاں سیاح کے نام سے چھاپی اور اسے سیف الحق خطاب دیا۔ [7] مولوی نجف علی جنھوں نے غالب کی تائید اور محرق کے رد میں "دافع ہذیان" لکھی تھی۔ [8] یعنی ایک آدمی کا بہت سے آدمیوں سے لڑنا۔ [9] ملاحظہ ہو لطائف غیبی صفحہ ۱۲۔

ہواخواہان بوہرۂ دکنی کو اغلاط متواترہ کے جواز پر اصرار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

"خرہ" بے واؤ بہ معنی "نور" اور "خورہ" مع الواؤ بہ معنی "جذام"، "ویزہ" بہ معنی "پاک" اور "آویزہ" بہ معنی "ناپاک"، ایک یہ اور ہزار ایسے اغلاط سند اور مقبول اور منظور، گویا یہ مصرع جو حمد میں ہے،

کند ہرچہ خواہد بر و حکم نیست

اسس کی شان میں صادق سمجھ لیا ہے۔ چشمِ بددور اب چاہیے کہ اس کو پوجنے والے اس کے نام کے بعد جل جلالہ لکھیں اور اگر اتنی جرأت نہ کریں تو نظر بافادہ و استفادہ عم نوالہ لکھیں۔ ستّر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، جمعیت کم، تفرقہ زیادہ اور پھر خودداری اور کسرِ نفس اور استغنا خداداد۔ بیہودہ بکنے میں اوقات کیوں صرف کروں؛ پاسخ نگاری کیوں لفظ بلفظ و حرف بحرف کروں؛ آپ کو اپنی نمود اور شہرت منظور ہے، خوردہ گیری و عیب جوئی سے، مجھ کو نفرت ہے اور حیا آتی ہے زیادہ گوئی سے۔ آپ کے حسن کلمات طیبات سے قطع نظر کر کے ناظرین منصف کے وجدان پر چھوڑ دیتا ہوں اور شکایت موعودہ سے پہلے تین امر ضروری لکھ لیتا ہوں۔

لفظ صیحہ "صیحہ بہ معنی آوازِ اسپ زینہار نیست"، اس کے سچ ہونے میں کیا کلام ہے؛ جو صیحہ سے آوازِ اسپ مراد رکھے، وہ ناقص ہے اور خام ہے۔ کیا عرفی کا شعر عرفی کے خط سے لکھا ہوا کسی کو نظر پڑا کہ ناظر سے سُن کر تمہارا ذہن وقاد و نقاد وہاں جا لڑا؛ لغت کسی باطن کے اندھے کے ہاتھ سے لکھا جائے اور پھر عرفی جیسا شاعر دیدہ ور بازپرس میں پکڑا جائے؛ تمہارا محبوب بوہرۂ دکنی شین منقوط مع التحتانی کے بیان میں شیہہ کو گھوڑے کے ہنہنانے کی فارسی بتاتا ہے۔ عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو صہیل بوزن دلیل کہتے ہیں۔ صیحہ بوزن بیضہ عموماً بہ معنی ہر صدائے ہولناک و مہیب آتا ہے۔ میں کیوں کر فرہنگ نگاروں کے اور ان کے مددگاروں کے قیاس کو وحی سمجھوں اور کیوں کر کاتبوں کے املا کو مصحف مجید کی طرح سر پر دھروں؛ یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو جماد اور نبات فرض کر لوں۔ "جرم و خطائے یوغ برگردن بندگان جناب است"[1] میں آپ کو مخاطب بالفتح ٹھہرا کر یہی فقرہ پڑھ کر چپ رہتا ہوں۔ بعد اس کے تبدیل جیم بہ تحتانی کو نامسموع کہتا ہوں۔ "یعقوب" کو بتغیر لہجہ انگریزی زبان میں "جاکوب" کہتے ہیں۔ کہاں مبدل منہ، کہاں تغیر لہجہ۔ حضرت آپ جو کہتے ہیں، خوب کہتے ہیں۔ کودک کو ترجمۂ طفل نہیں جانتے اور پھر خاتمہ میں ریدگان بصیغہ جمع لکھواتے ہو۔ واقعی یوں ہے کہ جو کچھ لکھواتے ہو بہ نیروئے بصر نہیں بلکہ از روئے سمع لکھواتے ہو (ساطع برہان صفحہ ۱۷۳)۔

استغاثہ خط تمام ہوا اب مستغیث کی عرضی سماعت ہو، لیکن سماعت از روئے انصاف بالائے طاعت ہو۔ عرضی گزراننے سے پہلے مستغیث پوچھتا ہے کہ آپ کے محکمہ عالیہ کا سررشتہ دار دیانت دار ہے یا نہیں؛ سخن فہم و ہوشیار ہے یا نہیں؛ میں تو گمان کرتا ہوں کہ امین نہ ہوگا۔

---

[1] یہ میرزا رحیم بیگ کا فقرہ ہے (ساطع برہان صفحہ ۱۷۰) غالب نے اعتراض کیا تھا کہ "یوغ" "کو" "جوغ" بھی لکھا گیا ہے۔ میرزا رحیم بیگ نے کہا کہ "ی" "ج" سے بدل جاتی ہے اور اعتراض خطا ہے۔

دلیل سُن لیجیے اگر یقین نہ ہو۔

"صیحہ بہ معنی آوازِ اسپ زنہار نیست۔ اس کے ماقبل اور بھی عبارت ہے، سُنانے والے سنے نہ پڑھی ہو، کتنا بعید ہے کس واسطے کہ اس عبارت کے مفہوم کو ملحوظ نہ رکھنا اور محمد اکرم[1] پنجابی کا شعر تو قابلِ التفات نہیں، مگر جمال الدین عرفی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر بہ تتبع کاتب غلط لکھوا دینا، تم سے ایسا بعید ہے۔ انشا میں ناسخوں کی تحریف کو مانتے ہو، املا میں کاتبوں کی غلطی کے کیوں نہ قائل ہو؟ انشا و املا و لفظ و معنی میں تقلید چھوڑ کر تحقیق کے کیوں نہ مائل ہو؟ تقصیر معاف، یہ نہ استناد بکلام عرفی عالی مراتب ہے، بلکہ پیروی خامۂ کج رفتار کاتب ہے۔

اپنی حالت کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ، نہ ہجوم امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے فراغ۔ آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی تو یہ اپنا شعر اُردو میرے وردِ زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اب جو اصلاحِ حال و حصولِ مطالب سے دل مایوس ہے تو طبیعت اسی غزل کی اس بیت کے ترنم سے مانوس ہے:



عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڑا رونا رزق کا ہے۔ جب معاش مقرر ہو تو پھر غم کیا ہے؟ نہ صاحب یہ باتیں جانوروں کی ہیں کہ کچھ کھا لیا، پانی پی لیا اور چین سے سو رہے۔ آدمی عموماً اور صاحبانِ ننگ و ناموس خصوصاً باوجود فراغ معاش ایسی جاں گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے۔ یہ حال تو یا صاحبِ واقعہ جانے یا خدا جانے، دوسرے سے یہ کار افتادہ کیوں کہے اور بغیر کہے دوسرا کیا جانے؟ مناظرے کا تو ہرگز ارادہ نہیں، اگر مُردہ دل نہ ہوتا تو باتیں کہتا، زیادہ نہیں، وہ بھی نہ از روئے بحث و تکرار، نہ بہ اندازِ استفسار۔ اظہار سے مقصود نفسِ اظہار۔

مولانا صہبائی یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے آپ کو اپنا امام بنا لیا ہے؟ جب تک نہ اجماعِ محققین کا ہوگا یہ خطاب باجماعِ اہلِ عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔ وہ فرمانروائے عہد، شہنشاہ کہلائے گا، کئی بادشاہ جس کے فرماں پذیر ہو جائیں گے۔ ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام "میر شہنشاہ" رکھ لیا، یہ "میر شہنشاہ" صاحب کیوں کر شاہجہان و جہانگیر ہو جائیں گے؟ اگر حضرت بفتحۂ قافِ ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققَین کہتے تو ایک ماموم آپ ہوتے اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔

ساطع برہان کی غلطیاں "ساطع برہان" کے تیرھویں صفحہ کی نویں سطر میں آپ لکھتے ہیں: "وہمچنیں بر افراط و تفریط توضیح ا

---

[1] یہ اشارہ غالباً غنیمت کنجاہی مصنف نیرنگِ عشق کی طرف ہے۔ وفات $\frac{1158}{1745}$۔

کار بند شدہ اند کہ بداں حرف گیری تواند کرد۔ تواند توانستن کے مضارع کی بحث میں سے صیغۂ واحد غیب ہے۔ فاعل چاہتا ہے، خواہی معرفہ جیسے احمد، محمود، خواہی نکرہ جیسے بہمان، کسے یا شخصے، مردے یا زنے اور اگر فاعل مذکور نہ ہو تو اُس صورت میں "تواں کرد" چاہیے کہ "تواں" مالم یسم فاعلہ" ہے۔ کرامت تو مجھے حاصل نہیں، ہاں از روئے حسنِ عقیدت کہتا ہوں کہ آپ نے یوں لکھا ہے کہ "کسے بداں حرف گیری تواند کرد" یا "تواند" کی جگہ "تواں" رقم فرمایا ہے۔ دیکھیے آپ نے بیل کے جوئے کا بوجھ میری گردن پر رکھ دیا اور میں نے ایک بیل کا بوجھ پشت مبارک سے اُٹھا لیا۔

آب دہ دست

"او اسد اللہ و اد خواہ جلد آ اور اپنی عرضی لا۔" حضرت آیا اور عرضی لایا۔ پہلے پانچ کاغذوں کی نقلیں علی الترتیب پڑھی جاویں، پھر سر رشتہ دار صاحب بکمال امانت و دیانت عرضی سنا دیں۔"

۱۔ **عبارت برہان قاطع**: "آب دہِ دست بکسر دال ابجد و ہائے ہوز، اشارہ بحضرت رسول صلوٰۃ اللہ علیہ است خصوصاً و شخصے را نیز گویند کہ بزرگ مجلس بود۔ آرائش صدر و زینت ازو باشد عموماً۔"

۲۔ **عبارت قاطع برہان**: "از خامی عبارت چشم می پوشم و می خروشم کہ "آب دہ دست" مرکب از "آب" و "دہ" کہ صیغۂ امر است از دادن و "دست" کہ باوجود معانی دیگر مسند را نیز گویند، معنی ترکیبی "رونق دہندۂ مسند"۔ بہر آئینہ تا مسند را بطرف نبوت یا رسالت یا ہدایت مضاف نگردانند بمقام نعت فرو نیارند، بلکہ در مدح اکابر و صدور نیز بے اضافۂ لفظ امارت و شوکت و امثال اینہا نگارند نہ بینی کہ تنہا آب دہ دست افادۂ معنی "شویانندۂ دست" می کند و آں خود ناستہ ست قبیح۔ بے چارہ در نظم و نثر لغت آب دہ دست رسالت دیدہ است و نیمۂ مضمون را لغت اندیشیدہ است۔"

۳۔ **عبارت ساطع برہان**: "آب دہِ دست" خدا نکند کہ ایں اعتراض از جانب میرزا سرزدہ من باشد۔ کور سوادے ہمچو من گفتہ باشد، بخاطر داشت آں درج کتاب کرد، ورنہ ایں کنایہ قابل اعتراض نیست۔ چہ "آب دہ دست" جملہ ترکیبی ست۔ "دست" کہ در عربی و فارسی بمعنی مسند ست، مضاف و مضاف الیہ محذوف باید دانست بلکہ کلامیست مستقل مترادف بالادست کہ معنی صدر و مسند و بزرگ قوم باشد۔ صاحب موید الفضلا در لغت فارسیہ ایں لغت را بسند دو کتاب کہ "ادات" "دقنیہ"[1] باشد۔ بہمیں صورت و صحت بہمیں معنی نگاشتہ و در "مدار" نیز[2] صاحب رشیدی آوردہ کہ آب دہِ دست بہ معنی بزرگ مجلس و معنی ترکیبی آں رونق دہ صدر و مسند۔

قولہ بیچارہ در نظم و نثر لغت آب دہ دست رسالت دیدہ و نیمۂ مضمون را لغت اندیشیدہ است انتہی **اقول** جامع ایں کنایہ را در نظم و نثر بے اضافۂ رسالت دیدہ است و ہمچناں در رشتۂ تحریر کشیدہ است۔ خاقانی گوید:

وست آب دہِ مجاور انش   ارزن دہ برج کوتر انش

تبصرہ پس گرداں جناب اگر فراموش نکنند در شرح کنایہ ماہی چشمۂ خضر در باب المیم جو بیند کہ میگویند کہ آب دہ دست استعارہ برائے آنحضرت ﷺ از خاقانی خالی از کاکت نیست۔ وائے بریں عقیدت کہ او را بہ پیمبری برداشتند و باز بہ نسبت

---

[1] ادات الفضلا اور قنیۃ الطالبین۔ لغت کی دو کتابیں ہیں [2] مدار الافاضل کتاب لغت۔



رکاکت سرنگوں انداختند۔

۴۔ عبارت برہان قاطع: "ماہوچی شمۂ خضر کنایہ از زبان و دہان معشوق است۔

۵۔ قاطع برہان: یارب "ماہوچی شمۂ خضر کدام لغت است من در کتاب منطبعہ بدیں صورت دیدہ ام:

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

در ضمیر میگزرد کہ "ماہی چشمۂ خضر خواہد بود و آں خود مضمونیست بطریق استعارہ بالکنایہ کہ سخنور لبسا خون جگر خوردہ باشد تا در نظم و نثر خویش آوردہ باشد۔ سپس ہر کہ ایں را در گفتار خویش آرد سرقہ خواہد بود۔ از لغات مستقلہ و کنایہ ہائے مشہورہ نیست کہ بکار دبیران روزگار آید۔ شیرِ خدا کہ ترجمۂ اسد اللہ است گوئی یکی از نامہائے جناب ولایت پناہ است۔ صد ہزار کس در کلام خویش آوردہ باشد و سرقہ نیست۔ دکنی در بحث شین مع الیا "شیر شرزۂ غاب" اسم حضرت امیر علیہ السلام نوشتہ و آں مضمونیست کہ خاقانی در قصیدۂ قسمیہ بہم ساندہ۔ "شیر شرزہ" خود صفتیست عام کہ بر ہر مرد شجاع و سرہنگ جنگ جُو اطلاق تواں کرد۔ "غاب" بمعنے بیشہ و نیستاں است۔ ہر آئینہ ایں صفت نہ سزاوار شان اسد اللّٰہی باشد، خاقانی خود بطریق تنزل گفتہ است ایں چنیں صفت اسم کسے کہ بعد از خدا و رسولؐ او را بہ بزرگی تواں ستود، چگونہ روا تواند بود؟ ہمچنیں آب دہ دست در باب الف ممدودہ اسم حضرت ختم المرسلین صلوٰۃ اللہ علیہ قرار دادہ است و ایں لفظیست در غایت رکاکت صفت لفظ۔ پس غالب منع کرتا ہے برہان دکنی کو کہ لفظ رکیک آنحضرتؐ کے حق میں صرف نہ کر۔ چناں کہ ہمدراں فصل مفصل نوشتہ ایم مقصود ما اینست کہ ایں چنیں مضامین لغت مستقل و کنایہ مقبول چرا قرار یابد و جز در شرح اشعارے کہ حاوی ایں کلمات باشد، چرا نگارش پذیرد؛ اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔

"آب" ترجمہ ماء کا، ہندی جس کی پانی اور بمعنی رونق و لطف بھی آتا ہے اور اسلحہ کی تیزی اور جواہر کی صفائی کو بھی کہتے ہیں۔ "دست" "ترجمہ "ید" ہے جس کی ہندی ہاتھ اور بہ معنی قسم و نوع اور بہ معنی مسند بھی مستعمل ہے۔ ہم کو اس مقام میں آب بمعنی پانی اور دست بمعنی ہاتھ اور اس کی ترکیب یعنی آب دست اور اس کی مقلوب یعنی دست آب کے باب میں کلام ہے۔ آب دست بحرکت و سکون موحدہ عموماً ترجمہ غسالۂ ید ہے اور خصوصاً وضو کو کہتے ہیں۔ تعمیم کی سند استاد کا شعر:

بے تکلف رو بساقی کن اگر دل خستۂ کا آبدست او شفا بخش ہمہ بیمار ہاست

تخصیص کی سند "نام حق" کی بیت:

آبدست و نماز باید کرد دل مقام گداز باید کرد

عرف میں آبدست کس عضو کے غسالے کو کہتے ہیں؛ ہم تو اتنا پوچھ کر چپ ہو رہتے ہیں۔ پس "آب دہ دست" اور "دست آب دہ" کے معنی وضو کرانے والا، ہاتھ دھلانے والا، آب بہ معنی رونق اور دست بہ معنی مسند کا یہاں ادخال محض جہل اور صرف اہمال۔

یہ تو میرا قول ہے کہ "آب دہِ دست رسالت" رسولؐ کو کہہ سکتے ہیں۔ ایک بے ادب فقط "آب دہ دست" کہتا ہے اور ہم منہ تکتے ہیں۔ منشی سعادت علی کو نہ علم، نہ فہم۔ اس نے اس قباحت کو نہ جانا، میرزا رحیم بیگ صاحب! افسوس کی

بات ہے تم نے اس بیان خاص میں "قاطع برہان" والے کے قول کو کیوں کہا مانا؟ ہے ہے سراسر بے پردہ اشرف الانبیاء علیہ وآلہ السلام کی تذلیل اور توہین ہے اور جو پیمبر کو ایسا کہے، وہ مجموع اہل اسلام کے نزدیک مرتد اور مردود و بے دین ہے۔ بلکہ مخالفین بھی، جو مسلمان اپنے پیمبر کو بُرا کہے، اس کو بُرا جانیں گے، یقین ہے۔ پس پیمبرؐ کا "آب دہ دست" نام رکھنے والا مورد لعنۃ اللہ و ملائکتہ والناس اجمعین ہے۔

اشعار خاقانی کی شرح

خاقانی کے شعر لکھنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ یہ شعر قطعہ بند اور اس کا پہلا شعر مجھ کو یاد ہے۔ پہلے پُوچھتا ہُوں کہ دست آبدہ کا فاعل اور شین کا مرجع تم نے کس کو ٹھہرایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نشان اس میں بطریق مذکور یا مقدر کہاں پایا؟ جب اس مصرع کے رو سے:

دست آب دہ مجاورانش

"دست آب دہ" پیمبرؐ کا نام قرار پایا تو دوسرے مصرع کے مطابق:

ارزن دہ برج کوترانش

"ارزن دہ" کا خطاب بھی حضرت پر صادق آیا۔ سبحان اللہ! جہاں مصطفیٰ و مجتبیٰ رحمۃ للعلمین و خاتم المرسلینؐ آپ کے القاب ہیں وہاں "آب دہ دست" بھی آپ کا لقب ٹھہرایا۔ میرزا جی میں ترک جاہل ہوں، بجا ہے۔ اگر مجھ کو گالیاں از روے عتاب دو گے، خدا کے واسطے پیمبرؐ کو کیا جواب دو گے؟

بندہ پرور خاقانی کا شعر قطعہ بند ہے اور اس شعر کا پہلا شعر یہ ہے:

روح از پئے آبروے خور را   خلد از پئے رنگ و بوے خور را
دست آب دہ مجاورانش   ارزن دہ برج کوترانش

اوپر کے دونوں مصرعوں میں را لفظ زاید، پہلا مصرع تیسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع چوتھے مصرع سے متعلق۔ نثر اس کی فارسی میں یُوں ہوتی ہے: "روح از پئے آبروے خود دست آب دہ مجاوران اوست و خلد از پی رنگ و بوے خود ارزن دہ کبوتران اوست"۔ یہ دونوں شعر کعبۂ معظمہ کی تعریف ہیں اور دونوں شینوں کی ضمیر بطرف کعبہ راجع۔ اس اظہار کی تصدیق "تحفۃ العراقین" سے کیجیے اور ہندی کی چندی غالب سے سُن لیجیے۔

روح اپنی افزائش آبرُو کے واسطے وضو کا پانی دیتی ہے کعبہ کے مجاوروں کو اور خلد اخذ رنگ و بو کے واسطے دانہ کھلاتا ہے کعبہ کے کبوتروں کو۔ وضو کا پانی دینا اور کبوتروں کو دانہ کھلانا ادنیٰ خدمت ہے۔ خدا کے واسطے مخدوم کونینؐ کو خادم کہنا مدح ہے یا مذمت ہے؟ معہذا خاقانی کے مصرع سے دست آبدہ پیمبرؐ کو سمجھنا بے اعتنائی اور غفلت ہے۔ خاقانی نے روح کو آبدست دہ کا فاعل مانا، تم نے پیمبر کو معاً اس فعل کا فاعل اور ایک فعل کا دو فاعل سے متعلق ہونا کیونکر جائز جانا؟

"قافلہ شد" یعنی "قافلہ رفت" یعنی "قافلہ سالار رفت" یعنی "رسول مقبولؐ رحلت کرد"، بہ "قاف مع الالف" ہیں کلام اسی مستہین رسولؐ کا ہے۔ "دست آبدہ" کی شرح میں تحقیر اور "قافلہ شد" میں استہزا ہے۔ "برہان قاطع" والا

اگر یہ قباحتیں نہیں سمجھا ہے تو احمق ہے اور اگر سمجھ کر لکھتا ہے تو کافر مطلق ہے۔ اب میرے خوننابۂ زخم دل کی روانی اور قلم کی خوننابہ فشانی دیکھیے۔

تبصرہ مندرجہ حاشیۂ "ساطع برہان" کے حق میں کیا فرماتے ہو اور اس فقرۂ اخیر کو "بازدر نشیب رکاکت سر انداختند" کس کا لکھا بتاتے ہو؟

مولوی فضل حق خیر آبادی کا بیان

سنو، فخر الفضلا و ختم العلما امیر الدولہ مولوی محمد فضل حق رحمۃ اللہ علیہ نے ردِّ عقائد وہابیہ میں بزبان فارسی ایک رسالہ لکھا ہے اور اس عہد کے علماء کی اس پر مہریں ہیں۔ اُس رسالے میں جناب مولوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ حضرتؐ کو قوت مجامعت بہت تھی، حالانکہ یہ امر واقعی ہے یا یہ کہے کہ آپ کی ردا میلی تھی، اگرچہ اس وقت میں ہو، لیکن چونکہ ایک گونہ سوءِ ادب اور اہانت ہے۔ حاکم اہل اسلام کو چاہیے کہ اس قول کے قائل کو سزا دے اور اگر سزا نہ دے تو اہل شہر پر عزل حاکم واجب ہے اور اگر اہل شہر ایسا نہ کریں تو وہ دار الحرب ہے۔ پس موجب فتوائے علمائے اسلام فقرۂ مذکور کا لکھنے والا کفر میں شداد سے اشد اور کذب میں مسیلمۂ کذاب سے سوا ہے۔ خیر عقبیٰ میں خالق کا مقہور اور دنیا میں اہل خلق کا مطعون ہوگا، مجھ کو کیا؟ مجھے تم پر ہنسی آتی ہے، بعضی بات سمجھی نہیں جاتی ہے۔ خاقانی روح کو آبدست دہِ مجاوران حرم کہتا ہے، تم کہتے ہو کہ خاقانی "دست آبدہ" اسم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہتا ہے۔ مولوی امام بخش نے تم کو بہت کچھ پڑھایا، مگر طریقۂ استنباط معنی نہ بتایا۔ میرے حق میں جو کہتے ہو خود بھی نہیں سمجھتے کہ کیا کہتے ہو۔ میں نے اس کے سوا کہ "خاقانی بطریق تنزل گفتہ است" اور کیا کہا ہے، جو مجھے بُرا کہتے ہو؟  وہ بھی ذکر "شیر شرزۂ غاب" ہیں، نہ "دست آب دہ" کے باب میں۔ اس نے جناب امیر المومنین کے واسطے ایک لفظ سہل سرسری لکھا، میں نے قبول نہ کیا اور اس کے قول کا تنزل ظاہر کر دیا۔ آنحضرتؐ کو اس نے آب دہ دست یا دست آب دہ کہاں لکھا اور کیوں لکھتا؛ نہ احمق تھا، نہ بے ادب۔ جب اس نے نہیں لکھا تو میں اس سے کیوں اُلجھوں اور کب اُلجھا؟ نہ کج فہم ہوں نہ مغلوب الغضب۔

آب دہ دست کے پردے کھل گئے۔ بے اضافہ لفظ آخر دست بمعنی مسند نہ آئے گا۔ آب دہ دست ہاتھ دھلانے والا کہلائے گا۔ ہاں ایک طور ہے تم نے اس کو اور طور سے لکھا ہے۔ میں بطریق ابلغ و احسن لکھتا ہوں، یعنی تخت اور اورنگ سلاطین کے جلوس کے واسطے اور وسادہ و مسند امراء کے جلوس کے واسطے موضوع ہے قطع نظر اس اصل پر سلطان کو زیب افزائے اورنگ بے اضافہ لفظ سلطنت اور امیر کو زینت بخش مسند بے افزائش لفظ امارت لکھو۔ انبیاء خصوصاً سید الانبیاءؐ مسند پر کب بیٹھے تھے؟ ان کے غلاموں کو امارت ننگ ہے اور زمزمۂ "الفقر فخری" بلند آہنگ ہے۔ میرے خداوند کا فرش حصیر، نمد گلیم، ردائے صحابہ، سطح خاک۔ میں مومن مجرم اپنے اس خداوند کو جس کی شان میں یہ مصرع اگرچہ مدح مجمل ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن قول فیصل ہے، آبدہ دست و زینت بخش مسند کیوں کر سمجھوں؟ بلکہ مجموع اہل اسلام بشرط فہم صحیح و طبع سلیم گوارا نہ کریں گے کہ وہ صفت عام جو دنیاداروں کے واسطے ہے، قبلۂ دین و دنیا پر صادق آئے۔ دکنی اور اس کے فضلہ خوار

قابلِ خطاب نہیں۔

ایہا الاخ المکرم! "فضلہ خوار" جواب ہے "پس گردان" جناب کا، یہ کلمہ منجب عتاب نہیں۔ یقین کہ آپ نے اب تو از روے دلالت لفظ بمعنی جان لیا ہوگا اور اسی فقیر حقیر کو نظر بہ قومیت ترک و پیشہ آبائی سپاہ گری عسس المحققین خطاب دیا ہوگا۔ جاننا اس امر کا کہ "آب دہ دست" میں اگر آب سے پانی اور دست سے ہاتھ مراد لیں تو اس کو اسم پیغمبر سمجھنا کتنی بے ادبی ہے اور اگر "آب" کو بمعنی رونق اور "دست" کو بمعنی مسند مانیں تو بے الحاق لفظ نبوت و ہدایت حضرت کو اس ترکیب کا مشارٌ الیہ سمجھنا کیسی بوالعجبی ہے۔ "آبدہ دست"، رونق بخش مسند صفت ہے۔ عموماً متعلق مالدار کی، یہاں تک کہ اس اصطلاح سے تعریف کر سکتے ہیں صرافان و ساہوکارانِ بلاد و امصار کی۔

ختم کلام

میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بکمال تعظیم سلام کرتا ہوں۔ پیغمبرؐ کی تقیر کو مسلّم رکھتے ہو، تم جانو اور سیّدِ ابرارؐ، خاقانی پر بہتان کرتے ہو، تم جانو اور وہ میدان معنی کا شہسوار۔ مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور راست نہیں، لیکن واللہ مجھ کو عرصۂ محشر میں اس کی بازخواست نہیں۔

زمین عشق بکونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

دیباچے اور تقریظیں

(۱)

دیباچہ سراج المعرفت

(مؤلفہ سیّد رحمت اللہ خاں بہادر)

سبحان اللہ آدمی اور خدا کی حمد و شکر کا دعویٰ! حمد و شکر کی گزارش کا سرمایہ دو قوتیں ہیں، فکر اور نطق اور یہ دونوں قوتیں موہبتی ہیں۔ بخشی ہوئی دستگاہ پر خود نمائی اور پھر اسی بخشنے والے کے آگے کیسی تنگ ظرفی ہے اور کیسی ہرزہ درائی۔ اس صورت میں ادائے حق حمد کے تو کیا معنی، مگر ہاں حمد کرنے والا بقدر توفیق حمد شایستۂ آفریں ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ توفیق نتیجہ کشت وکار ہے، البتہ عطیہ پروردگار ہے۔ قدرت حمد اس نے پیدا کی، توفیق حمد اس نے عطا کی۔ جبکہ آدمی حمد کا عازم ہو تو سپاس عطیہ توفیق کیوں نہ لازم ہو؟ ہاں اے حق شناس اگر تجھ کو شعور ہے، عطیہ توفیق شکر پر ایک اور شکر ضرور ہے:

گر کسے شکر حق فزوں گوید
شکر توفیق شکر چوں گوید

حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامۂ درہم پیچیدہ و سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے **لاموثر فی الوجود الا اللہ** اور خط میں مندرج ہے **لاموجود الا اللہ** اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔

ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں: آثاری و افعالی و صفاتی و ذاتی۔ انبیاے پیشین صلوات اللہ علیٰ نبینا وعلیہم، اعلان مدارج توحید سہ گانہ پر مامور تھے، خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھا دیں اور حقیقت نیرنگی ذات کو صورت **الآن کما کان** میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدیہ کا سینہ ہے اور کلمہ **لا اِلٰہَ الا اللہ** مفتاح باب گنجینہ ہے۔ زہے خامی عامۂ مومنین کی کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود، جو اصل مقصود ہے، وہ ان کی نظر میں نہیں۔ جب **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ** کے بعد **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ** کہیں گے، اس سے اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آ رہیں گے۔ یعنی ہمارے اس کلمہ سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعٰلمین ہونے کے اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح فزائے **من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ**۔

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے، لیکن وحدت حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے، کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبیؐ کی حقیقت ذوجہتین ہے: ایک جہت خالق کہ جس سے اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق، جس کو فیض پہنچاتا ہے:

نبیؐ را دو وجہ است دلجوے خلق — یکے سوے خالق، یکے سوے خلق
بداں وجہ از حق بود مستفیض — بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے الولایہ افضل من النبوۃ معنی اس کے صاف از روے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ہے، افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے، اُسی طرح ولی مستنیر ہے انوار نبوت سے۔ مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کی ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھی، نبوت کے ساتھ منقطع ہو گئی، مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے۔ نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور یہ سراج ایزدی ظہور صبح قیامت تک روشن رہے گا اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت۔ ولایت و ہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جواز روے کلمہ لا الہ الاّ اللہ مشہود عیون اعیان امت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے، مگر وہ بات اب کہاں، کہ ایک بار لا الہ الاّ اللہ کہے اور دل نُورِ معرفت سے منور ہو جائے اور وہ ضامن زبردست کہاں کہ قائل لا الہ الاّ اللہ کو، اگرچہ اس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو، قدم گاہ توحید پر قائم کر دے، یعنی رسولؐ مقبول واجب التعظیم، قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت۔ سچ بھی تو ہے، آدمی کیوں کر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اس کو کیوں کر تسلّی ہو، یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں، نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے۔

اے کردہ بآرایش گفتار بسیچ ۔۔۔ در زلف سخن کشودہ را خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش مے دانی ۔۔۔ ذاتیست بسیط، منبسط، دیگر ہیچ

جب اولیائُ اللہ نے کہ وہ اطبائے روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بہ سبب استیلائے وہم مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں۔ ہر چند ان کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے۔ ناچار اشغال و اذکار وضع کیے تاکہ قوت متخیلہ اس میں اُلجھی رہے اور رفتہ رفتہ بے خودی طاری ہو جائے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اس کو بہ جبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں:

دانی ہمہ اوست، ورنہ دانی ہمہ اوست

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا، بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری و پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بے خبری و بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آ گئی۔ ایک دریا میں جان کر کُودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا، انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں، یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں اور مخفی ہیں اور کہیں کہیں ہیں اور ایسے نفوس کو کہ جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشغال و اذکار ہیں بہت بلکہ بے شمار ہیں۔ حق سبحانہ ہمیشہ سلامت رکھے حضرت شاہنشاہی، حق شناس، حق آگاہ سراج الملۃ والدین ابوظفر بہادر شاہ کو جو لباس بادشاہی میں یادِ الٰہی کر رہے ہیں۔

شاہی و درویشی ایں جا باہم است ۔۔۔ بادشاہِ عہد قطبِ عالم است



حکم دیا حضرت پیر و مرشد برحق نے جناب افادت مآب، معرفت نصاب، مجمع البحرین شرع و عرفان، قران السعدین عقل و ایمان، ابوحنیفۂ ثانی، سراج العلماء، ضیاء الفقہاء، مولانا سید رحمت علی خان بہادر کو اور فرمایا ان سے کہ وہ اشغال و اذکار جو انتہائے قوس نزولی نبوت وابتدائے قوس عروجی ولایت یعنی عہد جناب رسالت علیہ السلام سے ہم سینہ بسینہ وہم سفینہ بسفینہ چلے آئے ہیں، ان کو ایک رسالے میں درج کریں اور اس رسالے کی تحریر میں وہ عبارت اردو کہ صاف اور بے تکلف ہو، خرچ کریں۔ کیوں کہ ارباب فہم اس رازداری پر قربان ہو جائیں کہ مجموع اشتغال و اذکار زبان حقیقت ترجمان سے فرمائے ہیں اور حکم دیا ہے کہ ان کو وابستہ لبسلاسل فقراو منقول من رسائل العرفا تحریر کریں۔ قضارا یہ ترک کج مج زبان، اسد اللہ خان ہیچمدان کہ جس کا فن سخن میں غالب نام اور وہ خود مغلوب ہوس ہائے خام ہے، اس رسالہ کے مشاہدے سے مستفیض ہوا۔ جی میں آیا کہ اس کتاب مستطاب پر ایک دیباچہ لکھیے اور پھر میں برگ و ساز کروں اور عزم سفر حجاز کروں، زمزم کے پانی سے وضو کروں اور اس کاشانۂ ملائک آشیانہ کے گرد پھروں اور حجر اسود کو چوموں اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ جاؤں اور خاک تربت اطہر کا سرمہ آنکھوں میں لگاؤں۔ بادشاہ سے کیا عجب ہے کہ دو برس کی تنخواہ دے کر مجھ کو خانۂ خدا کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گنہگار وہاں جاوے اور اگر زیست ہے تو وہاں جاکر اور اپنے ننانوے برس کے گناہ کہ جس میں سوائے شرک کے سب کچھ ہے، بخشوا کر پھر آوے:

غالب ہوائے کعبہ بسرم جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

—(۲)—

دیباچہ حدائق الانظار

(مولفہ خواجہ بدرالدین امان)

سبحان اللہ، شاہد زیبائے سخن کا حسن بے مثال، مشاہدہ اس کا نور افزائے نگاہ، تصور اس کا انجمن افروز خیال، از روئے لفظ اہل معنی کی نظر میں آئینہ عارض جمال، من حیث المعنی بصورت صنعت قلب کلام کا مقلوب یعنی کمال۔ اگر

---

(۱) کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ تحریر ۱۲۶۹ھ یا ۱۲۷۰ھ کی ہے۔ (۱۸۵۲-۱۸۵۳) ؟ میرزا چاہتے تھے کہ دو سال کی تنخواہ مل جائے تو وہ حج کے لیے چلے جائیں۔ اردو دیوان میں فرماتے ہیں:

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

معلوم ہے کہ ایک مرتبہ ابوظفر بہادر شاہ مرحوم نے بھی حج کا ارادہ کیا تھا۔ غالباً یہ ارادہ ۱۸۵۲-۱۸۵۳ میں کیا ہو اور اسی زمانے میں میرزا نے ساتھ لے جانے کی آرزو کی۔

نفس ناطقہ کو حق نے بصورت انسان پیدا کیا ہوتا تو ہم اس صورت میں کیوں کر کہیں کہ کیا ہوتا؟ اس صنعت دلفریب کی نظارگی سے بے بادہ مست ہو جاتے اور یہ پیکر ہوش ربا دیکھ کر اہل معنی یک قلم صورت پرست ہو جاتے۔ نہیں اور ہی روپ، نثر میں اور ہی ڈھنگ، فارسی میں اور ہی زمزمہ، اردو میں اور ہی آہنگ۔ سیر و تاریخ میں وہ کچھ دیکھو، جو سیکڑوں برس پہلے واقع ہوا، افسانہ و داستان میں وہ کچھ سنو کہ کبھی کسی نے نہ دیکھا نہ سنا۔

ہر چند خردمند بیدار مغز تواریخ کی طرف مائل ہیں گے، لیکن قصہ کہانی کی ذوق تشی و نشاط افزائی کے بھی دل سے قائل ہوں گے۔ کیا تواریخ میں ممتنع الوقوع حکایات نہیں؟ ناانصافی کرتے ہو، یہ کچھ بات نہیں۔ سام اپنے فرزند کو پہاڑ پر پھکوائے، سیمرغ اس کو اپنے گھونسلے میں اٹھا لائے۔ پرورش کر کے پہلوان بنائے۔ آداب جنگ و ضرب سکھائے۔ پھر جب رستم، اسفندیار کی لڑائی سے گھبرائے، زال اس اسم بے مسمیٰ کو بلائے۔ سیمرغ گرداں کبوتر کی طرح بیٹھ آواز سنتے ہی چلا آئے اور اپنی بیٹ کی لیپ سے یا اور کسی دوا سے رستم کے زخم اچھے کر کے، ایک تیر دو شاخہ دے کر فتح کرا لے جائے۔ رستم دس برس کی عمر میں مست ہاتھی کو ہلاک کرے، جب چشم بد دور، جوان ہو دیو سپید کو تہ خاک کرے۔ فرعون کا دعوائے خدائی مشہور ہے، شداد و نمرود کا بھی تواریخ میں ایسا ہی مذکور ہے۔ اگر اہل طبیعت ایک پہلوان زبردست اژدر کش رستم جیسا قرار دیں اور ایک زمرد شاہ گمراہ دعوائے خدائی کرنے والا مثل نمرود گھڑ ڈالیں، گو ایک ڈھکوسلا بنایا ہے، مگر روایات کا چربہ اٹھایا ہے۔ مگر اچھا اٹھایا ہے۔ موعظت و پند نہیں، تہ بات ندیمانہ ہے، سیر و اخبار نہیں، جھوٹا افسانہ ہے۔ داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے، سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔ عمرو کی عیاریاں دیکھو، حمزہ کی میدان داریاں۔



جامع ان حکایات کا کوئی سخنور ایران ہے مگر وہ میر تقی، محمد شاہی جو ندیم موتمن الدولہ اسحٰق خاں کا ہے گویا باغ ارم کو شہر میں اٹھا لایا۔ اس نے بوستان خیال میں کچھ اور ہی تماشا دکھلایا۔ ان قصص میں سے ایک جلد ہے معز نامہ۔ واہ ری بزم و رزم سحر و طلسم اور حسن و عشق کی گرمی ہنگامہ۔ معزالدین کی طلسم کشائیاں اگر سنیں تو امیر حمزہ کی یہ صورت ہو کہ اپنی صاحبقرانی کو ڈھونڈتے پھریں اور کہیں پتا نہ پائیں۔ ابوالحسن کی عیاریوں کے جوہر اگر دیکھیں، تو خواجہ عمرو کو یہ حیرت ہو کہ زیرہ سی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

درین ولا میرا برادر زادہ سعادت توأماں خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان کہ وہ ایک جوان شیریں بیان تیز ہوش ہے اور ہر فن کے کمال کی تحصیل میں سختی کش و سخت کوش ہے۔ ستار کا جو خیال آیا، ایسا بجایا کہ میاں تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ مصوری کی طرف جو طبیعت آئی، وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت ہوئی۔ اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا، معز نامہ کی فارسی نثر کے اردو کرنے پر آمادہ ہوا۔ معزالدین فیروز بخت کی کشور کشائیاں، ابوالحسن جوہر کی نیرنگ نمائیاں، عجائبات حکیم قطاس کی حیرت افزائیاں، ملکۂ نوبہار کی رنگین ادائیاں، جمشید خود پرست کی زور آزمائیاں، ضارِ منکوس منحوس کی بے حیائیاں، مسلمین و کفار کی لڑائیاں، مسلمانوں کی بھلائیاں، کافروں کی برائیاں، فارسی سے اردو میں لے آیا۔ یوں تصور کرو کہ قلم رو اردو میں ایک قصر دلکشا یا ایک خانہ باغ روح افزا سر تا سر بنایا۔ عبارت آرائی کو ترک کیا ہے، گویا تقریر کو پیرایۂ تحریر دیا ہے۔ بعد اختتام نگارش غالب فلک زدہ سے دیباچہ لکھنے کی آرزو کی۔ میں نے ہر چند عجز آمیز و معذرت انگیز گفتگو کی، بیدادگر نے ایک بات نہ سنی، ایک عذر نہ مانا۔ بھلا اس اصرار کا کیا ٹھکانا؟ اس ضد کا کیا علاج؟ بھتیجا اور پیارا بھتیجا، ناچار

بجز خامہ فرسائی کے کچھ نہ بن آئی۔ اس دیباچہ کے انجام کا بجز اس کے اور کوئی رنگ نظر نہ آیا کہ عالم ارواح کو سیدھا چلا گیا اور حضرت نظامی سے ایک شعر مانگ لایا۔ اسی شعر شعری شعار کو خاتمہ میں لکھے دیتا ہوں۔ بہت تنگ آ گیا ہوں، اب دم لیتا ہوں:

شکر کہ ایں نامہ بعنواں رسید

بیشتر از عمر بپایاں رسید

ومن اللہ التوفیق وھو خیر الرفیق

——(۳)——

تقریظ بر کتاب بہادر شاہ ثانی

اللہ اللہ! نطق کو آفریدگار نے کیا پایہ اور کیا سرمایہ دیا ہے کہ امورِ دینی میں سے کسی امر کا شہود اور مصالحِ دنیوی میں سے کسی مصلحت کا وجود بلکہ اگر مثل اسمِ اعظم فرض کیجیے تو اس کی بھی نمود، جب تک اس لطیفۂ غیبی کا شمول نہ ہو، عالمِ امکاں میں ممکن نہیں:

سخن را ازاں دوست دارم کہ دوست

بتصدیق از ما طلب گار اوست

مسائلِ حکیمانہ کی ہستی، ترہاتِ ندیمانہ کی مستی، درد و درماں کے مدارج کا اظہار، افسانہ و افسون کے مقاصد کا مدار، شکر و شکایت کا عنوان، نفرین و آفرین کا بیان، رد و قبول کی حکایت، فتح و شکست کی روایت، صرف و نحو کی راز دانی، لفظ و معنی کی گلفشانی، جو کچھ اگلوں نے کہا ہے، جو کچھ اب کوئی کہہ رہا ہے، جو کچھ آگے کہیں گے اور قیامت تک کہتے رہیں گے۔ جو کچھ نیک و بد نو و کہن سے ہے، سب وابستۂ نطق سخن سے ہے۔

اب سمجھیے کہ سخن از روے مثال کیا ہے؟ چشمہ ہے؛ ندی ہے؛ سیل ہے؛ دریا ہے؛ کیسی روانی اور کس زور کا پانی؛ اس کا چڑھاؤ، اس کی رفتار، اس پر کس کا زور اور کس کا اختیار؟ جدھر منہ کیا اُدھر ایک نالہ بہا دیا، دریا کی لہر کیا گھوڑے کی باگ ہے کہ کسی کے ہات ہو؟ بارہا دیکھا ہے کہ آغازِ کلام جس کی ہندی میں اٹھان اور فارسی میں انگیزہ اور عربی میں باعث کہیے کچھ اور ہے۔ پھر وسط میں صورت بدل کر وہ کچھ اور ہو گیا کہ انجام سے قطع نظر فی الحال نہیں سمجھا جاتا کہ یہ کیا طور ہے۔

یہ کتاب کہ مجموعۂ دانش و آگہی ہے، اگرچہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں، لیکن از روے حقیقت ایک نہر ہے کہ بحرِ سخن سے ادھر کو بہی ہے۔ جب اس نگارش نے انجام پایا تو مجھ کو پیشگاہِ سلطنتِ ابد مدت سے حکم آیا کہ بندۂ درگاہ، اسد اللہ اس کی تقریظ لکھنے میں اظہارِ حسنِ اطاعت کرے اور سخن طرازی میں آرایشِ زبانِ اردو پر قناعت کرے۔ جیسا کہ حکم بجا لانا ضرور، ویسا ہی یہ بھی کہہ جانا ضرور کہ منشاٴ اس رسالہ کی نگارش کا کیا ہے۔

ان اوراق کے ناظرین پر مخفی و مستور نہ رہے کہ سن اٹھارہ جلوس[1] میمنت مانوس میں، نہ شہر سے بلکہ خارج سے،

---

[1] یعنی ۱۸۵۲ء میں۔

یہ آوازہ بلند ہُوا کہ حضرت قدر قدرت، فلک رفعت، ثریا بارگاہ، انجم سپاہ، بادشاہ ابن بادشاہ، خلیفۂ روے زمین، ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ، بادشاہ غازی نے ترک مذہب آبا سے نامدار کیا اور تشیع کو تسنن پر اختیار کیا۔ باریافتگان بزم قرب و رازدانان خلوت اُنس حیران اور حیرت ان کی بجا۔ اگر بادشاہ نے کبھی یہ بات کہی ہوتی تو پہلے ان کو آگہی ہوتی۔ اسرار سلطنت کی خبر اور پھر اس میں عام کو تقدم خاص پر! نہ پوچھنے کا یارا، نہ چُپ رہنا گوارا۔ علماے نامدار و مشائخ کبار و فقہاے دیار نے جرأت کر کے عرضداشت لکھی۔ مضمون یہ کہ ایسا سُنا جاتا ہے اور باور نہیں آتا ہے۔ امیدوار ہیں کہ خداوند تاج و سریر کے ما فی الضمیر پر آگہی پاویں۔ حضور نے تحاشی کی اور فرمایا کہ کبھی ایسا داعیہ ہمارے ضمیر میں اور کبھی ایسا کلمہ ہماری زبان پر نہیں گزرا۔ بعد چند روز کے ایک دن حسب الحکم قضا توام:

بزم سلطانی ہُوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

شہنشاہ، گیتی پناہ، مسند جم نشین، اہل دل ہم نشین، امراے دستہ دستہ دست بستہ، صفحہ نگار بھی مانند خار سر دیوار باغ و پروانۂ پاے چراغ اس چمن میں نشاط اندوز اور اس انجمن میں ادب آموز۔ زبان مبارک گہر فشاں ہُوئی، حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت بیان ہُوئی، سوءِ ظن علماء اس مجمع عظیم میں بہ پیرایۂ حسن ظن جلوہ گر ہُوا۔ خاص و عام کو اعلیٰ حضرت کا ثبات قدم مسلک تسنن پر باور ہُوا۔ مضامین ارشاد کیے ہُوئے اعلیٰ حضرت کے بموجب ارشاد، قالب میں ڈھلے، ناگاہ جانب اجانب سے اس نظم کے جواب میں کچھ وار چلے۔ یہ گنہ گار بے گناہ بھی بہ ذم ممدوح ہُوا اور خنجر زبان کے زخم سے مجروح ہُوا۔ الغرض جب وہ تحریر یہاں دیکھی دکھائی گئی تو اس میں خلفا کی توہین پائی گئی۔ ناچار یہ رسالہ جیسا کہ حضرت مؤلف نے دیباچہ میں لکھا ہے، لکھا گیا اور مجھ کو تقریظ نگاری کے واسطے، جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، کہا گیا۔ میں اگر اس گزارش میں یہ سب نہ کہہ جاتا تو وضع تحریر کا موضوع لہٗ مجہول رہ جاتا۔ بحث و نزاع کا رسم و آئین اور ہے، شیوۂ سخندانان معنی آفریں اور ہے۔ نہ سفیہ ہوں کہ ہجو میں سخن سرائی کروں، نہ فقیہ ہوں کہ بحث میں زور آزمائی کروں۔ غریب الوطن سپاہی زادہ ہوں، فلک زدۂ خانماں برباد دادہ ہوں۔ تاب آفتاب حوادث سے ظل اللہ کے سایۂ دیوار کی پناہ میں بیٹھا ہوں، گویا ایک تھکا ہُوا مسافر ہوں کہ آرام کی جگہ دیکھ کر دم لینے کو راہ میں بیٹھا ہُوں۔ احسان ہے مجھ پر خدا کا کہ میں سواے اپنے خدا کے کہ وہ غیب دان اور اپنے بندوں پر مہربان ہے، یہ نہیں کہ کسی اور کا گنہ گار ہوں۔ جو مجھ کو اپنا ہم کیش سمجھیں اُن سے دعاے مغفرت کا متوقع اور جو مجھ کو اپنا مخالف مذہب گمان کریں اُن سے دعاے تخفیف عذاب کا اُمیدوار ہوں۔ حسبی اللہ نعم الوکیل، نعم المولیٰ و نعم النصیر۔

——(۴)——

تقریظ بر گلزار سرور

(مولفہ رجب علی بیگ سرور)

بسبحان اللہ خدا کی کیا نظر افروز صنعتیں ہیں، تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں۔ یہ جو حدائق العشاق کا فارسی زبان سے



عبارت اردو میں نگارش پاتا ہے، ارم کا ہین دنیا سے اٹھ کر بہارستانِ قدس کا باغ بن جاتا ہے۔ وہاں حضرت رضوان ارم کے نخل بند و آبیار ہوئے۔ یہاں میرزا رجب علی صاحب سرورؔ حدائق العشاق کے صحیفہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر یہ ہیچ میرز جو موسوم بہ اسداللہ خاں اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالبؔ ہے، خدائے جہاں آفریں سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہاں، اے صاحبانِ فہم و ادراک! سرورِ سحر بیان کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے:

رزم کی داستان گر سُنیے ہے زباں ایک تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے ہے قلم ایک ابرِ گوہر بار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان اور شوخئ تقریر میں "فسانۂ عجائب" بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعوے کو اور "فسانۂ عجائب" کی یکتائی کو مٹا دیا، یہ وہ تحریر ہے۔ کیا ہوا اگر ایک نقش دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے۔ مانی نقاش بے معنی تصویریں بنا کر پیمبری کا دعوٰی کرے، کیا عقل کی کمی ہے۔ یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعوائے خدائی نہ کرے، کس حوصلے کا آدمی ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ جناب مہاراجہ صاحب والا مناقب عالی شان الیشری پرشاد نارائن سنگھ بہادر[1] جس باغ کی آرائش کے کارفرما ہوں اور پھر اس پر طُرّہ یہ ہے کہ میرزا سرورؔ چمن آرا ہوں، وہ باغ کیسا ہوگا؟ بہشت نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ کوئی نہ کہے کہ یہ درویش گوشہ نشین فضول و سبک سر کیوں ہے؟ بے دیکھے بھالے حضور کا ثنا گستر کیوں ہے؟ صاحبو! حاتم سے ہم نے کیا دولت پائی ہے کہ اس کی سخاوت کی ثنا کرتے ہیں؟ رستم سے کہاں شکست کھائی ہے کہ ہم اس کی شجاعت کا ذکر کرتے ہیں؟ معہذا جناب مہاراجہ صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان بابو پرسد پرشاد نارائن کا مورد عنایت رہا ہوں۔ جن دنوں میں وہ دلی میں تشریف لائے ہیں، اکثر اوقات شریک صحبت رہا ہوں۔ جب ناشناسائی اور بیگانگی درمیان نہ ہو، تو ان کا نیازمند کیوں ان کا ثنا خواں نہ ہو؟ نہیں نہیں میرا کیا منہ ہے ثنا خوانی کا، میں تو عاشق ہوں ان کی شاعر پروری و سخن دانی کا۔ حضور نے قدر دانی کی، سرورؔ نے گوہر افشانی کی۔ حضور کا اقبال، سرورؔ کا کمال۔ حضور کی عالی ہمتی، سرورؔ کی خوش قسمتی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ یہ نقش صفحۂ روزگار پر یادگار رہے گا۔ مصنف کا شہرہ رنگین بیانی میں، مہاراج عالی جاہ کا نام فیض رسانی میں تا روز شمار رہے گا۔ فقط

—— (۵) ——

دیباچہ دیوانِ ذکاؔ

یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ شیاد کا نہیں۔ یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر اپنے دوستوں کے کلام کو معرض اصلاح میں بہ نظر دشمن دیکھتا ہے۔ پس جب تملق نہیں، مدارا نہیں تو جو مجھ کو نظر آیا ہے،

---

[1] مہاراجہ بنارس جن کے پاس سرورؔ ملازم تھے۔

بے حیف و میل کہوں گا۔ نثر میں نعمت خاں عالی[1] کی طرز کا احیا کیا ہے، مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری[2] کا چربہ اٹھایا ہے، مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز، عاشقانہ سوز و گداز۔ منشی حبیب اللہ ذکا، سخنور ہمہ دان یکتا، لفظ طراز، معنی آفریں، آفریں صد آفریں، صد ہزار آفریں۔

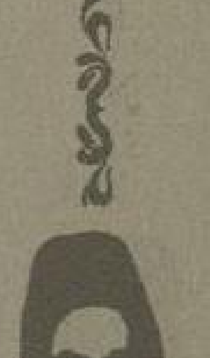
(۶)

دیباچہ قصائد

(میرزا کلب حسین خاں)

سبحان اللہ! شاہد سخن کمال حسن میں لاثانی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یوسفِ کنعانِ معانی ہے۔ کنعان ہو، کنواں ہو، کارواں ہو، کوئی جگہ، کوئی مقام، کوئی مکان ہو، زلف ویسی ہی معنبر، عارض بدستور تابدار، لب کی جاں بخشی کا وہی عالم، چشم اسی طرح بیمار۔ معہذا جو سلطنت مصر کے زمانے کا جمال تصور میں لائے گا، وہ آفتاب تاباں کو حضرت یوسف کا ادنیٰ ذرہ پائے گا لو ہم ابھی قلمرو سخن سے آئے ہیں۔ حسن پرستانِ سخن کے واسطے نوید سراسر اُمید لائے ہیں۔ سُنی سنائی نہیں کہتے، نہ دیکھے کے آئے ہوتے تو چُپ رہتے۔ اُمید یہ کہ دانش مند آدمی باور کریں، نوید یہ کہ دیدہ ور لوگ نظر کریں کہ یوسف سخن کنعان و چاہ و کاروان و بازار و زنداں سے نکل کر تخت فرمانروائی مصر پر جلوہ افروز ہوا ہے۔ زلیخائے عشق کے گھر عید ہوئی ہے اور یوسفِ حسن کی سرکار میں نوروز ہوا ہے۔

غالب آشفتہ، تو سن اس ورق کے ناظرین جب تک رمز نہ جانیں گے، تیری بات کبھی نہ مانیں گے۔ کیوں نہیں کہتا کہ خالق نے نواب عالی جناب والا دودمان میرزا کلب حسین خاں کو کیا اچھی طبیعت بخشی ہے، جو انھوں نے ان اوراق کو اپنے اشعار سے رونق اور اشعار کو نعت و منقبت سے زینت بخشی ہے۔ دیباچہ نگار نے اس مجموعۂ نظم کو مصر فرض کیا ہے اور شاہد معنی کو یوسف قرار دیا ہے۔ جس کتاب میں ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مدح کے سو قصیدے زینت اوراق ہوں، ان اوراق کے سواد کیوں نہ سرمۂ چشم اہل دین اور وہ اوراق کیوں نہ حرز بازوے مومنین آفاق ہوں۔ میں اپنے علوِ رتبت پر ناز کرتا ہوں کہ ائمہ اطہار کے مداح کا ستایش گر ہوں اور بذریعہ اس ستایش کے غالب پر غالب یعنی اپنے سے بہتر ہوں، اس دعوے کا گواہ، اسد اللہ۔ فقط



(۷)

دیباچہ رسالہ "تذکیر و تانیث"

(مولفہ سید فرزند احمد بلگرامی)

سیدی و سندی، نور بصر و لخت جگر، قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت و بقائے اقبال کی

---

[1] عہد عالمگیر کا مشہور شاعر اور نثر نگار۔ [2] فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر۔

دعا مانگتا ہوں، جن کو مبدءِ فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ سبحان اللہ تذکیر و تانیث کی تقریر کہ وہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے، کس لطف سے ادا ہوئی۔ ہرچند اس راہ سے کہ دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں۔ قواعد تذکیر و تانیث کے منضبط نہ ہونے کے خود معترف ہیں، لیکن قوت علم و حسنِ فہم و لطفِ طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہنچائے ہیں کہ اور صاحبوں کے دل کی دوسرے کو کیا خبر، مگر مجھے تو دل سے پسند آئے ہیں۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ رسالہ صفحۂ روزگار پر یادگار اور ہمیشہ منظور انظار و لوالابصار رہے گا۔ جو صاحب اس کا مطالعہ فرمائیں گے، نفع بھی پائیں گے اور لطف بھی اٹھائیں گے۔ مؤلف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر عظیم آباد و آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی سید صاحب عالم مارہروی کے نواسے ہیں۔ سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرت کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمۃ کا بیان ہے:

مادحِ خورشید مداحِ خود است
کہ مرا دو چشم سہ نا مُرمد است

داد کا طالب غالب

(۸)

خاتمہ "شعاعِ مہر"

(مرزا حاتم علی بیگ مہر)

اللہ اللہ نطق کو آفریدگار نے کیا پایہ اور کیا سرمایہ دیا ہے کہ امور دینی میں سے کسی امر کا شہود اور مصالح دنیوی میں سے کسی مصلحت کا وجود، بلکہ اگر مثل اسمِ اعظم فرض کیجیے تو اس کی بھی نمود جب تک اس لطیفۂ غیبی کا شمول نہ ہو، عالم امکان میں نہیں۔ مسائل حکیمانہ کی ہستی، ترہات ندیمانہ کی مستی، درد و درماں کے مدارج کا اظہار، افسانہ و افسوں کے مقاصد کا مدار، تشکر و شکایت کا عنوان، نفرین و آفرین کا بیان، رد و قبول کی حکایت، فتح و شکست کی روایت، صرف و نحو کی رازدانی، نثر و نظم کی گلفشانی، جو کچھ اگلوں نے کہا ہے، جو کچھ اب کوئی کہہ رہا ہے، جو کچھ آگے کہیں گے اور قیامت تک کہتے رہیں گے جو کچھ متعلق نیک و بد، نو و کہن سے ہے، سب وابستہ نطق سخن ہے۔

اب سمجھیے کہ سخن از روئے مثل کیا ہے؟ چشمہ ہے؟ ندی ہے؟ سیل ہے؟ دریا ہے؟ کیسی روانی ہے؟ کس زور کا پانی؟ اس کا چڑھاؤ، اس کی رفتار، اس پر کس کا زور، کس کا اختیار؟ جدھر منہ کیا اُدھر ایک نالہ بہا دیا۔ دریا کی لہر کیا گھوڑے کی باگ ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہو؟ ہاں اہل خرد کو اٹھا لینا چاہیے جو لطف جس بات میں ہو۔ یہ مثنوی کہ مجموعۂ دانش و آگہی ہے اگرچہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایک نہر ہے کہ بحرِ سخن سے ادھر بہی ہے۔ سخن ایک معشوقِ پری پیکر ہے۔ تقطیع شعر اس کا لباس اور

---

۱ مسائل حکیمانہ سے یہاں تک عبارت وہی ہے جو بہادر شاہ کی کتاب کے لیے لکھی گئی (ملاحظہ ہو تقریظ بر کتاب بہادر شاہ)

مضامین اس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہد سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکش ماہ تمام پایا ہے، اس رو سے اس مثنوی نے "شعاعِ مہر" نام پایا ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ یہاں مہر سے مراد آفتاب ہے۔ یہ شعاع اس مہر کی ہے کہ جو ذرۂ خاک راہِ بوتراب ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ سخنور روشن ضمیر مہر جہر میرزا حاتم علی مہر کو سخن طرازی میں ید بیضا ہے اور از روے انصاف اس طرح سے کہ نہ ادھر سے لاف، نہ ادھر سے گزاف، سچ سچ، صاف صاف۔ یہ مہر اپنے ہم نام مہر سپہر کا ہم چشم اور ہمتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ غالب کا شیوہ درویشی و آزادہ روی ہے۔ مہر کے حسن گفتار اور میرے صدق اظہار پر برہان قاطع یہ مثنوی ہے۔ میں فن تاریخ و فن معما سے بیگانہ ہوں۔ صرف حسن خداداد معنی کا دیوانہ ہوں۔ مثنوی کا طرز تحریر دل پذیر ہوئی، اس سے یہ تقریظ دل پذیر تحریر ہوئی۔ چاہیے یوں کہ کوئی کاتب کسی وقت میں اس تقریظ کو مثنوی سے جدا نہ کرے۔ ہاں گنجایش اس کی ہے کہ کسی زمانہ میں سہو و غفلت سے یہ امر واقع ہو۔ یہاں ہم کہتے ہیں کہ خدا نہ کرے ۱۲

(۹)

دیباچہ دیوان سخن



فخر الدین حسین سخنؔ ابن خواجہ جلال الدین حسین ابن فقیر مودود چشتی، یہ اصلاً لکھاری (سندھ) کے تھے۔ سخنؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۳ء میں اپنے پھوپھا میرزا محمد صدیق بہادر صدر امین ضلع سارن کے ہمراہ آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) چلے گئے۔ وہاں وکالت کرتے رہے۔ ۱۳۱۸ھ میں کلکتہ میں وفات پائی۔ کچھ مدت کے لیے غالباً منصف بھی ہو گئے تھے۔

نام خدا، سلطان قلمرو سخن، دیوان خاص میں رونق افزا ہوا ہے اور "نگاہ روبرو" "پادشاہ سلامت" کا شور ہر طرف بپا ہے۔ اہل نظر پادشاہ کا حسن و جمال اور بارگاہ کی عز و شان دیکھیں، سخنوروں کے ہزاروں دیوان دیکھے ہوں گے، اب سخنؔ کا دیوان دیکھیں۔ زہے شاعر یکتا و نامی کہ جس کا پیارا نام سخنؔ ہے، یعنی ہمہ تن سخن اور کام سخنؔ ہے۔ قرۃ العین خواجہ سید محمد فخر الدین حسین کو اگر سخنور بے عدیل کہوں تو بجا ہے، کیونکہ اس کا حسن کلام میرے دعوے پر دلیل اقوے ہے۔ اس سحر کار جادو نگار نے پری زادان معنی کو الفاظ کے شیشوں میں اس طرح اتارا ہے، جیسے آبگینے سے رنگ مے نظر آئے، لفظ سے جلوۂ معنی آشکار رہے۔ میں مغلوب دہر، غالب نام جو بازار ہستی میں متاع کاسد ہوں، بہ حسب اصطلاح فقہا اس سید زادۂ قدسی نہاد کا جد فاسد ہوں۔ چشم بد دور ہنوز آغاز جوانی اور نو بہار باغ زندگانی ہے۔ عمر کے لیے دفتر قضا و قدر میں حکم دوام لکھا گیا ہے۔ پس اگر جودت فکر طبیعت کی روانی ہے، اغلب ہے ذوق شعر اور شغل تحریر اشعار چلا جائے گا، پھر تو یہ دیوان اوراق افلاک میں نہ سمائے گا۔

(۱۰)

تقریظ "جام جہاں نما"

جناب بابو صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت!

نیاز مہر کیشانہ و دعائے درویشانہ قبول فرمائیں۔ ایک دن تفقد نامہ اور دوسرے دن نسخۂ اعجاز ہنگامہ پہنچا۔ نظر اس تقدیم و تاخیر پر خط کو پھول اور کتاب کو پھل سمجھا۔ پھول سے نشاطِ تازہ اور پھل سے لذتِ بے اندازہ پائی۔ "جامِ جم" جہاں نما ہو گا مگر کیا جانیے کیا ہو گا، بلکہ اس میں تردد ہے کہ نہ ہو گا یا ہو گا۔ جام جہاں نما یہ کتاب ہے جس سے ہر دیدہ ور بہرہ یاب ہے۔ یہاں تو میں مدح سے قاصر رہا۔ یہ میں نے کیا کہا؟ جس طرح ہر دیدہ ور پڑھ کر حظ اٹھا سکتا ہے، نابینا بھی سن کر لطف پا سکتا ہے۔ فیض اس کتاب کا عام ہے، "جہاں نما" اس کا سچا نام ہے۔

اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر کی خدمت گزاری اور اشاعت علم میں مددگاری ذریعۂ افتخار ہے۔ مگر فقیر میں تین عیب ہیں: ستر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، ہمیشہ بیمار ہے۔ آمد و رفت دوام میں قاصر اور جو تحریر وہاں سے آیا کرے گی اس مشورت میں حاضر رہے گا۔ یہ نہیں کہ نہ جاؤں گا مگر حسب الطلب یا حسب ضرورت کارگزار و فرمانبردار رہوں گا۔ بہر صورت تعجب ہے کہ اسسٹنٹ بہادر نے مجھے یاد کیوں نہ کیا، بلا کیوں نہ لیا؟ یقین ہے کہ جب آپ یہ خط اپنے نام کا حضرت کی خدمت میں بھجوا دیں گے تو وہ مجھے بے تکلف بلا لیں گے۔[1] فقط

عنایت کا طالب، غالب



(۱۱)

اردوئے معلّٰی کا حق طباعت

پیکر بے روح و رواں، فقیر اسد اللہ خاں غالب تخلص ہیچداں کہتا ہے اور لکھ دیتا ہے کہ یہ جو اردوئے معلّٰی تصنیف فقیر اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا، سو میں نے از راہِ فرطِ محبت اپنا حق تالیف نورِ چشم اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے اور اس حق کو خاص ان کا حق کیا۔ اب کوئی اور صاحب اگر مالک اکمل المطابع حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع اردوئے معلّٰی چھاپنے کا قصد کریں گے تو مواخذہ سے محفوظ نہ رہیں گے۔ اور فوراً حسب منشا قانون بستم ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔

مہر نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر
نظام جنگ (۱۲۶۶ھ)

۱؎ بنام ماسٹر پیارے لال آشوب

ضمیمہ

امین الدین احمد خاں

اے میری جان،

کس وقت مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے نکیرین کے جواب دینے کا زمانہ قریب آگیا۔ میرا حال اب جس کو دریافت کرنا ہو، وہ اہل محلّہ سے دریافت کرے۔ تمھاری خاطر عزیز ہے۔ فکر کی۔ بارے نفسِ ناطقہ نے بُری بھلی طرح مدد دی۔ نو شعر پہنچتے ہیں، لیکن نہ شاعرانہ، نہ عارفانہ۔

غزل

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں دشتِ غم میں آہوے صیاد دیدہ ہوں
ہو درد منداً جبر ہو یا اختیار ہو — گر نالۂ کشیدہ، گر اشکِ چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن — از بسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ — میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ — نے دانۂ فتادہ ہوں، نے دامِ چیدہ ہوں
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت — میں یوسفِ بہ قیمتِ اول خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ — ہوں میں کلامِ نغز، و لے ناشنیدہ ہوں
اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے فرقے میں، میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں[1]

۳۔ مارچ سنہ ۱۸۶۷ء — (ماخوذ از نقوش مکاتیب نمبر)

---

[1] اس زمین میں میرزا غالب کی دو غزلیں "نسخہ حمیدیہ" میں موجود ہیں لیکن اس خط میں جو نو شعر درج ہیں ان میں سے ایک بھی شعر نسخہ حمیدیہ میں موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ غزل بعد میں کہی گئی۔ لیکن کب؟ اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ خط کے بعض الفاظ سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ یہ سنہ ۱۸۶۱ء میں کہی گئی۔ لیکن اس زمانے میں میرزا کا عام اسلوب وہ نہ تھا، جو ان اشعار میں مسلسل اختیار کیا گیا۔ یہ اسلوب "نسخہ حمیدیہ" کے اسلوب سے قریب تر ہے۔ "فضا اور سہی"، "گلا ہے تو سہی" وغیرہ غزلوں کا انداز جو یقیناً آخری دور میں کہی گئیں، (باقی صفحہ ۵۸۰ پر)

غلام نجف خاں

لو صاحب۔ یہ پندرہ بیتیں ہیں۔ تقسیم اس کی اس طرح رکھنا کہ پہلے ایک سیدھی سطر میں صاحب ایجنٹ کا نام مع اجزائے خطابی بخط نستعلیق لکھا جاوے اور پھر ترچھی پانچ پانچ بیتیں تین بار لکھی جاویں اور آخر کو یہی سطر، جو میں نے اپنے نام کی مع خطاب و تخلص لکھ دی ہے، جس طرح کہ ہے اسی طرح لکھی جاوے۔ کاغذ البتہ بڑا ہوگا اور تقسیم اچھی طرح کیا جاوے گا۔ ان دو شعروں اور پندرہ شعر پر تو صورت بہت اچھی ہوگی۔ یہ ایک نمونہ ہے، مگر نمونہ اچھا ہے۔ تم کسی شخص سے اس کی نقل کرواؤ اور کاتب خوشنویس یعنی مرزا عباد اللہ بیگ سے لکھواؤ۔ اب آپ اس کو جلد تیار کروایئے اور...... آپ کو اب کے ہی ملے گا۔[۱] والسلام....

شہاب الدین احمد خاں ثاقب

میاں ثاقب صاحب

کہاں پارسل بناتا پھروں، کہاں ڈاک میں بھجواتا پھروں، تم اس کتاب کو لوہارو بھیج دو اور جلد بھیج دو۔

نیم روز دوشنبہ ۲۴۔ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء

شیو نرائن آرام

بھائی۔ میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ آج میرے پاس لکھنؤ کے ایک پارسل کی رسید آگئی۔ دوسرا بھی یقینی پہنچ گیا ہوگا۔

(بقیہ ص ۵۷۹) اس غزل سے مختلف ہے۔ یہ غزل ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم نے "ہمدرد" میں شائع کی تھی۔ مالک رام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ علائی کی بیاض میں تھی۔ [۱] یہ خط ایک قطعہ لکھوانے کی غرض سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا گیا تھا اور قطعہ کا ممدوح :

"معظم الدولہ، امین الملک اختصاص یار خاں فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی بارنٹ تامس تھیا فلس مٹکف صاحب بہادر فیروز جنگ"

تھا۔ قطعے کے آخر میں لکھا تھا:

عرضداشت نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب تخلص

جس عباد اللہ بیگ خوشنویس کا ذکر ہے وہ محمد امیر پنجہ کش کا شاگرد رشید تھا۔ ٹامس تھیوفلس مٹکاف، فریزر کے قتل پر ۱۸۳۵ء میں ریذیڈنٹ یا ایجنٹ مقرر ہوا اور ۱۸۵۳ء تک اسی عہدے پر رہا۔ بیرن کا خطاب اسے بڑے بھائی چارلس مٹکاف کی (باقی ص ۵۸۱ پر)

خاطر جمع رکھو۔ جناب آرنلڈ صاحب بہادر[1] آج تشریف لے گئے۔ سنتا ہوں کلکتہ جائیں گے۔ میم اور بچّوں کو ولایت بھیج کر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک ان کا شکر گزار رہوں گا۔

میرزا حاتم علی صاحب مہر اگر آجائیں تو ان کو میرا سلام کہنا۔ میرزا تفتہ کو اگر خط لکھو تو میری دعا لکھنا۔

دوشنبہ، ۱۷۔ جنوری ۱۸۵۹ء

سیّد کرامت حسین ہمدانی المتخلص بہ کرامت

از دہلی محلہ بلّی ماراں، ۷ مئی ۱۸۵۹ء

جیتے رہو اور خوش رہو   ع۔ اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

تمہارا خط آج صبح کو آیا۔ میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں:

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا   زیارت کدہ ہُوں دل آزردگاں کا

میرے اس شعر میں اظہارِ ناکامی کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مصرع اوّل کے آخر میں "ہوں" محذوف ہے۔ تشنگی استعارہ ہے آرزوے شوق سے۔ مطلب یہ ہے کہ میں گویا لبِ خشک ہوں ان لوگوں کا جو آرزوے شوق میں مر گئے ہیں اور میں زیارت کدہ ہوں آزردہ دل لوگوں کا۔

شبِ غم مرا تڑپنا وہ جگر میں درد ہونا   کبھی رو کے آہ کرنی کبھی آہ کر کے رونا

تمہارا یہ مطلع بہت اچھا ہے اور مجھے پسند ہے۔ دوسرے مصرع کو یوں بنا دو:

کبھی آسماں کو تکنا کبھی آہ کر کے رونا

"رو کے آہ کرنی" کے بجاے آسمان کو تکنا زیادہ برمحل ہے۔

نجات کا طالب۔ غالب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۰) وفات (۱۶۔ دسمبر ۱۸۳۵ء) پر ملا تھا لہٰذا یہ قطعہ ٹامس مٹکاف کے بچہ پیدا ہونے پر ۱۸۴۶ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان لکھا گیا اور اسی کی بنا پر قطعے کی تاریخ متعین کی جاسکتی ہے (بہ شکریۂ "آجکل" فروری ۱۹۶۵ء) [1] یہ حضرت علامہ اقبال کے استاد پروفیسر آرنلڈ مصنف پریچنگ آو اسلام کا بھائی ولیم ڈیلافیلڈ آرنلڈ ۱۸۵۶ء میں تعلیماتِ پنجاب کا ڈائرکٹر مقرر ہوا تھا میرزا سے ملاقات کے بعد کلکتہ گیا۔ بیوی بچوں کے ساتھ انگلستان روانہ ہوا راستے میں بیمار ہو گیا۔ جبل طارق پہنچ کر ۹۔ اپریل ۱۸۵۹ء کو وفات پائی۔

محمد حسین خاں

جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اسی میں درج کردیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار محض ہو گیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت کیا، میرا بیان کیا، میر قمر الدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں۔ کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلّد گویا مسودہ ہے اسی کو بھیج دیجیے۔

(اواخر ۱۸۶۱ء)

غالب ۱۲

صفیر بلگرامی

نورِ چشم و سرورِ دل فرزانہ مرتضوی گہر مولوی سید فرزند احمد صاحب زاد مجدہٗ اس نسبتِ عام سے، کہ ہم اور آپ مومن ہیں، سلام اور اس نسبتِ خاص سے کہ آپ میرے دوستِ روحانی کے فرزند ہیں، دعا اور اس نسبتِ اخص سے کہ آپ میرے خداوند کی اولاد میں سے ہیں، بندگی۔

میں قائلِ خدا و نبی و امام ہوں
بندہ خدا کا اور علیؓ کا غلام ہوں

آپ کے دو خطوں کا جواب بہ سبیلِ ایجاز لکھا جاتا ہے۔ دہائی خدا کی مجھے ولایت کے اپیل کی تاب نہیں۔ نہ تم اپیلانٹ بنو، نہ مجھے رسپانڈنٹ بناؤ۔ لکھ بھیجو کہ "صبحِ بہار" کی عبارت فارسی ہے یا اردو اور ماکتب فیہ اس کا کیا ہے۔

چہار شنبہ ہفتم ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ
(۳ مئی ۱۸۶۵ء)

نجات کا طالب
غالب

حبیب اللہ ذکاؔ

بندہ پرورا پرسوں مولوی صاحب کا خط آیا۔ ماکتب فیہ بسبیل نقل یہ۔ . . . . . (جگہ چھوڑ دی ہے) آج مسودہ عرضداشت کا جو آپ نے مجھ کو بھیجا تھا، پیش گاہ آقائے نامدار میں گزارنا، اور اپنے نام کے خط کا بھی پیش کرنا مناسب جانا۔ بعد ملاحظہ کے یوں ارشاد ہوا کہ قصیدہ اور عرضداشت کی تفتیش اور تلاش کی جاوے جو دار الانشاء میں ملے تو جواب لکھا جاوے۔ یقین ہے کہ بعد گرد آوری کاغذات کے اگر عرضداشت مل گئی یا قصیدہ نکل آیا تو جواب ملے گا۔ ۱۲

اب میں بقول صائب:

درماندۂ کارِ خودم حیرانِ اطوارِ خودم
ہر لحظہ دار دنیستی چو قرعۂ رمال ہا

یُوں سمجھا ہُوا تھا کہ وُہ لفافے جو علی التواتر یکے بعد دیگرے ارسال ہُوئے ہیں، متواتر دار الانشا میں پہنچے اور منشی نے چاک کر کے پھینک دیے ہوں۔ مانا کہ یُوں ہی ہُوا بشرطِ التفاتِ مولانا میرا مطلب اس صورت بھی فوت نہیں ہوتا۔ یعنی مولوی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ جو نذر اس کی میری معرفت گزری ہے اس کے قبول ہونے کی عز اطلاع میں وہی لکھا جائے جو قصیدہ و عرضداشت کے گزارنے کے بعد لکھا جاتا۔ مولوی موید الدین صاحب جو حضرت کے مقرب اور اوس حضرت میں میرے مقرب ہیں، بہ کلمہ موجز کہہ سکتے ہیں مگر میں ان سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ وُہ کاغذ دفتر سے نکل کر پیش ہُوئے یا نہیں۔ ۱۲

آگے اس سے جس دن دیوان کا پارسل اور خط مولانا کو بھیجا ہے۔ اس کے دُوسرے دن ایک پارسل اور ایک خط آپ کو میں نے بھیجا ہے۔ آج تک اس پارسل کی رسید میں نے نہیں پائی۔ سخت مشوّش ہوں۔ اگر وہ پارسل پہنچ گیا ہے تو اس کی رسید لکھیے اور اگر نہیں پہنچا تو وہاں کے ڈاک گھر میں دریافت کیجیے اور میرے اس خط کا جواب لکھیے۔

نجات کا طالب

غالبؔ ۱۲

ہاں۔ خوب یاد آیا۔ وہ قصیدہ بھی اس کلیّات میں مطبوع ہو گیا ہے صفحہ ۳۴۶ سطر ۱۲۔ دفتر سے قصیدے کا کاغذ نہ نکلنے کی صورت میں بھی قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے [۱]

”غدر“ کے متعلق غالبؔ کی ایک تحریر

ایامِ ”غدر“ کے سلسلے میں میرزا کی یہ تحریر ”انتخابِ غالبؔ“ میں چھپی تھی، جو میکلوڈ صاحب فنانشل کمشنر (بعد میں لفٹنٹ گورنر) پنجاب کی فرمایش پر مرتب ہُوئی تھی اور معلوم ہُوا ہے کہ ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۰ء میں اسے چھاپ دیا گیا تھا۔

غدر کے دنوں میں، میں نہ شہر سے نکلا، نہ پکڑا گیا، نہ میری روبکاری ہُوئی۔ جس مکان میں رہتا تھا وہیں بدستور بیٹھا رہا۔ بلّی ماروں کے محلے میں میرا گھر تھا۔ ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کے اس خاص کوچے میں اُتر آئے، جہاں میں رہتا تھا۔ اس کوچے میں بہ ہمہ جہت پچاس یا ساٹھ آدمی کی بستی ہوگی۔ سب کو گھیر لیا اور ساتھ لے چلے۔ راہ میں سارجن (سارجنٹ)

---

[۱] یہ اس قصیدے کا ذکر ہے جو نواب مختار الملک سر سالار جنگ اوّل کی مدح میں لکھا اور کلیات نظم فارسی طبع اوّل میں صفحہ ۳۴۶ - ۳۴۹ پر چھپا تھا۔ میرزا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ بھیجا گیا اور وہ دفتر انشا میں گم ہو گیا۔ ڈاک کے ذریعے سے مولوی موید الدین تک یہ بات پہنچانا چاہتے ہیں کہ اس کی رسید بطریق مرسوم بھیجی جائے۔ قصیدہ دفتر انشا سے نہ ملے تو مطبوعہ کلیات فارسی پیش کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔

بھی آملا۔ اس نے مجھ سے صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا: "آدھا مسلمان۔" اس نے کہا "ول صاحب! آدھا مسلمان کیسا؟" میں نے کہا: "شراب پیتا ہوں۔ ہیم (خوک) نہیں کھاتا۔"

غرض کہ وہ مجھے کرنل براؤن[1] کے پاس لے گیا۔ وہ چاندنی چوک میں حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اترے ہوئے تھے۔ باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا۔ اوروں سے نام بھی پوچھا اور پیشہ بھی پوچھا۔ نام میرا سن کر فرمایا کہ "اسداللہ خاں بڑے تعجب کی بات ہے کہ باؤ۔ ٹُپ[2] پر نہ آئے۔" میں نے کہا: "آپ سنیں تو کہوں۔" کہا "ہاں کہو۔" میں نے کہا "تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے۔ میں کیوں کر آتا؟ اگر کوئی فریب کر کے، کوئی بات بنا کے نکل جاتا، جب باؤ ٹے کے قریب گولی کی زد میں پہنچتا، پہرے والا مجھے گولی مار دیتا۔ یہ بھی مانا کہ تلنگے باہر جانے دیتے، گورے گولی نہ مارتے۔ میری صورت کو دیکھیے، میرا حال معلوم کیجیے۔ بوڑھا ہوں۔ ہاتھ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، نہ لڑائی کے لائق، نہ مشورت کے قابل، دعا کرتا سو یہاں بھی دعا کرتا رہا۔

کرنل صاحب ہنسے اور فرمایا: اچھا تم اپنے گھر جاؤ۔ باقی اہل محلہ سے غرض نہ رکھو۔ میں خدا کا شکر بجا لایا اور کرنل براؤن صاحب کو دعا دیتا ہوا اپنے گھر آیا۔[3]

---

[1] اس کا نام برن (Burn) تھا، جو ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا تھا اور اصل واقعہ ۵۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء کا ہے۔

[2] جھنڈا، پرچم، شہرہ۔ باہر شمال مشرق میں ایک مقام جسے انگریز فلیگ سٹاف کہتے تھے۔ یہیں محاصرۂ دہلی کے دوران میں انگریزوں کا مرکز تھا۔ [3] یہ واقعہ مجملاً دستنبو میں بھی لکھا ہے۔

ماسٹر پیارے لال آشوب

جناب بابو صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت۔ نیاز مہر کیشانہ و دعائے درویشانہ قبول فرمادیں۔ ایک دن پہلے تفقد نامہ اور دوسرے دن نسخۂ اعجاز ہنگامہ پہنچا۔ نظر اس تقدیم و تاخیر پر خط کو پھول اور کتاب کو پھل سمجھا۔ پھول سے نشاطِ تازہ اور پھل سے لذت بے اندازہ پائی۔ جام جم جہاں نما ہوگا مگر کیا جانئے کیا ہوگا بلکہ اس میں تردد ہے کہ نہ ہوگا یا ہوگا جام جہاں نما یہ کتاب ہے جس سے ہر دیدہ ور بہرہ یاب نہ ہے۔ یہاں تو میں مدح میں قاصر رہا۔ یہ میں نے کیا کہا جس طرح ہر دیدہ ور پڑھ کر حظ اٹھا سکتا ہے۔ نابینا بھی سُن کر لطف پا سکتا ہے۔ فیض اس کتاب کا عام ہے۔ جام جہاں نما اس کا سچا نام ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر کی خدمت گزاری اور اشاعت علم میں مددگاری ذریعۂ عز و افتخار ہے۔ مگر فقیر میں تین عیب ہیں۔ ستر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، ہمیشہ بیمار ہے۔ آمد و رفت دوام میں قاصر اور جو تحریر وہاں سے آیا کرے گی اس کی مشورت میں حاضر رہے گا۔ یہ نہیں ہے کہ نہ جاؤں گا۔ آنکھوں سے جاؤں گا مگر حسب الطلب یا حسب ضرورت کارگزار فرماں بردار رہوں گا۔ بہر صورت تعجب ہے کہ صاحب اسسٹنٹ بہادر نے مجھے یاد کیوں نہ کیا، بلا کیوں نہ لیا۔ یقین ہے کہ جب آپ یہ خط اپنے نام کا حضرت کی خدمت میں بھجوا دیں گے تو وہ مجھے بے تکلف بلا لیں گے۔ فقط

(اگست ۱۸۶۵ء)

عنایت کا طالب

غالبؔ

نوائے سروش

مکمل دیوانِ غالب مع شرح

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

جناب **غلام رسول مہر** صاحب

نے جس محنت سے خطوطِ غالب کو ترتیب دیا ہے بالکل اسی طرح انہوں نے نوائے سروش کو بھی اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس لیے یہ پڑھنے والوں کے لیے کشش کا باعث ہے۔

EST - 1887

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز

لاہور • حیدرآباد • کراچی